

# طاہرہ

یہ ناول بھٹی کے جہیز میں شامل ہونا چاہیے

عنایت اللہ

RDEBOOKSFREE.PK



## پیش لفظ

ہر مصنف اس دعوے کے ساتھ کتاب لکھتا ہے کہ ایسی کتاب پہلے کبھی نہیں لکھی گئی، اور یہ ایک بے مثال شاہکار ہے۔ ہر مصنف اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کی کتاب کے درجنوں ایڈیشن بکیں گے۔ اس دعوے کی تصدیق اور تائید کے لیے علم و ادب کی کسی معروف شخصیت سے دیباچہ، پیش لفظ یا تعارف لکھوایا جاتا ہے جس میں تعریفوں کے پُل باندھے جاتے ہیں مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ پُل بڑے کمزور اور بے سہارا ہوتے ہیں۔ قارئین کسی ایک بھی پُل کو کھڑا نہیں رہنے دیتے۔

مصنف کی برکتی یہ ہے کہ یہ فیصلہ کہ یہ کتاب پڑھنے کے قابل بھی ہے یا نہیں اس قاری کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کی جیب ہر مصنف کا ہاتھ پڑتا ہے۔

میں یہ ناول کسی دعوے سے پیش نہیں کر رہا اور اس کی بے جا تعریف کسی بڑی یاد یا چچے لکھنے والی کسی پیشہ ور شخصیت سے دیباچے کی صورت میں نہیں لکھوایا، میں دیباچہ اس لیے بھی نہیں لکھوایا کہ قاری اور کہانی کے درمیان آجانا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔ میں کہانی کے متعلق اپنی کوئی رائے نہیں دوں گا، کتاب کے متعلق دو چار باتیں کننا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ ضرور سنیں۔

اس کتاب کی قیمت ۳۹ روپے ہے جو زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں جتنا مواد یا جارا ہے وہ ۵۵ روپے کا ہے۔ وہ اس طرح کہ بازار میں آپ کو جو کتابیں ملتی ہیں ان کے ہر صفحے پر انیس سطریں تحریر ہوتی ہے اور کتابت کھلی کھلی ہوتی ہے بعض کتابیں انیس کی بجائے سترہ سطروں کی ہوتی ہیں۔ اس طرح کتاب کی ضخامت بڑی کر لی جاتی اور قیمت زیادہ رکھی جاتی ہے۔

یعنی کتاب کی ضخامت زیادہ اور مواد خاصا کم ہوتا ہے۔ ایسی کتاب کی مثال دوانی کی اس شمشیر کی سی ہے جس میں چند ایک گولیاں ہوتی ہیں اور باقی شمشیر روئی سے بھری ہوتی ہے۔

اس کے مقابلے میں علامہ کوہیں عام سائز سے بڑے سائز میں پیش کر رہے ہیں۔ سترہ یا انیس کی بجائے اس کے ہر صفحے پر ستائیس سطریں ہیں۔ اس کے علاوہ کتابت باریک کرائی گئی ہے تاکہ بہت زیادہ مواد کم سے کم صفحوں میں دیا جاسکے۔ اگر میں اسے عام کتابوں کے انداز سے چھاپتا تو یہی کمائی جسے میں نے ساڑھے تین سو صفحوں میں سمیٹ لیا ہے چھ سو صفحوں پر پھیل جاتی اور لاگت کے لحاظ سے اس کی قیمت چالیس روپے ہوتی۔ میں نے شمشیر میں روئی کی جگہ بھی گولیاں بھری ہیں۔

میں یہ وضاحت صفت کی حیثیت سے نہیں ناشر کی حیثیت سے کر رہا ہوں۔ کاروباری نقطہ نگاہ سے مجھے یہ کتاب عام کتابوں کے انداز سے پیش کرنی چاہیے تھی لیکن میں نے کم بیسوں میں زیادہ سے زیادہ مواد دینے کی کوشش کی ہے۔ میرے پیش نظر کم از کم اس ناول کے متعلق کاروباری مفاد کم اور یہ خواہش زیادہ ہے کہ یہ گھر گھر پہنچے۔

یہ بھی پیش نظر رکھیے گا کہ یہ کتاب فولڈ آؤٹ پر چھاپی گئی ہے جس کے اخراجات عام چھاپائی سے تین گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ سرورق چار رنگوں میں چھاپا گیا ہے جس میں نے یہ اخراجات کتاب کو خوبصورت بنانے کے لیے برداشت کیے ہیں۔

اس کے باوجود اگر آپ قیمت زیادہ سمجھیں تو یہ میری اور ہر ایک ناشر کی ایسی بھڑی سبب جس کا کوئی علاج نظر نہیں آتا۔ کاغذ بے شمشاد ہو گیا ہے اور اجرت کے ریٹ بجا طور پر کئی گنا بڑھ گئے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ جب آپ یہ ناول پڑھیں گے قیمت کے متعلق آپ کی شکایت رفع ہو جائے گی۔

غلامیٹ اللہ

مدیر "حکایت" لاہور

کمرہ عروسی کے عطر بڑے سکوت میں، ساجدہ، فرخ سائیں میں لیٹی، جارجٹ کے سرخ دوپٹے کی اوٹ میں نئے پلنگ پر لیے جس و حرکت بیٹھی تھی لیکن اس کے ذہن اور سینے میں بے لگم شور مچ رہا تھا۔

انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ہونٹ لرز رہے تھے جنہیں اس نے بار بار دانتوں میں دبایا مگر ہونٹ لرزتے ہی رہے۔ انٹھیں بے چین اور دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کی گردن جھکے جھکے گھٹنوں تک پہنچ گئی۔ ساجدہ نے دایاں رخساروں میں گھٹنے پر رکھ دیا۔ روئی جیسا ملائم کال میکلی سائیں سے پھسل گیا اور ساجدہ کے روتیں روتیں میں شرم و حجاب کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنے آپ میں سو رہی۔

کمرے کے سکوت کو دروازے کی ہلکی سی چوچاہٹ نے منقطع کر دیا۔ دروازہ کھلا۔ بند ہوا، چٹنی چڑھی اور قدموں کی چاپ بڑھتے بڑھتے اس کے قریب پہنچ گئی۔ ساجدہ نے اٹھ کے اسی گھر کو بھاگ جانا جہاں اسے اسے ہی شام نہایت خاموشی سے ٹانگے پر بٹھا کر بیاں لایا گیا تھا۔ جب سے جوان ہوتی تھی ایک جینی مرو کے تصور کو دل و دماغ میں بلاتے ہوئے تھی۔ ایک ان دیکھے، ان جانے مودا۔ آنا نکل میں بانڈھے اس نے حیرن خواب دیکھے تھے اور آج اسی مرو کے قدموں کی آہٹ سے وہ لرز رہی۔ اس کا ذہن غامض رہا۔ کاحر عشرت پر قہر جارا تھا کہ ایک جھٹکے سے اس کا گھونٹ دومرانا ہاتھوں نے یوں اٹھا کر پیچھے پھینک دیا۔ بیٹے ہوا کے تیز جھونکے سے کھڑکی کا پردہ اڑا کر ایک طرف ہوجاتا ہے۔ ساجدہ نے جاگ کر پلنگ سمیت زمین میں دھنس جاتے۔ وہ گھونٹ گھونٹ کر اسی درز میں دھنس سکی۔ پکوں نے آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔

اسے قدموں کی چاپ ایک بار پھر سنائی دی جو اب دوزخ بنی جا رہی تھی۔ ساجدہ نے شرم کے بوجھ سے جھکی پکوں کو ہلکی سی جنبش دے کر اوپر اٹھایا۔ اس نے دیکھا کہ ایک قوی میل مرد اس کی طرف پیٹھ کیے کمرے میں ٹپل رہا ہے۔ ساجدہ بوجھکا سا لگا۔ تصورات کے حملات نے زلزلے کا لگا سا جھٹکا محسوس کیا۔ گورشت پوست کا اتنا بوجھ اس کے خوابوں کے شہزادے سے مختلف تھا اور گھونٹ کا اس نے رنجی چٹا جانا بھی اس کے لیے حیران کن تھا۔ شادی سے پہلے شادی شدہ سیلیوں نے اسے شب عروسی کے جوڑو مانا۔ پھر تھے سناٹے تھے وہ دن گھڑات تھے نظر آنے لگے۔

ساجدہ افسانے اور حقیقت کی بھول بھلیوں میں کھو چکی تھی کہ اس کے سامنے پیٹھر کے شٹلے والا حیم مرزبزی سے گھوما۔ ساجدہ نے اسی تیزی سے نظریں جھکائیں اور سر سے بٹا جو اوڈو پیٹھ کھینچ کر ماتھے تک لے آئی۔ نظروں نے ا

بھٹکتے بھٹکتے بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ گھنی نگہیں، موٹی موٹی سُرخی آنکھیں، چوڑی پیشانی اور کھدے مانو لے چہرے۔ ساجدہ نے حیرت سے جمال کی طرف دیکھا۔ اس کی مضطرب آنکھوں میں ایک سوال لڑزٹا تھا۔ جمال جان گیا تھا کہ وہ سنجیدگی اور بے لوثی کے لیے جیلے اثرات — ساجدہ کے تصورات کے عملات میں شکاف پڑنے لگے۔ بحرے کیا پوچھنا چاہتی ہے۔ بلا۔۔۔ میں بحرے میں داخل ہوا تو فریڈن شین ہی جیسے میری کچھ احمیت نہیں۔ اسے خاندان اسرائیل نے دومان آلود سکوت ملول ہو گیا۔

”میں نے گھٹھٹ پیچھے کر دیا تھا۔“ عطر بڑے سکوت کو بھاری بحر کم مردانہ آواز نے اس طرح توڑ دیا جیسے کان بھج اور بڑے صاحب کے سوا کسی کی تعظیم کو نہیں اٹھائے لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ میری تعظیم کو بھی اٹھے۔۔۔ میں چاہتا تھا کہ میں کسی نے وزنی چتر بھینک دیا ہو۔ اس کا پھر ٹک آنا بے معنی ہے۔ ہمارے درمیان اب پردے خالی نہیں بچھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ شریعت نے تمام پردے چاک کر دیئے ہیں۔ وہ پٹر پیچھے کر دو اور میری طرف دیکھو۔۔۔ میں اب چننا ایک باتیں ساجدہ نے تڑپ کے چاناکہ مندہی بھرے ہاتھوں کو لکیریں اٹکار دیں پر کہہ دے۔ سُرخی ٹھوٹ اور وہ پٹے کو چیر چھانکر اور راز نہائی جو ہاتھ اور چہرہ لیں جاتے لیکن کمزور سوایتیت نے اسے پٹنگ کے ساتھ کپڑے رکھا اور جمال

ساجدہ نے آہی، نظریں اور جھکا لیں، فضا میں صبا بن کے بے شمار بلبلے منڈلا رہے تھے جو یکے بعد دیگرے ابلیگ کے خشک، جھوڑے اور جھڈے سے تنکنا کا الفاظ بحرے کی فضا میں بھٹکتے رومانوں کو یوں نکلنے رہے جیسے بارش لگے۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ لذت آگاہی تصورات، بے کلی کی وہ سائیں، پر لطف انتظام کی وہ راتیں، حلا غول کو بڑوں کے غول پر جھپٹ پڑا ہو، فزیز جو ان کو نرا پن کے پلہوں کے کشت و خون پر بھی وہی آنسو بہا تے تھے خواب اور وہ دل فریب پہلے خود شادی سے پہلے کبھی رہی تھی۔ نہایت سُرعت سے یوں گزر گئے جیسے تیز رفتار کمال کی تقریر خرم ہوگی اور اس نے بے سگم کی انحرافی کی، پھر ہاتھ لبا کہ تھی بھاری۔ ایک تنقہ حقیقت گدھ کی طرح گاڑی ٹھکانا، جھک، جھک، جھک کا شور و غوغا بیا کرتی، فرٹے جھرتی، نہاٹے سے گزرتے اور گرد اور سیاہ دھواں پیچھا ساجدہ کے گرد منڈلانے لگی۔ اس کی رومانوی امیدیں تہ در تہا سیاہی میں دب گئیں، آنسو بھرے شباب پر بھیا ایک کچھ افسر کی گرد ساجدہ کے گرد منڈلانے لگی اور اس گرد میں سے مردانہ آواز گھر گونجی۔ عورت کو خدا نے پیدا کیا ہے رات چھا گئی۔

اطلاعت کے لیے، تمہارا وہ پٹا اب تک نیچے ہے۔ میں نے کہا تھا میری طرف دیکھو۔۔۔ ساجدہ نے بھٹکتے شرمناک جمال بیک کی طرف دیکھا۔۔۔ یوں۔۔۔ چہرے کے ساتھ دماغ اور دل کے بھی پردے اٹھاؤ۔ تاکہ میرا ایک ایک لفظی پلہ عملوں بے لوث تھی جیسے اسے تیز رفتار رات نے ٹس لیا ہو۔ پھر میں طلوع ہونے لگیں۔ آفاس، طول اور بے کیف — ساجدہ کی تہا میں اور شادی سے پہلے کے جمال بیک آہستہ آہستہ ساجدہ کی طرف بڑھنے لگا اور گویا جو اہم نے افسانے پڑھے ہوں گے اور اسی گیت کی باب راتوں کی تیر کی میں بھٹکتے۔ بھٹکتے رہے اور بھٹکتے ہی رہے۔ فریب خوردہ زندگی کو اس نے فاضی کے نقوش سے ہوں گے میں نہیں بنا دینا چاہتا ہوں کہ۔۔۔ جمال کرسی گھسیٹ کر پٹنگ کے قریب بیٹھ گیا۔۔۔ میں میں یہ تادینا چاہتا ہوں یا لکیریں یہ نقوش بہت پیچھے رہ گئے تھے اور وقت کی ریت آہستہ آہستہ ان پر تہا میں عاتقی جلد ہی تھی، تنہائی نے اسے کہ میں افسانہ بنوں نہ فلی حیات۔ ایک حقیقت ہوں جسے شاید تم پسند نہیں کرو گی بہت کم لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ بڑے جو تھے قصے سننا کو بہانا چاہا لیکن جمال کی سز مہری اور خشک قسم کی سنجیدگی نے ان قہقروں اور پسپوں کو بھی یوں ہے میرے دفتر کا چپرا بھی مجھ سے نالاں ہے۔ وہی دہی کتا ہوں جو میرے دل میں ہوتا ہے لیکن میرے دل میں، گرد والا گرد والا جیسے تالاب کے شفاف پانی میں بھینس نے کوکر نیچے کا کچرا اور گرد دیا ہو۔

”ہاں میں ہاتھ دھو لکنا بھی میں سکھاؤں گا؟ ایک شام کھانا کھاتے جمال نے ساجدہ کو کہا۔ ”سُر مہر مہر سے گھر لو“ ہاں میں ہاتھ دھو لکنا بھی میں سکھاؤں گا؟ ایک شام کھانا کھاتے جمال نے ساجدہ کو کہا۔ ”سُر مہر مہر سے گھر لو“

ساجدہ پر بے حسینی کی ازیت رساں کیفیت طاری تھی۔ وہ جمال کے الفاظ کو سمجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہ چاہتی تھی۔ اکا ج زیادہ ضروری ہیں۔۔۔ ساجدہ اس دن ایک سہلی سے ملنے گئی تھی اور بناؤ شگھار کیا تھا۔۔۔ میری اجازت کے بغیر کی رات وہ کچھ اور سمجھنا نہ چاہتی تھی۔ وہ جمال کے قدموں میں پامیش کرنا چاہتی تھی جسے وہ دو سال سے طلب مانا رہا جو ماننا تھا قابل اعتراض ہے۔ یہ گھر تھاری دنیا ہے جس پر میری حکومت ہے۔ عورت کو حق حاصل نہیں کہ اس میں پائنتی رہی تھی۔

”تم آج سے میری بیوی ہو اور میں تمہارا خاوند، میرا کام ہے روزی کھانا اور تمارا کام ہے گھر ملانا، میری مرضی۔ جمال نے یہ باتیں ایک دن کہیں۔ دوسرے دن بھی کہیں اور کہتے کہتے یہ باتیں روز بروز معمول بن گئیں۔ شہر و معالقا، معاشرہ میری مرضی کے خلاف ہے۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ تم میری مرضی کے خلاف مجھ کو براؤ۔۔۔ میں ساجدہ نے اپنے آپ کو ان باتوں کے سامنے میں ڈھاننا چاہا۔ پھر جمال کو جواب دینے کی بھی کوشش کی۔ گھر میں اغزشیں برداشت نہیں کر سکتا۔ گاتھاری ایک اغزش محاف کو چکا ہوں، کیونکہ یہ پہلی اغزش تھی۔ میں توقع رکھوں اس کا جواب دینا بھی تو جرم تھا۔ چنانچہ اس نے جمال کی مرہات پر خاموشی اختیار کر لی لیکن ساجدہ کے خاموش ہونے سے جمال کی ایک جس تشہ زہی تھی۔ اس کا فظی مطالبہ تھا کہ ساجدہ آگے سے بولتی ہے بہت سے بات نکلتی رہے۔



دیکھتا رہا کہ کبھی کی مانند اس کے سینے میں نفرت اور غصے کا شعلہ بجھ رہا تھا۔ اُس نے پُری طاقت سے چائے دانی پر گھونٹنے سے خود بار آور ڈالی۔

”جمال! یہاں آ!“

”دوسرے لمحے جمال سو تیلے باپ کے سامنے کھڑا تھا۔“

”یہ کیا ٹوٹا؟“

”چائے دانی“

”سو تے ہو تے تھے کیا؟“

”جاگ رہا تھا؟“

”پھر تو نے چائے دانی کیسے توی؟“

”گھونٹ مار کر۔“

”کیا بچتے ہو؟“ باپ نے کہا۔ ”ایک طرف کر کے اٹھا اور حال کو تھپتا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا۔“

”خبردار! جمال نے نہایت متانت سے کہا۔ اب بچہ ہاتھ نہ اٹھاتا۔ جمال کی دونوں مٹھیاں بند ہو کر گھونٹنے میں لگیں۔“

باپ نے اس کے بھرے بھرے ہاتھوں کے گھونٹنے دیکھے۔ پھر جمال کے چہرے کو ایک نظر دیکھا جس پر مردانگی کا رنگ اور صفحہ چھایا مہر تھا۔ وہ دھمک گیا، مگر گن کو بولا۔ ”بھل جا میرے گھر سے مردود!“

جمال کے ہونٹوں کے کونوں پر طنز بھری مسکراہٹ کی جھلک نمودار ہوئی۔ اس نے باپ کو لکڑی نگاہوں سے دیکھا۔ ”بہت بڑے ہو گئے ہو۔ جمال نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔“ ”بڑھ کر تھوڑے چند دن اور جی۔۔۔ چال کھل کر مسکرایا جس طرح جو جھگڑو فرم لیت کچھ کر سکتا ہے۔“ مال باپ کے مرنے کے بعد اس کی پہلی مسکراہٹ تھی لیکن اس مسکراہٹ میں مسرت کا لہذا نہ تھا۔ وہ آہستہ سے گھوما اور دروازے کی طرف چل دیا۔

”اے بے اُموتے نے جی نہ جاتے دانی۔“ سو تیلے مال بچی پلاتی ہے۔ میں داخل ہوتی۔ جمال دوسرے دروازے سے باہر نکل رہا تھا اور اسٹینڈے میں تیری باجھیں چیر رہی تھیں۔

جمال کڑا گھوم کر دیکھا۔ پھر کڑا کھول کر باہر نکلا اور دروازے سے دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

دنیا کا ٹھکانا اور خلق کا راندہ جوا جمال جی انسانوں کے ہنہ میں داخل ہوا تو اسے ہر انسان نفرت و حقارت کا پتلا دکھائی دیا۔ دنیا کو جس زاویے سے دیکھ رہا تھا وہاں سے اسے محبت اور زندگی کی نیکیاں نظر آتی نہیں سکتی تھیں۔ اسے ہر سمت اذیت ہی اذیت دکھائی دے رہی تھی۔ دماغ تعمیری نگر سے بیزار اور دل ٹوٹا ہوا۔ دن کو اس نے سہارا۔ وہ عواہوت کے سنگ و خشت۔ یہ احساس کا شیشہ۔ تین دن وہ شہر کے ہنگامے میں ماما را پھر لڑائی پیٹ سے نو چنے کی ری سی قوت بھی سلب کر لی۔ اُس نے چاہا کہ گھومتے پھرتے انسانوں کے منہ فوج لے اور ان کی بولی بولی سڑکوں پر بچھ دے۔

اور چنچنے چلانے اور غصہ نہ کالنے کا موقع ملتا رہے۔

جمال بیگ کو ضرورت تھی ایک ایسے انسان کی جس پر وہ جی بھر کے غصہ نکال سکے اور جس پر وہ حکومت کر سکے۔ اچھی چند زمینوں کا بیٹھ تھا جب اس کی مال اسے باپ کے سپرد کر کے دنیا سے چل بسی۔ باپ نے چند زمینوں بعد سو تیلے مال کی گود میں چھپ چکا تھا۔ دو سال بعد باپ بھی مر گیا اور ایک سال بعد وہ سو تیلے باپ کے ہاتھ چڑھ گیا۔ اب بھی سو تیلے باپ بھی سو تیلے گھر میں جب بچے پیدا ہوئے تو جمال کی حیثیت ایک نوکر کی سی رہ گئی۔ دن کو مال نے رات باپ نے بیٹا۔ دن بھر بچوں کو اٹھاتے اٹھاتے پھرا اور رات کو باپ کی ٹانگیں دبائے بیٹھ گیا۔ بچوں کے کھلنا تھا کسی نے ڈنڈا مار دیا اور کسی نے اس پر غلیل کی نشانہ بازی کر دی۔ اگر اس نے بچوں کو ان حرکات سے انہوں نے رو کر مال سے شکایت کی اور باپ کی گسٹروں نے پوری کی۔

وہ بچوں کو مال کی گود میں چھپتے، اونگھتے اور سو تے دیکھ کر اتنا تھکا کہ کوئی گود سے سلا بنے کو دا نہ ہوئی۔ گھر کے سارے برتن دھو کر جب وہ باہر چلے گئے تو کچھ دھیل کی کھٹ پڑی تھا تو اس کے نرم نرم گال اور کولہوں پر تھپتھپانے والے اور بچوں کی چوڑوں کی ٹانگیں اٹھنے لگتی تھیں۔ دوسرے کچھ چلی پلاتی دھوپ میں جب وہ میں ٹوکے جھونکوں میں لیٹا تھا تو اسے بند کڑوں سے سجلی کے پتھروں کی سسک سسک سسک کی ٹھنڈی آواز دیا کرتی تھیں جو اُس کے سینے میں آگ لگا دیا کرتی تھیں۔

سو تیلے مال باپ کے اس سلوک نے جمال میں بچپن کی عمر میں ہی تشدد، نفرت اور عدم تعاون پیدا کر دیا۔ نے نہ نہایت مسرت سے حدیث انتہام کی صورت اختیار کر لی۔ یہ عرصہ اتفاق تھا یا جمال کی خوش قسمتی یا اس کے سر والہ دین کا خیال کہ وہ کچھ لکھ پڑھ کر اپنا ٹھکانہ کر لے کہ اسے سکول میں داخل کر دیا گیا تھا۔ حصول تعلیم اس کا اضافی فخر کے گھر لڑکوں میں فرق نہیں کیا تھا۔ اس نے دس سال جھاڑ دیا۔ چڑھنا جھونکا۔ برتن مانجھے اور گھر کے تمام جوتے اور کھنچے پڑھنے میں بھی لگن رہا۔

جب اس نے میرک پاس کیا تو لڑکیوں پرانی کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ جوانی کا آغاز اس کے سینے میں کچھ کی مانند شور بپا کیے ہوئے تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔ اس کا شعور بیدار ہو رہا تھا لیکن لاشعور کا تھا۔ اس کے سمت لاشعور میں بچپن کی عروسی کے اثرات اور قریب دو لڑکیوں کے بیڑے بیڑے نقش و نگار۔ تشنگی اور جذباتی کا د، زہر ملا مادہ جمع کر رہے اور اس کی صلاحیت اور جہت بھی اس زہر میں گھل مل گئی۔

ایک دن بچپنے پر وہ چائے کے برتن دھو رہا تھا اور ماضی دھال کی بھول بھلیوں میں جھپک رہا تھا کہ اس کے ہاتھوں پر پڑی جن پر سرخ سرخ گوشت اُجھڑا تھا۔ اس نے چائے دانی کر کے دو تین ہاتھ لگا گھونٹے بائیں ہاتھ کی تھیلی مارا۔ ایک ہاتھ کی قوت کو دوسرے ہاتھ کی طاقت نے پوری شدت سے روک دیا اور جمال نے جسم کی رگ رگ میں بے محسوس کیا۔ اُس نے لکھنویوں سے اپنے کندھوں کا جائزہ لیا۔ اس کے پاؤں میں پانی سے بھری چائے دانی کھنچ رہی تھی۔ میں اس نے اپنے چہرے کے مکس کو بڑے غور سے دیکھا۔ بیچہ روک سکتے تھے لائیں ایک مرد کا چہرہ تھا وہ مکس کا

تیسری رات وہ ایک بند ہوئی کے بالمقابل دوکان کے تختے پر لٹا کر بواضطراب سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ ہوئی کے سامنے چند کتے لڑ رہے تھے۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی جہاں کی داخلی دنیا میں عتاب اور انتقام کے شعلے تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ روح تو کبھی کی مرچا جتی۔ ہمت و استقلال اور صلہ پسندی کے نام سے بھی وہ ناواقف تھا۔ اس کی فطرتاً اب سمٹ سنا کر دو ہونوں اور سر چھپانے کی جگہ تک یہ وہ ہو گئی تھیں۔ اُس نے خود تہ بمل کوڑتے کتوں کو دیکھا۔ اُنہوں نے بے ہنگم اور دم چاڑھا تھا۔ کچھ ایسا ہی اور دم اس کی اپنی آسیدب زوہ کائنات میں بپا تھا۔ وہ غصے سے اٹھا اور پوری طاقت سے ایک کتے کے پیٹ میں ایسی لات جمائی کہ کتا وہیں گر کر ترپنے لگا۔ جمال نے کتے کوڑتے اور مرتے دیکھا تو اسے سکون سا محسوس ہوا۔ اعصاب سے جیسے کئی من ذراں ہلکا ہو گیا۔ دوسرے کتے جھاگ گئے اور جمال ہوئی کے سامنے ٹھلنے لگا۔

”ہوئی کے روپے تنخواہ مل گئی۔ روٹی اور چارپائی، بستر بھی ملے گا۔۔۔۔۔ پھلے کس کوڑی کی جے؟“

”ہاں! جمال کے روٹیں روٹیں میں طینان کی لہر دو گئی۔ اس نے کہا۔“ ایک گھر میں کوڑی کی تھی۔ ویسے ہی چھوٹی سی ہے۔ مجھے لکھ لکھ کر تنخواہ منظور ہے۔“

اور جمال ہوئی میں ملازم ہو گیا۔

میرٹل کا سر ٹھیکٹ۔ ملنے لگا جمال کس نکس سر چھپانے لکھا جاتا تھا۔ اُس نے تین بیٹے ہوئی کے برتن صاف کیے۔ اُن دیکھے، اُن جانے، ہر پیشہ اور مرقاش کے لوگوں کے آگے کھانا رکھا۔ مالک کی ٹائٹ ڈپٹ سہی۔ دوسرے کوڑل سے کئی بار لڑائی جھگڑا اور اس کوڑل کے گرد ہر قسم سے چوتھے روز سر ٹھیکٹ کے لیے بکھرے لگے۔ اس دوران اُس نے تین نوکروں اور دو گاہکوں کو بھی بیٹا۔ ایک بی کو دم سے پکڑ کر فرش پر پٹخ کر مار دیا اور پھر طلب کسی کے ساتھ بات نہ کی۔

آخر اسے میرٹل کی سنبھل جتی چند دنوں کی آوارہ گردی کے بعد اسے مل کر کی اسالی مل گئی اور اسے لاہور سے جلال آباد بھیج دیا گیا۔ چالیس روپے، ہوا اور اس کے لیے کم نہ تھے۔ اس کی ضروریات روٹی پر لڑنے تک محدود تھیں۔ زندگی کی جانشینی سے وہ نا آشنا تھا۔ بظاہر خاموش مگر سینے میں آفندھیاں اور طوفان سیٹھ ہوتے اس نے سادہ سی زندگی کو راہ کے ایک چھوٹے سے گھر میں قید کر لی۔ خود پیش میں اُسے نفرت و حقارت اور بے مہر سی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اسے ہر انسان میں نقائص ہی نقائص نظر آتے تھے۔ دفتر کے چڑچڑ سے لے کر بڑے صاحب تک اس کی نظریں وحشی اور درندہ تھیں۔ وہ دن رات ایک انقلاب کی سکین سوچا رہتا تھا۔ اس کی ہر کیم کی تان اس فیصلے پر ٹوٹی تھی کہ فلاں فلاں اور فلاں کو قتل کر دیا جائے۔

دفتر میں ہر کس فاکس سے لڑتے بھگڑتے اور اُلٹتے۔ اس نے پانچ برس گزار دیے۔ انسانوں کے اس انبوہ عظیم میں اسے اپنے جیسے تین چار جمال، بل گئے جو معاشرہ تو معمولی چیز ہے نفار قدرت سے ہی نکلاں تھے۔ ان کی ٹھن میں اگر ملنے کے بجائے کے خلاف بات ہوتی تھی تو اسلامی محاکم کے ایک بلاک پر جا کر ختم ہوتی یا ایسے انقلاب پر جس میں خون ہی خون ہوتا تھا۔ ہم نیالی اور مشکل انصافی فتنگی کی بدولت وہ دگر سے دوست تھے اور ایک دوسرے کے خیر خواہ اور ہمدرد۔ ان میں صرف جمال غیر شادی شدہ تھا۔ قاتی تینوں نے اور تینوں کی بیویوں نے بھاگ دوڑ کر جمال کی شادی ایک مہمان کو کی تاکہ لگائے اور ناک خیال لوکی سے کراوی اور یوں سادہ جیسی فوئیر کل جمال کے قدموں میں آچڑی جس کے سینے پر پاؤں رکھ کر جمال نے چند دنوں ہی میں اس کی جوانی کی انگلیں مل کر رکھ دیں تھوڑا ت سے دل بھلائے والی لوکی جمال کے جذبہ انتقام کا نشانہ بن گئی۔

شرح شروع میں وہ سادہ کو صرف زبان سے کوستا ڈالتا رہا پھر ذہنیت پھر گھونٹے تک جا پہنچی۔ سادہ نے

فراموشی ویر بعد مرغ نے پیام سر نہایا۔ آفٹ سے اُجالا چڑھا۔ شہر میں سرگوشیاں سنا کی دینے لگیں جوڑتے بڑھتے ٹوڑا بن گئیں سرگوں اور فٹ پا۔ پراشائوں کی جھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ یہ شور یہ ہاجی تیز تر اور تیز تر ہوتی گئی اور سی زلف سے شوری کی جھک میں اختلاف ہو تا کہ ایک جمال کے دل و داغ میں بھی تک شب تار چھائی ہوئی تھی۔ وہ بدستور مثل ہاتھ اس نے محسوس کیا جیسے وہ کئی سیلوں کی مسافت طے کر آیا ہو۔ وہ قدم اٹھاتا ہی چلا جا رہا تھا کہ اسے ایک آواز نے رک دیا۔

”سنو! جمال نے چوہ کی خرابی میں طرف دیکھا۔ ہوئی کا مالک اسے بلارہا تھا۔ جمال دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا کہ وہ ابھی تک ہوئی کے سامنے مثل رہا تھا۔

جمال اس کے پاس جا گیا۔ ہوئی میں لوگ ناشتہ کر رہے تھے۔ کھانوں کی خوشبو نے جمال کے پیٹ اور داغ پر نرا پکار دینے۔

”مجموع میرے سے میں مثل رہے ہو۔ ہوئی کے مالک نے مالکانہ جیسے میں کہا۔ فوئیر دھکٹوں سے میں نے دیکھ رہا ہوں کسی کا انتظار ہے؟“

”یوں ہی؟“ جمال اس سوال کے لیے بالکل تیار نہ تھا اور نہ ہی اس کے داغ میں اتنی سخت باقی تھی کہ فوری طور جواب دے سکتا۔ بولا۔ تو ویسے ہی۔۔۔۔۔ انتظار تو کسی کا نہیں۔ وہ گھر گیا تھا۔

”کہاں رہتے ہو؟ کوئی کام دھندلا کرتے ہو؟“

جمال کی آنکھیں جھک اٹھیں جن میں بے قراری کی جھلک نمایاں تھی۔ اس نے ہوئی کے مالک کو دیکھا۔ پھر ہوئی کے اندر دیکھا جہاں لوگ ناشتے میں مصروف تھے۔

”رہتے کہاں ہو رہا؟“ سامنے تھا۔ جمال خاموش رہا اور جیسے جینی عیان تر ہو گئی۔ ”گھر سے بھاگ آئے ہو؟“

”سائیکل چور ہو گیا۔“ مالک کے پاس کھڑے ایک نوکر نے طنز کر کہا۔

جمال نے کبھی کی سی سرعت سے اس مرحلے سے نوکری طرف دیکھا۔ پھر ہوئی کے مالک کی طرف تھوڑا سا ہلکا ہوا۔ دیکھ جمال نے نہٹیاں جمیں کر کچھ والا ہوٹ ڈالتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی بے جینی میں غصے کی گہری سرخسائی آگئی

والے لمحات کے انتظار میں رُو جانے بے چینی میں مبتلا تھیں جیسے قتل کا مجرم عدالت میں فیصلہ سننے کا منتظر ہو۔ جمال نہایت سکون سے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ماں اور بیٹی کو ایک ایک کمر موت کے قریب کھینٹ رہا تھا۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے کبھی تو یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ وقت کو پیچھے کھینچ کھینچ کر دکھانے ہو رہی ہیں اور گا بے ان کے چہروں سے ایسی بے بسی ٹپکنے لگتی تھی جیسے انہوں نے اپنی محبوبیتوں کو وقت کے تیز دھارے سے نکل کر کم کر رکھا ہو۔

جمنہ کی شام تھی۔ ساجدہ کو درد اُٹھا تو وہ لیٹ گئی۔ ماں چوٹے سے ڈانڈی اُٹا کر ضروری اشیاء جمع کرنے میں مصروف ہو گئی۔ شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور کچھ اسی قسم کا اندھیرا ساجدہ کی آنکھوں کے سامنے پھیلتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ماں نے جمال کے آگے روٹی رکھی اور دندھی جوئی اُڑا دیں۔

"بیٹا! دعا کرو، خدا تمہاری مراد خیریت سے پوری کرے"

جمال نے خاموشی سے کھانے کی طرف ہاتھ دھرایا۔

"بیٹا! کھو! آمین!"

"دانی! کی ضرورت ہو تو بلاؤ اور پتہ پتہ ہوتے ہی مجھے اطلاع دینا۔" جمال نے لاپرواہی اور دیکھنے بن سے کہا۔ وہ کچھ اور کھنے ہی کا تھا کہ ساجدہ کے کمرے سے اس قسم کی بیخ بول خوارنے بلند ہوئے جیسے بگڑاؤ بیج ہو رہا ہو۔ جمال بھاگ کر اس کے پاس گئی۔

آدھ کا اوچھ وچھار میں رات گزر گئی۔ سحر کا صبح وقت تھا۔ قدرت کی رعنائیاں انگنائیاں لے کر جاگ رہی تھیں۔ افق سے چٹوٹی سپیدی کی کرنیں سیاہ پردوں کو کھینچ رہی تھیں۔ ننھی سی ایک بان نے اس دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ اس کے کانوں نے سب سے پہلی بات سنی وہ تونڈن کی اذان تھی۔ "اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔" ننھی سی یہ بان بہت ننھی سی تھی لیکن اللہ کا بہت بڑا پیام۔

ساجدہ بے سہارہ بیٹھی تھی۔ ماں کا بل پٹھ گیا جسم لرز گیا۔ ساجدہ نے آنکھیں کھلیں اور ماں کی طرف دیکھا۔ ماں کی آنکھیں میں آنسو تھے۔ ساجدہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ صبح کی سپیدی سورج کی کرنوں میں تنہا ہو گئی۔ جمال کی آنکھ کھلی تو اس کے کانوں میں بچھے کے رونے کی آوازیں پڑیں۔ وہ کھٹکھٹا ساجدہ کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ خاموشی سے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ جمال نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا خبر ہے؟" جمال نے متانت سے پوچھا۔

"خدا کو یہ منظور تھا۔" ساجدہ کی ماں نے کہا۔ "لو کی پیدا ہوئی ہے۔"

"تو لے جاؤ اسے۔" جمال نے فیصلہ نہ کیا۔

"بیٹا!۔" ساجدہ کی ماں نے رندھی جوئی اُڑا دیں۔ "وہ تمہاری بیٹی ہے۔ خدا کچھ تو کتنی خوبصورت..."

"اے سے جاؤ۔" جمال نے گرج کر کہا۔ "ابھی... کھڑی فز کیا دیکھ رہی ہو؟"

"بیٹا جمال ہوش میں آؤ۔"

ماں سے شکایت کی۔ ماں لو کے آنسو روکنا خوش ہو گئی۔ ساجدہ کی فطرت فطرت جی تھی۔ اس نے جمال کو تلخ حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا۔ گھونٹ سست کر دیا تھا لیکن۔ ساجدہ نے گل لیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ تھا نہ کوئی پناہ۔ شادی طے کرانے والے اور دایاں ایک طرف۔ ہو گئی تھیں۔ ساجدہ نے مارپیٹ کے باوجود جمال کی خاطر خدمت اور فرمانبرداری میں فرق نہ آنے دیا۔ رات رات اس کا سر دایاں دونوں اپنی بی بی کو سنبھالتے ساجدہ نے اٹھارہ ماہ گزار دیئے۔

دو ہزار سال اس کے لیے ایک لمحہ حقیقت کے لیے کیا پیش ہیں ایک سادہ جان کو سنبھالنے کا گھڑا سلام کرا کر کتنی تپتی جمال کی باتیں اور باتیں۔ ایک بار تو اس نے اپنا کلا گھونٹ لینا جا مانگین اس خیال نے اسے باز رکھا تھا کہ ایک اور ننھی سی جان کا خون ہو گا۔ وہ جان جس نے ابھی دنیا میں آنکھیں نہیں کھولی تھی اسے وہ اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے جانا چاہتی تھی۔

"بیٹا! ایک دن ساجدہ کی ماں جمال کے پاس آئی اور کہا۔" ساجدہ کی طبیعت اچھی نہیں۔ یہ آخری دن بڑی مصیبت کے ہوتے ہیں۔ ذرا تامل سے کام لیں۔ بچے کی پیدائش کے بعد جو۔"

"میں جانتا ہوں پتہ پیدا ہونے والا ہے۔" جمال نے ساجدہ کی ماں کی بات کا شٹے بڑے کہا۔ اپنی بیٹی سے کر دینا کہ لو کا پیدا ہونا چاہیے۔ سبھی لو کی نہیں چاہیے۔ اگر لو کی پیدا ہوئی تو اسے تم لے جانا۔

"بیٹا! ساجدہ کی ماں نے التجا کے لیے بھیں کیا۔ اس میں ساجدہ کا کیا اختیار ہے۔ وہی ہو گا جو خدا کو منظور ہو گا۔"

"میں اپنے گھر میں لو کی کا جو بڑا داشت نہیں کروں گا۔ خدا کی مرضی میں میرا دخل نہیں۔ اپنے گھر میں تو میرا دخل ہے! "لو کی جوئی تو کیا قیامت آجائے گی، جمال بیٹا؟"

"قیامت؟" جمال نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ "فتنہ، معرت سرا یافتہ ہے۔ میں اپنے گھر میں فتنہ و فساد کو پرورش نہیں پانے دوں گا۔ میری سوتیلی ماں بھی عورت تھی میری اپنی ماں بھی عورت تھی جو مجھے اس قدر ہی اور اباؤ دنیا میں پھینک کر خود مر گئی تھی۔"

"بیٹا! جمال! ساجدہ کی ماں نے ڈرتے سینے کہا۔" معرت نہ ہوئی تو..."

"تو میں اس ذلیل دنیا میں نہ آتا۔" جمال نے غصے سے فخر پور کیا اور کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا جس میں جمال کی پھولی ہوئی سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ذرا سے توقف کے بعد بولا۔ "اپنی بیٹی سے پوچھ لینا اسے کس دن سنائی ضرورت ہو گی؟"

ساجدہ کی ماں کمرے سے باہر آئی۔ دیکھا کہ ساجدہ چوڑے کپاس بیٹی رو رہی تھی۔ ماں بیٹی نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ دونوں کے سینوں سے آہیں نکل کر ہوا میں تھیں ہو گئیں۔

"گھبراؤ نہیں آتی! ساجدہ نے آنسو پونچھتے بڑے کہا۔ وہی ہو گا جو خدا کو منظور ہو گا فکر نہ کرو۔ ان کی عادت کچھ ایسی ہے۔ اس جمعرات کو آجائے۔"

ماں نے تختی سانس لی اور علی گئی۔

جمعرات کو ماں ساجدہ کے پاس پہنچی۔ شام ہو رہی تھی۔ ساجدہ اور اس کی ماں کرب و مضطرب کے عالم میں آنے



لے کر مرنا جاتا تو کہیں نظر آتا؟

خاتون کا شوہر جوانی میں ہی اللہ کو ماریا ہو گیا۔ محبت اور شاکار کا یہ عالم کہ اس نے بحرِ فوجی کو خداوند کی یادوں کے حوالے کر دیا تھا۔ دوسری شادی کا نام نہ لیا۔ وہ ماضی کے حسین لمحات میں جھٹک جایا کرتی تھی۔ ان طویل اور سپاٹ برسوں میں خاتون نے جانے کتنی رانیں آنسوؤں کے دھارے میں بہادی تھیں لیکن وہ طاہرہ بیٹی کو اس عمووی کے احساس سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے اسے سادہ کے نام سے ہی پکارنا رکھنے کا تہیہ کر لیا۔ خاتون کا سنگار دان کو برسوں گزرے مگر کبھی گتا، لیکن طاہرہ بیٹی کو اس نے لڑکیا کی طرح نبوا سنوار کر رکھا۔ اس کے سینے میں جانے کتنے درد بھرے گیت تڑپ رہے تھے لیکن طاہرہ کو اس نے وہ درد اور ان دہن جن میں باسنت کی جگہ سوز تھا۔ محبت تھی، عشق تھا۔ خدا کا نام تھا اور جن میں زندگی کی تپش تھی۔ خاتون کے رگ دلیٹے میں دکھ بھری کہانیاں رچی ہوئی تھیں لیکن طاہرہ کو جو درد قصے سنائی کرتی تھی ان میں مسرت، شجاعت اور خود داری کی جھلک غالب ہوئی تھی لیکن ہر کہانی میں ایک شہناوے اور شہناوی کا ذکر ضرور آتا تھا۔ ایسے میں خاتون پر رقت سی طاری ہو جاتی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھال لیتی تھی۔ ان کہانیاں میں اس دیکھ کا ذکر سرگزشت ہوتا تھا جو بریوں کو کھٹاکر لے جاتا ہے۔

سوتے جاگتے، مینتے کھیلتے، لوریوں کی تان پر اور کہانیوں کی روانی میں پانچ برس گزر گئے۔ طاہرہ کو سکول چھیننے کا وقت آن پہنچا۔ خاتون نے محسوس کیا کہ وہ مصروفِ کجی کو ہر روز پانچ پچھٹھنوں کے لیے نظروں سے اوجھل کر سکے گی۔ سادہ کو تو خاتون نے گھر میں ہی فرائز اور نوڈل دو کتا میں پکھا دی تھیں۔ وہ زمانہ کچھ اور تھا اور طاہرہ کے وقت زمانے کا رخ ہی بدل چکا تھا۔ نئے رجحانات اور نئے ترقی پسند خیالات بیدار ہو رہے تھے۔ وقت کے تقاضے بدل رہے تھے۔ لباس کے ساتھ ساتھ لوگوں کی چال ڈھال بھی بدلتی جا رہی تھی۔ خاتون کو اچھی طرح یاد تھا کہ ایک بی بی اسے پاس لڑکے نے سادہ کو محض اس لیے قبول نہیں کیا تھا کہ وہ میرکل نہیں علاحدہ اس وقت انگریزی تعلیم کو لیے جاتی سمجھا جاتا تھا۔ خاتون کو خیال آیا کہ مر حومہ اگر میرکل پاس ہوتی تو شاید اس منظومیت کا شکار نہ ہوتی۔

ایک صبح خاتون حسبِ معمول جاگی۔ ناشتہ کیا۔ اتنے میں طاہرہ بھی جاگ اٹھی۔ آنکھیں ملتی پانچ سالہ بیٹی کو دیکھ کر خاتون زیر لب مسکرائی۔ اس نے طاہرہ کو نہاد اٹھارہ گنا شہناوے پر لڑکے کی دو سطر پڑھائیں اور پوچھا۔ "طاہرہ بیٹی! سکول پڑھنے جاؤ گی؟"

"ہاں اتنی جان" طاہرہ نے خوشی سے اچھل کر کہا۔ "میں سکول جایا کروں گی بڑی بڑی سوئی موٹی کتابیں پڑھا کروں گی۔۔۔"

مجھے تصویر دلی کتاب لا دوں اتنی؟

"میری اچھی بیٹی! خاتون نے لپک کر طاہرہ کو گود میں دلوچ لیا اور مٹی روزنامے نے طاہرہ کو لڑکیوں کے سکول میں داخل کروا دیا۔ طاہرہ کے لیے سکول کا ماحول ابھی تھا لیکن وہ وہی روز میں ہم جماعت لڑکیوں میں گھل کر گئی۔ اس کی طبیعت شگفتہ تھی۔ ذہانت کی کجی بھی نہیں تھی۔ خاتون اسے سننا سنا کر رنٹ نہتے کپڑے پہنا کر سکول بھیجا کرتی تھی۔ خاتون کی زندگی میں نیا چارہ اور نئی سیرابی پیدا ہو گئی۔ طاہرہ کی تعلیم میں وہ اس طرح دل چسپی لینے لگی جسے وہ اسی مقصد کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ یہاں

ہوٹل لہوڑی گردن۔ سیدھا کھڑا قدرت نے جیسے اپنی مصروفیت اور تنہی میں سمودیا تھا۔ جب وہ لگی میں کھیل رہی ہو تو راہ جاتے لوگ اسے رک کر دیکھتے تھے۔ چلتے اور پیچھے مڑ کر دیکھتے تھے۔ بعض کے منہ سے ہمدردی کے چند جملے نکل جاتے تھے۔

"بے چاری"

"روپ دینے والے نے لکھ بھی ایسے ہی لکھے ہوتے۔"

"باب! دیکھو اور سچے بکھو"

"الٹیری شان"

"یہ سچی کس کی ہے؟"

"الٹرنٹسٹ لیفٹنسٹ خیر دین کی دہتری ہے۔ مال مرگتی ہے بے چاری کی"

"اور باب؟"

"مری گیا بکھو۔ ایسے باب نہ ہی ہوں تو بہتر ہے"

"محبت ہے خاتون کی۔ ایک عورت نے کہا۔"

"پیسہ ہو تو محبت بھی آجاتی ہے۔۔۔ دوسری نے دیوار پٹھو کتے بھونے کہا۔" اللہ کا یاد تو انہیں۔۔۔ دو مکان کراتے پڑے جوئے میں۔۔۔ زمین آبی کر سال بھرا کا انکال کر مفضل پر نر بار بارہ سو درپھر آجاتا ہے۔"

"جہاں کا کچھ پتہ چلا؟ ایک دن ایک عورت نے خاتون سے باتوں باتوں میں پوچھا۔"

"کوئے کنوئیں میں مردود خاتون نے دکھ بھرے غصے میں جواب دیا۔ "میری بلا سے بہتر ہو تو کیا؟ دو ڈھائی برس گئے ہیں کبھی جوئے سے بھی خیال نہیں آیا؟"

"کتنے میں فوری چھوڑ گیا تھا۔ عورت نے کہا۔ "میں دن سادہ بشتن نے دم دیا تھا، اس دن سے ٹوٹا ہی نہیں۔"

اور بہن خاتون! عورت نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ "بات بھلائی تھی کہ سادہ کے مرنے کے آٹھ دس روز ناپہنچیدل نے دیا سے ایک لاش نکالی تھی۔ کتنے تھے کہ چہرہ اور اوپر کا دھڑکا اٹھایا ہوا تھا۔ لگوں نے مشہور کر دیا تھا کہ جہاں لاش ہے۔ ہم نے تو بہن اتنا عرصہ تم سے یہ بات پوچھی ہیں جس کی فائدہ کوئے مڑے اٹھا نہ لے گا۔"

"یہ تو دنیا بھر کو معلوم۔۔۔ ہم کو پولیس نے مجھے بھی لاش کی شناخت کے لیے بلایا تھا۔ خاتون نے کہا۔"

"تو پھر؟ عورت نے بے تاب سے قریب سر کئے ہوئے پوچھا۔ "جہاں لاش کی تھی نا؟"

"گلی مٹری لاش کو میں کیسے پہچانتی؟ کپڑا اور پٹھانہیں۔ تنگ دھڑنگ لاش تھی۔ شک ہو تا تھا کہ اسی کی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ دوں۔ یہ جہاں لاش ہے۔ پھر، چاہتا نہ دالے اٹھا میرے حوالے کر دیں گے۔ کون مصیبت مول لیتا۔"

میں نے کہ دیا تھا یہ جہاں لاش نہیں، مگر معلوم ہوا تھا اسی کی ہے۔"

"جہنوں نے لاش دیکھی تھی کتنے تھے کہ اسی کی تھی بعض تو قیاس سے کہتے تھے کہ جہاں دریا میں چلا گیا تھا۔"

کی تمام تر مصروفیات کا مرکز ظاہر اور ظاہر کا سب سے بڑا سکول بند ہونے کے وقت وہ دروازے میں بیٹھ جاتی اور بے پروا سے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے اس جھڑپ کا انتظار کرنے لگتی تھیں میں ظاہر ہنستی پھیلتی ساری لڑکیوں کے لیے ہنسنے کا سامان پیدا کرتی رہی ہوتی تھی۔ خاتون کے لیے یہ چند لمحات زندگی کے خوبصورت ترین لمحات ہوا کرتے تھے۔ وہ بڑھ کے ظاہر کو گودی اٹھا لیتی۔ کھجور لاتی۔ کھانا کھلاتی۔ اس کی سختی دھوتی اور اس سے سکول کی باتیں پوچھنے بیٹھ جاتی تھی۔ چار سال گزر گئے۔

ظاہر و مسلم گزرا ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہو گئی۔

ظاہر کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ خاتون کے دل میں ساجدہ کی یاد بیدار ہوتی جا رہی تھی۔ اس یاد کے ساتھ ہی وہ ظاہر کے مستقبل کے متعلق سوچنے لگی۔ اسے سکول بھیج کر وہ اکثر وقت گزارنے کی محسوسات میں کھو جاتی۔ ایک وہ وقت بھی تھا۔ اب آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ اب وہ اچھے بھائی بن چکی تھی۔ عمر چودہ برس سے تجاوز کر رہی تھی۔ بے ٹھہری اور حسین گزرا گیا تھا۔ ایک وہ وقت ہوا تھا کہ ظاہر کے پاس میں وہ ساجدہ کو بھول گئی تھی۔ لیکن ظاہر وہاں جوں بڑی سے پوش پانے کی وجہ سے ظاہر چودہویں سال میں سولہ سترہ برس کی دو شہرہ گئی تھی۔ سیدہ کھڑا قدمی گون۔ سپیدی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے نقوش اور خدوخال کھڑکھڑ ساجدہ کی صمیمیت پر غور کرتے تھے۔ اور ساجدہ کی یاد روز بروز نکھر آتی تھی۔ ہل چہرے پر دل نشین خدوخال موزوں پیشانی۔ ستواں ناک۔ پیچھے تلے ہونٹ اور ان ہونٹوں پر زریں لب تبسم جو جلور صبح کی طرح جس نے خاتون کو از سر نو معلوم اور اداس کر دیا۔ وہ تنہا میں ہوتی۔ چپ چپ کے آہیں بھریں۔ ساجدہ کے انجام پر اپنے آپ سارے چہرے کو ڈھونڈتا کرتے رکھتا تھا جس کا یہ پیکر بے معصومیت، ذہانت، وقار اور ایک گویہ مال کے لطیف پروے میں لکھنا بھی۔ اسے اپنا غامد بھی یاد آتا تھا لیکن اس نے یہ سب و غم، تلخ یادیں اور ملال ظاہر سے چھپانے رکھا اور اسے اپنا غم معلوم ہوتا تھا جس میں چہرہ پر اپنا پاؤں میں پھرتی اور ڈانٹوں میں سلیقہ تھا۔ دیکھنے والے ایک قسم کے تقدس سے یہ احساس ہی نہ ہونے دیا کہ انسانی زندگی میں یا سیت اور اداسوں کا بھی دخل ہوتا ہے اور چھوٹی بسری یادیں انسان کو آگے مٹا ہوتے تھے۔

ظاہر نے اسی عمر میں ہی مزار میں کی نگرانی اور زمین اور مکانوں کی آمدنی کا حساب کتاب رکھنا شروع کر دیا تھا۔

ظاہر نے جب پہلی جماعت میں چلی تو اس نے اپنے ابا جان کے متعلق پوچھا تھا خاتون نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ ملائی میں مارے گئے تھے اور یہ تو ظاہر کو یقین تھا کہ خاتون ہی اس کی مال ہے۔ خاتون نے کبھی بھولے سے بھی اس پر غماز نہ ہونے دیا تھا کہ اس کی مال ہو سکتی ہے۔ مرنے کی حالتوں کو بھی نہیں کر کے اس نے قابل کر لیا تھا کہ وہ ظاہر پر راز فاش نہ ہونے دیں۔ مال کا نڈا ہوتے ہیں۔ اسی قسم کا سلسلہ خاتون کے گھر بھی شروع ہو گیا۔ رشتہ دارا کہتے تھے اور وہ ایک روز سماں رہ کر اور ظاہر کو پانچویں کا عجیب خوش نصیب بھی تھی کہ غلے کے کسی ڈرنے ظاہر پر حقیقت ظاہر نہ ہونے دی۔ مال میں سادہ اور خاموش سی زندگی بسر کر رہی تھی۔ روپے دے کر چلے جاتے تھے خاتون امید واروں کی اس قطار کو صفائی سے لٹاتی رہی۔ اس نے ان میں سے کسی کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ یہ تو اس کی خوش نصیبی تھی کہ وہ کسی کی محتاج نہیں تھی۔ وہ نہ لوگ جانے اس کا کیا حشر کرتے۔ وہ اور تو کچھ کرنے سکے تھے۔ سوائے اس کے کہ اتنا سادہ کی وفات پر کوئی نہ کیا تھا۔ خاتون نے بہت حد تک اطمینان کا سانس لیا تھا کہ ایک مالدار سی باندی سے گلو خلاصی ہو گئی لیکن اب وہی باروی دالے دل ہی دل میں خاتون کی وہ لغزش معاف کر کے از سر نو رشتہ جوڑنے آگئے۔ سب کو چودہ سال بعد ساجدہ کی موت کا سبب صدر رنج تھا۔ خاتون تصنع، فریب اور چھوٹی ہمدردیوں کے اس تانے بانے سے صفائی نہ پختی رہی۔

ظاہر جب پڑھ رہی ہوتی تو خاتون اسے ہمیشہ نیکابوں سے دیکھنے لگ جاتی تھی۔ دو تین بار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسے یہ خیال تانے لگا کہ لڑکیاں پر لایا مال ہوتی ہیں۔ اس خیال سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ بے اختیار چاہنے لگی کہ ظاہر



لو سینے سے چپکائے اور زندگی کے باقی دن اسی طرح گزار دے بعض اوقات ایک انمولی سی خواہش اس کے دل پر ابھرتی ہے کہ وہ اپنے گھر کو واپس آئے اور اپنے گھر کے لوگوں کے ساتھ رہے۔ لیکن وہ اس خواہش کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی بجائے وہ اپنی زندگی کو ایک نئی شکل دینا چاہتا ہے۔ اس کے دل پر ایک نئی بات ابھرتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو ایک نئی شکل دینا چاہتا ہے۔ اس کے دل پر ایک نئی بات ابھرتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو ایک نئی شکل دینا چاہتا ہے۔

نئی کلاسیں شروع ہوئے ابھی چند دن گزرے تھے کہ ایک دن طاہرہ کو سکول سے واپس آتی تو اپنے ساتھ کئی کپڑوں میں ملبوس ایک سیدھی سادھی سی لڑکی کو گھیر لاتی اور خاتون کو بتاتا کہ یہ عفت ہے۔ انھوں نے جماعت تک اس کے ساتھ پڑھتی رہی ہے اور اب اس لئے نو میں داخل نہیں کرادی کیونکہ وہ بہت غریب ہے۔ اس کا باپ مریض ہے اور وہ بیمار ہے۔ اس کے علاوہ عفت کی بیوی بھی تھی خود اس جماعت میں اس کے کسی سکول میں اس کی بیوی لگ جائے اور چار لڑکیوں کی پرورش کرے گا۔ اس کا نام ہے۔

خاتون نے دونوں کو کھانا کھلایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر طاہرہ نے خاتون کو دوسرے کمرے میں لے جا کر کہا۔ ”اُمی جان! میں عفت کو اپنے خرچ پر پڑھانا چاہتی ہوں۔ بڑی ذہین لڑکی ہے۔ وہ بے چاری کی زندگی برباد ہو جائے گی۔“ اس نے پہلے اسے میرے کپڑوں میں سے اچھا سا جڑا دیں۔ اس کے پاس ہی کپڑے ہیں جو پہنے ہوئے ہیں۔“ خاتون شاید اپنے طور پر یہ زبرداری قبول نہ کر لی لیکن ایشیا کی راہ میں چار لڑکیاں یہاں سے جتنی جتنی تھیں ان کے دل میں ایک دو باتیں تھیں کہ اس نے خاندان پریشانی سے طاہرہ کو کھانا دیا اور عفت کو طاہرہ کے اچھے کپڑوں میں سے ایک جڑا دیا۔ ایک دوپٹہ دیا جسے عفت نے طاہرہ کے اصرار پر چھینکے شرماتے لے لیا اور خاتون نے عفت سے کہا۔ ”کل تم اپنی کلاس میں چلی جانا اور کتاؤں کی فکر نہ کرنا۔ ہم سے دیں گے۔“ طاہرہ بیٹی اہل اس کی فیس کے پیسے سے جانا۔ عفت کے آنسو پھوٹ آئے۔ وہ تھوڑی دیر بعد گھر چلی گئی۔

شام کو عفت کی ماں عفت کو ساتھ لے کر اور کپڑوں کا جڑا اٹھاتے خاتون کے گھر آئی۔ غریب اور نادار سی یہ ماں حیران ہو کر پریشان ہو گئی۔

”آہ بہن! خاتون نے چلنے کی لگ تیر کر تے ہوئے شکر کراس کا استقبال کیا۔“ اری نیچے کیوں بیٹھ گئی ہو۔ اٹھو چلاؤ پڑھو۔ طاہرہ بیٹی! اب ہر آؤ۔ دیکھ عفت آئی ہے۔“

”عفت کو یہ کپڑے آپ نے دیئے ہیں؟“ عفت کی ماں نے کپڑوں کا جڑا چاچا پانی پر رکھتے ہوئے طویل سی سیدھی سے پڑا۔ ”ہاں! میں نے ہی دیئے ہیں۔“ خاتون نے جواب دیا۔ ”بے چاری تو بے ہی نہیں رہی تھی۔ ہم نے زبردستی دیتے تھے۔“

”معاذ آپ کو بہت دے بی بی! عفت کی ماں نے شکر لیے کے لیے میں کہا۔“ میں یہ وہ ہوں اور سخت غریب لیکن خیرات قبول نہیں کروں گی۔“

”بہن! یہ لڑکی کیسے کی! خاتون نے پیا بھر سے غصے سے کہا اور آٹھ نوکریں عفت کی ماں کی گود میں رکھ دیتے۔“ عفت میری بیٹی کی سہیلی ہے اور میں نے اسے اپنی بیٹی کی طرح کو یہ کپڑے دیئے ہیں خیرات کا ہے کہ؟ خبردار جو کپڑے واپس کیے



جذبات سے مغلوب ہو کر تھی لیکن ان پر عمل کا رنگ چڑھنا چاہتی تھی۔ پہلے دو کمرے میں ٹٹلی، ٹوکی جلی چل کر کی پھول، ہو گیا۔  
لیٹ گئی اور چھت پر نظر اٹھانے لگی۔ "میں کون سی عفت در کچر بند کے کرسی پر بیٹھ گئی تھی کمرے میں پراسرار سکوت چھا  
"عفت! — طاہرہ نے چھت پر نظر اٹھانے سے کہا — "فاسی جہت کرو۔"

"کیا؟"  
"سائے بیٹھک میں جواز کے بیٹھ پڑے ہیں ان میں سے کسی ایک کو بلاؤ۔"  
"نہ طاہری! — عفت نے شرارت سے بولے کہا — "بھلا میں اتنے سارے لوگوں کے سامنے کیوں  
گی نہ عفت نے پوچھا — "مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"میں ان سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ ہم اس جنگ میں کس طرح شریک ہو سکتی ہیں؟"  
"یہ تو مردوں کا کام ہے۔" عفت نے کہا — "ہم عورتیں کیا کر سکتی ہیں؟ اگر یہ کام عورتوں کا ہوتا تو اب تک غزہ  
بازر نہ نکل آتی ہوتی؟"  
"نشاہتاً عورتیں جو لڑنے پر تھیں یہی اور اپنی اپنی جگہ پتھروں کی طرح پڑی ہیں۔ طاہرہ نے کسی حد تک میں ہم چاہتی ہیں کہ..."

"اچھا! میں سمجھ گیا کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔ لڑنا کھڑا ہونا اور بلا میں اپنی جماعت کے لیڈر کو اور پوچھنا نہیں۔ اس  
سلسلے میں دہی آپ کو ہدایات دے سکتا ہے۔ اسی طرح لڑنا خانوں سے مخاطب ہونا آپ اجازت دیں تو میں دوسرے  
لڑکے کو اپنی بیچ دوں؟"  
"بھیک دو، بیٹا! — خانوں نے وہی آواز سے کہا جیسے وہ لڑکوں کا اس طرح کھلم کھلا اپنا پسند کر رہے ہوتے بادل تختہ  
اجازت دے رہی ہو۔"

"میں حیران ہوں تم نے باتیں پوچھ کر کرو گی بھی کیا؟ — خانان نے پوچھا۔  
"اتی جان! اسب کچھ تیرا چلی ہوں۔ طاہرہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ آپ کے سامنے ہی تو پوچھ رہی ہوں۔"  
اتنے میں کمرے کے دروازے پر کبھی دستک ہوئی اور ایک غور و خوش پوش اور غرض وضع نوجوان کمرے میں  
داخل ہوا اور آداب بجالایا۔ طاہرہ اسے دیکھ کر کھینچ گئی۔ اس کے کچھ سے ہونے دلکش خدوخال سے ایک پختہ عزم  
مرد کا رعب اور جلال چھوٹ رہا تھا۔ وہ ہمت و استقلال اور مردانگی کا پیکر معلوم ہوتا تھا۔ طاہرہ نے اسے دیکھا تو اس  
پر شائسا اچھا لگا۔ زبان لگتے ہو گئی۔ ایک وہ لڑکا تھا جابھی ابھی اوپر آیا تھا اور طاہرہ کو دیکھ کر کھڑا تھا اور ایک یہ لڑکا کہ جسے  
دیکھ کر طاہرہ پر رعب طاری ہو گیا۔

"سائے بیٹھک میں سے کسی لڑکے کو بلا لائیں؟"  
"کیوں؟"  
طاہرہ داتی کا استعجاب دیکھ کر فوراً منبھل گئی۔ جذبات کے اس طوفان میں بھی اس نے محسوس کر لیا کہ وہ ماں کا ایک کونے میں اور خانوں دروازے کے ساتھ۔ طاہرہ نے شرم و حجاب سے چھکی نظروں کو درازا اسٹاکس پر پیکر کر ایک بار  
جس میں ڈال رہی ہے۔ اس نے کہا۔ "نہا اس سے آج کے حادثے کی کہانی سنیں گے۔ کتنا غلط ہے اسی جاتی آ؟"  
"کہانی کیا ہے بیٹی! — خانان نے کہا۔ "محال جلوس کے آگے آگے آگے تھا پولیس نے گولی چلائی اور بے چارہ  
۳۱

”مجھے ارشد ارشد سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ لوکا عاہرہ سے مخاطب ہوا۔ ”اکرم نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ آپ مسلم گزرائی سکھایا جیتی ہیں۔۔۔۔۔ آپ کا نام؟“

”عاہرہ“

”جس عورتوں کے تعاون کی سخت ضرورت ہے لیکن وہ باہر نکلنے سے بھیج کر رہی ہیں۔۔۔۔۔ ارشد نے سنجیدگی سے لالچ کی چند ایک لوکیاں ہیں، اگر ان کے ساتھ چند اور لوکیاں شامل ہو جائیں تو ایک مجلس عورتوں کا نکالنا جاسکتا ہے، اگر چند روز بعد زیادہ لوکیاں اور عورتیں باہر نکل آئیں گی، اس سلسلے میں پہل کرنے کے لیے باہمت لوکیوں کی ضرورت ہے اگر آپ ساتھ دے سکیں تو بات بن سکتی ہے۔۔۔۔۔ کیا آپ اپنے سکول کی کچھ اور لوکیوں کو بھی تیار کر سکتی ہیں؟“

”امید ہے آٹھ دس لوکیاں تیار ہو جائیں گی۔۔۔۔۔ عاہرہ نے جواب دیا۔

”ہماری سچم تیار ہے۔۔۔۔۔ ارشد نے خود اعتمادی سے کہا۔ ”لوکیوں کے مجلس کی ضرورت میں ہم ان کی حفاظت کے لیے ساتھ ہوں گے بلکہ یہ مجلس مردوں کا بھی ہوگا۔ ضرورت یہ ہے کہ اس مجلس کی قیادت لوکیاں کریں۔“

”اقی جان!۔۔۔۔۔ عاہرہ نے ارشد کی بات کاٹتے ہوئے غافلون سے کہا۔ ارشد صاحب کے لیے جانتے تو باتیں غافلون باورچی خانے کی طرف گئی تو عاہرہ نے ارشد سے کہا: ”ہمارے اقی کے لیے یہ باتیں عجیب سی ہیں۔ آپ کچل ہیں گا مانی سکول کے باہر ہیں۔ میں اور عفت۔۔۔۔۔ یہ عفت ہے، میری سہیلی۔۔۔۔۔ ہم دونوں آپ کو لکھنؤ کے سکول کے باہر لکھنؤ چھٹی تویر سے جوتی ہے لیکن ہم کسی عہدے پر نہیں آئی ہیں۔“

اور میں کالج کی دو لوکیوں کو ساتھ لیتا آؤں گا کل کی ملاقات کے بعد آپ کا قلعہ انہی کے ساتھ رہے گا۔ ارشد نے کہا ”میں بہت مصروف رہتا ہوں۔ میں ان دنوں عورتوں کے مجلس کے لیے ہی پریشان ہو رہا ہوں۔“

عفت ابھی کمرے سے اسی کونے میں کھڑی ارشد کو گھری لگا ہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ارشد نے ایک بار اس کی طرف نظر تو اس نے نظریں جھکا لیں اور ارشد نے عاہرہ کو ہندوستان کے کونے کونے کی خبریں سنائی شروع کر دیں۔ قادیان عظم کے راجہ کو وضاحت سے بیان کیا اور بتایا کہ کس طرح ہندوستان کے مسلمان جاگ اٹھے ہیں مسلمان کیا پابستہ ہیں اور جو کچھ وہ جانے ہیں وہ کس طرح لے کے رہیں گے۔ قادیان عظم نے مسلمانوں کو ایک نوہ دے دیا ہے۔ ”پاکستان یا موت۔“ مسلمان نے اس نعرے کی گونج سے انگریز کی شینری سے کھل پڑے بیکار کر دیتے ہیں۔ انگریز کے ایوانوں میں زلزلے کے جھلکے محسوس ہونے لگے ہیں۔

ارشاد نے اسے تفصیل بتایا کہ کس طرح انگریز اور ہندو نے مسلمانوں کے خلاف گٹھ جوڑ کر دیا ہے اور مسلمان اس گٹھ جوڑ کا مقابلہ سینہ تان کر کر رہے ہیں مسلمانوں سے مجلسیں بھر گئی ہیں۔

اتنے میں غافلون چائے کی طے اٹھائے آگئی اور وہ بھی ارشد کی باتیں سننے لگی۔ ارشد کے بولنے کا انداز اب تقریر کا سا ہوا لگتا تھا جس کے پیچھے شے الفاظ روح میں اترتے محسوس ہوتے تھے غافلون ان باتوں میں ایسے محسوس ہو گئی جیسے کچھ کچھ کہنے وقت تصویر میں اس کھائی کا جزو بن جاتا ہے۔ مگر مجھے مجھے چہرے پر ایک تباہ اور ماضی کی حسیں یادوں سے بھر پور ہونے لگی۔

ذہن میں ایک پہل شروع ہو گئی، عاہرہ اور عفت بھی جہاں دگر میں بیٹھ چکی تھیں جب ارشد نے کہا۔ ”لاہور میں عورتوں پر انک آؤ گیس چھبڑی گئی اور پولیس نے بے ہوش لوکیوں اور عورتوں کو بے دردی اور بے شرمی سے اٹھا اٹھا کر لاریوں میں بھینکا۔۔۔۔۔ تو غافلون کے رشتہ گیر انہوں نے کڑی کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اس کے بازو کی گیس اس طرح ابھڑکیں جیسے ابھی لاہور پہنچ جانا جاسکتی ہو۔

ارشاد کہہ رہا تھا۔ ”پشاور میں مردوں کا ایک مجلس کو فٹنٹ ہاؤس کی عمارت کے اوپر لہرنا ہوا یوں جیک اٹارنے کو بڑھا تو پولیس نے گولی چلانے کا اعلان کر دیا۔ مجلس رک گیا اور چند دن قہقہے بٹھا۔ ایک نوجوان لڑکی نے مردوں کی پیدائش کی تو بڑھ کو پکڑتی، ”اٹا کر، کافرہ بند کر دے“ وہ آگے بڑھی اور کو فٹنٹ ہاؤس تک پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک جھنڈا تھا۔

پولیس کے کئی سپاہی اس کی طرف پیچھے توڑ لڑکی نے مجلس کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اگر اس عمارت پر یہ جھنڈا لہرایا گیا تو اسے مردہ!۔۔۔۔۔ وہ اسی قدر کہنے پانی پانی کر پولیس کے سپاہیوں نے اسے دبوچ لیا لیکن مردوں میں نئی زندگی اور نیا دھڑ بھاگ اٹھا اور پولیس پلوٹ پڑے۔ انہوں نے لڑکی کو پولیس سے چھین لیا اور اس کے ہاتھوں سے جھنڈا بھی سنبھال لیا۔ ابھی چلی۔ گولی چلی۔ مجاہد گرے اور فٹنٹ گھٹنے کی خوریزی کے بعد انگریز کی سفید عمارت پر بڑھ پڑا لہرنا تھا۔۔۔۔۔

غافلون کی آنکھیں سرخ ہو گئیں عفت کے انوکھل آئے اور عاہرہ اپنے ارشد کے درمیان پیچھے جوتے جوتے غلامیں کھو گئی۔ اس غلام اسے سبز جھنڈے لہرائے نظر آ رہے تھے۔ اس غلام اسے نوجوان لڑکیاں پیچھے جوتے گیس کے بوس کے زمریے ڈھونڈیں بے ہوش ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس غلام اسے انگریز اور ہندو نظر آ رہا تھا اور اس غلام اس نے اپنے آپ کو دیکھا۔ قادیان کو دیکھا محترمہ قادیان کو دیکھا، اس نے بہت کچھ دیکھا اسے یوں لگا جیسے وہ اسی جہاد کے لیے پیادہ ہو چکی۔

”محمد بن قاسم کون تھا؟ صلاح الدین یوٹی کون تھا؟ ارشد کہہ رہا تھا۔ طارق بن زیاد کیا تھا؟ انسان تھے۔ فرشتے نہیں تھے۔ عاہرہ آپ محمد بن قاسم میں عفت، آپ طارق بن زیاد میں، انا جی آپ وہ ماں میں جس نے صلاح الدین یوٹی کو ختم کیا تھا۔ اماں جی آپ وہ ماں میں جس نے اپنے شہید بیٹے کو صرف اس لیے منشی سے انکار کر دیا تھا کہ تیرا س کی بیٹی پر لگا تھا اور ماں نے کہا تھا کہ میرا بیٹا بھاگے بیٹے کو مارا گیا ہے تیرا س کے سینے میں لگنا پائیتے تھا۔“

”کاش! امیر ایک بیٹا ہوتا۔“ غافلون نے لڑکی بھڑکی آواز میں کہا۔

”آپ کے دو بیٹے ہیں۔“ ارشد نے چڑچوش لہجے میں کہا۔ ”عاہرہ اور عفت۔“

چائے کی پیالیں میں سے ڈھول اٹھ اٹھ کر ختم ہو گیا۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ وقت گزر گیا لیکن عاہرہ نے محسوس کیا جیسے وقت کا ایک لمبھی آگے نہیں بڑھا۔

دوسرے دن گیارہ بجے ارشد چار لوکیوں کو ساتھ لیے مسلم گزرائی سکول کے باہر کھڑا عاہرہ کا انتظار کر رہا تھا چند منٹ بعد عاہرہ اور عفت آگئیں اور ارشد نے چاروں لوکیوں سے ان کا تعارف کرایا۔ یہ چاروں لڑکیاں شکل و صورت، چال ڈھال، لباس اور بول چال سے اوپنے گھر ان کی معلوم ہوتی تھیں لیکن عاہرہ کے چہرے پر جو رعنائی تھی وہ سب پر ہلکا سا احساس محترمی مستط

کوئی۔

عفت پر چھینپ سی طاری تھی، وہ اپنے آپ میں سحر بازی تھی، حالانکہ وہ شکل و صورت اور لباس میں ان چاروں سے کم نہیں تھی۔ ارشد نے ہلکا سا ہنس مذاق جو شروع کی تو اہمیت اور چھینپ کم ہو گئی، وہ پل بڑھے۔ چاروں لوگوں نے آگے آگے اور اشارہ، ظاہر اور عفت کے درمیان پیچھے چھو جا رہا تھا، وہ جیسے بازو میں سے گزر رہے تھے جہاں برسوں کا وہ قدم کے فاصلے پر لاٹھیل سے مسلح پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ وہ دوکانوں پر لوگوں کی بھر تھی، لوگ اس طرح سودا سلف خرید رہے تھے جیسے ان کے بعد انہیں سودا نہیں مل سکے گا یا بازار بند ہو جائیں گے یا قحط پڑ جائے گا۔ مسلمانوں کی دوکانوں پر سبز چھتڑے لہرا رہے تھے، زباناں دوکانداروں نے سبز قمیضیں پہن کچی تھیں۔

چاروں لوگوں کا بغیر برقعے کے تھیں۔ ظاہر اور عفت برقعے میں، جب وہ ایک بوڑھے علوی کی دوکان کے سامنے سے گزریں تو بوڑھے نے جوش میں کراہا تھا کہ کراہا۔ پاکستان! مذہب! ارشد نے اسی طرح اپنے پر ہاتھ لکھ کر سلام کا ہر دیا۔ "زندہ باد پاکستان"۔ اور اس نے دیکھا کہ عفت نے برقعے کا نقاب نیچے چھینک دیا تھا، ارشد نے ایک ہی متوقع سے متکلفی سے جن میں جھنجھلاہٹ جو شامل تھی۔ اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ "کل سے آپ بغیر برقعے کے بازار میں نکلا کریں گی۔ یہ پردہ درودہ اب ختم نہیں ہو سکتا۔ ظاہر و صاحبہ، اماں جی کو عرض تو نہ ہو گا؟"

"ہر گاہ بھی تو وہ کچھ نہیں کہیں گی۔" ظاہر نے جواب دیا۔

عفت کا سا لاجم کا نقاب اٹھا، اس کے رگ دوریلے میں اونٹنی سی ایک لہر دوڑ گئی اور اس کی پٹیاں پر پسینے کے قطرے چمک اٹھے۔ اس وقت تک وہ دم کے ہاتھ کے ٹکس سے ناشتا تھی، اس کا باپ کچھن میں سرچا تھا اور بھائی تھا نہیں سترہ برس کی عمر تک ایک ہی مرد۔ باپ اب بھائی یا کوئی اور اس کی زندگی میں ایک ثانیے کے لیے بھی نہیں آکا تھا۔ ارشد کی گرفت واصل تھی، عفت نے ایک جھٹکے سے ارشد کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا کر جھاک جانا چاہا لیکن اس میں جھاک جانے کی جیت اور جرات نہیں تھی۔

"یہ تمام دوکاندار جل میں بند ہیں۔" ارشد نے چند ایک بندوکانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ یہ سارا بازار مسلمانوں کا ہے۔ وہ بازار در بعد باقی دوکانیں بھی بند ہو جائیں گی مسلمان پاکستان کے نام پر بچوں کی روزی بھی قربان کر رہے ہیں۔ ہر سکتا ہے ان میں کچھ شہید بھی ہو چکے ہوں لیکن کسی کو معلوم نہیں۔"

یہ قافلہ بازار سے نکل کر ایک گلی میں داخل ٹھہرا گئی کے دونوں طرف دو دو تین تین منزلہ مکان تھے جن کی بالکونیوں کے جنگلوں کے ساتھ ریت کی چھوٹی بوریوں اور اینٹوں کی دیواریں سی سی مٹی تھیں بعض مکان ایسے بھی تھے جن کی کھڑکیاں اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ اس طرح ہر مکان قلعہ بنا ہوا تھا اور ہر بالکونی باقاعدہ مورچہ ہر مکان کے اوپر کا محروس کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ "یہ مزدوروں اور کھنوں کا محکمہ ہے۔" ارشد نے عفت کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ان لوگوں کو علم ہے کہ چند دنوں کے بعد ایک بونے والا ہے۔ ان کی عورتیں بھی اس وقت کے لیے تیار ہیں اور یہ مورچہ بندی پیش بندی ہے۔ ایک گلیوں میں غنوں سے گا۔ ایک ایک مکان کے ایک ایک کمرے میں جنگ ہو گی۔ ان لوگوں کے پاس دوپہر ہے اور اشتیاد یہاں گھر گھر میں بندوق اور تمنا ہے۔ ان

لوگوں نے عالمی جنگ کے دوران جو دولت ٹھیکیداروں اور ملک مارکیٹ میں کمائی ہے وہ آج مطالبہ پاکستان کو کچلنے کے لیے لگا دی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے چند ایک مسلمان ایسے بھی ہیں جنہوں نے جنگ میں خوب ہاتھ رنگے ہیں۔ وہ یہ فرض کر کے کہ مسلمان پاکستان نہیں بنا سکیں گے انگریز اور ہندو کے متحہ و محاذ میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان میں وہ جاگیر دار بھی ہیں جنہیں انگریز نے اپنی قوم سے غدار کے شعلے میں جاگیر دی تھیں۔ یہ مسلمان انگریز کے زرخیز غلام ہیں۔"

عفت نے سر جھکا لیا اور ظاہر نے ایک سرسے ناکھوٹی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "میاں کوئی ٹیکہ دیتی ہے کیا؟ اندر سے شخ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ میں تو آٹھ پہلی بار اس عتیں آتی ہوں۔"

"یہ ہندو اور سکھ لوگ ہیں گنگا اور گجہ بازی کی شوق خور ہیں۔" ارشد نے جواب دیا۔ "دو استاد دروزا نہیں شوقی کرانے آتے ہیں۔ یہ سرسے ایک ہندو کی ہے اور اس نے اسے ام کا کم کے لیے وقف کر دیا ہے، شام کو مرقا بازی کی شوقی کرانے ہیں۔۔۔ ظاہر وہ؟" ارشد نے پوچھا۔ آپ کے دلہا بندوق تو نہیں ہے؟

"ہے۔" ظاہر نے جواب دیا۔ "ابا جان مرحوم کی دونالی بندوق سب سے کار توں بھی ہیں۔ ایک ابا قی نے دکھائی تھی۔" "اے ابا میں نے آپ سے ابا جان کے متعلق تو ابھی پوچھا ہی نہیں۔" ارشد نے چونک کر کہا۔

"وہ جنگ میں مارے گئے تھے۔" ظاہر نے جواب دیا۔ "میں نے تو مرقا کی صورت بھی نہیں دیکھی۔"

"آپ بندوق چلانا سیکھ لیں۔" ارشد نے کہا۔ "اوپر عفت کو بھی سکھایاں۔ اچھی طرح ہاتھ بٹھالیں۔ دونالی بندوق کے نشانے کی زیادہ مشق کی ضرورت نہیں، چھپرے کی کوئی نہ کسی کو تو بے سی لیتے ہیں، صرف دھماکے اور دھکے کی مادی جو بھائی،" "لیکن مشق کریں کہاں؟" ظاہر نے پوچھا۔

"منوجاری؟" ارشد نے آگے آگے جاتی لوگوں سے کہا اور ایک رگ گئی۔ "ظاہر کے پاس دونالی بندوق ہے، انہیں بھی ساتھ لے جایا کرو۔ دیکھتے ظاہر اب جاری کچھ کچھ پستول لے کر ہار جاتی ہے اور مشق کرتی ہے، آپ بھی اس کے ساتھ بندوق لے کر چلی جا کریں۔"

عفت نے ایک بار پھر ارشد کو دیکھا اور چند سے کھنٹی بنا رہی۔ وہ ظاہر سے مخاطب تھا۔ "ہم کہاں رہیں گے؟" ظاہر نے پوچھا۔ "نیشنل گاؤں کے ہیڈ کوارٹر میں۔" ارشد نے جواب دیا۔ "ہاں آپ کا قاتل سالار سے کرائیں گے؟"

نیشنل گارڈ کا سالار احترام کے لیے اٹھا۔ دوسری چار لڑکیوں نے تو اسے پہلے دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔ طاہرہ اور عفت کے لیے شخصیت اہمیتی تھی۔ پھر اچھا سرخ و سفید چہرہ، سیدھے کندھے، چھ فٹ سے اوپر قد، عموماً شکل اٹھائیں برس ہوگی اس کے سامنے میر چنید ایک قاتلین رکھی تھیں اور ان کے درمیان کا فذوں کا ایک پلندہ۔ کسی کے عقب میں دیوار کے ساتھ ہندوستان کا نقشہ لٹک رہا تھا جس پر حلال آباد کے مقام پر ایک پن اور پن کے ساتھ سبز کاغذ لگا ہوا تھا۔

ارشاد اور لڑکیاں کرسیوں پر بیٹھ گئیں تو سالار بھی بیٹھا۔

”وقت بہت کم ہے اور میں ویسے بھی تقریر کے موذیں نہیں۔۔۔ سالار نے تعارف اور دیگر نکلمات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس افادے بات شروع کی جس طرح کوئی بیوپاری فیصلہ کن لمحے میں کرتا ہے۔ پانچ روپے دو آنے سن۔ ایک فیسہ کم نہ ہوگا۔

”ہی آپ کو معلوم ہے کہ برسوں میں اس شہر کے مسلمان ایک تاریخی مجلس نکال رہے ہیں؟ سالار نے لڑکیوں سے پوچھا اور کاغذوں کے پلندے کو الٹ پلٹ کر ایک کاغذ سامنے رکھ لیا۔

”جی ہاں! کالج کی ایک لڑکی نے جواب دیا۔

”آپ کو معلوم ہے کہ اس مجلس کی قیادت لڑکیوں کو کرنی ہے؟

”معلوم ہے؟

”اور یہ بھی معلوم ہے کہ لاشی چارنگ ہوگا؟

”معلوم ہے؟

”اور یہ بھی کہ گیس بھی پھڑی جائے گی؟

”جی ہاں!

”اور یہ بھی کہ شاید پولیس گولی بھی چلائے؟

”جی ہاں!

”اور یہ بھی کہ آپ کا زخمی یا شدید بیمار بنانا پولیس کی لاری میں ہماری نظروں سے اوجھل ہونا بھی متوقع ہے؟

”سب کچھ معلوم ہے؟

سالار نے طاہرہ اور عفت کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ”آپ دونوں بالکل خاموش ہیں؟

”یہ سیکول کی لڑکیاں ہیں۔“ ارشد نے جواب دیا۔ ”ان کی ہمت ہے کہ یہاں تک آگئی ہیں۔ دونوں دسویں جماعت میں ہیں۔ ان کے ساتھ آٹھ دس اور لڑکیاں بھی تیار ہو جائیں گی۔“

طاہرہ نے فضا کے تقدس اور حالات کی اہمیت اور شدت کا اندازہ کر لیا تھا۔ ایک سرور تھا جو اس پر چھا گیا تھا۔ وہ ٹھیک

مکئی تھی کہ وہ ان لڑکیوں میں سے ایک ہے جنہیں پردوں کے پیچھے چھپائے رکھنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ کچھ عجیب تو وہ

معین میں جھٹک اٹھی تھی باقی میاں دھل گیا۔ اس کے دل دماغ نے تو جیسے خولی میں داخل ہونے تک کی زندگی کو اگل کر اس

۳۰

اٹھائے پاکستان زندہ باد“ اور قائمہ زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے مجلس مجلس نکلیں رہے تھے بعض بچوں نے سربقیہا

ارشاد کا فاذ لگی میں سے ہوا ایک جولی کے سامنے جا کر۔ یہ ایک قلعہ نما خولی تھی جس کے اوپر بہت بڑا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

باہر کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ سب اندر چلے گئے۔ سامنے وسیع صحن تھا جس کے چاروں طرف برآمدہ اور برآمدہ میں متعدد کمرے

تھے۔ صحن میں بے شمار آدمی چارپائیوں پر بیٹھے حالات حاضرہ پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ برآمدوں میں نیشنل گارڈ کے بادل

رضاکار بھاگ دوڑ رہے تھے جولی کا کمرہ یا تو قورنٹا ہوتا تھا یا اس میں چارپائیاں رکھ کر کمرہ بندی کر دیا گیا تھا۔ صحن پر آمدوں اور

خود میں ایک زندگی کی حرکت بہت تیز تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وقت تیزی سے اڑ رہا ہے اور یہ لوگ بھاگ کر

وقت سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔

اب ارشد آگے آگے تھا اور تمام لڑکیاں پیچھے۔ ارشد نے بلند آواز سے اسلام علیکم کہا اور لڑکیوں نے ہاتھ کے اشارے

سے زیر لب سلام کیا۔ صحن میں ایک گونج سنائی دی۔ ”علیکم السلام۔“ یہ گونج ان سیاہ بادلوں کی گرجا سے جتنی جاتی تھی جاتی تھی

اٹھ کر موسم ہمارا کا آواز کرتے ہیں۔ یہ سیاہ بادل اپنے ساتھ ہمارا کھانکھار لاتے ہیں، نئی زندگی اور پرکھیت بھی لاتے ہیں۔ یہ گرج دانی

مربصیوں کو بھی ایک بار بستر سے نکال دیتی ہے۔ اس گرج میں ایک عزم ہوتا ہے۔ میں برسنے کے لیے آئی ہوں؟

طاہرہ اور عفت کو یوں لگا جیسے وہ اس طوفان گرہاں گونج کی لپیٹ میں آگئی ہوں اور دوسرے ہی ثانیہ انہوں نے

یوں محسوس کیا جیسے وہ اس گونج کا حصہ بن گئی ہوں۔ اس گونج میں انہیں ایسی زندگی محسوس ہوئی جو ان شب دروڑ سے بالکل ہی

مختلف تھی جو انہوں نے اس جولی میں قدم رکھنے تک نہ دیکھی تھی۔ اس زندہ گونج میں داخل ہونے سے پہلے وہ عورتیں تھیں، بے بس

لڑکیاں، کمزور، نحیف، ہلاک، جو کسی مرد کا سامنا کرنے سے گریز کرتی تھیں اور جو ہر کسی کی مدد پر بھاگتی یا غامد کی حفاظت

میں رہنا چاہتی تھیں۔ اس لمحے سے پہلے وہ برقعے کی سیاہ اوٹ میں ہی چھپا رہنا چاہتی تھیں جیسے یہی چند گز پر ان کا محافظ تھا

جب انہوں نے خولی میں آئے مردوں کو دیکھا تھا تو وہ ارشد کے قریب ہو گئی تھیں۔ دونوں کے قدم رک سے گئے تھے کہیں

چٹانوں کو لڑ رہا نہ کہ مردوں کے دینے والی گونج نے ان کا استقبال کیا تو ان کی نوازی بھیج کر خوف اور احساس بے بسی یوں دھل

گیا جس طرح شوق کی گرم کرنوں سے صبح کی دھند غائب ہو جاتی ہے اور جن کا تپا نہ کھاتا ہے۔

ان میں نوجوان تھے، جوان بھی اور بوڑھے بھی تھے۔ طاہرہ اور عفت نے یوں محسوس کیا جیسے کسی نے ان کے کانوں

میں کہا جو یہ رہتا رہے بھائی ہیں، یہ رہتا رہے باپ ہیں۔ طاہرہ نے عفت کی طرف دیکھا اور عفت نے طاہرہ کی طرف

دونوں مسکرائیں۔

اس گونج نے ایک زندگی پر پردہ اٹھایا اور دوسری کا پردہ اٹھایا۔

ارشاد نے ایک کمرے کی چٹا اٹھائی تو اندر سے جواب ملا ساتھ والے کمرے میں بیٹھے۔ صرف دس منٹ پہنچیں

فارغ کروں۔ ارشد کی جماعت دوسرے کمرے میں جا رہی تھیں پر ابھی۔ وہ اس درمٹ بیٹھنے کا ڈر کے ایک سپاہی نے

انہیں باہر سے کہا سالار بلا رہے ہیں۔ ارشد لڑکیوں کو ساتھ لے کر سالار کے دفتر میں جا گیا۔



چاروں لڑائیوں نے کاغذ پر جھک کر تحریر نہ کی اور ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ کوئی سلاوی کسی نے گھبراہٹ کا اظہار نہ کیا اور کسی نے کچھ بھی نہ کیا۔ سالار سمجھ گیا کہ کام ان چاروں کی ہمت سے باہر ہے۔ اُس نے ظاہر اور عفت کی طرف دیکھا اور شہنشاہ نے کاغذ ظاہر کی طرف سر کیا۔ ظاہر نے تحریر پڑھتے ہی خود اعتمادی سے کہا میں بول دوں گی۔

”شہنشاہ! — سالار نے کہا۔ ”آپ اس مجرم میں تمنا نہیں ہوں گی۔ کوئی نہ کوئی آدمی آپ کو عداوت دیتا ہے گا۔“

ارشاد صاحب ابائی پر وگرام کا توپ کا قطر ہے نا؟... خوب... کالج کا کیا حال ہے؟

”خیر تو یہاں ہے۔ جلوس کے ساتھ سارا کالج ہوگا۔“

”جوت خوب! — سالار نے کہا۔ تو آپ لوگ جا کر تیاری کر لیں۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔“

”اے بی بی! بات تو میں ساری سمجھ گئی ہوں۔“ خاتون نے ظاہر کی ساری بات سن کر کہا۔ میں یہ بھی سمجھ گئی ہوں کہ اس جلوس کا مقصد کیا ہے اور لڑائیوں کی شمولیت کس قدر ضروری ہے۔ لیکن... لیکن... لیکن بی بی!...“

”لیکن یہ کہ آپ ڈر رہی ہیں کہ آپ کی بی بی ماری جائے گی۔ ظاہر نے منہس کر کہا۔ اس کی ہنسی نے فحشا کا کچھ اور خاتون کی گھبراہٹ کو بہت حد تک کم کر دیا۔ اُس نے کہا۔ ”لیکن یہ نوبت نہیں آئے گی یہاں کہ میں آپ کو بتا چکی ہوں مرد جہاں پوری طرح حفاظت کریں گے۔“

خاتون غلاموں میں تھکنے لگی۔ اس غلام اس سے جانے کیا نظر آیا کہ اس کا چہرہ پٹکنے لگا۔ بے نور آنکھیں روشن ہوتی جہاں تھیں جسم ساکت و جامد تھا لیکن اس سکوت اور جہود میں ایک طوفان اٹھ اٹھایا لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد خاتون کے ہونٹ تھر تھراتے۔ بوڑھا سینہ ایک بار زور سے دھڑکا اور خاتون نے بے ساختگی سے دوپٹے کا پو دوںوں ہاتھوں میں لٹٹا کر کہا۔ ”اللہ میری بچی کو فتح دے۔ آمین۔ اللہ میری بچی کے بھائیوں کو فتح دے۔ آمین۔“ بوڑھی عورت کی آواز میں جلالی رقت کا رنگ پیدا ہو گیا۔ وہ لڑتی آواز میں بولی۔ ”اللہ مسلمانوں کو فتح دے آمین۔“ اور خاتون کے آنسو نکل آئے۔ اس کی باقی دوامیں ملتی ہیں ہی ایک کے رو گئیں۔

ظاہر آگے کر خاتون سے لٹل کر ہو گئی اور اسے بھیج کر کہا۔ ”میری پیاری امی؟“

جلال آباد کا شہر جہاں دروازہ لہذا رنجی جلوس نکلنے والا تھا چند منٹوں سے الشہر کا پاکستان زندہ باد اور قائمہ عظم زندہ باد کے نعروں اور ہندوؤں کے جے کاروں سے گونج رہا تھا۔ خود و پودوں کی طرح سبز جھنڈے بھڑکتے اور شیریں پر لہرا رہے تھے۔ شہر کی آبادی میں صرف بیس ہزار مسلمان اور باقی ہندو اور کھتے۔ یہ شہر چاروں طرف سے سکھوں کے چھوٹے چھوٹے دیہات میں گھرا ہوا تھا۔ اس طرح شہر کے بیس ہزار مسلمان اتنی تو بے ہزار سکھوں اور ہندوؤں کے زمرے میں تھے۔ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں جہاں سرگرمی، دوڑ دھوپ اور آٹھک جدوجہد تھی، وہاں تلخ سا کھچھاؤ اور خوف و ہراس بھی تھا۔ گذشتہ بیسے کے آغاز سے اس شہر میں مسلمانوں کے جلوسوں پر لاشی جہاز بھی ہونے لگا تھا اور دوبار گولی بھی چل چکی تھی۔

نئی زندگی کی سرگرمیوں کو قبول کر لیا تھا۔ عفت پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی لیکن وہ دورہ کر اشد کے پڑشباب چہرے اور اس کے مردانہ منہ کو دیکھ رہی تھی۔

”ہر سوں آپ دن کے تین بجے معنی لڑائیاں ساتھ لاسکیں ملائیں اور سبزی منڈی کے چوک میں جمع ہوجائیں۔“ سالار نے کہا۔ ”ایوں! کیجئے ارشد صاحب! آپ کسی مزدور جگہ ان لڑائیوں کو جمع کر لیں۔ یہ کام آپ کا ہوگا۔ سب کے گھروں کے لڑائیوں کی کاغذ لے لیں لیکن وقت کی باندی لڑی ہے۔ میں جیسے بعد دوپہر سبزی منڈی کے چوک میں... نیشنل کالج کے ڈی مشنل سے آئے عورتوں کا بندوبست کیا ہے۔ عورتوں کا باہر نکالنا اور خصوصاً آج کل کے حالات میں ناممکن ہو رہا ہے۔ اگر عورتوں کا پہلا جلوس کا میاب ہوگا تو امید کی جا سکتی ہے کہ سبزی منڈیوں اور عورتوں کا جلوس نکل سکے گا۔... سالار سوچ میں لگ گیا اور شیل سے کاغذ پر لکھنے لگا۔ ”آپ کے ساتھ جس بول کی اٹھارہ... چھ آپ ہیں... چوبیس...“

”چھ اور شیل کی کیجئے۔“ کالج کی ایک لڑکی نے کہا۔

”گو تیس کا اندازہ ہے۔“ سالار نے کہا۔

”دوپٹے سبز ہونے چاہئیں؟ — ارشد نے پوچھا۔“

”بالکل سبز۔“ سالار نے فیصلہ کرنا چھوڑ دیا۔ وہ دینے جاتیں گے۔ ہم نے ایک بسے رستے کا انتخاب کر رکھا ہے۔ مرد لڑائیوں کے گرد رستے کا گھر اڈا لے رکھیں گے حفاظت کا مکمل بندوبست ہے۔ آپ اپنے ساتھ پانی میں بھیجے ہوئے دوپٹے یا چادریں ضرور لائیں۔ گیس کے حملے کی صورت میں یہ دوپٹے اور چادریں سر پہرے اور گردن کے گرد پلٹ لیں۔ مرد جان توڑ توپ کی حفاظت کریں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ یہ ہوگا کہ جب پولیس آپ کو گرفتار کرنے کے لیے آگے بڑھے گی تو وہ ایک ایک لڑکی کو پولیس کے ہاتھ سے چھین کر جلوس میں ہی گم کر دیں گے۔ ہو سکتا ہے پانچ منٹ کے عرصے میں آپ بیسوں مردوں کے ہاتھوں میں جائیں۔ ایسے وقت آپ شرم میں نہ آجائے۔ دو سب آپ کے بھائی اور باپ ہیں۔ وہ آپ کو پیچھے کر کے اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں گے۔“

”جہاں اس روز کا پروگرام یہ ہے کہ تم تھانے پر قبضہ کریں گے اور پاکستان کا جھنڈا لہرائیں گے۔ اسی وقت دوسری پارٹی پوری پر جھنڈا چڑھا لے گی۔ پھر ناک خانے پر بھی اس طرح جھنڈا چڑھا جائے گا۔ پولیس تھانے کی حفاظت کے لیے رہتی ہوئی کھے گی۔ چونکہ ہمارے شہر میں یہ اقدام اپنی نوعیت کا پہلا ہوگا اس لیے ڈر ہے کہ لوگ اس تلخ مزاحمت کے آگے ٹھہر نہ سکیں گے۔ اس صورت میں میں ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جو وہاں اپنی جان کو تھیل پر رکھ کر ایک تقریر کر کے بھاگے ہوئے مردوں کو روک لے اور ان کے خون کو گراما سے...“

سالار نے کاغذوں کو الٹ پلٹ کر ایک کاغذ نکالا اور کالج کی لڑائیوں کے سامنے رکھ دیا۔ اس کاغذ پر بارہ فقرے لکھے ہوئے تھے۔ سالار نے کہا۔ ”تقریر اس قسم کی ہونی چاہئے جس میں عداوتی جہاں تک عام کا تعلق ہے وہ دور عداوت کا ہے۔ آپ دیکھیں کہ آپ میں سے کون سی لڑکی یہ کام کر سکے گی ہو سکتا ہے اس کی نوبت نہ آئے لیکن میں ہر طرح کی پیش بندی کر لیتی چاہتی ہوں۔“



یوں... وہ تو معمولی ہے مگر مسلمانوں کی نذر دایاں صرف تین ہی باقی سب کچھ مبرا دین... معلوم ہوتا ہے یہ سارے مسلمان پاکستان  
نہیں کہیں گے... دیں ہی!... بنائیں ہی بنائیں ہیں تو اپنی تھانیداری کی فکر ہے... نہ جی بھی تو دیکھتے کسکھوں کے علاقے  
میں مسلمان کا زور و ابھار کاجی کچھ خیال کریں... اچھا... اچھا حضور... بڑی کراپا حضور... مجسٹریٹ صاحب کو میں بتا دوں گا...  
کل دس بجے تک یہ کچھ ہے... بہت سری اکل!

دوسری صبح جلال آباد کی فضا میں غیر معمولی تازہ اور سرگرمی تھی۔ ہر کوئی بھاگنے دوڑنے کے موذ میں تھا۔ ہر طرف افواہ فرما  
تھی۔ گھر گھر میں کل کے جلوس اور مظاہرے کی اطلاع پہنچتی جا رہی تھی۔ لاہور میں گاڑی کی فانی نماز سے احکام آچکے تھے۔ لوگ  
سودا سلف خریدنے میں اس طرح مصروف تھے جیسے دوکانیں بمشتر کے لیے بند ہو جائیں گی نیشنل گارڈ کے رضا کار پیل ہائیڈرو  
اور تانگوں پر ادھر سے ادھر اڑے جا رہے تھے پولیس کے سپاہی چار چار کی ٹولیاں میں شہر میں گشت کر رہے  
تھے۔ سوچ بہت آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی مصروفیت اور چال ڈھال میں تیزی اور سوچ کی  
تمازت پیدا ہو چکی تھی۔ ہندو اور سکھ دوکانوں میں بیٹھے، بھاگتے دوڑتے مسلمانوں کو قہر کو آواز دے رہے تھے۔ دیکھ کر  
رہے تھے کہیں کہیں چند ہندو اور سکھ پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ سر جوڑنے کھڑے نظر آتے تھے۔ وہ پر تھک بازو  
کی جیسٹیں اڑا رہے تھے۔ شہر لوگوں میں اب دیہاتی بھی نظر آنے لگے۔ ادھر پولیس کی نفری میں اضافہ ہو گیا۔ اور ترسے پولیس  
کے دو مسلح سپاہی پیچھے تھے۔

ظاہر اور عفت سکول رنگیں۔ وہ گھر گھر گھوم رہی تھیں کسی گھر سے انہیں بالوں کی جواب ہلا اور وہ منہ لبورے  
ہونے نکل آئیں اور کسی گھر سے وہ بیٹی کھینچ نکلیں۔ ظاہر کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر وہ نام لکھی اور مٹا جلی جا رہی  
تھی۔ ایک گھر میں وہ کسی کے باپ کے ساتھ بحث میں اُلجھی ہوئی تو دوسرے گھر میں کسی کی ماں بہن یا ساس کی منٹیں کر رہی ہیں۔  
خاتون اور عفت کی ماں اپنے گھر میں سر جوڑے بیٹھی تھیں خاتون کا بے رحمیہ جو جاتی اور دوسرے ہی گھر  
اس کا چہرہ کھل اٹھا لیکن وہ کیفیت اور ہر حال میں عفت کی ماں کو تسکین دے دے کر سمجھا رہی تھی کہ جو کچھ ہو رہا ہے  
ٹھیک ہو رہا ہے۔ دروازہ دروازہ چند لوگ یہاں سکھوں کی بادشاہی جو جاتے گی۔ وہ ہماری لوگوں کو اٹھائے جائیں گے پھر  
ہماری مسجدیں اٹھیں گی اور خدا کا نام لینا جرم قرار دے دیا جائے گا مسلمان ہندوستان میں اپنا احتیاط مانگ رہے ہیں  
جہاں وہ خدا اور قرآن کی حکومت قائم کریں گے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کسی مسلمان کو خطا تیر پاکستان پر قابل کرنے کے لیے زیادہ پسینہ نہیں بہانا پڑا تھا۔ ایک جوش تھا  
اور ایک جذبہ کہ اترتے سیلاب کی طرح ہر کسی کے سینے میں مرجھ جیو گیا تھا جس نے بات سنی، ہاں خردی اور تھوڑی دیر بعد  
اس کی منڈیر پر سبز جھنڈا لہرائے لگا۔ ہر مسجد میں ہر نماز کے بعد پاکستان کے لیے دعائیں، ہر جمعہ کے خطبہ میں پاکستان کا ذکر ہر محفل  
میں پاکستان کی تہنیں اور حدیہ کہ قہر تانوں اور خاتونوں پر چرس پینے والے ٹنگوں نے بھی "تری" اور "عالی" کے نعروں کے  
ساتھ پاکستان زندہ باد کا اضافہ کر لیا تھا۔ ہر کوئی اپنی اپنی لفاظی کے مطابق مرنے مارنے پر تیار تھا۔ کوئی چاقو سے، کوئی لٹھی  
سے، کوئی دونوں ہندو سے بعض خالی ہاتھ اور خالی نعروں سے اور بعض قلم سے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو مطالبہ پاکستان

کیا سی پس نظر کو سمجھتے تھے کچھ ایسے تھے جنہیں پاکستان کی صرف ہمزانی اپنی پیش منہج کی ہستی جو سیاسیات سمجھنے سے  
اچھے تھے وہ چند عمری مرنے یا تین ہی سمجھ گئے تھے اور جو کچھ بھی نہ سمجھ سکے وہ خوب ہمارے حادثہ کو نہایت اچھی طرح سمجھتے تھے  
مسلمانوں کا قتل عام ایسی دلیل تھی جس کے سامنے تمام سیاست اور فریضہ چینی تھی۔ وہ بہر حال، بہر صورت اور بہر قیمت پاکستان  
بنانے پر تیار تھے۔

اور دوسرے میں میل دور جلال آباد کی فضا کا یہ ارتعاش صرف ایک شہر کا نہیں تھا۔ یہ پورے ہندوستان کا ارتعاش تھا۔  
چھ ماہ یا شہر ہندوستان بھر کی تصویر پیش کر رہا تھا۔

اسی روز پچھلے بہر حال آبادی سڑکوں اور گلیوں میں پولیس کے ساتھ سکھ بمبٹ کے سپاہی بھی نظر آنے لگے بڑا کراہ سکھ  
بمبٹ کی ایک کچی پیچ گئی۔ فروغ کو دیکھ کر مسلمانوں کے ہاڈ اور دماغ کی حرکت اور تیز ہو گئی تھوڑی دیر بعد ایک ڈھنڈورچی لگے  
میں احوال نکالتے لگی ڈھنڈو واپسٹ رہا تھا:

"بہر خاص وہم اور اطلاع دی جاتی ہے کہ اپنے حکم تک کسی کی بازار میں سواتے  
مسجد، مندر، گوردوارے اور گرجے کے پانچ سے زیادہ آدمیوں کا اکٹھا ہونا  
جرم ہے، مرد، عورت یا بچہ۔ لٹھی چاقو کی تھیلہ لے کر شہر کی حدود میں نہ  
چلے پھرے درزہ خندا کیا جاوے گا۔ رات کے دس بجے سے صبح پانچ بجے  
تک کوئی آدمی باہر نہ نکلے درزہ حوالہ پولیس ہووے گا یہ مجسٹریٹ صاحب  
کا حکم ہے۔ جرم عدلی کر کے دلاخت بہڑا دے گا۔"

ڈھنڈورچی جب مسلمانوں کی ایک گلی میں داخل ہوا تو اسے چند عورتوں نے گھیر لیا اور پوچھا کیا بات ہے؟ ڈھنڈورچی نے  
موجوں کو تو دے کر ادھر ادھر دیکھا اور کہا نکل دن کے تین بجے مسلمانوں کا جلوس نکلے گا جس میں ہر مرد و عورت اور بچہ شامل  
ہو کر اب دارن حاصل کرے۔ کوئی مسلمان مرجو جلوس میں شامل نہیں ہووے گا، دوزخ میں جاوے گا۔ کل تین بجے سبزی  
مڑی کے چوک میں۔

ڈھنڈورچی جلدی جلدی قدم اٹھاتا آگے نکل گیا۔ عورتیں سر جوڑ کر کھڑکیں لگیں اور دوسری گلی سے آواز آ رہی  
تھی۔۔۔ پانچ سے زیادہ آدمیوں کا اکٹھا ہونا جرم ہے۔ کوئی آدمی مرد یا عورت یا بچہ۔ لٹھی چاقو۔۔۔

تمام رات شہر پر اسرار غامضی طاری رہی۔ رات کے اس سکوت میں صرف فوجیوں اور پولیس کے سپاہیوں کے  
ڑے بڑے بوتلوں کی دھمک، دھمک سنائی دیتی تھی یا کسی کتے کے بھونکنے کی آواز۔ درزہ سکوت تھا۔ ایک غامضی اور اس  
غامضی میں لینے ہوئے سینکڑوں مکان بے جان ہوتوں کی طرح کھڑے تھے لیکن مکانوں کے اندر جلی جتی، حرکت اور  
دولت تھا۔ باہر کی فضا تو جیتی اور اندر کی دنیا جاگ رہی تھی۔ صرف ٹٹاتے تیاروں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے محلوں میں چھتوں کے  
اوپر کچھ ساتے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ یہ سارے تمام رات متحرک رہے۔

لے جایا جارہا ہے اور جلوس آگے بڑھنے ہی والا ہے۔

جلوس کے آگے بچاس کے قریب نوحوان لڑکیاں لائی گئیں۔ سب کے دوپٹے سبز تھے اور سب نے کمر کے ساتھ ایک ایک جھینگا بنواد و پٹ لپیٹ رکھا تھا۔ لڑکیوں کو چھ چھ کی تعداد میں کھڑا کر دیا گیا اور دگر دو کو کئی تیس فیمل گاڑو کے رضا کاروں نے مضبوط موٹار سے تان لیا۔ اس کے پیچھے ساتھ ساتھ باوردی رضا کار تھے اور لڑکیوں کے آگے چار رضا کار گھوڑوں پر سوار تھے۔ یہ چار سوار شہر کے چھٹے نمبر کے لڑاکے، پھر تیلے اور جانناز تھے۔ ان میں دو باکسر۔ ایک پہلوان اور ایک فٹ بال کا کھلاڑی تھا۔ کچھ توان کے جھول کی ساخت ہی تاریخ کے جنگجوؤں سے ملتی جلتی تھی لیکن جاذب نگاہ و ٹوڑھا تھا جو ان کے چہروں اور آنکھوں سے شعلے برسا رہا تھا۔ ان میں ایک سالار تھا۔ ان کے ہاتھوں میں جھنڈے تھے جو دراصل زیرے تھے اور ان کی نوکیں جھنڈوں میں جھپی ہوئی تھیں۔

ظاہر اور غفلت کا کچھ لوگوں کے ساتھ قیصری قطار میں قیصر ماحول نے دونوں کی جھجک ختم کر دی تھی۔ ظاہر نے کان میں سرگوشی سی موسیقی کی۔ اس نے دیکھا، ارشاد کے ہونٹ اس کے کانوں کو تقریباً چھو رہے تھے۔ ظاہر نے چہرہ اٹھوڑ کر دونوں کی سانسوں ٹکرائیں۔ غفلت نے اس طرف دیکھا تو ارشد نے ہاتھ لہا کر کے اس کے کندھے پر رکھا اور کہا: ”مُحَاظَفْ — ظاہر نے جیسے خواب میں کہا۔“ **”فِي اِيْمَانِ اللّٰهِ“**

پولیس اور فوجیوں کا دستہ روکے کھڑی تھی۔ پولیس کے چار ایگسٹ اور کچھ جرنیل کا ڈیوٹی اسٹیشن تھا۔ جہاں سے وہ نکلے۔ جرنیل بھی پہنچ گئے۔ چاروں ایگسٹ اور ڈیوٹی اسٹیشن اس کے گرد جمع ہو گئے۔ صورت حال کے پیش نظر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایگسٹوں کو روکا نہ جائے اور حالات کے مطابق کارروائی کی جائے۔ جرنیل نے اشارہ کیا تو پولیس کی ایک مڑ چرکی بھٹ کے اوپر دو لاکھ پیکر نصب تھے۔ سامنے آئی جرنیل نے مڑ چرکی میں تیرہ ڈفرن اور اعلان کیا۔

”جلسوں کو آگے بڑھنے کی اجازت ہے مگر سب کو خبردار کیا جاتا ہے کہ کوئی منظمہ و شہری اس کو خط سے من ڈالنے کے لیے کیا گیا تو بغیر لوٹس پسٹے لاسٹی چارج ہوگا۔ پھر گلی پھلائی جاتے گی، عورتوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ ان کی عزت اور جان کی حفاظت ہمارے ذمے نہیں ہوگی۔“

”ہماری عزت کا محافظ خدا ہے۔“ — ایک لڑکی نے چلا کر کہا۔ — ساتھ تیشل گاڑ کے ایک رضا کار نے جوش

انکو لغو نہ لگایا جس کے جواب میں ایک گونج نے جیسے آسمان کو بھی بلایا ہو۔ مجبڑیٹ کا اعلان فلک شگاف لغزوں کی کھوگی۔ چاروں سواروں نے جھنڈے بلند کر کے اشارے سے جلوس آگے بڑھ کر دہائیں طرف مڑا دی۔

کاٹوں پڑی آواز سنائی دیتی تھی۔ نعرے تیز اور بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔ آگے چار جانباز گھوڑوں پر سوار، گھوڑوں کی جگہ بجا مال، پیچھے لوکیوں کا ترتیب دار دستہ، اس کے گرد مشیش گارڈ کے رضا کار تہہ نہانے ہوئے اور اس کے پیچھے کاٹکے انسان سروس اور بھندڈول کایل، لوکیوں کے نعرے، مردوں کا جوش اور اس منتظر پرسینکروں ہزاروں جھنڈوں سے مزین سڑک۔

دوسری صبح سورج ہر روز کی طرح طلوع ہوا۔ اُور اُٹھا دھارے چھوٹے بہنے لگے۔ دن کے بارہ بجے۔ ایک اور جب دو بجے تو سبھی منہ پڑی کے دوکان پر لگا ہوں کی جھینٹ نظر آنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس جھینٹ میں خود ان لوگوں کے آنے لگیں۔ لوگوں نے ان لوگوں کو لکڑیوں کو لٹکائیوں دیکھا اور مسکرا دیئے۔ اڑھائی بج گئے۔ انسانوں کے انجود میں جھینٹ دھانی دینے لگے۔

پولیس اور فوج کی بھاری تعداد ہنری منڈی میں گشت کرنے لگی۔ دوکانیں ایک ایک کر کے بند کر گئیں۔ ہنری منڈی معلقہ گلیوں، راستوں اور سڑکوں سے جیسے سیلاب اٹھ آیا ہو۔ ہنری منڈی کے اُس سرے سے اس سرے تک انسان ہی نہیں اور سبز جھنڈے دکھائی دے رہے تھے۔ شیل گاڑ کے بارودی زخاں اس جگہ میں اُدھر اُدھر جھگ دوڑ رہے تھے۔ میں دیہات بھی نظر آنے لگے۔ دو گلیوں سے اُڑنے سے ہی چلے آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی لاشیاں خلیج سرکاری اعلان کی زدِ بھر پور انہیں سختی۔ وہ تو اس سرکار کے ہی منکر تھے اور وہ اس سرکار کے قانون کو ہنس نہس کر نظر آئے تھے۔ ان کی سرکار اب صرف ایک انسان تھا۔ قاترِ اعظم!

بعض آدمی بیٹیوں پر پانی کے بھرے حمام منہ دے اور ہاتھوں میں گلاس اٹھاتے پسینے میں شرابور لوگوں کو بلارہے تھے۔ سبزی منڈی سے پیچھے والا بازار بھی اب انسانوں سے آٹ گیا تھا اور بھی تمک اس انہر عظیم میں ہونا جارہا تھا۔ دوکانوں کی چھتوں، مکانوں کی منڈیروں، بالکنیوں اور بالائی منزلوں کی کھڑکیوں سے عورتیں اور بچے جھنجھکے ہوئے نکل رہے تھے۔

مزارہ انسانوں کا یہ حجم حیران کر رہا گیا۔ فوج اور پولیس مجلس میں سے نکل کر سبزی منڈی کے دونوں سرسبز پرچوں  
تحتی مجلس کارخانہ اور تیشیل گاؤں کے مرادولہ دستے سبزی منڈی کے اس طرف تھے جو بڑی سڑک کے ساتھ تھا۔ مرادولہ  
میں کچھ بل چل سی پیدا ہوئی۔ پیچھے والوں نے سمجھا شاید پولیس مداخلت کر رہی ہے۔ ایک نے بہانہ بلند کر دیا کہ  
مزارہ اسٹینڈن سے نکلے ہوئے۔ التراکڑ کے دو مقدس لفظوں نے حلال آباد کو بنیادوں تک ہلادیا۔ پیچھے والے لوگ  
گے بڑھنے کو قیام تھے، آگے والوں کو دھکیلتے لگے۔ حمزہ نے اور بلند ہو گئے۔ ہمیشہ نکلنے والے رضا کاروں نے  
جو نظم و ضبط اور ہدایات پر مامور تھے، بڑی مشکل سے مجلس کے عقبی حصے کو قابو میں کیا اور انہیں بتایا کہ لوگوں کو آگے

”میرے بزرگوار میرے بھائی تیرا بھائی ہے وہ کون سی قوت تھی جس کے اثر سے طاہرہ کی آوازیں مردکار عیب پیدا ہو گیا تھا۔ چھپچھپانوں کا زور لگا کر بولی ”امتحان کا وقت آ پہنچا ہے... دو کاغذ کوٹھی میں دبا تے زبانی بول رہی تھی جیسے پرستا نا چھایا۔ ہزار ہا انسانوں نے جیسے سانس ہی روک لی تھیں۔ سڑک کے کنارے ایک دو منزلہ مکان کی کھڑکی میں سے پھولوں کا ایک ہار سنسا نا ہو آیا اور طاہرہ کے کندھوں پر آگرا۔ ایک رضا کار نے ایک کرنا طاہرہ کے گلے میں ڈال دیا۔ لوگوں نے اوپر دیکھا۔ کھڑکی بند ہو چکی تھی۔

”... خدا کی راہ میں ہلی رکاوٹ ایک مجسٹریٹ اور چند بندہ دقوں کی صورت میں ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ ہمارا رخ مغرب کی طرف ہے اور میں مشرق کی طرف جانے کو کہا جا رہا ہے۔ کیا یہ ہزاروں مقدس جھنڈے چند ایک بندہ دقوں کے خوف سے اپنا رخ موڑ لیں گے؟“

”نہیں موڑیں گے۔“ ہجوم میں سے دو تین آوازیں بلند ہوئیں۔  
”یہ جھنڈے مغرب کی طرف جائیں گے۔“ کئی اور آوازیں۔

”میرے بھائی اور بزرگو! طاہرہ کی آواز بلند ہو گئی۔ پہلی گولی اس بیٹی کے سینے میں لگے گی...“ اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ کر کر کہا۔

”ہجوم میں ایک گوجر ہارسر سلاٹ پیدا ہوئی اور ایک بے یقینی جلوس میں سے ایک آدمی دو آدمیوں کے کندھوں پر کھڑا ہو گیا اور زور سے بولا۔ ”ہماری بچی کڑی رہی ہے۔ پہلی گولی اس کے سینے میں لگے گی۔“

جلوس کے پچھلے حصے میں ایک اور آدمی بولا۔ ”ہماری بچی کڑی رہی ہے پہلی گولی اس کے سینے میں لگے گی۔“

”گولیاں ہم کھاتیں گے۔ گولیاں ہم کھاتیں گے۔ ایک شور اٹھنڈے اوپر اُڑا دیا۔“

”مردو! پتھریں کو پیچھے کر لو۔“

”آگے بڑھو۔“

”جلوس کیوں رک گیا ہے؟“

”بچی کو سنبھال لو۔“

”ہن کو نیچے اتار لو۔“

”جلوس مغرب کی طرف آگے بڑھے گا۔“ سارا کی دنگ آواز گونجی نیٹیل گاڑ کے کئی رضا کار دوکانوں کے

توں پر بھاگتے نظر آتے۔ وہ اعلان کر رہے تھے ”ممبر کرو مسلمانو! جلوس آگے بڑھے گا حکم مل گیا ہے۔ شاباش مجاہدو! ابے صبر نہ ہونا۔“

”لوگوں کا خیال رکھنا۔“ کئی آوازیں اُڑنے لگیں۔

”وہ ہماری حفاظت میں ہیں۔“ نیٹیل گاڑ کے جواب دیا۔

”مکھنکس — مژدہ باد“

”پاکستان — زندہ باد“

”مکھنکس راج — مژدہ باد“

”مکھنکس — زندہ باد“

”مے کے دین گے۔ پاکستان۔“

فرش سے عرش تک کی مسعت دل بری تھی بڑا دل بھی مسکرا رہا تھا۔

مجسٹریٹ پولیس کی موڑ میں بیٹھا آگے آگے جا رہا تھا نصف پولیس اور فوج جلوس سے آگے اور نصف جلوس کے پیچھے تھی۔ پولیس لائینوں سے مسلح تھی اور فوج کے پاس رائفلیں اور ٹینک گنز تھیں۔ جب جلوس اسلام آباد کالج آگے بڑھ کر اس دورا ہے پر پہنچا جہاں سے ایک سڑک بھانے کی طرف اور دوسری ریوے سٹیشن کی طرف جاتی تو مجسٹریٹ نے موڑ روک لی۔ چاروں گھوڑے بائیں طرف گھومے تو مجسٹریٹ اور پولیس افسروں کے چہروں کے تنہا بدلنے لگے جلوس کا رخ بھانے کی طرف تھا۔ بھانے کے بالمقابل کچھری تھی۔ ان دونوں جگہوں کی حفاظت لازمی پولیس جلوس کی راہ میں حائل ہو گئی۔ جلوس رک گیا۔ مجسٹریٹ کی موڑ سے اعلان ہوا کہ جلوس اس طرف نہیں جا سارا نے آگے ہونے کو مجسٹریٹ کو کہا۔ ”ہمارا مظاہرہ بے غرض ہوگا۔ اگر جلوس کو روک دیا تو شاید یہ مظاہرہ کی صورت بدلے۔“ میں خبردار کرتا ہوں کہ جلوس یہاں سے آگے اس سڑک پر نہ جاتے۔ لاؤ سپیکر بولا۔

”جلوس اسی سڑک پر جاتے گا اور مظاہرہ پرامن ہوگا۔“ سارا نے بارع جواب دیا۔

”میں جلوس کو دس منٹ کی مسعت دیتا ہوں۔“ لاؤ سپیکر پھر چنچا۔ ”اگر جلوس منتشر نہ ہوگا تو لاٹھی چارج ہوگا۔ پولیس لائینیں سنبھال کر جلوس کے سامنے آگئی۔

سارا نے ایک رضا کار کو پاس بلا کر کان میں کچھ کہا اور رضا کار بھاگتا ہوا لوگوں کے درمیان اُکھڑا بولا۔ ”ہن تقریر کر سکتی ہے۔ ہر سکتا ہے۔ ہن مقابلہ ہو جاتے۔ ڈر ہے لوگ بھاگ اٹھیں گے۔ یہاں کسی لڑکی کا بولنے بے ضروری ہے۔“

”یہ پہلے سوچ لینا چاہیے تھا۔“ ایک لڑکی نے کہا۔ ”کسی کو تقریر رکھ کے دے دی ہوتی۔“

”میرے پاس لکھے ہوئے چند ایک فقرے ہیں۔“ طاہرہ نے ایک کاغذ کھانے ہوئے کہا۔

”میں زبانی بولوں گی۔“

چند رضا کاروں نے کسی سے ایک ٹول لے لیا۔ طاہرہ کو اٹھا کر اس پر کھڑا کر دیا گیا۔ چار رضا کار بھی پاس ہی کھڑے ہو گئے۔ دو کئی طاہرہ کو یوں لگا جیسے اس کا حلق خشک ہو گیا ہوا اور کوئی چیز اس میں آگ لگی ہے۔ اس نے متحکک لیکن حلق خشک ہی رہا۔

”لو طاہرہ! ایک جانی بچانی آواز اس کے کانوں میں پڑی اور ساتھ ایک نعرہ بلند ہوا۔ ”نعرہ بحیرہ“ اللہ اکبر۔“

نہیں کریں گے۔

”ہمارے پاس رائفیں اور سنگین ہیں۔“ انگریز نے رعب سے کہا۔ ”موجودہ سرٹاپس جلیس کو مست روکو انہیں کھلے میدان میں آئے دو میں ان کو مار کے دم لوں گا۔“

”نہیں! مجسٹریٹ نے کہا۔“ میں جلیس کو آگے نہیں جانے دوں گا سنئے نہیں ہو وہ انگریزوں کو گالیاں دے رہے ہیں؟ انگریزی حکومت کی بے عزتی کر رہے ہیں میں انہیں یہیں منتشر کر دوں گا۔“

”دیکھو مجسٹریٹ! لیفٹیننٹ نے انگریز حاکم کی طرح کہا۔ جلیس کو آگے جانے دو میں انہیں سنبھال لوں گا۔“

”میں اس علاقے کا مجسٹریٹ ہوں۔“ مجسٹریٹ نے تنکھانہ لہجہ میں کہا۔ میری ذمہ داری ہے یہاں میرا کچھ گا جلیس آگے نہیں جاتے گا میں گولی چلانے کے حق میں نہیں، لائٹنی چارج کروں گا۔“

”شٹ آپ نو آؤنڈین؟“ انگریز لیفٹیننٹ نے کہا۔ ”تم مجسٹریٹ چھوڑ بندوستان کے کسی صوبے کے گورنر ہی کیوں نہ ہو پھر بھی تم انگریز کے محکمہ برصغیر ہندوستان کی مجسٹریٹ اور انگریز لیفٹیننٹ بنو۔“

”تم سنئے نہیں وہ لنگ جارج کو گالیاں دے رہے ہیں؟“ مجسٹریٹ نے بوجھل کر کہا۔ ”میں برداشت نہیں کر سکتا۔“ مجسٹریٹ کے حکم میں اب چالو سی اوٹوڈی بن گیا۔

”میں جانتا ہوں یہ مسلمان ہیں اور ان میں جوش زیادہ ہے۔“ لیفٹیننٹ نے کہا اور طنز پر لہجے میں کہنے لگا۔ لنگ جارج صلاح الدین کو شکست دینا جانتا ہے۔ اور انگریز کی گردن تن گئی۔

پاس ہی ایک مسلمان پولیس انسپکٹر کھڑا تھا۔ اس نے مسکرا کر انگریز کا ہتھ سے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے لنگ جارج اپنی طاقت کا غلط اندازہ لگاتا ہے۔“ انسپکٹر آکاڑ میں ایک طنز تھی ہے لیفٹیننٹ نہ سمجھ سکا اور آہستہ سے کہا۔

”شٹ آپ نو آؤنڈین؟“

اور لیفٹیننٹ نے مایکروفون میں یہ اعلان کر کے کلا جلیس آگے جاسکتا ہے۔ مجسٹریٹ کی حکومت چھین کر فوجی حکومت کا اعلان کر دیا۔

سیلاب کے سامنے سے دیوار ٹوٹ گئی۔ اوڈ سپیکر والی موٹر آگے نکل گئی پولیس اور فوج آگے چل پڑی اور اس کے پیچھے مجسٹریٹ اس طرح جا رہا تھا جیسے جنازے کے ساتھ جا رہا ہو، سر جھکا تے ہوئے اور افسردہ لیفٹیننٹ نے آگے جا کر اپنے سمبار، سمبیدار اور پولیس انسپکٹروں کو کھٹا کر کے باایات دیں اور تمام فوجی ترقی قدم آگے چلے گئے۔ اور جلیس کے قدم بھی تیز ہو گئے۔ لیفٹیننٹ کا ارادہ تھا کہ اتھارے سے فرار اس طرف ہو کھلا میدان ہے وہاں لائٹنی چارج کر کے جلیس کو پھیلایا جائے گا اور پھر گولی چلائی جائے گی مسلمان اس سحیر سے آگاہ نہیں تھے۔ دو گونج اور ٹھٹک شگاف نفروں کے ساتھ بڑھ جا رہے تھے جلیس میں جوش تو پہلے ہی تھا لیکن جس وقت سے ظاہر ہونے دوچار فوجی بول کر مسلمانوں کو لٹکا رہا تھا۔ اس جوش میں غیض و غضب اور آتشیں دھواں پیدا ہو گیا تھا۔

میدان صرف ایک سو گز دور رہ گیا اور لیفٹیننٹ نے فوجی دستہ روک کر پھیلایا پھر پولیس کے انسپکٹر انچارج کو

ظاہر وجہ میرے آری تو دو کا پستے جوئے لٹوانی بازوؤں نے اسے دبوچ لیا اور اس کے پسینے۔ شرابو پھر کے پولیس کی بادش ہوئے گی۔ اس نے دیکھا اس کی فنی خاتون زار و قطار روتی اس کی باتیں لے تھی۔

”میری بچی، میری طاہر بچی۔ تو میرا بیٹا ہے۔ تو نے آج میری ساری حسرتیں پوری کر دی ہیں۔ تیرا باپ یہ دیکھ کر تیرے باپ۔ یہ دیکھ اپنے بھائی۔ تو ان کی بیٹی ہے۔ تو ان کی بہن ہے۔ دیکھ تیری عزت کی خاطر کس طرح دے رہے ہیں۔ میری بچی۔“ اس کے ہاتھ میں تھرموس بوتل تھی۔ کارک کھول کر بوتل کی پیالی سے اسے شربت

ظاہر کا خیال تھا کہ امی گھر میں ٹیٹھی پریشان ہو رہی ہوگی لیکن اسے معلوم ہی نہ تھا کہ وہ جلیس کے ساتھ سا شربت کی بوتل اٹھاتے جا رہی تھی۔ خاتون نے پھر غصت کو گلیے سے لگایا اور اسے شربت پلایا نیشنل گاڑ کے

رخصتا کرنے اسے کندھوں سے تختہ انریک حرف رلیا۔ ویک۔ انان جی اے میرے ساتھ رہیں۔

خاتون پیچھے ہٹ آئی اور دور سے ظاہر کو دیکھنے لگی۔

ظاہر نے جلیس میں تامل کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ آگے سے جلیس رکھا ہوا تھا اور پیچھے کا یہ حال جیسے سیلاب آگے مضبوط دیوار آگے جا رہا تھا۔ لہذا اسے لہس ہوا تھا کہ سیلاب کو دیوار ٹوٹنے پر مجبور کر رہی ہوں۔ پولیس دسلے لائٹنی اور فوجی رائفیں تان کر سامنے کھڑے تھے۔ مجسٹریٹ پولیس انسپکٹروں کو ہدایات دے رہا تھا۔ فوجی دستے کا

ایک انگریز لیفٹیننٹ تھا جسے مجسٹریٹ نے محض لیفٹیننٹ یا پتا ماتحت سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہاں مجسٹریٹ کی فکر تھی اور یہ انگریز اس کے حکم کا پابند تھا جلیس کے نفروں اور ہماروں کا دل چیرنے والی لٹاکا سے کالوں پڑی اور آواز سنا

دیتی تھی۔ مجسٹریٹ اور انگریز لیفٹیننٹ میں کچھ ترش کلامی شروع ہو گئی۔ دس منٹ کبھی کے کر چکے تھے۔ دونوں افسر

میں نہایت اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔

مجسٹریٹ نے کسی قدر غصے میں آکر اوڈ سپیکر والی موٹر جلیس کے قریب کر لی۔ ابھی وہ اعلان کرنے ہی والا

انگریز لیفٹیننٹ نے اسے غصے میں کہا۔ ”میں اعلان کرتا ہوں۔ آپ ذرا خاموش رہیں۔“ پیشتر اس کے کڑے اسے روکنا اور کہنا کہ ”ہاں میرا حکم چلے گا۔ تم میرے ماتحت ہو۔“ لیفٹیننٹ، ایکروفون ہاتھ میں لے کر ایک

کی چھت پر کھڑا ہو گیا اور فوجی اڈوں میں بولا۔ ”ہم تم لوگ کو کوئی مارو گے۔ ہم تم لوگ کا یہ لڑائی اٹھا لے جاتے گا۔ کو...“ لیفٹیننٹ راجس! مجسٹریٹ چلاتا ہوا جوش میں سے نکل آیا اور موٹر کے پائیدار پر کھڑا ہو کر انگریزی میں کہنے کے لیے ایسے الفاظ نکلا۔

”دو زمرہ لوگ تیار ہوئی ہوئی کر دیں گے۔“

مجسٹریٹ یہ کہہ رہا تھا کہ لیفٹیننٹ کی چھاتی پر کوئی چیز آکر ٹکرائی۔ اسی قسم کی ایک اور چیز منبر پر گئی۔ اس نے

سہل کر نیچے دیکھا۔ موٹر کی چھت پر دو زنا نہ جوتیاں پڑی تھیں۔ ایک، الٹی، ایک سیدھی۔ زنا نہ دستانے میں کئی اور لڑکیاں

جوتی سینڈل اتار رہی تھیں کہ سالار نے انہیں روک دیا۔

”میں ان لوگوں سے پنشنا جانتا ہوں۔“ انگریز نے کہا۔

”تم غلطی کر رہے ہو۔“ مجسٹریٹ نے اسے تنکھانہ لہجے میں کہا۔ ”یہ مسلمان ہیں یہ عورت کی بے عزتی کر رہا



انارے سے اپنے قریب بلایا۔

بغیر دریسی آئی تھی کہ سپاہی جلوس کے ساتھ تھے۔ ان میں سے ایک نے موقع دیکھ کر نشین گارڈز ایک رضاکار کے کان میں کچھ کہا۔ رضاکار نے بھاگ کر سالار کو کچھ کہا۔ سالار کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ کانوں کان ایک سینا کار کے آخر تک پہنچ گیا۔ جلوس کے راہنما سوار اور لوگوں کا دستہ کھلے میدان سے بین بکس گزرنے کے فاصلہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس مقام سے تھانے تک ایک راستہ میدان میں سے جاتا تھا اور دوسرا بائیں طرف کی کھلی گلی سے۔ اُدھر لیٹنے فوجی دستے اور پولیس کو ہدایات دینے میں مصروف تھا۔ ادھر جلوس بائیں طرف گھوم کر گلی میں داخل ہو گیا۔ ان کی آنکھیں جلوس میں سے باہر پائیوٹروں نے اُن کے بڑھ کر لوگوں کو رولڈ میچوں کا کرنا۔ اب جلوس چل نہیں رہا تھا۔ بھاگ رہا تھا۔ لوگوں کو بھی ان ساتھ دوڑنا پڑا لیٹینٹ نے جب دیکھا کہ جلوس اس کی توقع کے مطابق میدان میں نہیں آ رہا تو وہ بولھا گیا۔ اس نے جلد سے اپنے دستے کو گلی کے دوسرے سرے پر استرا دکنے کے لیے بھیج دیا۔ چونکہ ہدایات پوری نہیں دی گئی تھیں، اگر لیے پولیس بھی جیڑوں کی طرف ان کے پیچھے بھاگ اٹھی۔ فوجی اس کے کئی فوجی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچنے جلوس گلی میں نکل کر تھانے سے دوسرے کھلے میدان تک پہنچ چکا تھا۔

وہ دیکھتا: ادھر سے بھی لوگ آ رہے ہیں۔ ایک کچھ پولیس انسپکٹر نے بڑا کر کہا۔

لیٹینٹ نے دیکھا کہ ادھا جلوس میدان کی طرف سے آ رہا تھا۔ نشین گارڈ کی سکیم کے جلوس کو دو حصوں میں تقسیم کر تھا۔ مجسٹریٹ ایک طرف کچھ فوجی حکومت پر مشتمل آ رہا تھا۔ وہ کوشش کرتا تو شاید اس صورت حال پر قابو پالیں لیکن وہ ان لیٹینٹ کو سن سکا جاتا تھا۔ لیٹینٹ پاگوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ پولیس الٹک منتشر ہو گئی۔ فوجی دستہ ایک طرف بڑا تھا۔ ادھر گلی میں سے جلوس نکل کر کھلے علاقے میں بچھ گیا۔ اُدھر میدان کے رستے آنے والے مسلمانوں نے ایسی صورت اختیار کر لی جیسے ٹمک رستے سے آتا ہو۔ سیلاب کھلے علاقے میں پھیل جاتا ہے اور جگہ جگہ جزیرے بن جاتے ہیں۔ پولیس فوج کی مرکزیت ختم ہو گئی۔

لیٹینٹ فوج کو چھوڑ کر پولیس کے دو ایجنٹوں کی طرف آ رہا تھا کہ وہ جلوس میں بچھ گیا۔ تقریباً تین سو گز کے علاقے میں انسان ہی انسان تھے اور ان پر چھینڈوں یا بے انگریز لیٹینٹ چھینڈوں کے ساتھ مل ہی گئیں کچھ ہو گیا۔ جلال آباد کا تھانہ ایک قلعہ نما پرانی عمارت تھی، چھت پر باقاعدہ مورچے بنے ہوئے تھے۔ دیواریں پتھروں کی اور دروازہ لوہے کا تھا۔ اس کے باقاعدہ پچاس ساتھ گز کے فاصلے پر کچھ کی عمارت تھی۔ دونوں کے درمیان میدان اور میدان میں سے کئی سڑک گزرتی تھی۔ دونوں عمارتوں کے اوپر انگریز کا جھنڈا لہا رہا تھا۔ تھانے کے سامنے بڑا صوبہ دار درخت اور درخت کے سامنے میں عرضی فوسوں اور بکلیوں کے نشیوں کی نیزیں اور سخت پوش رکھے تھے۔ بیچ اور لڑا چھوٹی کھوسیاں بھی تھیں۔

جلوس اس میدان میں پہنچ گیا۔ جگہ جگہ ایک چھینڈے ہی چھینڈے نظر آ رہے تھے فوج اور پولیس کی جمعیت بکھر چکی تھی اور ان کا خود ساختہ کمانڈر لاپتہ تھا۔

اگر کچھ گز بڑی توجہ دے آپ ہوں گے۔ اس لیٹینٹ سے کوئی جواب طلبی نہیں کرے گا۔ ایک پولیس انپکٹر نے مجسٹریٹ کو خبردار کیا۔ مجسٹریٹ کسی حد تک خوش بھی ہوا کہ لیٹینٹ لاپتہ ہے اور سول حکومت بھال ہو گئی ہے۔ اس نے فوراً انپکٹر کو اور فوجی سرداروں کو حکم دیا کہ تھانے اور کچھری کو گھیر لو۔ دروازے اندر سے بند کر لو۔ فوجی بندو قوں میں پانچ پانچ کا قوس بھر لیں۔ پولیس لائٹیں چارج کے لیے تیار ہو جائے۔

مجسٹریٹ لائٹنگ کی دلی موز میں بیٹھ کر کچھری اور تھانے کے درمیان گیا۔ پولیس اور فوج تھوڑی سی جدوجہد کے بعد تھانے اور کچھری کے سامنے پہنچ گئی۔ فوجیوں نے بندو قوں میں گولیاں بھریں۔ گولیاں پتھروں والی تھیں۔ میں ہوس کو خبردار کرتا ہوں کہ دہائی کا مظاہرہ کیا گیا تو لائٹیں چارج کیا جائے گا۔ پھر فوجی فزس ڈی جلا دی جائے گی۔ چاروں گھوڑ سواروں کی سنی کر کے تھانے کی طرف بڑھنے لگے۔ لوگوں کو پیچھے کر لیا گیا تھا۔ یہ شمارہ دہائی چروں کو چاروں میں لیٹے لائٹیں تانے لوگوں کے ارد گرد بکھرے تھے۔ ان کی آنکھوں سے بول نکلتا جیسے لوگوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے والے کو پچا جاتا ہیں گے۔ گھوڑ سواروں کے پیچھے ہزاروں چہرے غش غش اور خمرشی سے چلے ہی آ رہے تھے۔

”میں آخری بار اعلان کرتا ہوں کہ جلوس دومنت کے اندر نہ لگا تو لائٹیں چارج ہو گا۔“

جلوس موڑ سے دس قدم دور رہ گیا۔

”ایک۔“

سپاہیوں نے لائٹیں سنبھال لیں۔ جلوس موڑ کو گھوڑا رہا۔

”دو۔“

سپاہی آگے بڑھے۔

”تین.... لائٹیں چارج۔“

جلوس تھانے کی طرف ٹوٹ پڑا اور لائٹیں چارج شروع ہو گیا۔ چاروں گھوڑ سوار پہنچ پہنچ کر جلوس کو ہدایت دے رہے تھے۔ جن دہائیوں کے پاس لائٹیں تھیں وہ آگے بڑھنے لگے لیکن سامنے کے خالی ہاتھ لوگ پولیس کی لائٹوں کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹنا شروع ہو گئے تھے۔ یہ پستی پائی ایسی افواہ تھی سے ہر ہی جگہ کہ آگے بڑھنے والوں کے لیے لگاؤت بن گئی اور پندرہ منٹ بعد مسلمان تھانے سے دو تین سو گز دور بہت آتے تیس چالیس آدمی زمین پر پڑے کرناہ رہے تھے۔ جرم دور دراز تک پھیل گیا۔ مجسٹریٹ اور پولیس انپکٹر تیزی سے سر طرف بھاگ دوڑ رہے تھے۔

نشین گارڈ کا سالار گھوڑے پر سوار لپا ہوا تھے جرم کو جوش دلا دلا کر دکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جرم ایک ہلچل کے بڑھا۔ مجسٹریٹ نے فوج کو حکم دیا کہ رافٹیں لے کر سامنے آجائیں جب کچھ فوجیوں کا دستہ رافٹیں سیدھی کر کے سامنے آیا تو جرم کھ گیا۔

آفتیش لا دانا بنائے جوڑنے تھا اس کی پیش کشاں کے اندر پہلے سے موجود تھی چند ایک سناں اہل کار جو مجلس میں شریک نہ ہو سکے تھے، اندر سے سرکار کا کام کر رہے تھے وہ دواں بیٹھے بیٹھے قوم کی ہی خدمت کر سکتے تھے کہ اندر سے دروازہ کھول دیں۔

ملوں دیں۔  
چند منٹ بعد لوہے کے دروازے کی اندرونی زنجیر نکال دی گئیں۔ دوسرے ہی لمحے مسلمانوں کا جُرم تھا  
کے صحن میں تھا۔ اتنے میں جلوس کے ایک حصے سے کچہری کی عمارت پر انگریزی جھنڈا بھاگر پاکستان کا جھنڈا اُڑھا دیا اور  
کچہری کی کچہریاں اور دروازے ٹوٹنے شروع ہو گئے جس کچہری کے کافدات سے ولی پچی تھی انہوں نے کافدوں  
سے پورا لبرال انصاف کیا اور جانے لگتے ہی مقتول کا فیصلہ دیا سلاتی نہ کر دیا۔

تختہ میں داخل ہو کر پھر پھوٹی کو کھینچے پھاڑے گئے۔ پھر انگریزوں نے چندے کے پڑے جو ایسے اڑ رہے تھے اور اس کی جگہ طاہرہ سبز چنداڑ چھا رہی تھی۔ اس کے بعد ٹاک خانے کی پیشانی کو بھی سبز پھیر سے سجایا گیا۔ پھر پنجاب میل جابجائشیں پر کر دی گئیں۔ جرم نے جاگڑ رک لی اور دو گھنٹے ڈوٹ لکھی۔ انہی کے ساتھ پر پاکستان کا چنداڑ نصب کر کے دوڑا تاں مسلمان گاڑی میں بیٹھ گئے جنہوں نے امرتسرگ گاڑی کو جگہ جگہ پر پھیر کھینچ کر دو کا دو گاڑی نے سبکیں میل کا فاصلہ چار گھنٹوں میں طے کیا۔

سارے ہندوستان میں یہی کچھ ہو رہا تھا۔

انگریزی مشینری رکے گی تھی۔ شاہی مملکت میں بھی زلزلوں کے جھٹکے محسوس ہونے لگے تھے۔ انگریز کے پاؤں ٹھکانے لگے تھے۔ انگریز نے ہندو کا سہارا لیا جا تھا کیا حکم بات نہ ہو سکی۔ ہندو اور انگریز جو سودا بازی کر رہے تھے اسے مسلمانوں نے طے نہ ہوئے دیا۔ ایک لمبے ترنگے، دیلے پستے انسان نے کھڑوں مسلمانوں کے نیم مردہ جسموں میں وہ روح چھونک دی تھی کہ انگریز کا قانون ہندوستان کی گلی گلی میں مسلمانوں نے کچل ڈالا تھا۔ سرحدی چٹانوں نے ہندوؤں سے مظاہرہ کیا تو بنگالی مسلمانوں نے ہاشی کی لٹھیروں سے کام لے لیا۔ سندھیوں اور بلوچیوں نے خالی ہاتھ سرکار کے نظام کو لادیا تو چادریوں نے لٹھیریں اور پستوں سے مسلح جلوس نکالے۔ جلوس میں جگہ تھی نہ راشن۔ اب وہ وقت بھی آگیا کہ پولیس نے کھڑکیوں سے مرنے موڑ لیا اور انگریز اور چچے تہجداروں کا ترنگا۔

جلال آباد میں ایک انٹری لینٹینٹ گنم ہو گیا یہ لینٹینٹ راجرس تھا، سبھی دستے کا کمانڈر۔

اسی رات جب خالون اور عفت کی مال طہارہ اور عفت کے جسم سملا رہی تھیں اور زرہ رو کر جا رہی تھیں کہ بلا تیس لے رہی تھیں، شہر کے باہر قشتان کے کونے میں مسرت منگوں کے چٹوٹ خانے میں وہ جاہل رہا تھا۔ بندہ کمرے کی اندرونی فضا چرس کے دھوئیں سے بھر رہی تھی۔ لاپتہ انگریز ٹیفنڈنس اس دھوئیں کے بادلوں میں، دونوں ہاتھ رسی سے بندھے جوئے حار باقی رہ چکا تھا منگوں کو کوس رہا تھا جادوں ملک اس کی طرف ذرہ بھر توجہ نہیں دے رہے تھے۔

[illegible]

”خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا مجاہدو!...“ طاہرہ حسم کی تمام ترقوت کے زور سے

چچی کو تو لپٹا ہوا ہے جو ہم بھاگ گئے ہو۔ کافروں کی دس لاکھوں کے سامنے میں ہزار مسلمان بھاگ گئے ہیں۔ دھوکہ دینا، نشانہ دہی، خون کی گھٹیا ناک پرہیزوں کے قدموں میں پی پی جے میرے بھائی کو اور زور دے گا۔ ظاہر ہے کہ ہمارا دوطرفہ سرے اندر کربا میں لہرا رہا ہے۔ پہلے سے زیادہ جوش سے کہا: او ادا پی پی کی کو گولی بھارت دیکھو کہ میں میرے نئے سر کی قسم ہے۔

”مگر فدا کرو۔۔۔ مجسٹریٹ کا لاؤ پیس کیس گرجا۔

دوسرا بھی گھوڑے کی طرف بھاگے۔ سالار نے جھنڈا اگے کر لیا۔ اس جھنڈے میں نیزہ چھپا ہوا تھا۔ چھپے۔ ایک گھوڑا سوار نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا دونوں سپاہیوں کی طرف سرسپ بھاگا۔ پیٹر اس کے کعبہ سرسپ یا دونوں سپاہی سمجھ سکتے کہ یہ کیا ہوتا ہے اور کیا ہونے والا ہے، ایک سپاہی جھنڈے میں چھپے ہوئے نیزے کے کعبہ سے اور دوسرا گھوڑے کی زونیں اکرا کر اٹھا رہا تھا۔ گھوڑا سوار اسی رفتار سے باقی فوجیوں میں سے گزرتا تھا۔ ان کی ادھت میں چلا گیا۔ سالار کا گھوڑا میں ٹکارا اور ظاہر ہوا کہ پیچھے پیچھے گئی۔ دوسرا سپاہی اور آگے بڑھے۔ دوسرے ایک اور گھوڑا سوار نے گھوڑا کو ایڑ لگائی۔ یہ گھوڑا دونوں سپاہیوں کو گڈی رہا تھا کہ ایک گولی ملی۔ جہیز نے دیکھا کہ گھوڑا سرسپ بھاگا جا رہا تھا لیکن سوار گھوڑا کی پیٹ پر پڑا اور سے منہ بول گیا تھا۔ جھنڈا زمین پر گر پڑا تھا۔ جہیز ٹوٹ پڑا۔

”فائز“ — لاؤ و سپیکر حلیما۔

سالار نے گھوڑے کو ایڑ لنگائی اور رانفلوں کی زو میں سے نکل آیا۔

گولیوں کی پہلی بوچھاڑ سے نعرے کچے دیر کے لیے خاموش ہو گئے لیکن سمندر اٹھایا تھا۔ ایک راولپنڈی اور فائرنگ جرم سے پہلے ہی بتول فائرنگ اور دیہاتیوں نے لٹھیلیوں سے جوابی حملہ شروع کر دیا۔ رافٹوں کے مقابلے میں لٹھیلیاں جیل رہی تھیں اور اڈاکا کو بتول فائرنگ ہو رہا تھا۔ زخمی مسلمانوں کا ڈھیر لگتا ہوا تھا اور مسلمان، فوجی دے اور پولیس کو ہاتھ چلے کر رہے تھے پانچ پانچ راکٹ فائر ہو چکے تھے لیکن مسلمانوں نے فوجیوں کو اس سرور اٹھیں بھر نے کی خدمت نردی۔ پیچھے تھانے کی دیوار تھوڑے سا منے سے میسب لہروں کی طرح مسلمان بڑھے چلے کر رہے تھے۔ سپاہی پس کھڑے ہو گئے۔ اگر دس مسلمان کھڑے تو دوسرے لٹھیلیاں اور ایک آدھ رافٹل ضرور جھین لگتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تھانے کے آہنی دروازے کو توڑنا ایک مسئلہ تھا۔ لاکھٹیوں سے تو لوہا ٹوٹنے سے رہا لیکن جو عذیبہ باہر کے ہجوم کو

داخل ہو رہا تھا۔

”ہسٹونٹینٹ راجس آپ انکسٹر نے اندر اکھڑا دیا نہ کر سکتے ہوئے کہا۔ ایک چوڑا کچر جس کا دھواں اچھا توڑ لگا ہوا۔ مجھے اخوس سے ہمارے لیے اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں تھی۔“

لیفٹیننٹ زور سے گرجا۔ ”میں یہاں سے نکل کر نہیں توکری سے برخواست کروا دوں گا۔“

”وصاحب! کاش نکلاؤ۔“ ایک خٹ نے جھوم کر تھک لیفٹیننٹ کے سامنے کہا تو لیفٹیننٹ نے لات مار کر تھک کر دیا۔ ملک نے اُٹھنے ہاتھ سے اس کے منہ پر لایا گھونہ جیسا کہ اس کا سر تھچے دیوار کے ہاتھ لگا۔

آج پندرہ سالن شدید ہوئے تھے۔ آپ انکسٹر نے لیفٹیننٹ سے کہا۔ ”دوسو کے قریب رہی ہوئے ہیں لیکن انگریز کے خیراتی ہسپتال میں ایک بھی نہیں گیا۔ قاتل گارڈ کے رضا کار، مردادہ عورتیں، ان کی سرپرستی اور تیمارداری اپنے بنائے ہوئے ہسپتال میں کر رہے ہیں اور مٹا راج نقصان جہاں ہے وہاں تہمت مجھے شرم کوں ہو رہی ہے۔“

”منو، ایک کڑا میں نہیں کچھ دیتا ہوں کہ میرے ہاتھ کھول دو۔“

”ہاتھ کھول دو۔“ انکسٹر نے نرم سے۔ ”جیسے میں کہتا ہوں کھولیں گے اور پھر ان کی زبان میں کہا۔“

”ہاں... میں کہیں کچھ کھاد کروں۔“

”ہاتھوں نے ماتھوں پر ہاتھ رکھ کر دیا۔“ سلام کیا اور کہا۔ ”جو کچھ سرکار کو تو آج...“

”جیسے مناسب سمجھو۔“ یہ ہمارے حوالے سے اور اگر اسے چھوڑ دیا۔“ انکسٹر نے تعانلاری رعب سے کہا۔

”تو تم چاروں ایک ہی گڑھے میں دبا دیے جاؤ گے۔“

انکسٹر نے جب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ روپے کا نوٹ ملکوں کے سامنے پھینک کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ذرا سا رگ اور گوم کر لیفٹیننٹ کو کچھ سماعت رکھنا لیفٹیننٹ راجس اس میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں اور وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد رات کے اندھیرے میں چاروں ملک ایک گڑھے میں مٹی ڈال کر زمین کے ساتھ بھرا کر رہے تھے۔ پاس ہی گیدڑوں نے ایک بار چیخ و پکار اور آواز داری کی اور رات بھر خاموش ہو گئی۔

جب یہ اطلاع میں گزر پنجاب کے پاس پہنچیں تو وہ تھکے پھر حیران نہ ہوا۔ جلال آباد میں کوئی نرالی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ گورنر کے سامنے سارے پنجاب کی کوشش ڈھیر کی صورت میں بیٹھی تھیں جن میں اب اس نے پڑھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ نہ ہی اس میں اب یہ رویہ پڑھنے کی ہمت تھی لیکن اس نے انگریزی حکومت کا منہ رکھنے اور مرضی خفیت مٹانے کی خاطر جلال آباد والوں کو اپنی ٹیم دے دی کہ اگر ایک ہفتے کے اندر اندر مال لیفٹیننٹ زورہ واپس نہ ملے تو...۔

لیکن اس افی ٹیم میں جان نہیں تھی۔ یہ انگریز کی حکومت کے نزع کا وقت تھا جلال آباد میں اس افی ٹیم نے ہلاک سا ارتعاش بھی پیدا کیا۔

دوسری شمع ظاہر اور صفت حسب معمول سکول گئیں۔ سکول کی لڑکیوں نے اسے گھیر لیا کوئی اسے مبارک دے

رہی تھی، کوئی لڑکی کی تعصبات تو پھر بھی رہی تھی اور باقی اسے رشک و حیرت سے دیکھ رہی تھیں سب کے دل میں ایک ہی خاموشی تھی۔ کاش! ظاہر کی جاگ میں ہوتی۔ یہ خواہش ایک ارادے کی صورت میں لڑکیوں کے دلوں میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ چند ایک استانیوں نے بھی اسے مبارک بادی لیکن ٹھنڈی سی بیڈ میٹریس نے اسے دفتر میں بلا کر سخت تہدید کی اور کہا۔ ”اگر اب مجھے رپورٹ کی تم نے کسی جلسے یا جلوس میں حصہ لیا ہے تو سکول سے نکال دوں گی نہیں معلوم نہیں کہ حکومت اس سکول کو دس ہزار روپیہ سالانہ گرانٹ دے رہی ہے۔ اگر لڑکا لکھا کوئی انگریزوں کے خلاف زبان کھولتی ہوگا۔ ظاہر و خاموشی رہی خاموشی سے بہتر اور کوئی جواب نہ تھا۔ بیڈ میٹریس نے اس خاموشی کو ترمیم رضایا ظاہر کی شکست سمجھا لیکن دو تھکے ہوئے کسی کا ظاہر ہونے اس خاموشی میں کتنے طوفان چھپا لیے ہیں۔

چشمی کے بعد ایک جواں سال استانی، سنجہ، ظاہر دو کاپٹے گھر لگتی۔ ظاہر نے سنجہ سے بیڈ میٹریس کی چمکی کا ذکر کیا تو سنجہ نے عینی سے کمرے میں شٹلے لگی۔ ظاہر توں گھٹتے بعد سنجہ کے گھر سے نکلی۔ دوسرے دن سنجہ گزرا توئی سکول میں زمین فوگر گزرا۔ سٹوڈنٹ فڈریشن قائم ہو گئی اور سکول میں ایک خاموش تحریک کا آغاز ہو گیا۔

فیصل گارڈ نے اب سنجہ کو جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا اور یہ بھی کہ ہر جلوس کی قیادت عورتیں کیا کریں گی۔ ادھر سکول میں تھانے والوں کی چٹھنی آئی کہ آئندہ جو جلوس کو نوٹیفکٹ پارٹی کا ایک ڈیرہ اور لاہور کا کھنڈر دے پر آ رہے ہیں اور سکول کی تمام لڑکیاں استقبال کے لیے دن کے دو بجے ریوے نشین پر پہنچ جائیں۔ یہ اطلاع ان تمام سکولوں کو اور دونوں کالوں کو بھی گئی۔ جنہیں حکومت باقاعدہ گرانٹ دیتی تھی۔ بیڈ میٹریس نے تمام لڑکیوں کو یہ ہدایت دے دی جسے تمام نے خاموشی سے سن لیا۔

بیڈ میٹریس اس دسویں بہت خوش تھی۔

جمہور کا دل آیا حسب معمول گھنٹی بجتی رہی لیکن سکول کے اندر اب ہر سکوت سا طاری رہا۔ دینیچوں کا شور و ہنگام صرف بیڈ میٹریس، تین استانیوں اور جمہوری اتحاد میں کیڑا چلا رہی تھیں۔ داخل ہوئیں پانچویں جماعت سے دسویں جماعت تک کی صرف چھ لڑکیاں سا تھیں۔ بیڈ میٹریس کی گھبراہٹ اور بھگتا ہوا لڑکھارے عالم کو لاہور استانیوں سے دست گریاں ہو رہی تھیں۔ اسی میں اس نے دوات انڈل کر میز کا ستاسی کر لیا۔ چڑھی کو بلایا اور سکول گئی کہ کریوں بلایا تھا۔ دو دنوں کے سامنے کھڑا اور بیڈ میٹریس نے اسے ٹانہ دیا کہ کریوں کھڑے ہو اس کے جانے کے بعد اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تمام کر گھنٹاں میز پر رکھی ہوئی سیاسی پرکھ دی جب سیاسی کمی ہارنے کے لیے سے ہو کر انہیں کوٹھیں ہوئی تو اس نے چڑھی کو لا کر کھڑا کرنا۔ کھجنت تھجھ میر صحت کر کے کو بلایا تھا اور تم بھاگ گئے؟ دن کے بارہ بجے تک سنی سی بیڈ میٹریس نے سکول میں اور دم چلتے رہا اور سکول بند ہونے کی گھنٹی بج گئی۔

دوپہر کے دو بج کر پچیس منٹ پر لاہور کی طرف سے آنے والی ایک پریس جلال آباد سے ایک مسل و تھی کہ مسلمانوں کا جلوس شیشن سے ایک فرار لگتے تک پہنچ گیا جلوس کے آگے آگے سینکڑوں چھوٹی چھوٹی بچیاں اور نوجوان لڑکیاں تھیں جن کے ہاتھوں میں سیاہ جھنڈیاں تھیں۔ سامنے ظاہر اور صفت نے ایک جھنڈا اس کے دونوں طرف ہالٹ لگے ہوئے تھے اٹھار کھانچا تھا۔ نگران کے ساتھ ساتھ تھی جھنڈے پر لکھا تھا۔ ”مسل گزرا توئی سکول جلال آباد نوٹیفکٹ پارٹی مرڈہ۔“

پاکستان زفرہ باد

لوکیوں کے اس مجلس کے دایں بائیں اور پیچھے سینکڑوں بارودی رضا کار تھے۔ نچھے سے اس مجلس کے بیچ مزار مردوں کا جلوس تھا۔ وہی گونج دلا نعرے اور وہی جوش و خروش جیسٹیشن کے نقص امن کی صورت میں لاٹھی چارج کا اعلان کیا تو سارے آگے جا کر جیسٹیشن کو گولا۔ یہ مجلس پر امن مظاہرہ کرنے گئیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کوئی بد امنی نہیں گی۔ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر کوئی مرد نہیں جائے گا۔ صرف پچاسی جاہلیں گی۔ اگر پولیس نے دعوت دی تو شاید تھانے اور پکڑی والا منتظر بن جائے اور گاڑی کی بے گناہ سواریاں مصیبت میں پڑ جائیں۔

جیسٹیشن کے خبریاتی عصب تو کھانکین و جوتی پر تیل ڈالنے کا بھی خیال نہ تھا۔ سارا کے ساتھ اس نے زبانی سجاد علی طے کر لیا کہ کوئی مرد پلیٹ فارم تک نہ جائے۔ جیسٹیشن بھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ جلوس ریلوے سٹیشن کے ارد گرد پھیل گیا گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی ایک وزیر اور لاہور کا مشنر جلال آباد کے دو بے پرآ کر بے تھے۔

گاڑی کی تو پولیس نے ان کے کچا پلٹ گھیر لیا اور انہیں باہر آنے سے روک دیا۔ پلیٹ فارم پر ہر طرف سیار جھنڈیاں لہری تھیں۔ انگریز مشنر نے نذر کپاٹھٹ کی کڑکی سے جیسٹیشن اور پولیس افسروں کو خوب ڈانٹا سبھی تھڑکے تھوڑے سبھے مشنر نے آٹھ گڑاڑی کا دروازہ کھولے ہوئے کہا۔ آؤ میں تمہیں بتانا ہوں کہ مجمع کی طرح پراسن رکھا جاتا ہے۔ تم پر پالیسی اختیار کر کے تو گزشتہ بیٹھے جلال آباد میں اتنا نقصان نہ ہوتا۔

مشنر نے کچا پلٹ کے کھلے دروازے میں سے باہر کا منظر دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ بدلتے لگا۔ پلیٹ فارم پر چھوٹی چھوٹی پچاسی اور لڑکیاں سیاہ جھنڈیاں اوڑا پٹھاتے۔ انگریز راج مردہ باد، ٹوٹی دیر مردہ باد، قائد اعظم زندہ باد کے نعرے لگاتے تھیں۔ نیشنل گارڈ اور لوگوں کا ہجوم پلیٹ فارم کی حدود سے باہر نہایت خاموشی سے کھڑا تھا۔

مشنر کی جانفیدہ اور بھرپور کاز کا جلوس جب سینکڑوں بچوں کو دیکھا تو چند لمحے دیکھا ہی رہا۔ اس کی سبزی لکڑی انھیں فراہم ہندوئیں اور اس کے چہرے پر ایک اور رنگ آگیا۔ وہ دروازہ بند کیے بغیر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور سر جھکا لیا جیسے ہزاروں مسلمانوں کے جلوس کی پراسن خاموشی اور بچوں کا تنہا سا جنگلہ ایک بوجھن کو اس کی گردن پر اڑا چلا۔ اس نے گردن ذرا سی گھما کر جیسٹیشن کی طرف دیکھا جو مدیعتاب کے لیے تیار کھڑا تھا۔

وہ آپ نے اچھا کیا جو اس جلوس پر تشدد نہیں کیا۔ مشنر نے ہامنی ہاسٹنگی سے کہا۔

لوکیوں اچھا کیا ہے؟۔ یونینسٹ وزیر نے اپنی مہر جگہ کا احساس دلانے کی خاطر اچھل کر کہا۔

نہیں چلائی؟

وہ پچاسی میں۔ مشنر نے وزیر کو کہا۔ تمہاری پچاسی جو ہمیں پسند نہیں کرتی۔ وہ تمہارا استقبال سیاہ جھنڈیوں سے کر رہی ہیں۔

باہر کا ماحول نچھے نچھے اور نسواری نعروں سے لرز رہا تھا۔

مشنر اٹھا اور گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ وہ ظاہرہ اور عفت کے قریب گیا۔ ذرا سا مسکرایا اور انگریزی میں پوچھا کہ اس

جھنڈے پر کیا لکھا جاتا ہے۔ سچے ترجمان کے اسے بتایا تو مشنر نے پہلے ظاہرہ اور عفت کے گال تھپکاتے اور سکرا کر آگے چل پڑا۔ پیچھے سے ایک پولیس افسر نے اسے چیخ کر کہا۔ حضور! آگے نہ جلیے گا۔ مشنر نے گھوم کر دیکھا اور خاموشی سے آگے چل پڑا۔

لڑکیاں جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ لڑکیاں جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ لڑکیوں میں جھوم بھڑ بھٹا کسی کے سر پر ہاتھ رکھتا کسی کے گال پر ملتی سی تھیک سی دتا کہیں ذرا سا لگا اور تھوڑی دیر جا کر واپس آگیا۔ پلیٹ فارم سے باہر کا ہجوم ایک انگریز کی ان حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ مشنر نے ہجوم کی طرف دیکھا اور بازو اوپر کر کے الدعا ایماز سے لہرایا۔ اس کے جواب میں ہجوم نے پاکستان زندہ باد کا وہ نعرہ لگایا کہ ماحول لرز اٹھا۔ مشنر خاموشی سے اپنے ڈبے میں آگیا۔ گاڑی کا گارڈ اور ابن کا ڈرائیور باہر آئے حکم کے منظر تھے۔ گاڑی کو صرف تین منٹ لگا تھا اور مشنر اور وزیر کو یہیں اتارنا تھا مگر نصف گھنٹہ گزر چکا تھا۔

وگاڑی چلاؤ۔ مشنر نے گاڑی سے کہا۔ ہم یہاں نہیں اتریں گے۔

جب انہیں سینیٹی بجائی تو دو دروازیاں ہاتھوں میں سیاہ جھنڈا اٹھائے آگے بڑھیں اور اسے ڈبے کے ساتھ کہیں لگانے لگیں۔ پولیس افسر جھنڈا پھینکنے کے لیے پکارا۔ مشنر نے روک دیا اور جھنڈا لڑکیوں کے ہاتھ سے لے کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ جب گاڑی پلیٹ فارم سے نکلی تو مشنر نے جھنڈا زمین پر پھینک دیا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے اس نے یونینسٹ وزیر سے کہا۔ جب کوئی تحریک پچوں تک پہنچ جاتی ہے تو اسے چھلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ انگریزوں کی غلطی ہے کہ وہ ابھی تک ہندوستان میں باؤل لہارے ہوئے ہیں۔

وہ آپ انگریز ہیں؟۔ وزیر نے غصے سے کہا۔ میں ہندو کوئی چلا دیتا؟

مشنر نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں انگریز ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں گولی سے بستر علاج سوچ سکتا ہوں۔ مسلمانوں کا سطل لہاب گولی سے دب نہ سکے گا۔

گاڑی کی ٹھکڑی ٹھک زیادہ تیز اور بلند تر ہو گئی۔

جلوس کی یہ عظیم ترین فتح تھی جلوس پراسن طریقے سے منتشر ہو گیا۔

”اللہ ذکر ہے“ عفت نے کہا اور کتاب بند کر دی۔ پھر دل ہی دل میں اُس نے ارشد کی سلامتی کے لیے جانے کتنی دعائیں کیں۔

”دوسری صبح جب سکول کھلا اور کلاس میں شروع ہوئی تو ہیڈ ماسٹر نے اسٹانی نجمہ طاہرہ و عفت اور نویں جماعت کی دس بارہ لڑکیوں کو دفتر میں بلا کر نوٹس دیا۔ ”ہج سے تم سب کے ہم سکول سے غارت کر دیتے گئے ہیں اور نجمہ! تم آج ملک کی تنخواہ وصول کر لو۔ تمہاری ملازمت آج سے ختم ہے۔“

نام لڑکیاں بے ساختہ ہنس پڑیں اور ہیڈ ماسٹر کی کرسی پر اچھلنے لگی۔ نجمہ اور لڑکیاں ہلنتی ہوئی دفتر سے نکلیں۔ نجمہ نے کہ کر کہا۔ ”ہیڈ ماسٹر! صاحبہ امیری تنخواہ آپ ہی لیے لیں۔ ہو سکتا ہے حکومت سکول کی گرانٹ بند کر دے اور وہ لڑکیوں کے پیچھے پیچھے سکول سے نکل گئی۔

اگلی صبح سکول کھلا تو ہیڈ ماسٹر سس صاحبہ نے چال سے اُس کی اصل چال سے زیادہ بھڑی تھی دفتر میں آئی تو دیکھتے ہی دیکھتے سکول کی بے شمار لڑکیاں اُس کے دفتر کے سامنے جمع ہو گئیں سکول کے دروازے پر منظر کشی کر رہے ہوا دیکھ کر انہوں نے رز نہ لگے۔ ہیڈ ماسٹر نے پورے حاکمانہ طحال سے باہر نکلی لیکن لڑکیوں کے بے شکم نعروں میں اس کا جلال دیتے کی بجائے گھبراہٹ ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے اُدھم کے بعد ہیڈ ماسٹر نے یہ حکم جاری کیا کہ کچھ لو کچھ لایا جاتا ہے اور دوسری لڑکیوں کو بھی لول کہنے کی اجازت ہے۔

”لیکن میں یہ بتا دینا چاہتی ہوں۔“ اُس نے چشمہ اتارتے ہوئے کہا۔ ”اگر حکومت کی طرف سے باز پرس دینی تو میں کسی کی ذمہ داری نہیں لوں گی۔“

”اور جہاں دوسرا مطالبہ یہ ہے۔ ایک لڑکی نے کہا۔“ آج سے سکول کی عمارت پر پاکستانی جھنڈا لہرائے گا اور ہم دھاکے بعد لڑکیاں جھنڈے کو سلامی دیا کریں گی۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ ہیڈ ماسٹر نے نرمی سے کہا۔ ”اس سکول کو گورنمنٹ گرانٹ دیتی ہے۔“

”یہ ہو سکتا ہے۔“ یہ ہو گا۔“ ایک شور ”یہ مسلم سکول ہے پاکستانی جھنڈا زندہ باد“ وہ شور کہ ہیڈ ماسٹر نے غشی کی حالت میں دیکھا۔

”میں اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتی۔“ ہیڈ ماسٹر نے افسوس سے کہا۔

”اس کی ذمہ داری ہم لے لیں گی۔“ ایک اور لڑکی نے کہا۔

شام کا اندھیرا لگا رہا تھا۔ طاہرہ چھٹی ماہی اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹی خیالوں کی بھول چھلیوں میں کھوئی ہوئی تھی عفت اس کی طرف پیچھے کیے کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ طاہرہ سوچ رہی تھی کہ جان اور عمر کو خطرے میں ڈال کر اسے بٹھنے کھینچنے کے دن کیوں بھول گئے ہیں؟ ہنرے لگا کر لڑکیوں اور رانفلوں کے سامنے اسے مسرت اور نوعانی کیت کیوں محسوس ہوتا ہے؟ وہ کون سی قوت ہے جو اسے ہزاروں مردوں کے سامنے بے دھڑک بولنے پانے دیتی ہے؟ یہ تبدیلی کیوں کر پیدا ہوئی؟ اس نے سوچا۔ کیا یہ میری روح کے ساتھ پیدا ہوا تھا؟ کیا مرا کچھن مر گیا؟

مر گیا ہے تو میں ملہن اور مسرور کیوں ہوں؟ غطوں سے مجھے کیوں اٹھن ہو چلا ہے؟ اسے معلوم نہ تھا کہ انی خاتون نے اسے جو ریاں دی ہیں ان میں خدایت بہت کم تھی۔ اسے جو کمانیاں ملی تھیں ان میں خاتون نے باسیت، مایوسی، شکست، غم و غم کی اور جذبات پرستی کو بھی آئے ہی زیادہ تھا خاتون نے اسے گڑبازوں سے کم کھینچنے دیا تھا اور اسے اس کے نام کی چھتیں پانچ لمبی کرج (فوجی توپ) زیادہ دکھائی تھی اور کرج سے وابستہ شجاعت سے بھر پور کئی داستانیں اسے سنائی تھیں۔ طاہرہ کی شخصیت انہی داستانوں کے سانچے میں ڈھل گئی تھی لیکن اسے ایسے بھی آتے تھے کہ اس نے وقت و زمانہ سے بھی آگے نکل جانا چاہا۔

”عفت!“ عفت بظاہر کتاب پڑھ رہی تھی لیکن کھوئی ہوئی وہ بھی خیالوں میں تھی۔ طاہرہ کی آواز سن کر وہ خواب بیدار ہو چکی تھی۔ ”کیوں طاہرہ؟“

طاہرہ چھینپ گئی۔ وہ عفت سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اتنے دنوں سے ارشد نہیں آیا۔ ذرا کی ذرا جلوس میں دیکھا تھا پھر ملا نہیں لیکن اس نے نہ پوچھا۔

”کیا بات ہے طاہرہ؟ عفت نے پوچھا۔“

”معلوم نہیں کیا بات تھی۔“ طاہرہ نے ہنس کر کہا۔ ”بھول گئی ہوں۔ یاد رکھو۔“

”طاہرہ! عفت نے پوچھا۔“ اتنے دنوں سے ارشد نظر نہیں آیا۔“

”نرمی ہو گیا ہوگا۔“ طاہرہ نے لول کہا جیسے اسے ارشد کے زخمی ہونے نہ ہونے سے کوئی واسطہ ہے۔





جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۶ء

ہندوستان میں جنگ پاکستان عروج پر پہنچ رہی تھی اور پنجاب میں اس کے شعلے بلند تر ہو رہے تھے۔ ہندوستان کی پروردہ جماعت نیشنلسٹ پارٹی کی وزارت تھی جس کا وزیر اعلیٰ حضرت حیات ٹوانہ تھا۔ مسلمان اس میں سے استغفار مانگ رہے تھے۔ بہروز مجلس نکلنے اور مظاہرے ہوتے تھے جن میں انگریز اور ہندو کی فوجیں اور بیداری کے خواب خشک کانٹوں کی طرح جل رہے تھے۔ جلوسوں پر پولیس کے حملے، لاشیں چارچ گولیاں، تختوں کی حوالوں میں مسلمان لیڈروں کو بند کر کے دھوکہ بکڑنا، درویشوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر پولیس کی لاریوں میں سرکے پاکستان کو چھیننے کے ظالمانہ طریقے روزمرہ کا معمول تھا، مگر انگریز کی مزاحمت اور ہٹ دھرمی دھیلی ہو گئی۔ ہندو فتح سی آہ لی اور انگریز کو قہر آؤنگا۔ ہندووں سے دیکھ کر چپ بگیا۔ ٹوانہ وزارت متعفی ہو گئی۔

ہندوؤں اور سکھوں نے شکست غورہ ہو کر ایک اور بھی حال کی تیار کیا۔ شروع شروع میں انہوں نے اپنے مکانوں میں قلعہ بند کیا۔ شروع شروع کریں گھر میں اسلحہ، برچھیاں اور گزیاں جمع کر لیں۔ یہ تو درویش پروردہ تھا اور بارہا لیڈروں نے مسلمانوں کی جا پوسی شروع کر دی، گاندھی کو ایک مدت بعد خیال آیا کہ شہر بہا میں ہزار مسلمانوں کو بند کر کے اس لیے قتل کیا تھا کہ وہ ہندو نہیں تھے، گاندھی کے آنسو نکل آئے اور مائیتا کی گلیوں میں جھانڈوئے گئے جہاں انہیں شبہ نہ ہوا تھا کہ ساتھ ساتھ ہزاروں ہندوؤں کے خون کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے لیکن مسلمان آنسوؤں سے واقف تھے۔

ظاہر تو اب سوتی بھی کو کھتی گزرتی ٹوٹ فیڈریشن اور انگریز ٹوٹ فیڈریشن کے درمیان رابطہ قائم کر کے اُسے دن رات بھاگ دوڑ کرنی پڑتی تھی۔ آئے دن اسے ایک تقریر تیار کرنی پڑتی تھی کوئی فیڈریشن کے اجلاس لیے اور کوئی جلوس کے لیے، پڑھانی تقریریں ختم ہو چکی تھیں، میڈیکل کے امتحانات ختم ہو چکے تھے نتیجے بھی نکل چکے لیکن ظاہر اور حقیقت امتحان میں شامل ہی نہ ہوئیں۔ انہیں اتنی فرصت ہی کمال تھی، سبھی دن رات ایسی چیزیں رتبہ تھیں۔

مسدود نے بھاگتے چور کی انگلی پٹی پٹی اور انگریز کو پنجاب کے دوڑنے کے کرنا پر آمادہ کر لیا۔

نئے چاند کا ایک کونڑا سیاہ بادل کے کنارے سے نکلتا دکھائی دیا۔

۲۶ جون ۱۹۴۶ء کے روز تقیم ہند کا اعلان ہو گیا۔

مشرقی پنجاب کے مختلف حصوں سے ہندو مسلم فساد کی خبریں آنے لگیں جو فزوقارانہ فسادیں تھیں بلکہ مسلمانوں کا ہندو اور سکھ اور اچھے ہتھیار لے کر حملے آئے اور مسلمانوں کے اکیلے دیکھے گاؤں میں کشت و خون شروع کر دیا۔ ضرورت حال کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ اس سے زیادہ اہم اور پاکیزہ مہم میں مصروف رہے تھے۔ وہ ہندو جو کل کو ہندوستانی بھائی کہتا تھا آج مسلمان کے ٹخن کا پیسا سا بولیا اور وہ مسلمان جو علیحدہ قومیت کے قابل نہیں ہوا

وہ بھی اس عملی دلیل سے قائل ہو کر پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔

ایک شخص ارشد ظاہر کو گھر آیا اور اسے بتا کر شام چار بجے نیشنلسٹ گارڈ کے دفتر میں ایک غیر معمولی اجلاس ہو گا۔ مردوں کا اجلاس ابھی شروع ہو رہا ہے اور وہ بہتر کتب ختم ہو جائے گا۔ ارشد گھبرا ہوا تھا اس نے کہا۔ اور شام چار بجے عورتیں جمع ہوں گی۔ چند نہایت ضروری باتیں ہیں۔ اب آپ کو ہندو کی شدید ضرورت پڑے گی۔ لانے اور نہ لانے کا وقت آ گیا ہے۔ آج کی سینگ کا موضوع یہی ہے۔۔۔ بہت جلدی میں ہیں، آپ کا انگریز کو بھی ساتھ تھیں آپ۔

شام چار بجے جب سبغہ ظاہر اور حقیقت نیشنلسٹ گارڈ کے دفتر والی ٹولی میں داخل ہوئیں تو حویلی کا صحن، مردوں، عورتوں اور لڑکیوں سے آنا بڑا تھا۔ مرد باہر نکل رہے تھے اور عورتیں جمع ہو رہی تھیں۔ ظاہر نے مردوں کے چروں کا جائزہ لیا یہ دیکھ کر حیرت سے حیرت ہوئی کہ وہ ایک دم کھینچ رہی تھی۔ ان باتوں پر عزم اور پرجہاں چروں پر آج انہیں سائیکہ تار تھا۔ مردوں کی چال ڈھال میں اب پہلی سی پٹری کی تم ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ پر اسرار سا ضروری پن آ گیا تھا۔ وہ سب جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ حویلی میں کل تک والہ وحش و غرض نہیں تھا۔ قہقہے، ہنسنے، جھگڑے سے تھے اور ماحول پر گھٹی ہوئی خنید کی طاری تھی۔

عورتیں چار باتوں، پنجوں اور کرسیوں پر بیٹھ رہی تھیں۔ مرد باہر نکل گئے تو حویلی کا راز اور عہدہ بند ہو گیا صحن میں صرف عورتیں اور فیصل گارڈ کے چند ایک رضاکار رہ گئے۔ بے شمار عورتیں جنہیں بیٹھنے کو جگہ نہ ملی برآمدوں میں کھڑی تھیں۔ اس اجتماع میں نوجوان لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ایک برآمدے میں نیشنلسٹ گارڈ کا رعب سالگرہ رضاکاروں سے باتیں کر رہا تھا۔ "میری بہنو! سالار اجتماع سے مخاطب ہوا اور عورتوں پر سنا پچھائی گئی۔ ہم نے ہندوستان کے دو ٹکڑے کر کے پاکستان بنالیا ہے۔۔۔"

"پاکستان۔ ایک بے ساختہ چیخ۔ زندہ باد۔ ایک فلک شگاف نعرہ۔

"آپ نے جو کچھ کیا ہے، آپ نے جو کچھ کر دکھایا ہے وہ ایک عجز ہے۔ اگر ہمیں بھائیوں کا ہاتھ نہ بتائیں تو شاید مسلمان ایک صدی اور انگریز اور ہندو کی غلامی میں کرا رہا ہوتا۔ اب اس سرزمین پر پاکستان کا جھنڈا لہا رہے گا۔۔۔ لیکن میں آپ کو نہایت افسوس ہے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم جلال آباد پر پاکستانی پر عزم سالار کی آواز ملنے میں ایک کے رو گئی اور اس پر برقت طاری ہو گئی۔۔۔ ہم۔۔۔ اس نے سینے کا پورا زور لگا کر الفاظ کو باہر دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اس کا صحت دہانی سے بھرپور جسم و دماغوں کو زبان پر نہ لی سکا۔ سب پر سچ آؤ گا سوشلی طاری ہو گئی۔ سالار کا سر جھک رہا تھا لیکن اس نے ایک جھٹکے سے سر اوپر کر لیا اور اس کی شرح آنکھوں نے سینکڑوں سوالیہ اور مقرر نظروں کا سامنا کیا۔ اس کے جسم نے بھرپور جہد کی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ دھبگ آؤ گا میں بولا۔۔۔ لیکن ہم جلال آباد پر پاکستانی جھنڈا نہیں لہا سکیں گے۔ عورتوں کے اجتماع میں یوں کھڑے ہوئے شروع ہو گئی جیسے ہوا کے تیز جھونکے خشک گھاس میں سے گزر رہے ہوں۔ یہ سر سر ہٹ دھماکہ ہوئی۔ سرگوشیاں۔ پھر آوازیں صاف ہونے لگیں اور اجتماع میں بے صبری پیدا ہو گئی۔

سالار نے اُس طرف دیکھا۔ یہ نمبر جل رہی تھی۔ اُس کے قریب سے ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی۔  
 ”پاکستان“ اور خانوش جہوم میں جیسے دھماکہ مچا سہو۔ زندہ باد۔  
 سالار ایک بار پھر تڑپ گیا۔ ”وہیں ہی کہنا چاہتا تھا لیکن میری عزت سنبھالو۔۔۔ سالار کی آواز میں عجیب سا  
 جلال پیدا ہو گیا لیکن میری عزت محض مسلمانوں ہونے نہیں دے گا میرے رضاکار آخری مرد ہوں گے  
 جو جلال آباد سے نکلیں گے۔ سبز دودی میں لمبوس میرے پیشیہ۔۔۔ اس نے بازو ہلکا کر کے اپنے دائیں طرف  
 اشارہ کیا جہاں میں کے قریب رضاکار سر جھکا کر کھڑے تھے اور اب ان کے سروا پھٹے ہوئے تھے۔  
 ”پیشیہ جلال آباد سے اُس وقت نکلیں گے جہاں ان کی دودیاں لال شمع ہوجائیں گی۔۔۔“

”اگر میں مذہباتی تقریریں نہ لیا تو مذہبات میں ہی رہتا چلا آؤں گا میں اب طلب کی دو باتوں کو بھلا رہا ہوں۔  
 پہلی بات یہ ہے کہ ہندو مذہب کیسے تھا کہ کھلا لیا گیا ہے اور وہ مسلمانوں کے پیچھے کھلنے پر آمادہ ہے جو فوجی  
 دہشت کے کچھ جلال آباد پر حملہ کرنے کی تیاری مکمل کر چکے ہیں۔ اتر سردار امرتسر کے گرد فوج میں مسلمانوں کا قتل عام  
 شروع ہو چکا ہے سکھوں کے پاس برجیاں اور گریپس ہیں اور دیگر ہتھیار ہیں اور فوج بھی ان کا ساتھ دے  
 رہی ہے۔ یہ طوفان جلال آباد کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے مسلمان بے مگر سے لڑ رہے ہیں اور کٹ  
 رہے ہیں۔ ہماری تعداد کم ہونے کے علاوہ ہمارے پاس اسلحہ اور تھیلوں کی کمی ہے کافر فوج کی زیادہ تر فوج تو ریلوں  
 پر ہے۔ ہندو ہینٹے مسلمانوں کا خون بہا کر خفت مٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔۔۔“

”دوسری بات یہ ہے کہ آپ مردوں کے ساتھ ساتھ رہیں اور وقت آئے پرمردوں کے دوش بڈش  
 لڑیں۔ اور افسوس! نفسانفسی پیدا نہ ہونے دیں۔ ہم نے مردوں کو تمام ہدایات دے دی ہیں سب سے  
 ضروری بات یہ ہے کہ ہمارا مقصد صرف لڑنا نہیں اور مارنا بھی نہیں بلکہ یہاں سے نکل کر پھر جاکر پاکستان  
 پہنچنا ہے۔ زور بات اور نقدی پیسے سے طریقہ دیکھ کر گئے ہاں رکھے اور گھر کی کسی دوسری چیز کا لالچ نہ کیجئے۔  
 گھروں سے وابستہ جذبات کو یکسر فراموش کر دیجئے ورنہ یہ فوجی آپ کو گھر سے نکلنے دے گی۔۔۔  
 مقامی ہدایات آپ کو مردوں گے۔ آپ سب کے پاس ایک چاقو چھری یا پتھر ضرور ہونا چاہیے۔ مرد  
 برجیاں وغیرہ فراموش کر کے میں صرف وہیں اور پیش کش کاڑ کے پاس جس قدر فالتو لاشیں اور برجیاں ہیں وہ  
 ہم نے گھروں میں پہنچانی شروع کر دی ہیں۔ آخر میں آپ ہنسنے کو عارضی طور پر اوداع لکھنا ہوں ہم انشا اللہ  
 لاہور میں ملیں گے میں آپ کو کھانا کھا کر سپر کرنا ہوں۔ خوفزدہ نہ ہونا میری ہمنوا اُمید آپ کے ساتھ ہے۔  
 ”پاکستان۔۔۔ دو تین آوازیں۔  
 ”مژدہ باد“ سب کی آواز۔

شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے عورتیں دودھ دین، تین، چار چار کی ٹولیوں میں گھر لوگ جا رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر  
 طرح کا اثر تھا خوف کا، دھماکا، رنج کا بھی، ایشا کا بھی، جھجکا بھی تھی اور عزم بھی لیکن انہیں اس طرح ساکن تھیں جیسے

لیکن اس کا یہ طلب نہیں کہ ہمارا جہاد ناکام رہا ہے ہم نے منزل پالی ہے ہم نے ایک گھر بنالیا ہے  
 جسے ہم اپنا گھر کہہ سکتے ہیں۔ وہ گھر جو انگریز کے اسیب سے پاک ہے جس میں کوہارے لٹوا اور پسینے نے سنبھا  
 ہے وہ ہمارا منتظر ہے۔ اب یہ تین تیس چھوڑ دینا ہے جلال آباد کی گلیوں میں اب ہم امنی ہیں خدا نے اپنا  
 وعدہ پورا کر دیا ہے۔ ہمارا امن و امان ہے افغانستان کی سرحدوں تک اور شرمی کی چوٹیوں سے سبز و عرب کے  
 ساحل تک پھیلا ہوا ہے۔۔۔ اگر جلال آباد اُنٹ کی تو کیا نعم۔۔۔ وقت کم ہے اور میں مذہباتی باتوں سے نکل  
 کوشاں کی طرف آتا ہوں۔۔۔

”پہلی حقیقت یہ ہے کہ آپ نے تاریخ اسلام میں ایسے باب کا اضافہ کیا ہے جو خون سے لکھا گیا ہے  
 آپ نے اسلام کی تاریخ کو زندہ کیا ہے۔ یعنی باب جاری آنے والی نسوں کا خون دھار کر ہے۔۔۔“

”آپ نے محسوس میں جس نظم و نسق، حصے، استقلال اور باہمی جہودی کے جذبے کا مظاہرہ کیا ہے۔  
 شدید ضرورت ہے کہ اس جذبے کو آنے والے حالات میں برقرار رکھا جائے۔ آج تک ہماری ہم آہنگی  
 ہم تھی لیکن آج کے بعد ہمیں ایک اور ہم آہنگی کا آغاز کرنا ہے۔ وہ ہم ہے جلال آباد کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر نکلنا  
 لاہور پہنچنا۔۔۔“

مجموع پر ہیبت ناک سکوت طاری ہو گیا۔ عورتیں اب ایک دوسری کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہی تھیں۔  
 ”۔۔۔ ہم ایسی ہے جو میں اپنے بل بوتے پر سر کرنی ہو گی۔ یہ بھی متوقع ہے کہ آج رات  
 ہی ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ ہم میں نفسانفسی اور جھگڑا شروع ہوجائے عین ممکن ہے ہاں اپنے بچوں کو  
 اور بھائی اپنی بہن کو بھی بھول جائے اور جس طرف منہ آئے سب بھاگ اٹھیں۔۔۔“

عورتوں کے اجتماع پر موت کا سایہ پھیل گیا۔

”۔۔۔ میں آپ سنبھالنے سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مردوں کے سہارے کا انتظار نہ کریں اپنی  
 جان اور عزت کی خاطر اُسی نظم و نسق کا مظاہرہ کریں جس کا آپ نے محسوس میں کیا ہے۔ آپ پولیس اور فوج  
 کے لاشی پاران اور گولیوں کے سامنے سینہ سپر رہیں اور منتشر نہیں ہجوزیں۔۔۔ اور اب آنے والے  
 حالات میں اگر آپ پولیس کی مدد کر سکیں تو کم از کم اپنے خاندان کے افراد اور خان حالات کاوش بڈش  
 مقابلہ کریں میں پھر کتا ہوں کہ عورتیں مردوں کے سہارے کی محتاج نہیں ہیں۔ آپ میں خون ہے۔ آپ میں  
 قوت ایمان ہے۔ اگر آپ میں سے کوئی بہن خدا عزت تین چار کافر فوج کے ہاتھ میں آجائے اور بے بس  
 ہو جائے تو اس میں کوئی دھمکا لڑنا ہوگا۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو آپ سب کے پاس ایسا سامان ضرور موجود ہونا  
 چاہیے کہ آپ۔۔۔ سالار کی آواز ایک بار پھر کہیں دے گئی۔ ”اور ایسے میں آپ۔۔۔ زبان اس کا ساتھ نہیں  
 دے رہی تھی۔ ساکت و جامد عورتوں میں طبعیت ہی چل پھل پیدا ہوتی۔ ایک کونے سے ایک نسوانی اور پرجہوم  
 آواز آئی اور ہم قوم کی عزت کے نام پر قربان ہوجائیں گی۔“

سورج جلال آباد کے شہر اور مضامین میں جلیبی کوئی نہیں سمیٹ کر کوئی کتے سمیت جاتا تھا۔ شہر کی گلیوں اور دروازوں میں موت کے سائے منڈلانے لگے، شام کے دھندلے کے ساتھ ہی لوگوں نے شہر میں بے شمار غراؤں سے چہرے دیکھے شہر کے ارد گرد اونچی فصلوں میں بھی سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔ شام پر سناٹا طاری تھا گلیوں میں بولناک خاموشی تھی، اگے وکے لوگ تیز قدم اٹھاتے نظر آتے تھے۔ ستارے بھی بچھے بچھے دکھائی دے رہے تھے مسلمانوں کے گھروں میں مردوں کا یہ حال تھا جیسے قبیحی جاکتی میں آنے والی بادش کو سو گھنچوں کو اٹھا اٹھا کر محفوظ جگہ پہنچانے میں سرگرم ہو جاتی ہے۔

رات کی تاریکی گہری ہو رہی تھی۔ طاہرہ کے دروازے پر دھک بھڑکی چٹینی کھلی تھی۔ دھک کے ساتھ ہی ارشد داخل ہوا۔ اس کے ساتھ مشیل کا توڑکا ایک رضا کار تھا۔ دو ریحیاں رضا کار کے ہاتھ میں اور ایب ارشد کے ہاتھ میں تھی۔ ارشد کے شنگھ چہرے پر ڈوڈائی سی بنگد کی طاری تھی اس نے اندر سے دروازے کی دونوں چٹینیاں چڑھا دیں۔

”غیریت ہے؟“ ارشد نے طاہرہ سے پوچھا اور خاتون سے مخاطب ہوا۔ ”اماں جی! ہم آج رات آپ کے پاس ٹھہرائیں گے“

”آؤ بیٹا! خاتون نے اُس کی پیٹھ پر بھر رضا کار کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ”آج نہیں، ہر رات میں گزارو“

”مہر رات تو اب لاہور میں گزرے گی۔“ ارشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آج کی رات غیریت سے گزر جاتے سی۔“ اُس نے چادر پانی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں میں آپ کو ڈروائی خبریں سنانے لگا ہوں۔“

”اوپر کے دیہات میں ہندوؤں اور سکھوں نے ضعیف اگر دیا ہے۔ چند ایک مسلمان بچ سپر انٹیل گاؤ کی حویلی میں آگئے ہیں باقی مسلمان لاہور کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ بہت ظلم ہو رہا ہے۔ اماں جی! لاہور پہنچنے کے تمام راتے بند ہو چکے ہیں شہر کے لوگوں نے ابھی ابھی کوٹھوں پر چڑھ کے دیکھا ہے۔ دیہات کو آگ کے شعلے چاٹ رہے ہیں۔ آج رات جلال آباد کی باری ہے ہم لوگ تیار ہیں مسلمانوں نے چند ہسپتال اور ہندوؤں کی کشتی کر لی ہیں۔ باقی گھروں میں لاٹھیاں اور ریحیاں ہیں۔“

ان صاحب کو سناٹے کو آپ کے ہاں لگایا ہوں؟

”اور متارے گھوٹیں؟“ خاتون نے پوچھا۔

”وہاں اللہ کا نام ہے۔“ ارشد نے کہا۔ ”گھر کے تمام افراد پچھلے پہر نکل گئے ہیں صرف میں آپ کے لیے بچے رہ گیا ہوں۔ خدا انہیں غیریت سے لاہور پہنچائے۔“

”اللہ تجھے زندگی دے بیٹا،“ خاتون نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

طاہرہ اور عفت نے چونک کر ارشد کی طرف دیکھا اور دونوں کے سر جھک گئے۔

”اور سچ ہے؟“ عفت کی ماں نے پوچھا۔

”ان کے ہاں بھی مردوں کا انتظام کر دیا گیا ہے۔“ ارشد نے جواب دیا۔ ”میں وہاں سے ہوا ہوں بنگر نے مجھے قید کر دیا تھا کہ میں بہت جلدی آپ کے ہاں پہنچ جاؤں۔“

آنے والے حالات کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ سچہ، طاہرہ اور عفت، طاہرہ کے گھر والی گلی میں نہیں تو انہوں نے وہاں کے سکھوں کا ایک گروہ گلی میں آنا دیکھا۔ سب کے ہاتھوں میں بوجھیاں تھیں اور وہ تیز قدم چلے آ رہے تھے۔ طاہرہ نے پوچھا۔ ”ریحیاں وغیرہ نے کوئی تو خلاف قانون ہے؟“ بنگر نے جواب دیا۔ ”آج قانون مر گیا ہے۔“ اور انہوں ایک طرف گئیں۔ دس بارہ سکھوں کا یہ گروہ میڈن لائکس کو لنگھیں گھورتا اور زیر لب مسکراتا آگے نکل گیا۔

”اب میں ان بچہ گلیوں کا متاثرہ کرنا ہے۔“ طاہرہ نے کہا۔

”متار سے گھر میں مرد بھی کوئی نہیں،“ طاہرہ نے بنگر سے کہا۔ ”ارشاد کو ہی بلاؤ۔“

”نہیں؟“ طاہرہ نے جواب دیا۔ ”ہمارے پاس بندہ قی اور ایک کرچ ہے۔“

”خیر، بھندوبست ہو جائے گا۔“ بنگر نے کہا۔ ”اچھا خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“ طاہرہ نے بنگر کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ”اگر رات خیریت سے گزری تو صبح میں گے۔“

خاتون اور عفت کی ماں نے آنے والے متوقع حالات کی روڈ اوپنی قوان کے دل ہٹا گئے خاتون کو جلال آباد کے فوج میں پھیلے ہوئے اپنے کھیت اور شہر میں کڑے پڑے ہوئے مکان بے چین کرنے لگے۔ خبردار پولیس کی مالت یہ جاتا اور سینکڑوں روپے ہمارا کی یاد کی پھوڑنے کے لیے دل گروے کی ضرورت تھی۔ طاہرہ نے خاتون کی اندرونی کوجھانپ لیا۔ اس نے کہا۔ ”میں متنبی جاننا دیا ہوں چھوڑ کے جاتیں گے اتنی ہی پاکستان میں مل جاتے گی؟ اور اس نے بہت سی باتیں کر کے اتنی کا دھیان اور سہہ بنالیا۔

یہ بھی غنیمت تھی کہ خاتون کو زیورات نبوانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے اپنا اور سادہ مرحوم کے زیورات محفوظ رکھنے کے علاوہ دس ہزار کے زیورات طاہرہ کے لیے ہوا رکھے تھے۔ جب سے ارشد ان کے گھر میں تھے تلکھی سے آنے جانے تھا خاتون نے دل ہی دل میں جینے کی طویل فہرست تیار کر لی تھی جس میں تین ہزار روپے کا تصرف ایک بار شامل تھا خاتون کی نظروں نے وہ رنگ بھی جانپ لیا تھا جو ارشد کو دیکھتے ہی لڑو کے چہرے کو دل کش کرتا دیا کرتا تھا۔ طاہرہ کو یہ معلوم تھا کہ اس کی اتنی ارشد کی ماں کے ساتھ راہ دور سم پید کر چکی تھی لیکن دونوں ناؤں کے درمیان ابھی رسمی باتوں کا پڑنا تھا۔ خاتون نے طاہرہ کی باتیں سن کر دل ہی دل میں اندازہ کر لیا تھا کہ اس وقت گھر میں کوئی بچہیں ہزار کے زیورات موجود ہیں۔ یہ تو طاہرہ کا اصل گھر تھا کہ خاتون نے کچھ نقدی بنک میں جمع کرادی تھی ورنہ خاتون کو بیکوں اور ڈاک خانوں سے خدا واسطے کا پڑتا تھا۔ طاہرہ کو خوش کرنے کی خاطر اس نے تھوڑا سا روپیہ بنک میں جمع کرنا شروع کر دیا تھا پھر بھی اپنے دل کو خوش رکھنے کے لیے اُس نے آٹھ ہزار کے قریب روپیہ رضا تیوں والی بیٹی میں سب سے پیچھے والی رضائی کی تھوں میں چھپا رکھا تھا۔ رضائی کی فٹنٹ شیٹ خروان مرحوم کی محبوب رضائی تھی اور مرحوم کی وفات کے بعد خاتون نے اسے مرحوم کی یادگار کے طور پر سجا کے رکھ دیا تھا۔ یہ خاتون کا بیک تھا اور طاہرہ کو اس کا علم ہی نہیں تھا۔ انہوں نے حالات میں خاتون کو ایک غورظاہن مبرا کر اس قدر روپیہ اور زیورات ہاتھ میں ہیں جنہی بنگر کا کام آتی ہے۔

اُس کی پیرسکراہٹ اُس کی ہر سکرابہٹ سے خالی تھی! اور تم دونوں .... وہ حذر اعلیٰ سے مخاطب ہو! اپنی جگہ پر بیٹا رہنا۔  
جیسے میں کہوں ویسے کرنا۔

خود کو کھڑکی فراموش کھول کر بندوبست میں لے کر کھڑا ہو گیا۔ غامقوں جھانکتی نیچے آئی۔ ارشد کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ پتھر کے کادور واڑہ بند کر لیا۔ آٹھ دن مسٹ بعد از شہر باز نکلا اور خاتون رضا بیوں والی چٹائی بند کر کے پتھر پر اوڑھ بیٹھ گئی۔

ظاہر اور عفت نے پوچھنا پا کہ اسی نے کھرے میں بے جا کر اشر کو کیا کہا ہے لیکن ماحول کا بھی ایک تناؤ اس قدر تھا کہ کوئی کسی کے ساتھ بات کو نہیں سمجھتا تھا۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ تھے فتنہ باز۔ تھے خدا کے نیک بندے یا ایک کڑے امتحان میں سے گزر رہے تھے۔ کتنے جی پی جی کو بھوکا رہے تھے شہر میں مزدوروں اور پستروں کے دھماکوں، بے کاروں اور غفلتوں کی چیخ و پکار سے کانوں کے ساتھ دل کے پردے بھی چٹھے جا رہے تھے۔ بیشتر گلیاں اور مسلمانوں کے گھر میدان کا زار بن چکے تھے۔ اس شور و غل، آہ و بکا اور نندوں کی جنگی جھلجھلی میں اللہ اکبر کے نعرے بھی سنائی دے رہے تھے کبھی کبھی ایک آواز کسی اونچی چھت سے آتی تھی۔ ”مسلمانو! جم کے مقابلہ کرنا، خدا تمہارے ساتھ ہے۔“

اُشد نے آواز پہچان لی۔ یہ نیشنل گارڈ کا نعرہ باز تھا جس کے سامنے مائیکروفون کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

دلی نیچے آتی۔ میں نے اُدپر سے دیکھا ہے، اُس طرف شہر میں آگ لگی ہوئی ہے۔“

”بی بی! گھبراؤ نہیں۔ ایک مزار سے خاتون کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اسم کس لیے میں؟“ اور خاتون کو پھر اُپر بھیج دیا۔ ”اب چھت پر نہ جانا، بی بی!“ — مزار سے زور سے کہا۔

شہر میں موت کی دہلاوینے والی چٹھیا لڑیں اور شیطان کے کمرخت قلعے اس قدر بلند اور اس قدر زیادہ ہو گئے تھے کہ کمرے میں بات کرنے کے لیے جینا پڑتا تھا یہ شور اس گلی میں بھی اُسن پھینچا۔

موتی بجا ہوا۔“ ارشد نے کہا اور عفت نے نبی بجا دی۔ گلی میں بی بی قبل رہی تھی اور لیے لیے سائے نظر آنے لگے۔ ایک دھماکا، کچرہ مہیب گونج سے کانپ گیا۔ ارشد نے پہلی گولی چلائی۔ پھر دوسری اور تیسری دونوں میں بندوق میں دو کا تھوس کر لیے۔ گلی میں لیے لیے سائے کے گئے اور ان میں در سائے کھم بہر گئے؟ اور گلوں کو فتح چمک گئی۔ سائے بچکر دیواروں کے ساتھ ہو گئے۔ محال مرموم کی کھڑکی میں سے ایک ایک علی علی۔ ایک اور گولی۔ کئی اور گولیاں گلی میں بھاگتے۔ فوٹوں کی آوازیں۔ پھر خاموشی جیسے شہر کا قیامت خیز شور مڑا کر دھماکا دس منٹ بعد گلی میں پھیر دی شورا اور دمنٹ۔ عطا بھر کے مکان کا دروازہ اس طرح کج آٹھا جیسے اسے ہاتھی گلی میں مارے ہوئے ارشد کی بندوق خاموش رہی لیکن سامنے والے مکان کا یہ تلوں گنگا گاتا رہا۔

”لوغاتون؟“ سامنے کے مکان سے ایک مردانہ آواز چلتی— ”گھبرانا نہیں، ہم ابھی زندہ ہیں۔“ لیکن ان کا بھی دروازہ  
 کھٹ رہا تھا۔

دروازے پر بے شکم بنوئی توبسب کی آنکھیں ساکن ہو گئیں مگر نے میں جیسا کہ سکوت چھا گیا۔ کوئی کسی  
دیکھنا نہیں جا رہا تھا۔ دس بج کر بنوئی جیسے دروازہ توڑا جا رہا ہو۔ شیش ٹل کا رٹو کے رخصا کھڑے ہو بھی مانتے میں نے کر کوڑا لے  
فرسا لکھو لا اور باہر دیکھا۔ دوا آدمی دروازے کو سپٹ رہے تھے۔

”کون؟“

”تم خونِ ہر؟ ہم بی بی کے مزار سے ہیں“ باہر سے ہنپتی ہوئی آواز آتی۔

خاتون نے دروازہ کھولا۔ دوسرا سچے کپتے کا پتہ کرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کا جائزہ لیا اور اطمینان کا سانس

”سکھ پانی کی طرح ٹٹھاٹھیں مارتے چلے آ رہے ہیں۔“ ایک مزارع نے کہا۔ ”پار

”تم نے تھوکر مے اور خیر سے کو وہیں چھوڑا اور بی بی آپ کی طرف بھاگے۔ سوچا گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔“

عورتوں اور بچوں کو کیشنل گارڈ واے شام کو ہی لے گئے تھے۔ کہتے تھے یہ عورتیں اب ہمیں لاجپور میں ملے گی۔ ان کا توجہ کوئی خطر نہیں۔ بھاگ سکتی ہیں۔ بھوکے بھی رہ سکتی ہیں۔ یہیں تو آپ لوگوں کا ڈر تھا، بی بی! اللہ کا شکر ہے کہ

”منفوا صغرا“ ارشد نے فیض کارڈ کے رضا کار سے کہا۔ ”تم ذرا سبک کرو یہاں جمہور آدمی ہو گئے ہیں۔ باتوں

ضرورت نہیں کہ مجاہد فردی مرکز یا کامران جانتے ہو۔۔۔ ارے وہ فلولاری کو نہیں جانتے؟۔۔۔ ہاں وہی۔۔۔ وہی ہے۔ گھر میں اس کی ماں اور بیوی ہے۔ تم ان کے پاس پہنچ جاؤ۔

”اچھا جی! — رضا کار اٹھا اور کہہ — ”التذیلی“

”اور یہ لو“۔ ارشد اے اسے دل خرد و سری بر بھی دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے اُن کے کھڑن میں بھی نہیں سوگا۔ دونوں بر چھیاں لے جاؤ۔“

رہا کارا رات لے بھیا نک اندھیرے میں تم ہو کیا۔

رات کا سکوت جو رضا کار کے قدموں سے م

یہی ارشد کو دے دی کار توں کے چار اور تے فرش پر لار کھے۔ ارشد اٹھا اور بندوق بھری پھر عورتوں کو دبایا تے

”تم دونوں ایک کواڑ کے ساتھ اور دوسرا دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔“ ارشد نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔  
”جی جلد دو۔ جی جی مل گئی۔ تم دونوں، طاہرہ اور عفت، ڈیوڑھی میں دروازے کے باہل سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ۔  
بھاگو، ڈیوڑھی کی جی جی جلد دو۔ برچھیاں تھام لو۔“

دروازہ ٹوٹنے والا تھا۔

”نہیں! طاہرہ نے لڑائی آواز سے کہا۔ ”میرے پاس ابا جان کی کرپ ہے۔ اس نے سر ہانے کے نیچے۔  
کرپ اٹھائی اور ڈیوڑھی میں بھاگ گئی۔

ارشد نے دواڑے سے ایک طرف سوکھتی کھلی اور پیچھے ہٹ گیا۔ پانچ سو سکھ ان، انفل جوتے  
ساتھ ہی کواڑوں کے عقب سے دونوں مزارعوں کی نگہائیاں حرکت میں آ گئیں۔ ارشد پانچ گز دو دو تین طرف دیوار کے ساتھ  
لیے کھڑا تھا۔ دروازے میں چھ لاشوں کا ڈھیر لگا گیا۔ ان کے اوپر سے کوڑ کڑ پانچ چھ اور سکھ اندر آ گئے۔ پشتیر اس کے گرد  
برچھیاں نبھالتے مزارعوں کی نگہائیاں اپنا کام کر چکی تھیں۔  
طاہرہ اور عفت دروازے کے باہل سامنے دس گز دو دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔ باہر سے آنے والے سوا  
بتی کی روشنی میں انہیں دیکھ کر ان پر ہی جھپٹا مارنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ موت کواڑوں کے عقب  
میں منتظر ہے۔

ارشد بدق بھرا تھا کہ ایک سکھ جو نگہائیاں سے بچ گیا تھا کرپان سیدھی کر کے اس کی طرف لپکا۔ دوسرے ہی لمحہ  
طاہرہ کی کرپ اس کے پیلو میں داخل ہو گئی۔ ادھر عفت ایک کے پیٹ سے برچھی نکال رہی تھی۔ دروازہ لاشوں سے  
مکمل طور پر بند ہو گیا تھا۔

ڈیوڑھی میں ڈھواں پھیلنے لگا لیکن کسی نے اس طرف توجہ نہ دی جب ڈھواں آنکھوں کو گلنے لگا تو ارشد نے بھاگ  
کر کمرے میں دیکھا مگر غریبے آگ لگی ہوئی تھی اور شعلہ تیزی سے پھیل رہے تھے۔ کسی نے کھڑکی میں سے تیل یا پٹرول  
پھینک کر آگ لگا دی تھی۔

طاہرہ کے کانوں میں ارشد کی صرف یہ آواز پڑی۔ ”اماں جی اور اگلہ کو نیچے لے آؤ۔ پھر ڈھواں اس قدر پھیل گیا کہ  
ڈیوڑھی میں ہاتھ کچھ نہ بچائی نہ دیتا تھا۔ اس طرح سامنے کے مکان کی کھڑکیوں میں سے شعلہ نکل رہے تھے۔ ارشد  
نے لگی۔ ”جھانکا لگی جلتے ہوئے مکانوں کے شعلوں سے دن کی طرح روشن تھی۔ موت کی اس خبر کو روشنی میں پانچ چھ  
کی بھڑی ہوئی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ دواگوڑ کی فتح اور تیرے کارے دوسرے صف میں منتقل ہو گئے تھے۔

ڈھواں پھیلنا لگا اور طاہرہ کی آنکھوں کی یہ حالت جیسے اب کھل نہ سکیں گی۔ ڈھواں ہر طرف ڈھواں ہی ڈھواں  
آنکھیں بندیں تو ڈھواں، آنکھیں کھولیں تو بھی ڈھواں اور اسی ڈھواں دھار میں ایک رات، ایک دن، دوسری رات  
دوسرا دن، ایک اور رات اور کئی اور راتیں گزر گئیں۔

پھر طاہرہ کو لوں لگا جیسے دھوئیں کے بادل چھٹ گئے اور فضا صاف ہو گئی۔ سور آسمان کی نیلا ہٹ بکھڑائی ہوئی۔ اس نے آنکھیں  
کھولیں تو دھواں بھی غائب اور دھوئیں کی بو بھی غائب تھی۔ اس دھوئیں نے بہت کچھ چاٹ لیا تھا۔ طاہرہ کی متاع عزیز نکل  
لی تھی۔ اس کا جلال آباد، اس کی گلیاں، اس کا دوسرا مکان، اہلسا نے کھیت، اس کی کئی سیپیاں، اس کی انی غاتون، عفت کی  
مال اور ایک مزارعہ۔ اس سے چھن گئے تھے۔ پاکستان نے اس سے آبی بڑی قربانی لی تھی جو کبھی اس کے تصور میں بھی نہیں لگتی تھی  
ایک شام کے لیے اسے لوں لگا جیسے دھوئیں نے وہ نعرے اور مڑوں بھی نکل لیے ہیں جو جلال آباد کے درو دیوار کو  
بلادیا کرتے تھے وہ جوش و خروش اور وہ ہنگامے بھی شاید اسی دھوئیں کی نذر ہو گئے تھے جو طاہرہ نے مردوں کے پاپا ہوتے  
جو ہم کو آگ بکھڑ کر کے تھانے کی دیواروں سے ٹکرا کر برپا کیے تھے۔

طاہرہ نے یہ سب کچھ محسوس کیا لیکن مٹا نہیں سکتی تھی۔ ایک احساس تپ کے بیدار ہو گیا۔ نہیں! وہ سب کچھ زندہ  
ہے۔ اس کے سینے میں اس کے رگ دریشے میں زندہ ہے، وہ دولہ، وہ عزم، سبز جھنڈے کا وہ احترام، پاکستان کی خاطر وہ  
جذبات، اندر مرنے والے انسان ہیں۔ طاہرہ نے اپنے جسم میں پھر سے ایک تپش محسوس کی۔ وہ کھانچا ہوا  
سرا پچا کر کے بیٹھ گئی۔ اس کی بڑی بڑی دکھ تھی جو جڑ سے روٹی میں اٹھ رہی تھیں۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے سامنے فرش پر ایک بوسیدہ کپڑا پھیلائے عفت سوئی ہوئی تھی۔ طاہرہ نے اس کی  
صورت دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ اس کی اپنی صورت کسی ہوگی۔ بال بکھر کر رہ گئے تھے۔ ہونٹوں پر خشک دم دم لگی تھی۔ چہرے پر لڑائی  
پرچھائیاں اور آنکھوں کے نیچے سیاہی لگی تھی۔ ہاڈن نیچے قیغ جگہ جگہ سے کچھ ہونٹا دوپٹا غائب تھا۔ وہ ایک فراج عمر سے  
میں تھیں جس کے فرش پر چار پٹے پڑے مکمل پیچھے ہوئے تھے۔ ارشد اور مزارعہ غائب تھے۔ طاہرہ نے اپنا جسم کھینٹ کر  
اٹھایا اور دروازے میں سے باہر کا منظر دیکھا۔

وہ طاہرہ میں دالین کے ریشمی کیسے میں تھی۔

اس کے سامنے فوجی بارکین نے ترقی سے بکھری ہوئی تھیں۔ بارکوں کے برآمدوں میں، کمروں میں اور سڑکوں کے کنارے  
انسانوں کا مفلوک الحال جہم سورا تھا یا جاگ کر اس طرح ادھر ادھر اوپر نیچے اور آگے پیچھے دیکھ رہا تھا جیسے یہ جہم اس دس  
میں اپنی بہت سے تنگ دھڑنگ تھے، تھکان اور خوف دہراں کی ماری ہوئی لوکیاں اور عورتیں جیتھتھول میں لمبوس

مرد، برتن ہاتھ میں اٹھائے تیزی سے آگیا رہے تھے۔ مردوں میں بے شمار ایسے تھے جن کے سرول پر پیشانی بندھی ہوئی تھی۔ ان کے کپڑے غول آلود تھے، کچھ لنگڑا کرپل رہے تھے بعض ضعیف لمبے راکھوں میں لمبھے خالوں میں نمک رہے تھے۔

اس جہم کا ظاہری حال علیحدہ جگہ کی ہوتی، شکست خوردہ بنے ترتیب فوج کا ساتھ کیا لیکن ظاہر کے دیران ہر نوبت پر جلسے کماں سے مسکراہٹ لگائی، وہ جانتی تھی یہ فوج شکست خوردہ نہیں، فاتح ہے ظاہر کو مسکراہٹ ڈرا کی ذرا پھیل پھر سگدی گئی، وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی، داغ ساتھ نہیں دے رہا تھا جہم کے ہٹھے اور اعضاءِ نظام دوسرے ہر گنا تھا۔ اس نے داغ پر زور دیا مگر اس کے ذہن میں وہواں پھیل گیا۔ وہ لپاسی ہٹھاں جو اس کے گھر کی ڈھونڈ میں لپکاں لپکتا، اس شخص میں اس کے سامنے پیرا دیو یا یہ جہم، ہنسنے لگتا، جہم نے ہٹے گئے، جہم پیرا دیو، جہم جیت گیا، ہٹے کئی روز پہلے کا ہواں یاد آگیا، اس وہوں میں سے ایک آواز اسے پھر سنائی دی جو شاید ارشد کی تھی۔ ”اماں جی اور نانا کو نیچے لے آؤ“

”اس کے بعد کیا بڑا تھا؟ طاہرہ کی پیشانی کے شکنجے ٹیڑھے ہو گئے۔ اسے یاد آیا؟ ہاں! ابھر سب سے بڑی سچی اور حلال لڑائی۔ دیکھی تھی۔ پھر اور کچھ نظر نہ آیا۔ پانی خان کو سب کچھ پتا تھا۔۔۔۔۔ ٹوب جانے کا خون، ادھر تیر نکلتے کا حوصلہ، منہ پر خون کو گر مارنا تھا۔۔۔۔۔ لہرس۔ اور سے گرتی سوس۔ ارشد اور طاہرہ ان کے اوڑ سے گزرتے ہوئے۔۔۔۔۔ گلاسے لہرں کے جو دم دم رملہوں کے سے ماسر بھاگتے ہوئے تو کون سا مثال ہو گئے تھے“

اسے وہ ساری باتیں اور اس واردات کی ساری تفصیلات باور میں آ رہی تھیں۔ طاہرہ نے آنکھیں بند کر کے پھر دہن کے ساتھ یہ سب مزارعہ اور عفت لاپتہ... بانی، سرطانی پھر دھواں، لگدھواں.... یادوں کی کڑیاں پھر لوٹ لیں کڑیاں دھنکے میں جہاں جیسے جھوٹے بسرے خواب کو یاد کر رہی ہو لیکن اس خواب کی کڑیاں جڑنے کی بجائے بکھری ہو جاتی تھیں۔ پھر دہن کے زلیں، کہیں کہیں سے.... دو خودی شریستی تھی.... ارشد نے اس کے ساتھ لپٹا تھا.... وہ اکٹھے شریستی تھے.... وہ ارشد کی بڑھتی رستی تھی.... کہنا اور دھتکا مانگا اور تھا ہی نہیں.... بانی نے سب کچھ نکل لیا تھا.... مزارعہ کو کبھی، عفت کو کبھی.... اس نے داغ کو خشک لیو کی طرح تجوڑا اور دھن قطرے نکال دیے۔

”بھوکوں کے ایک گروہ سے جبر پڑی تھی۔۔۔ ظاہر نے بھیجیوں اور کپانوں کا مقابلہ کرچ سے کیا تھا۔۔۔ ارشد اور انیس۔۔۔ دو بجے پانی کی پہاڑیوں پر دکھائی دیتے تھے۔۔۔ لاشیں تھیں یا زہد؟ تھے انسان!۔۔۔ پھر کیا ہوا تھا؟۔۔۔ دو مزارعے ساتھ تھے۔۔۔ بھانگی عورتوں اور بچوں کا فاقہ بھر گیا تھا۔۔۔ لاشیں بچوں کی۔۔۔ جنہیں عورتوں کی۔۔۔ مقابلہ مردوں۔۔۔ بین کویاں ترواخ سے لوٹ کر بچہ گئیں۔۔۔ اور کنارہ۔۔۔ اور بھوکوں کے کی طرح دھکے جسم۔۔۔ مزارعے بے ہوش غفلت کو اٹھا۔۔۔ دھماکے، بندوقول اور پستولوں کے۔۔۔ بھٹکوں کی سرسب وڑ۔۔۔ اندھیرا۔۔۔ وھواں۔۔۔ گپ اندھیرا۔۔۔ باجرے کی ان کی طرف آ رہا تھا۔۔۔ وہ لیٹ گئے تھے۔۔۔ دھوپ تیز تھی۔۔۔ دھوپ گرم۔۔۔ کون عین، بنید کا شمار۔۔۔ ہم نے منزل مکتی کے فصل انسانوں اور گھوڑوں نے روند ڈالے تھے۔۔۔ اوپنے فصلوں میں مھمتیں چھپ گئی تھیں۔۔۔ لٹ بھی کر گئی تھی۔۔۔ ارشد کی بے ساختہ آواز۔۔۔ وہ سو گئے تھے۔۔۔ دماغ اس قدر شل کر فینڈ میں جلال آباد کا خواب بھی زندہ کیے تھیں۔۔۔ ہاں! ہاں! یاد آیا۔۔۔ ارشد اور مزارعے نے دو لڑکیوں کو تین بھوکوں سے آواز کر لیا تھا۔۔۔ وہ لڑکیاں کہاں ہیں؟ لڑنے۔۔۔ جلال آباد بہت دور دور گیا تھا۔۔۔ دونوں اور راتوں کی مسافت۔۔۔ مصائب کی راہ۔۔۔ آہ! اتنی تو نے مجھے اس کدھر ملی گئیں تھیں؟ ظاہر کو یاد نہیں آ رہا تھا۔۔۔ دریا کا کنارہ۔۔۔ تھیں ٹھیک مارا ہوا دور یا۔۔۔ پھر اندھیرا۔۔۔ پھر جبر پڑا۔۔۔ پھر لڑنے۔۔۔ پھینک کی عمر میں کتنا پکا حوصلہ دیا تھا۔۔۔ خدا استغیٰ۔۔۔ آنسوؤں کی دھند۔۔۔ آہوں کا دھواں۔۔۔ وھواں آہستہ آہستہ گھٹنے سے جانے کتنے اور گزر گئے تھے۔۔۔ جانے کتنی سی اتیں۔۔۔ ظاہر کے سامنے یادوں کی کوئیاں پھر کچھ گئیں۔۔۔ اُس نے انہیں چار۔۔۔ آسمان کی سیلابت بکھر آتی۔۔۔ ایک تجویم۔۔۔ مفلوک الحال۔۔۔ حواس باختہ۔۔۔ ایک کارواں۔۔۔ لائو۔۔۔ جھکان سے جڑنے لگی۔۔۔ یادیں میں آجے پڑ گئے تھے۔۔۔ بھوک لگتی تھی، پیاس بھی۔۔۔ اتنی خاتون کی گڑبڑ تھی۔۔۔ ارشد نے کدھوں پر اٹھ۔۔۔ چڑھ کر دو راں کی تئیں۔۔۔ ٹھنڈے سانس۔۔۔ گرم آنسو۔۔۔ مردہ جہنم۔۔۔ اُنھیں بے نور۔۔۔ لیکن سینے موڑ لیا تھا۔۔۔ پھر حملہ۔۔۔ اتنی کو ظاہر نے کدھوں پر اٹھا لیا تھا۔۔۔ پھر اندھیرا۔۔۔ جنہیں چنگا کر پانوں، برہمیں اور گھوڑوں کی تعداد۔۔۔ پھر کیا ہوا تھا پھر؟۔۔۔ غفلت کی اُمی غائب تھی۔۔۔ ایک مزارعہ غائب تھا۔۔۔ کہاں چلے گئے تھے وہ؟ اور وہ نے سر جھکالیا۔۔۔ اسے یاد آیا۔۔۔ اس نے، ارشد، غفلت اور دوسرے مزارعے نے دو گڑھے کو کدھوں کی اُمی اور مزارعے۔۔۔

اس نے اپنی گردن کے گرد ایک بازو کا گھیرا موس کیا۔ ظاہر ہے اسے بھی تصور سمجھا لیکن کسی کی اُکھڑی جوتی نہیں



اس کے بائیں گال کو لطیف مجونوں کی طرح چھو رہی تھیں۔ اسے قراز سانس ہوا۔ دیکھا، عفت، اس کے سر  
لی گھڑی تھی۔

”آگ کھل گئی، عفت؟“

”ہاں! ایک جانی۔“

”جانے کتنے دن گزر گئے ہیں“

”آٹھ یا دس دن۔“

”نہیں! زیادہ!“

”شاید زیادہ!“

”آئی یاد آتی ہیں؟“

”بہت کچھ یاد آتا ہے۔“

”بھول جاؤ۔“

”تو اور کیا؟“

”اب نیا گھر بنے گا۔“

”نئے لوگ ہوں گے۔“

”زندگی جی نہی ہوگی۔“

”خوبصورت زندگی۔“

”خوش باش زندگی۔“

”پاکستان۔“

”جمہوری سرزمین۔“

”اپنا دیس۔“

”اللہ سلامت رکھے۔“

”یہاں کب تک رہیں گے؟“

”چند دن اور!“

”ارشاد نے بتایا تھا؟“

”ہاں!“

”مکان مل جائے گا؟“

”بہت خوبصورت!“

”طابری؟“

”ہوں!“

”بیاد کرو گی؟“

”شاید... کیوں عفت! اس ماحول میں تمہیں بیاد کا خیال کیسے آگیا ہے؟“

”وہ میرا خیال مستقبل سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ طاہرہ! میں سوچ رہی تھی کہ ہم دونوں کا بیاد ہو جائے گا تو ہمارے بچے

پیدا ہوں گے، پھر ہم انہیں تیار کریں گی تاکہ ہم نے پاکستان کی طرح حاصل کیا تھا۔“

”ہاں عفت! ہم نہیں نہیں کی تو اپنے بچوں کو جنوں اور پروں کی کمائیاں نہیں سنایا کریں گی۔ ہم نے ایک نئی کمائی

خلق کی ہے جو ہم بچوں کو سنانے کے لیے نہیں جگانے کے لیے سنایا کریں گی۔“

”یہ لولو کیو! ارشد کی شکستہ آواز نے کمرے میں موسیقی بکھری دی تو آواز نہ کر لو۔“

طاہرہ اور عفت نے گھوم کر دیکھا۔ ارشد باغ میں چھوٹی سی ایک بالٹی اور المینیم کے ٹیڑھے پچکے سے گلاس اٹھا

کرے میں داخل ہوا۔ مزارع کے باغ میں روٹیاں اور سالن تھا۔ یہ لوگ ان ٹوٹے ٹیڑھے برتنوں سے ٹانوس ہو گئے تھے

ان کو تین وقت ان میں کھانا آتا تھا اور انہیں یہاں آتے کئی روز گزر گئے تھے۔ ارشد کے بھی کپڑے پھٹ چکے تھے۔

ماجرے ہوئے اور گرد آلود تھے۔ دریا کے سیلابی پانی کی مٹی اس کے بالوں میں جمی ہوئی تھی۔ صرف منہ دھلا ہوا تھا۔ اس

سے زیادہ پانی ہی کہاں تھا کہ سر بھی دھولیں۔

چاروں اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ مزارع نے حسب عادت ایک روٹی بزرگ سا سالن رکھ کر علیحدہ بیٹھنا چاہا

ن طاہرہ نے منہ سے میں آکر ڈانٹ دیا۔ ”تمہیں ہر روز کھانا پڑتا ہے کہ ہمارے ساتھ بیٹھ کے کھایا کرو۔ وہ مزارعین

ال آباد میں رہ گیا ہے۔ یہ پاکستان ہے۔ یہاں بادشاہ اور مزارع ایک ہی گالی میں کھاتے ہیں۔ تم اب ہمارے نوکر نہیں

ہو۔ اور مزارع دیہاتی ہنسی ہنس کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

ایک وہ ارشد کہ جلال آباد میں اس کے چہرے پر ہر وقت پر عزم اور باوقار سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ وہ بیٹھا ہوتا تھا

بی یوں لگتا تھا جیسے اس کا جسم صرف ہے اور ہچاک دوڑ رہا ہے اور اب وہ ارشد کہ لفظ کی کیمپ میں پہنچتے ہی

ہیت بدل ڈالتی۔ تھکان زدہ ہونٹوں پر تبسم۔ زبان پر مزاح، آنکھوں میں شوخی اور شرارت اور ہاتھوں میں جلیلا پن۔ اس کی

ل باتیں اور حرکتیں کھلنے دے لوگوں سے ملتی جلتی تھیں۔ اب وہ چند منٹ سے زیادہ سنجیدہ نہیں رہتا تھا۔ مزارع کو سادہ

لیکن میا شیوں اور کھوں کے سینکڑوں لطیفے اسے زبانی یاد تھے۔ ذرا سا چیرہ دوا اور کمرہ مقبول سے بھر جاتا تھا۔

وہ دن بھی گزر گیا۔ رات نے لوری دے کر پناہ گزینوں کو سلا دیا۔

مزارع اور عفت جلدی سو گئے۔ ارشد اور طاہرہ اور اُدھر کی باتیں کرتے۔ ہے۔ ستمبر کی رات کی تنگ چاندنی کمرے

روشن دانوں میں سے جھانک رہی تھی۔ کمرے میں چاندنی نے رومان بکھر دیئے تھے۔ ارشد اور طاہرہ بھول ہی گئے تھے

انٹوں کے غیر ہمارا فرش پر لیٹے ہوئے ہیں۔ کرنیں جلتی سرکھی ارشد کے سینے تک پہنچ گئیں۔ اس کی فیض بخشی ہوئی اور بن۔

کھلے تھے۔ لیسنے نے سیلاب کی مٹی کے نشان لیسنے سے دھوڑا لے تھے اور لیسنے کی سرخی مائل سپیدی بکھر آئی تھی۔

”نہیں نہیں آ رہی، طاہرہ؟“

”نہیں۔ بالکل ہی نہیں۔ باہر چلیں؟“

”گھومنے کو جی چاہتا ہے؟“

ہیں!

”حلیو“

اور تھوڑی دیر بعد وہ رضیو جی کیمپ سے ذرا دور ریلوے اسٹیشن کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ چمکتے پانی کی

لکیروں کی طرح، ریلوے لائن، درخت کا ٹک سنبھری جلی گئی تھی۔ پورے چاند نے سوئی ہوئی دسیا پر سفید اور لطیف پر وہ ٹال دیا اور اس پر دے میں سے ہر چیز کا جن جن جاک بکارت چاندنی خاموش تھی۔ دشت اور کھیت خاموش تھے۔ ساری کائنات سکوت طاری تھا۔ رات کی لذت انگیز شکنی میں ظاہرہ اور اشتہا جگ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے ذرا ہٹ کر بیٹھے ہوئے تھے لیکن دل قریب۔ بہت ہی قریب۔ جانے کس طرح اور شکا ہاتھ ظاہرہ کے ہاتھ میں جلا گیا اور دونوں ہاتھوں انگلیاں اگلیں اگلیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دکھا۔ ایک چہرے پر چاندنی پوری طرح پڑی تھی اور دوسرے اپنے ہی چہرے کا سایہ تھا۔ اس چہرے کا ناٹھاسے میں بھی اچھی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے تاثرات تو انداز میں بھی نظر آتے ہیں۔ ہر دیکھنے میں جانتے، محسوس کئے جاتے ہیں۔

دو دنوں ہاتھوں نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دونوں ہاتھوں نے ایک دوسرے کو دبایا پھر جانے لے پہل کی اور جاگنے کی کوشش کی تاہم تھکا کر طاہرہ کو سراسر ارشد کے سینے پر بٹھا۔ اس کے چڑے چڑے ہوئے اور مٹی سے اٹے ہوئے بالوں میں ارشد کی انگلیاں خوبصورت سانپوں کی طرح رنگ ربی تھیں۔ پھر باتیں ہوتی ہیں۔ باتیں ہی بتلاؤ جلال آباد میں پہلی ملاقات کی باتیں۔ پہلے جلوس سے لے کر فریجی کی کمپ تک پہنچنے کی باتیں۔ ان باتوں کے دوران ارشد نے طاہرہ کو ایک بار پھرہ ٹوٹ اور لیوات دکھائے جو خانوٹوں نے اس رات گھر پر کھولنے کے حلقے سے پہلے اسے کمرے میں لے جا کر اس کے حوالے کر دے تھے۔ اس روز سے ارشد نے انہیں کمرے کے گروڈیٹ رکھا تھا۔ ایک اس نے دو انگلیاں تھک کر دوانے میں جا کر ٹوٹوں کو دھوپ میں پھیلا کر خشک کر لیا تھا۔

ارشاد نے طاہر کو بتایا کہ ابھی اسے اپنے خاندان کا پتہ نہیں چلا۔ یقیناً ضرورت تھا کہ وہ کوئی مددگار ملے۔ طاہر نے جواب دیا کہ میں اسے اپنے مکان کا بھی پتہ دے دوں گا۔ ارشد نے کہا کہ میں اسے اپنے مکان کا بھی پتہ دے دوں گا۔ ارشد نے کہا کہ میں اسے اپنے مکان کا بھی پتہ دے دوں گا۔

پھر سیار کی باتیں جل جڑیں اودھتی ہی رہیں چاند نے دو دنوں پر کیکر کے درخت کا سایہ ڈال دیا اور خود اس کی او  
سب گویا چاند کو بھی معلوم تھا کہ یہ دونوں اللہ کے سپاہی ہیں۔ فاسخ ہیں۔ میدان جنگ کے تھکے ہوئے ہیں۔ یہ چوری  
لڑاکا قتل کرنے والے ملٹی جنون اور سرور اٹھانے والے۔

اس رات کے بعد طہرہ کے دل و دماغ میں جلال آباد اور قادیان کی خاتون کی تصویریں دھندلی ہونے لگیں اور ارشد کا خیال سوچ و فکر پر غالب آنے لگا۔ خواب بھی سہانے ہو گئے اور لقیہ کی کمپ کی گھنٹن اور کوفت کی بھی تہمت برکھائی۔

ایک دن طاہرہ ارشد کے سامنے کھڑی تھی تو اس نے ارشد کی کچھنی چھوئی تھیں کہ کھٹکے ہوئے گریبان کو کپکپا کر عیب کی بجائے تابی سے کہا "جب اسے گاؤں میں تیری قمیض کے تین ان ہاتھوں سے لگاؤں گی۔ اس کے لیے میں بہت بڑی تھی۔ اس نے نیچے والا ہنٹ ہانٹ میں ڈال دیا اور ارشد نے نہایت آہستگی سے اس کے کال پر تھکی دی اور سسکا کر گریبان پھیر دیا۔

ظاہر نے ارشد کو کئی بار کہا — ”اتنے پیسے میں ۱۰ اپنے لیے ایک تینوں قمیض اور جو تلوں کا ایک جوڑا لے لو تیس روز دربار برپا کر آجے۔“ لیکن ارشد نے ہر بار اڑل دیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب تک دو اچھے سے مکان میں نہ چلے جائیں ۱۰ اچھے بڑے نہیں بنوایں گے اور ایک بار اس نے کہا تھا — ”میں سب سے پہلے تمہارے اور عفت کے کپڑے بنواؤں گا۔“ ارشد روزمرہ کی طرح اپنے خاندان کی تلاش میں لاہور کی خاک چھانسنے کے لیے نکل گیا۔ ظاہر اور عفت وقت گزارنے کا غلط طریقہ نہیں سمجھتے تھے۔ سزاور میں کیمپ کی سیر کو نکل گیا تھا۔ عفت نے ظاہر سے پوچھا — ”ظاہری! اچھی بات! ارشد نہیں اچھا لگتا ہے؟“

ظاہر و کویہ سوال عجیب سا لگا۔ اس نے عفت کا دل بھلائے کی خاطر مسکرا کر پوچھا: ”کیوں؟ تجھے اچھا نہیں لگتا؟“  
 ”کیوں نہیں؟“ عفت نے کہا۔ ”مٹا کی قسم ظاہری ارشد بہت ہی پیارا آدمی ہے۔ لیکن ظاہری عفت کا  
 زہل کیا اور ذرا سے توقف کے بعد بولی: ”ارشد بہت کم ہمارے ساتھ رہے گا۔ اپنے خاندان کا پتہ بتائے ہی اپنے  
 رہا رہے گا اور ایک کھان مار مار کر پھرتی گی“

”ایسا نہیں ہوگا، محنت، تپا، رونا، اسے بتایا۔“ ہم اب ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ میں تیری شادی اپنے ہاتھوں  
 دل کی، اتنا لہو روں گی کہ دنیا تجھے دیکھے گی۔ اور تیرے لیے وہاں فدا تلاش کروں گی کہ تمام عمر جنت میں گزار دوں گی۔ وہ  
 بچے میں رکھے گا۔“

”اور ہماری شادی؟“

”اُری میری بھی جو جاتے گی۔ بخدا مجھے اپنے سے زیادہ تیری فکر ہے.... ظاہر نے بڑی بہنوں کے پیار سے  
میں نے تماری زندگی کا دفتر اٹھایا ہے، عفت! میں تو تمہارے لیے بڑی سے بڑی قربانی کر سکتی ہوں اور کروں  
لو تو ایسا دل بھی نکال کر تم سے دے دوں!“

عفت کے ان سو نکل آئے۔

ہکیوں؟ ظاہر ہے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر لپچھا اور اس کا سراپنہ سینے کے ساتھ لگا لیا۔ غصت اس کی آغوش  
رکھ کر لیٹ گئی۔ ”یہ آنسو کسوں؟“

”سوختی بولن طاہری اتم مرے سے لے کر کچھ کروا کر۔“

رفیقو کی کیمپ کی زندگی کا بلی اور قحط کی زندگی تھی پاکستان سے متعلق احترام اور جذبات لوہا ہی جبر ہے اور یہی ان اجڑے ہوئے لوگوں کا سہارا تھا لیکن چھوڑے ہوئے گھروں کا خیال، بچھڑے ہوئے عزیزوں کی یاد اور مستقبل کا کھری پر جگہ ایک حقیقت تھی — اٹل اور تلخ — ایک وہ تھے جو راہ میں شدید غم سے دوسرے وہ جو زخمی ہوئے اور تیسرے وہ جن میں کچھ ہی نہ بڑا لیکن ایک خوف و ہراس ان کے اعصاب کو ابھی تک کچل رہا تھا۔ وہ رات سوئے میں بھی جڑا کر اٹھ بیٹھتے تھے۔ اس خوف و ہراس کے علاوہ یہ تو بھی ایک سوال بن کر ان پر سوار تھا — ”اور اب؟“ اب یہ لوگ ایسے مقام پر کھڑے تھے جہاں سے اپنے گھروں کو واپس جانے کا تو سوال ہی ختم ہو چکا تھا لیکن نئے گھروں میں جانے کا سوال بھی تو ابھی سوال ہی تھا۔ یہ سوال کیمپ کے رہائشیوں کے لئے انکھوں میں جھلکتا تھا اور بعض دوسرے اس سوال نے ان کو بکریوں کی طرح دیکھتے تھے جہاں چارائے آدمی اکٹھے کھڑے دیکھے وہاں جانور لگتے تھے۔ کوئی نادر خان میں پرچا ہے لیکن وہاں تو ابھی تک ایک ہی خبر بروز روز برائی جا رہی تھی — ”آج فلاں جگہ کے اتنے سپاہیوں کو گولی مار دی ہے“

مردان کھوں کے چتھوں کی طرح تیزی سے علی آ رہی تھیں اور ان لوگوں کے پاس سوائے بوسیدہ فوجی کیمپوں کے کچھ بھی نہ تھا۔ کیمپ کی آبادی بڑھتی جا رہی تھی اور اب لوگ بلند آواز سے پوچھنے لگے تھے — ”ہیں کب بلایا جائے گا؟“ یہ سوال پوچھنے والی اور ایسی موضوع پر باتیں کرنے کے سوا ان لوگوں کے پاس اور کوئی کام نہ تھا۔ سیاست دان اس دور کو عبوری دور سمجھتے ہیں لیکن یہ لوگ تو کچھ بھی عبور نہیں کر رہے تھے۔ کارخانہ بند تھے۔ تھے۔ قوم کا ایک باڑی غلطی ہو گیا تھا۔ ان کے بازو بے تھے وہ کرشن مگر سنت لگا اور ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے گھروں تک ان کو پہنچ گئے تھے اور جن کا مانتا ان کا عرف تھا تھا۔ خدا کے گھر میں صرف ایک جگہ تھا جس میں ٹکا کا لیا تھا۔

پھر بھی لوگ ایک امید کے بل بوتے پر کبھی کبھار مسکرائے لیتے تھے۔  
 ارشد اپنے شاندار فن کا شوق میں مگن کیا تھا۔ مزارعہ بھی تھوڑے کھڑے کر لیا تھا۔  
 ”چلو نڈا اڑوس پڑوس کی خبر چلو“ طاہر نے عفت سے کہا۔ ”خائفانہ“ وہ نے جواب دیا۔ ”آج سے کسی سے کبھی شک نہیں کی“

”انہوں نے دافین طرف دیکھا۔ بڑی لمبی ہارک کے لیے برآمد سے، عورتوں، بچوں اور تھکے ماندے مردوں کی بالائی باتوں میں مصروف تھیں۔ اغلاؤں میں گھور رہی تھیں۔ طاہر اور عفت برآمد سے نیچے نیچے برآمد سے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ چلے گئے۔ وہ ان بے خانان کیمپوں کو بھیجتے جا رہی تھیں لیکن انہیں کوئی بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔  
 ”غیر پیسے دھیلے کے مکان میں جا بیٹھنے سے کیا فائدہ؟“ طاہر کے کانوں میں ایک مردانہ آواز پڑی۔

اس نے دافین طرف دیکھا۔ ایک ادھیر عمر آدمی ایک سے کمرہ تھا۔ ”سو دو سو کا بندوبست ہو جاتا ہے تو چار بڑی اینٹیں بغیر دزگار مکان میں جا بیٹھا ہے کیمپ میں دو وقت کی روٹی تول جاتی ہے۔“

”بہت کچھ...“ طاہر نے پوچھا۔ ”کیوں؟“  
 ”نہیں شک تو نہیں...“ عفت نے طاہر کو ہاتھ اپنے ہاتھ میں ملے ہوئے مل سے لیے۔  
 ”جوں کوئی ایسا دورا نہ آجائے کہ ہم الگ الگ ہو جائیں۔ کون جانے لگا ہوگا۔ انسانوں کو ملنے لگا دیتا ہے۔“  
 ”یہ کیا قصہ ہے بھئی؟“ طاہر نے غصے سے کہا۔ عفت کا یہ اندازِ تلخ اس کے لیے اجنبی تھا۔  
 ”یوں ہی خیال آتا ہے۔“ طاہر نے — عفت نے آہ لے کر کہا — اس کی آواز میں اداسی تھی۔  
 عفت طاہر سے بہت ہی مختلف تھی۔ اس نے زندگی کے چودہ برس یعنی پچیس کا تمام تر دور، مال کے ساتھ ساتھ اندھیری کو اندھیری میں تر غریب میں گزارا ہے تھے۔ مال کو لوگوں کے چھوٹے برتن یا کچھ اور اور پر کا کام کے چند بے روئین محلات تھی۔ اس میں دست پستی تھی جس میں بڑیاں چاؤ چیلے اور تین فرمائشوں سے مال باپ کا کد کر دیتی ہیں۔ اس عزم عفت نے ملنے کے اچھے گھروں کی آواز پہنچی تھی۔ یہ محرمیاں آسیب کی طرح شخصیت اور کد رہتی اور دل و دماغ کو وہم اور دوسوں سے بھرے رکھتی ہیں۔

طاہر نے عفت کو اندھیری غریب سے نکال کر بڑی راہ دکھا دی تھی۔ اس نے اسے اچھے دن اور پر کد دکھا جس میں اس سے عفت بطور عفت ہی نہیں رہی تھی۔ وہ ٹھوڑے جیسے پسانوے ساتے منڈلا رہے تھے۔  
 کرشن و شب کا شب کا بکرا بن گئی تھی۔ غریب کے بوجھ سے بھکی گردن تن کر اس کی خوبصورتی کو دل نشیں بنا رہی تھی۔ چال ہی خود اعتمادی اور شان سی پیدا ہو رہی تھی۔ بال جو سرسوں کے گاڑھے تیل سے چھیکے رہتے تھے۔ جھل کر شرم کے تاروں اور اب عفت جس وجہ میں طاہر کو متاثر کرتی تھی۔ دونوں کے طاہر ہی جن میں بہت معمولی فرق تھا۔

پھر بھی ادا کے تلخ اثرات لاشعور سے ابھر رہے تھے۔ رفیقو کیمپ میں ان اثرات اور لوگوں کی گفتگوئی سے اسے اس شک میں ڈال دیا کہ طاہر اور ارشد اسے راہ میں ہی چھوڑ دیں گے۔ یہ شک ایک احساس بن کر اسے پریشان لگا۔ اس احساس کی عمر شاید اس کی پچھلی پرانی فیض اور طاہر حال علیہ تھا۔ اس فیض نے شاید اس کے ذہن پرانی یاد تازہ کر دی تھی۔ حالانکہ وہ دیکھ رہی تھی کہ طاہر اور ارشد بھی اسی حال میں ہیں — لیکن اس قدر زوردار ارشد اور طاہر کے پاس ہے... عفت نے سوچا — ”اس میں میرا کیا حصہ ہو سکتا ہے؟“ اس پر میرا کوئی جلال آباد کی بات اور تھی۔ وہاں تو طاہر کو آدمی کی بے انداز آمدنی تھی۔ مجھ جیسی چھ اور لڑکیاں اس آمدنی میں آس پاس کی تھیں اور اب تو یہی زوردار روپہ ہے کب تک چلے گا؟

طاہر و باہر نفسیات نہیں تھی۔ وہ سمجھی کہ ماں کی موت نے قفل عام کی سبب اور ہولناکی نے اور بے عفت کو غم اور پریشان کر دیا ہے۔ وہ اسے تسلی دلا سہ دینے لگی اور سمجھی کہ اس نے اسے ہلا لیا ہے۔ چہرہ تیار تھا کہ جو دم اس کے ذہن میں سا گیا ہے اسے وہ بیان نہیں کرنا چاہتی یا اس کے پاس اظہار الفاظ نہیں۔

”کچھ تیر چلا؟“ — طاہرہ نے انکو گالافانہ پھاڑ کر پھیلاتے ہوئے کہا۔

”اسی خوشی میں تو انکو لایا جنوں“ — ارشد نے خوشی سے بھر پور آواز میں بتایا — ”ابا جان کے ایک واقعہ کار اتفاق سے مل گئے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ میرا سارا خاندان راوی روڈ پر کہیں ایک بہت بڑی کوکھی میں مقیم ہے۔ ابا جان کو اسی جگہ میں اسی پوسٹ پر لے لیا گیا ہے لیکن اس آدمی کو کوکھی کا پورا پتہ معلوم نہیں تھا۔ پھر میں ابا جان کے دفتر گیا۔ معلوم ہوا وہ دس روز کی چھٹی پر ہیں۔ کوکھی کا وہاں بھی کسی کو پتہ معلوم نہ تھا۔ اب سات آٹھ روز ذرا خاک چھانی پڑے گی۔“

”کیسے میں انکو بلے جا سکتا ہے؟“ — طاہرہ نے عام سے لہجے میں کہا۔ ”بہن! لوگوں کی حالت بہت بُری ہے۔ آئندہ یہ عیاشی یہاں نہ کرنا کہیں مکان مل گیا تو دیکھا جاتے گا۔“

”تیرا بڑا بھائی“ اس نے کہنے سے پہلے دواؤں بیٹھی۔ ”جی تھی تہذیبیت نہ کر۔“ — تیرا بیٹا —

ایک ہزار روپیہ دے دیا جاتے۔ بے چارہ روزگار کا بندوبست کر لے گا۔ ورنہ اس کے چار بیٹے سڑی میں مرجائیں گے۔ اسی بے روزگاری کی وجہ سے وہ مکان میں نہیں جا رہا۔“

اسی رات ٹھٹھا تے کیے کی روشنی میں وہ آدمی اور اس کی بیوی، ارشد، طاہرہ، عفت اور ذرا ع کی گھٹلی میں بیٹھے جوتے تھے اور طاہرہ اسے کہہ رہی تھی۔ ”یہ ایک ہزار روپیہ قرض نہیں ہے کل ہی مکان میں چلے جاؤ اور دوکان کا بندوبست کر لو۔“

”اور دیکھو، بڑے میاں! ارشد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھکانے لہجے میں کہا۔ ”میں وہاں آکر دیکھوں گا۔ اگر ایک بیٹے کے اندر تم نے دوکان نہ کھولی اور اس رقم کو گھر بیٹھے بیٹھے پیٹ کی نذر کر دیا تو میں لو پولیس کے حوالے کروں گا۔“

”نہیں رہے بونا؟“

”میرے مالک! — آدمی نے ہاتھ جوڑ کر فرمانداز میں کہا۔ ”میرے بیٹے ساری عمر تجھے اور تیری ان بہنوں کو دعائیں دیتے رہیں گے۔“

طاہرہ اور عفت نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیں۔

دوسرے دن ایک خاندان آباد ہونے کے لیے جا رہا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر طاہرہ اور ارشد کو الوداعی سلام کہا اور دعائیں دیں اور نئی زندگی کی طرف روانہ ہو گئے۔

”جیو! ایک ہزار روپیہ ٹھکانے لگا۔“ ارشد نے اطمینان کی آہ لے کر کہا۔

”میں تو اتنی بول کر باقی روپیہ بھی اسی قسم کے متحق لوگوں کو دے دیا جاتے۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”اور زیورات نہ لیے رہنے دیں۔“

”طاہرہ! تم بہت سادہ دل کی جو۔“ ارشد نے کہا۔ ”مستحق لوگوں کی تلاش بڑی مشکل ہے۔ مجھے تو جسے یہ لوگ حرام کاروبار پر کچھ کر رہے ہیں برا دکھائی دے گا۔ ہاں اب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ روپیہ اسی مقصد کے لیے وقف کر دیا جائے ضرورت کے مطابق ادا کیا جائے۔ رجبات میں دینا محض برا کر کے والی بات ہے۔“

رات بھی برسات کی طرح خاموش ہو گئی۔ ارشد اور طاہرہ اپنے دونوں ساتھیوں کو سوتا چھوڑ کر چاندنی میں لپٹی

طاہرہ نے کمر عفت کو بھی روک لیا، دونوں اس کنبے کو دیکھنے لگیں۔

”آؤ بی بی بیٹھو۔۔۔ اکیلی ہو کر مرد بھی ساتھ ہیں؟ ایک عورت ان سے مخاطب ہوئی؟“ وہ دونوں بہنیں معلوم دونوں ان کے پاس فرش پر بیٹھ گئیں۔ طاہرہ نے کہا۔ ”ہم جلال آباد سے آئے ہیں۔ مرد ساتھ ہیں۔“

یہ موقع کہنا یا سننے کا نہیں تھا کہ کیا ان بھی نئی نہیں تھیں۔ سب کے سینے پر ایک ہی کمانی لکھی ہوئی۔

سب ایک ہی کمانی اٹھاتے اٹھاتے پھرتے تھے۔

”آپ کو شاید مکان مل گیا ہے؟“ — طاہرہ نے پوچھا۔ ”آپ کہہ رہے تھے۔“

”ہاں جی! عورت نے کہا۔ ”مکان تو مل گیا ہے۔ اللہ خوش رکھے، اپنے رشتہ دار لاہور میں پہلے سے موجود۔“

نئے ایک مکان کو تلاش کیا گیا ہے۔ کل دیکھ چکے تھے اسے میں لیکن وہاں جا کر کریں گے کیا؟ ترن نارن میں چھوٹی سی دوکان؟

”جیہاں کاپیٹ بھر جاتا تھا۔ اب چھوٹی گھڑی نہیں۔ یہ دیکھتے چار پیسے ہیں۔“ اُپر سے سبزی چرخی آرہی ہے۔

مرے تو جانے میں مرجائیں گے۔ عورت کے آسوں مل آتے۔

”آپ کو کتنا روپیہ چاہیے؟“ — طاہرہ نے پوچھا۔ ”آپ کم از کم کتنے میں دوکان کھول سکتے ہیں؟“

”یہ تو سنا ہی بیجا ہے۔“ ”بچوں کے باپ نے فرش پر لے پڑی ہے کروٹ بدلی اور کہا۔ ”پیسے کا جی سوال اس سوال کا کوئی حل نہیں سچی بات ہے کہ قتل کی گئی ہوئی نہیں۔“

”نہیں! میں دیکھنے پر چلی ہوں۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”اللہ کا راز ہے۔ انسان بہت تو کرتا ہے۔“

”دوکان کھول لو ایک ہزار روپیہ چاہیے۔“ اس نے آہ لے کر جواب دیا۔ ”ہزار کی دوکان میں پانچ سو روٹے نکل آتے ہیں اور چھ بڑی کے لیے تو سو دو سو بھی بہت ہیں لیکن چھ بڑی میں جھک جھک زیادہ ہوتی ہے۔“

ان بچوں کا گھر کھاتے جا رہے، بی بی زہرا دیکھو تو! ٹرا پیچوں میں پرستھا اور چھوٹا تیسری میں۔ اب یہ اجڑے گے اور تمام عمر مزدوری یا چپڑاس کر رہے ہوں گے۔ جاننے میں نہ لیا کیا کیا تھا۔

”فکر نہ کریں۔“ طاہرہ نے عرض کیا۔ ”خود اعتمادی سے کہا اب تو ابی حکومت ہے۔ کوئی بھوکا نہیں، کوئی بچہ تعلیم کے نہیں رہے گا۔ ہم نے جو خون پسینہ بھریا ہے۔ آئیگاں نہیں جاتے گا۔“

”ہاں، بی بی! — اس نے کہا۔ ”میں بالوں تو نہیں ہوں۔ اس سبز جھنڈے پر بھر دوسرے۔“

”ہاں! یہ بات! — طاہرہ نے کہا۔ ”میں نے پاکستان بنایا ہے، جھک تو نہیں ماری۔“

مرد وہیں کھڑا اور طاہرہ اس کے بچوں کو کھتی رہی بچوں نے ماں کو روٹی کے لیے پریشان کرنا شروع کیا۔

ماں انہیں ٹال رہی تھی۔ طاہرہ یہ منظر زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی اور عفت کو لیے واپس آگئی۔

ارشد ان کے کچھلے پر دایں آیا۔ پسینے میں نہلا ہوا آتے ہی انکو سے بھرنا اٹا فافو لوگوں کے سا کر ہوا۔

”آج پہلی بار بھول میں روٹی کھا لی ہے اور تھارے لیے انکو لایا ہوں۔۔۔ آج چاہے! اس نے مسکراہٹ سے مزارعہ کو بھی ملایا۔

”اسی فریاد کے کھینٹا ہوا نساں جھلکا اور منگ ہو سی۔“  
دل میں افسان کرتے، ارشد! سینوں سے نکلی جوتی برسی کی کہ تاہرین  
دھوکی کی دوسو بیڑی یاد رکھاں جدول باز دل میں تنگ ہو سی۔  
پرتی آواز کے اور مینے، ارشد نے سکون کی آہ لی اور اپنا کال  
پانچامنی کی لطیف لہروں پر تیرتی تھی، سبز گھاس کی تیاں لرز

”یہ لوگ زندہ ہیں۔“ — ارشد نے جوش میں کہا۔

”ہم سب زندہ ہیں“ — طاہرہ نے وجد میں کہا۔

خاموشی — طویل خاموشی اور اس خاموشی پر قص کرتی بیوٹی نغمے کی بازگشت۔

”ارشاد: ایک آدم، زیرِ لب۔

”طاہرہ! — ایک سرگوشی، بختاب آلود۔

انھیں ایک دوسرے کے قریب ہو گئیں۔ انھوں نے کپتیاں پھیل گئیں پھلتی چلی گئیں قریب اور قریب پانزدہ سال کی مسجونہ موسیقی سے مسحور ہوئے خود بھری چلی فنون کی گونج ابھی تک فضا میں تر رہی تھی۔ انھیں ایک دوسری میں جذب ہو گئے۔ دو دل ایک دوسرے کے ساتھ لگے دھڑک رہے تھے۔ ان کے دل میں یہی گونج دور بہت دور سے پھر ایک دور ایک گرا کر ابھرت۔ دوسرے کے پیروں نے دوسرے کی پیڑی پر قیامت خیز دھواں لٹکیا جو طارہ اور ارشد کے سینوں میں ٹھنکے ٹھنکانوں میں تحلیل ہو گیا۔ ان کے دھوئیں نے ان پر سایہ کر لیا۔ چاند بے آواز پاسفرط کرتا گیا اور کیر کی شاخوں میں گھٹنے لگا۔

”رات گز رہی ہے۔“

”گذرگتی ہے۔“

”مرغ اذانیں دے رہے ہیں۔“

”سحر طلوع ہو رہی ہے“

وہم

”کونکرے تیرے آکھند“

وہ اٹھنے چلنے رکے رک کر چلے۔ یوں جیسے جانڈی اگتھی کڑنوں کے سہارے چل رہے ہوں۔ بازو ایک سرے کی کمر کے گرد غطرت انہیں چوم رہی تھی، بڑیاں غاشمی کڑی تھی، عریہ تمہارا انعام ہے، تم نے مجھے کوجینوں سے لایا، تم نے خدا کا سہرا ہرچم پر لیکھ کر کافر کے سینے پر لہرایا ہے، تم جھکے ہوئے جو تہ سناؤ میرے بچے کھیلو۔ اب کیلوا، خدا کا تہا سہرا لے رہے۔

نبوتی اس حسین خاموشی میں گم ہو گئے۔ جہاں دو گزشتہ رات جا بیٹھے تھے۔ گزشتہ رات ابھی کی وصل نے انہیں محبت کی لے کے خودی سے جگایا تھا۔ لیکن آج روح ریلوے لائن سے دور کھلے میدان میں بیٹھ گئے جہاں ہر طرف پھیلے ہوئے گھاس کی اوج افزا جھبھی جھبھی خوشبودار وادیاں جگلا رہی تھیں۔ پنجاب کی تنگ رات کا وہاں عروج پر تھا۔ طالع بد نے ارشد کا طوط دیکھا اور چند آنٹنے اسے دیکھتی ہی رہی جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اتر پردیش کی بڑھاپی رہی تھی۔

وہ خاموش تھیں لیکن ان کے دل خاموش نہیں تھے۔ سینوں میں بل بلاتی تھی۔ ان کے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے سے پس بکریں۔ یہ خوف تھیں۔ ان کے سامنے یہ بیان تھا جس کے بیان ظرف رنجیہ جی کہیں کی کہیں تھیں اور بارکوں کے باغدوں میں مشرقی پنجاب کا سارا حسن، ساری زندگی کی کا گمشدہ اور باہمی قیدیوں کے روگنی تھی۔ اہلماں نے فصلوں میں دھن کر کے میرے وارث شاد کے بول، مرزا صاحبان کی بلوایاں، لڑکوں کے انگریزیت، بچوں کے معشوم فقے، دوشیزاؤں کی لکلی، کبڈی کے ڈھول، گڈوں کی دوڑ اور مشرقی پنجاب کی تمام مرمیقیت اور سرگرمی سمٹ سٹا کر ان خرد و چہتوں کے نیچے سو گئی تھی۔ ارشد کو آج پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ راج پرورد ہنگامے مجبور ہوئے جارہے ہیں۔

خاموش رہو گے آج؟ — طاہر نے خواب کا آواز میں پوچھا۔

ارشاد نے طاہرہ کی طرف دیکھا اور باز اس کے کندھوں پر رکھ دیا۔ اس نے آہ لی، کوئی جواب نہ دیا۔

”کیوں؟“ — طاہرہ تڑپ اٹھی۔

”بعض اوقات دل بوجھل سا ہو جاتا ہے۔“ ارشد نے دیکھی ہوئی سکرابٹ سے کہا۔ ”سوچتا ہوں یہ مجبور زندگی کی کیا ایک بار پھر مش کھیل سکے گی؟“  
 ”یہ مجبور تو نہیں؟“ طاہر نے کہا۔

”نہیں! — ارشد بلال — ”میرا وہ طلبہ نہیں، ہم نے شہیدوں کا خون دے کر ایک نئی زندگی حاصل کی ہے۔ میرا مطلب اس رجاؤ سے ہے جو مشرقی پنجاب کے درو دیار اور گندم کے ایک ایک خوشے میں تھا۔ وہ بات پیدا ہو سکتی گی، طاہرہ! سوچتا ہوں یہ مجبور متدن وال روٹی کے دھندے میں ہی وہ مرنے کوڑے سے، وہ دس چھوڑنے کا ٹوٹھے کوئی رُک رہا نہیں۔ یہ خوشحالی اپنی جگہ ہے لیکن انسانوں کی وہ بیباختہ مسکراہٹیں — وہ اڑتے چڑتے دوپٹے، وہ موچکوں پر تار، وہ گیت، وہ بھولے...“

”الف اُج دی رات سہاگ والی کھٹکے کی جاناں کپڑا رنگ بوسہ“

کیمپ کے اس کونے سے ایک سرسبز اور چرخاوار بلند مرقی رات کا سکوت بھی وہاں میں اگیا۔ چاندنی جھوم اٹھی۔  
کی موسیقی محسوس لمحوں کی طرح ارشاد اور ظاہر کے گرد مٹھانے لگی۔ ظاہر کے جسم نے جھرجھری لی اور دور ارشد کے  
نزیب ہو گئی۔

”وہ زندگی زندہ ہے ارشد!“

جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو کمرے کا سامرا ماحول سوتا تھا۔ ارشد لیتے ہی سو گیا لیکن طاہرہ سوئی چلا جا  
بارک کے کونے پر بیٹھا اذنگھڑا تھا اور اس کی تھکی ہوئی ایک کون کھڑکی کی راہِ عفت کے چہرے پر ستاری تھی۔ طاہرہ اس پر غما  
حسں چہرے کو دیکھنے لگی۔ کتنا پاک چہرہ کس قدر مصوم۔ طاہرہ نے ہاتھ بڑھایا کہ عفت کی پیشانی پر پڑے بال پیچھے کر دے  
ہاتھ رک گیا، وہ جاگ نہ اٹھے۔ جائے کیا خواب دیکھ رہی ہوگی۔ طاہرہ اسے دیکھتی رہی اور زیر لب کہا۔  
”میری پیاری عفت! یہ سارا زور تجھے دے دوں گی میں نے تجھے سب کچھ دینے کا وعدہ کیا ہے جو مانگو گی وہ  
لیکن دیکھنا میری بہن! کہیں ارشد ہی مجھ سے نہ لنگ لیا۔ یہ متاعِ عزیز نہ دے سکوں گی.... شامیری اچھی عفت؟ اچھا  
طاہرہ کی سرگوشی خواب کی آواز بن گئی۔

”دوسرے دن ناشتے کے بعد ارشد حسبِ معمول اپنے خاندان کی تلاش میں نکل گیا۔ طاہرہ اور عفت ساتھ والی بارک  
دوسرے پر چلی گئیں۔ طاہرہ نے آج پھر دو کپڑے ڈھونڈنے کے لیے جنسین مکان تول گیا تھا لیکن روزِ گار کی کوئی صورت نہیں  
1۔ طاہرہ نے رات کو ان کے مردوں کو اپنے کمرے میں بلایا۔ ارشد سے پانچ پانچ سو روپیہ لے کر ان کے حوالے کر  
اور انہیں کہا۔ ”یہ روپیہ تمہارے پاس خدا کی امانت ہے اگر اس میں خیانت کرو گے تو خدا تم سے جواب طلبی کرے گا۔“  
”طاہرہ! عفت نے ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد طاہرہ سے کہا۔ ”اتنا روپیہ تم کو یوں ختم کرتی جا رہی  
ہے پانچھی کچھ خیال کرو۔ ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔“

”ہمارا خیال خدا کرے گا عفت! طاہرہ نے کہا۔ ”اتنا روپیہ ہم اپنے پاس کس طرح دبا رہیں جب  
بے پردہ میں ہی لوگ پیسے پیسے کو توڑ رہے ہیں۔ کیا یہ گناہ نہیں کہ محض پانچ سو روپوں کی خاطر ایک کپڑے کی زندگی بٹا  
ہو اور ہم پانچ ہزار روپیہ سینے سے لگائے بیٹھے رہیں؟“

”تم یہ مت بھولو، طاہری! کہ تم لڑکی ہو خدا جانے کل کوئی سما رہا ہی لے یا نہیں ہے۔“

”اس سے میری غمزدگی ہی کہ عفت! کسی کو تکلیف میں دیکھ کر مجھ سے رونا نہیں جاتا۔ معلوم نہیں میں خدا کو خوش کر رہی  
ہے اپنے آپ کو لیکن کسی کا ہاتھ بنا کر مجھے لذت محسوس ہوتی ہے۔“

طاہرہ کو معلوم نہ تھا کہ اس کے باپ نے صفت اس لیے اس کا گناہ ٹھٹھا پٹھا کر دیا تھا کہ وہ لڑکی تھی۔ خاتون یہ راز اپنے  
بابا ہی دبا تے سرحد پار غلام تو میں سو گئی تھی کہ ساجدہ کو لڑکی پیدا کرنے کے لیے چڑھیں نہ دیا گیا تھا۔ اب تو یہ رازِ جلال آباد کے  
نئے مکانوں کی راہ میں مل بھون گیا تھا۔

ارشد طاہرہ کے اس شہد کی راہ میں مزاحم نہ ہوا۔ اس کے اپنے جذبات طاہرہ سے بیٹے جلتے تھے۔

شام کو ارشد کمرے میں داخل ہوا اور مبارک ہو، گھر مل گیا، مبارک ہو۔ کے نعروں سے کمرے میں شگفتگی بکھڑی  
ہو ا پس جا رہا۔ ”... اس نے کہا۔ ”رات کو واپس نہیں آؤں گا۔ آبا جان کی کوٹھی کا پتہ مل گیا ہے۔ خواہ تمام  
اش میں گھر جاتے دھونڈ کے ہی دم لوں گا۔... کوٹھی کا نام ہے آشا بھون، صبح سویرے تم تیار رہنا میں ناگھر لے  
آؤں توڑے کھانا لے آؤں.... ارے ہاں طاہرہ! کیوں تم میں نور کے کو ساتھ لے جاؤں۔ یہاں تمہیں کئی ڈر خطرہ



تو نہیں؟

”ہاں! — طاہرہ نے کہا۔“ اسے ساتھ ہی لے جاؤ تو بہتر ہے۔ رات کا وقت ہے اور تمہارے وہ چپ بگٹی اور ارشد کو ٹکڑی مندی سے دیکھنے لگی۔ ارشد نے بھی رقم اور زیورات مکر سے ہانڈھ رکھے تھے۔ ارشد اور مزاحہ رات کو چلے گئے۔ طاہرہ اور عفت ایک نئی امیڈ اور ایک نئے دلوے کی بنیادوں پر قلعے بنانے لگیں۔ انہوں نے دنیا بھر کے پروگرام بنائے۔ باہر کی دنیا اور گھر کی جتنی اور یہ دونوں لوگوں کی خوشی کے اچھل کود ہی تھیں۔ آخر طاہرہ نے ویسا ہی دیا اور دونوں لیٹ گئیں۔ بظاہر دونوں سونے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن نیاوں میں جیہان اور اضطراب تھا۔ دونوں کے قصورات اپنی اپنی راہ بنارہے تھے اور دونوں کے ذہن الگ الگ تھے۔ خواب دیکھ رہے تھے۔ پانچ مہینے میں تیرہ مہینے میں آ رہی تھیں اور عمر و پراسرار نحو سے ستور ہوا۔

”نیز آ رہی ہے؟ — عفت نے طاہرہ سے پوچھا۔

”آئی تو نہیں؟ — طاہرہ نے منگھٹے سی بے چینی سے جواب دیا۔

”کوئی بات کرو، طاہری؟

”تم جی کچھ کہو۔

عفت سرکل کو طاہرہ کے قریب آگئی۔ طاہرہ پیٹھ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ عفت اس کے قریب لیٹ

لیٹ گئی اور ایک ہاتھ طاہرہ کے گال پر رکھ کر پید سے کہا۔ ”طاہری! ایک بات پوچھوں؟

”پوچھو؟

”تم ارشد کو جانتی ہو؟

طاہری نے منہس کر کر دھت بدل لی اور عفت نے اس کی عمر کے گروڈاؤ لیٹ کر اسے اپنی طرف

ارشد انہیں ایسا مردہ ٹھاکا تھا جس سے ان دونوں لوگوں کے غم جیسے دھل ہی گئے تھے۔

”تم نہیں جانتی اسے؟ — طاہرہ نے پوچھا۔ ”ہم موت کی وادیوں میں ہم سفر رہے ہیں۔“

جوں کہ میں ارشد کو نہیں جانتی؟

”ہاں جی بھئی نہ بنو طاہرہ۔“ عفت نے کہا۔ ”تم جانتی ہو میں کیا پوچھ رہی ہوں؟

”مجھے ارشد سے تھوڑی تھوڑی محبت ہے۔“ طاہرہ نے مسکرا کر کہا۔

”طاہری! — عفت کے چہرے کا تاثر اوروں کے دل پر ایک لمٹ بدل گیا اور وہ ہنسی کی گے بولی۔

مجھے معلوم نہیں میں نے دور و فانی اور چمک بھی دیکھی ہے جو ارشد کو دیکھتے ہی تمہارے چہرے پر اور آنکھوں

میں نے تم دونوں کو آدمی رات کے وقت باہر جاتے دیکھا ہے۔

”اری میں تو کبھی جتنی تم سوری ہوگی۔“ طاہرہ نے ہنسی مذاق کے لئے کہا۔

”نہیں۔“ طاہری عفت نے دیکھی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”میں جاگ رہی ہوں جتنی میں نے کبھی

کو ارشد کا ہاتھ پکڑ کر اسے دیرالگ تھک لے جاؤں لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ طاہری! میری سنی اور حقیقت یہ کیا ہے۔ تم اوپنے خاندان کی لڑکی جو اور ارشد بھی میرا تم دونوں کے ساتھ کیا جوڑ ہے؟

”تم غلط کہتی ہو۔“ طاہری کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ”میں نے تمہارے دل سے یہی اوپنے نیچے کا احساس دور کرنے کی خاطر ماننے کی کیا جتن کیے ہیں لیکن تم ابھی تک اس کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہو۔

”کچھ بھی ہو۔“ عفت نے سر کو ہٹک کر کہا۔ ”ارشد کے معاملے میں تم بہر صورت مجھ سے برتر ہو۔۔۔ میری سنی

نو طاہری! ہم میری بہن جو تم نے ہی مجھے بہن بنایا ہے۔ آج اپنی بہن کی باتیں سنو۔۔۔ ایک رات جب تم دونوں باہر نکل گئے تو میں بھی پیچھے پیچھے چلی وہی۔ ”کیکپ کی“ دیوار سے بہت آگے نکل گئے اور میں دیوار کی اوٹ میں پھنسی رہی۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر کھڑی رہی۔ میں روٹی بھی تھی۔ میں کون تھی۔ تمنا ہی۔ اد میں حاکم ہونے والی، طاہری؟۔۔۔ میں کہاں ہوش ہو گا۔ کال رات جب ایک دل جلانا کس کے قصور میں اور کس کی یاد میں کھو یا بھگا رہتا تھا۔ کوئی گل و سوجھڑی یا دکھان جدوں باؤں تان دل تنگ ہوئی۔ اس وقت میرے بھی دل سے یہی فریاد نکلتی تھی کہ طاہری! تمہارے یوں چلے جانے کے بعد میرا دل روتا ہے۔ مجھے بھی کوئی بات کہ جا کر کہ اس روتے دل کو بھلا لیا کروں۔

طاہرہ کو دل پھیل کر صحت میں ایک گیا اور عفت کے سینے کے کوڑاؤٹ گئے۔ اس کے آنسو بہے جا رہے تھے اور

الفاظ کا پیتے بہتوں سے پھسلتے ہی آ رہے تھے۔ وہ کتنی گنتی اور طاہرہ ہنسی رہی۔

”طاہری! تم نے مجھے کال کوٹھری میں سے نکال کر گھر میں لایا تھا۔ تم نے مجھے غربت کی گرد سے اٹھا کر نواری چنگوں پر سلا یا تھا۔ تم نے میری اجڑی ہوئی زندگی کو مسکراہٹوں اور مسرتوں سے سمیٹا لیا تھا۔ تم نے میری زندگی کو میرے دل کی تپائیں تم نے یہاں آکر کس بے دردی سے چھلین اور میری انگلیں تم نے رات کی خاموشی میں مجھ سے چھین لیں۔

”تم نے مجھ سے کبھی ذکر بھی کیا تھا کہ تم ارشد کو اس قدر جانتی ہو؟ — طاہرہ نے پوچھا۔

”میں کون ذکر کرتی؟ — عفت نے جواب دیا۔ ”تم نے مجھے رشیم کے کپڑے کو ہونا دیتے لیکن میرا دل ہی کھڑی میں ہوس رہا۔ جو خدا نے میری قسمت میں لکھ دی تھی۔ میں اور ارشد کو کجا دیکھتی ہوں تو اپنے آپ کو غفل میں گم ہل کا پیوند سمجھنے لگتی ہوں۔ اسیے میں میں بھاگ کر اسی کال کوٹھری میں جا چھپ جاتی ہوں جہاں سے تم نے مجھے نکالا تھا۔ میری دنیا ہی تھی، طاہری! میں اس اندھیرے سے کبھی نہ نکل سکوں گی۔“ میں نے یاد ہے، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں جوانوں کی تم تو دو گی میں اس وعدے کو دہرا نہیں جانتی تھی۔ تم نے یہ کجا وعدہ اس لیے کیا تھا شاید میں زیور یا کوئی اور چیز مانوں گی۔ تم ہزار بار ارشد اور قربانیاں کرو، طاہری! لیکن تم مجھے ارشد تو نہیں دے سکتی؟

طاہرہ کے آنسو نکل آتے۔

”یہ ہے وہ دوسرا جس کا میں نے اس روز ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ انساؤں کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔“ عفت نے کہا۔

میں نے کہا تھا کہ تو کی ہوں ہماری راہ میں ایسا دورا نہ آجائے کہ ہم جدا ہو جائیں۔۔۔ آہ، طاہری! — عفت نے طاہری کا ہاتھ دیا اور اسکی لے کر کہا۔ ”وہ دورا آگیا ہے۔ اب میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گی۔ ایک دفعہ تم پہل سکوں گی میں نے

یہ ہے وہ دوسرا جس کا میں نے اس روز ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ انساؤں کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔“ عفت نے کہا۔

میں نے کہا تھا کہ تو کی ہوں ہماری راہ میں ایسا دورا نہ آجائے کہ ہم جدا ہو جائیں۔۔۔ آہ، طاہری! — عفت نے طاہری کا ہاتھ دیا اور اسکی لے کر کہا۔ ”وہ دورا آگیا ہے۔ اب میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گی۔ ایک دفعہ تم پہل سکوں گی میں نے

بہت کوشش کی ہے کہ ارشد کو دل سے نکال دوں۔ میں اس کے خیال کو آنسوؤں میں بہانے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ لیکن آنسو بہ گئے اور خیال نیل ہی رہا۔ دماغ پر سوار۔ اعصاب پر سوار اور میں... غفلت کی آواز دب گئی اور وہ خاموش ہو گئی۔ ذرا کہ بولی۔ ”میں نے غربت دیکھی ہے۔ بے ہنگمی اور فاقہ مستی بھی دیکھی ہے۔ جی لوں گی طاہری! ایک سی جی جی لوں گی۔ اب میں تمارے ساتھ نہ چل سکوں گی۔“

”اگر میں تیس ساتھ چلاؤں تو؟“ طاہریوں بولی جیسے گھر سے غریب سے بول رہی ہو۔

”ناممکن ہے طاہری!“

”اگر میں ارشد کا ہاتھ تمارے ہاتھ میں دے دوں تو؟“

”پہلی! غفلت نے غمزدہ کیا۔ بہت سے کہا۔ ٹوٹے ہوئے تار سے کس کے ہاتھ آتے ہیں؟“

”غفلت! طاہری بولی۔“ کسی کی خاطر قربان ہونے کا جذبہ میری رگ میں بھرا ہوا ہے۔ جانے کس نے بھرا ہے۔ جلال آباد میں تم نے دیکھا تھا کہ میں نے کس طرح تھانے کے سامنے اور اس کے بعد برنگہ اپنے آپ کو شولی پر لٹکا دیا ہے۔ سینے میں ایک اگلی گولی ہوئی ہے جو مجھ سے یہ سب کچھ کر دیا ہے۔ اس کا انعام مجھے یہی ملے گا کہ میری چار دو کانیں تیار ہو ساری جائداد اور میری عزیمتیں مجھ سے چھین لی گئی ہیں لیکن میں خوش ہوں۔ یہ چیزیں میری نظر میں کچھ سی نہیں۔ غفلت! نے تمہیں بستیوں سے نکال کر ملینڈی پر پہنچایا ہے تو اب تمہیں یہاں سے نیچے نہیں چوں گی۔ تم میری بہن ہو۔ ارشد تمارا... طاہرو نے کہنے کو ڈر دیا لیکن اس کی آواز صلیق میں لگتی گئی اور سخر ہاک کے رو گئی۔ وہ دھڑا سا چپ ہو کر رونے لگی۔ آواز میں بولی۔ ”میں ارشد کو تمارے حوالے کر کے دم لوں گی۔“

”نہیں! غفلت نے کہا۔“ یوں نہیں ہو گا۔ میں تمہاری نیکوئی کا ریلہ نہیں دوں گی، طاہری! ارشد تمارا ہے اور میں تمہاری راہ سے بہت رہی ہوں۔ اپنی خوشی سے۔ اگر میں تم دونوں کے ساتھ رہی تو میں تم دونوں کے اعصاب پر ناگوار ہوں۔ مجھے تم سے لگے تو نہیں۔ یہ تو میرے احساسات تھے جو میں نے اصلی روپ میں تمارے سامنے آگے دیے ہیں میں اب تم دونوں کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی۔ جو سکتا ہے... نہ بولو، طاہری! آج کی رات مجھے بولنے دو۔ مجھے کچھ کہنا ہے۔ مجھے مت روکو۔ کہہ لینے دو۔ جو سکتا ہے میں تم دونوں کے ساتھ نہ کر دوں دوں کے درمیان کوئی بے فکر کردوں۔ میرا یہ رشک اور میری یہ غلط فہمیاں حد کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ میں عورت ہوں۔ تم نے میرا زور اور تیرا زور میں پرورش اور تربیت پائی ہے۔ میں عروسی اور بپتی میں پلی کر جان ہوئی ہوں۔ مجھ میں ملینڈی خیالی اور بدلتا اخلاق آج نہیں کئی نہیں کاہتا، طاہری، کہ میں سینے میں کیسے کیسے طوفان دبا رہتی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ طوفان اس شدت سے اٹھ اٹھ کر میں دبا نہ سکوں نہ دب سکیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہاری محبت کی نقب زنی پر آمناؤں میں بستیوں میں پلی ہوں اور میری شناخت آسانی سے اتر سکتی ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ میری ہمتی میں ٹھجی ہوئی وہ پست عورت بیدار ہو جائے اور طاہری کا کاکا گھونٹ دے... طاہری! میری بہن! اب مجھے اپنی راہ لگ جانے دو۔ مجھے تم سے پیار ہے اور مجھے... طاہری مجھے ارشد سے پیار ہے۔“

”اوہم دونوں کو تم سے پیار ہے، غفلت! طاہرو نے اس کے گلے تھام کر کہا۔“

طاہری محسوس کر رہی تھی کہ غفلت پر بے خودی یا دوسرے کی کسی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اس کا بھی دکھ تھا۔ طاہرو کو ایک جذبہ مجبور کر رہا تھا۔ ”میں یہ قربانی دینی ہی ہوگی۔“ ایک غیبی آواز اس کے کانوں میں کر رہی تھی۔ تم پیادیا ہی اس لیے کی گئی ہو کہ روئے دلوں کو نہاؤ۔ یہی ہمتاری راہ ہے۔ قربانی پیسے کی نہیں ہوتی۔ ایشا زور اور جان کا نہیں ہوتا۔ کسی کی خاطر اپنا آپ اور اپنی انگلیں تباہ کر دینے کو تیار کتے ہیں۔ تم نے اس لڑکی کو ایک غار سے نکالا تھا۔ اب اسے تنہا فچھڑا دینا اور وہ ایسے غریب جاگرسے کی جہاں لوگ اس کی پوشیاں بھی نوج لیں گے۔ ان حالات میں اسے تنہا فچھڑا دینا یہ اس کی اپنی آوازیں تھیں جو ابھی صدائیں بن کر اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اس کی ایک جس مکمل طور پر بیدار ہو گئی تھی۔

غفلت کتنی رہی۔ جانے کی کتنی رہی اور طاہرو اپنی سچی سے اشتیاق آوازوں کو سن رہی تھی۔ کوئی اسے کہہ رہا تھا۔ کوئی بے نیلین کہہ رہی کہ رات کے اندھیرے میں بھاگ اٹھے۔ ان حالات اور اس ماحول میں ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کا بے اسرار ہو جانا مناسب نہیں۔ اس میں بہت خطرے ہیں۔ طاہرو! ایک ہی راستہ ہے۔ ایک ہی راستہ ہے...“

طاہرو اس سے آگے نہ سنا نہ جانتی تھی لیکن اس کی واقعی دنیا میں دو عورتیں ایک دوسرے کا شہ نوج رہی تھیں۔ ایک نظام۔ ایک جنگام۔ غفلت دلوں کی عالم میں کچھ نہ کچھ کے جاری تھی کہ طاہرو نے تصورات کے میدان جنگ میں دیکھا کہ ایک عورت لولہاں ہو کر بے حس ہو گئی ہے۔ طاہرو کو تلخ سا سکون محسوس ہوا اور اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھ غفلت نے اپنے سینے پر دبا دیے تھے۔

”غفلت! اس نے کہا اور وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔ بولی۔“ ارشد تمارا ہے... سنو! تمہیں سچی بات بتاؤں! طاہرو نے سکون آئیر آوازیں کہا۔“ ارشد دراصل تمہیں چاہتا ہے۔ وہ تمارے ساتھ بات کرنے سے بھگتا تھا۔ ہر باتوں کو جو بھرتا تھا۔ تھے وہ اس لیے نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے پیار و محبت کرنے جاتے تھے نہیں۔ ارشد میرے پیچھے چلا جاتا تھا کہ میں اس کے ساتھ شادی پر رضامند کروں لیکن میں اس لیے خاموش تھی کہ کہیں ٹھکانہ نہ جائے تو اب فچھڑاؤں کی بجائے یقین تھا کہ تم انکار نہیں کر دو گی۔“

”بھوٹ! غفلت نے کہا۔“ اس کی آواز میں اب سترت عود کر آتی تھی۔

”یقین کرو، غفلت! طاہرو نے پراٹھیاں اٹھا دیں کہا۔“ میں نے تو شادی کے متعلق ابھی سوچا بھی نہیں میرے سامنے اور بہت سے پروگرام اور ارادے ہیں میں بھی جانتی تھی کہ تمارا ارشد کا کیا کردار اور تمہاری ذمہ داری سے خارج ہو کر اپنے ارادوں کی تکمیل کروں... بولتے بولتے طاہرو کو غوطہ سا کیا اور وہ تھک بگل کر بیٹھ گئی۔ وکتنی خوشی کی بات ہے کہ تم نے خود ہی اس کا انکار کر دیا ہے۔“

”لیکن میں اتنی دیر سے جھک جھک کر رہی ہوں۔“ غفلت نے یک لخت اپنے آپ میں آتے ہوئے کہا۔

”تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ روک لیا۔“

”اوہ! پہلے؟“ طاہرہ ذرا سی گھبرائی لیکن جلدی ہی منہل گئی۔ ”میں ذرا متنازعہ تھا مگر دیکھنا چاہتی تھی مزہ اُڑا تھا۔“

”بہت پرے۔“ عفت نے اسے دھکا دے کر کہا۔

”لیکن ابھی ارشد سے کوئی بات نہ کرنا۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”مکان میں منتقل ہو لیں تو یہ سلسلہ میں خراب کی....! اچھا؟“

”بہت اچھا؟“

عفت تو اطمینان کی نیند سو گئی اور طاہرہ نے پیچھے ہل لیت کر بارک کی خود ملی چھت کی سیٹوں پر نظریں جمادیاں کی جگہ ایک بے عینی نے لے لی۔ طاہرہ نے بار بار سر جھٹکنا لیکن وہ سر جھٹکنے سے یہ طوفان عظم نہ سکا۔ طاہرہ نے عفت کی زندگی کے اس دور سے الگ نہ ہونے والی اس کی اپنی شخصیت اندر ہی اندر دھتوں میں بٹ کر ایک دور اسے آکھڑی ہوئی۔ اس نے کمرے کے اذیت رساں سکوت میں اپنے آپ کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ جذباتی اثرات زلزل بننا تھا۔ عفت کو کبھی جوتی اس کی اپنی باتیں اسے بے جاں الفاظ محسوس ہو رہے تھے جیسے اس کا اپنا سایہ، اپنا عکس ہر پیکر کی صورت اس کے جسم اور چھت کے درمیان کھڑا تھا۔ عورت کی کمزوریوں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

”تم جاہل ہو، لڑکی۔“ اس کے عکس نے اسے کہا۔

”نہیں، میں عفت کو یوں مجروح نہ ہونے دوں گی۔“ طاہرہ بڑبڑاتی۔

”ہوئے دو تجھے کیا؟“ عکس نے سرگوشی کی۔ ”کیا سادی عزم و مددوں کے لیے ہی دیتی رہو گی؟“

”لذت اسی میں ہے۔“ طاہرہ نے جواب دیا۔

”بیوقوفہ خیال ہے۔ ارشد کا وہ نرم و گداز، سرخ و پیدہ سینہ یاد کرو۔ دیکھو لائن کے کنارے اس سینے کا لسل... کیوں؟ تصور میں ذرا اس گداز کو پھر محسوس کرو۔“

”عفت مجھ رہے، بے بس ہے۔“

”کچل دو، تم عورت ہو۔ عورت اپنے محبوب کو یوں نہیں چھوڑ دیا کرتی۔“

”لیکن عفت میرے مقابلے میں آئی ہی کب ہے؟ اس نے مجھے لگا تو نہیں، مدد کے لیے لایا ہے۔“

”میرے تو اور اچھی بات ہے۔“ عکس نے کہا۔ ”وہ خود ہی متاری لہ سے بہت رہی ہے۔ تم ماری کیا لگو؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ طاہرہ نے زیر لب کہا۔ ”لیکن کرے جوتوں کو روز نما مجھے آتا نہیں۔“

”ارشد حسیا خوب صورت ہیں بلے گا نہیں، طاہرہ! عکس نے کہا۔ ”عفت تم پر ہنسے گی۔ تمہارے اشارہ کو تو شکست سمجھے گی، یہ میری شکست ہے۔ یہ میری تو ہیں ہے۔“

”لیکن تم جو کون؟“ طاہرہ نے بے عینی سے سر کو جھٹکنے پر تے سرگوشی کی۔ ”تم خود غرض ہو۔ مجھے خود غرض

سے نفرت ہے۔“

”پھر یوں کرو کہ میرا کاکھوٹ دو۔ عکس نے سکا کر کہا۔ ”لیکن یہ جرات تم کر نہ سکو گی۔ تم میری غلام ہو۔ میری لڑائی ہو۔ اپنی خواہشات کی لڑائی مجھے نہیں بیچنا؟ میں تم ہوں۔ تمہارا سایہ! مجھ سے نہیں تم! اپنے آپ سے نفرت کر رہی ہو۔“

”عطا ہے! میں آزاد ہوں۔“ طاہرہ نے کہا۔

”تم ایک عورت سے آزاد نہیں ہو سکتی، بچی!... سایہ فاعکس کا زیر لب قہقہہ چھت کی سیٹوں پر سرسرایا۔ ”تم اپنے آپ سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ میں ارشد کو ہاتھ سے جلنے نہ دوں گی۔ میں تمہاری کمزوریوں کا مجسمہ ہوں۔ تمہاری خواہشات کا پیکر۔ تم اپنے پیکر سے آزاد نہ ہو سکو گی۔“

”میں تمہارے جسم کو کبھی کا دفن کر چکی ہوں.... تم، میری کمزوریوں کا مجسمہ، مر چکی ہو۔ میری روح تیرے چنگل سے آزاد ہو چکی ہے۔“

”روح؟ سایہ سرسرایا۔ ”میں تمہارے جسم کو ارشد کی گود میں ڈال دوں گی۔ تم عفت کو بھول جاؤ گی۔“

”میں تینیں شکست دے چکی ہوں۔“ طاہرہ نے سرگوشی کی۔ ”میں ارشد کو عفت کے حوالے کر چکی ہوں۔“

سایہ کمرے کے اندر سے میں تھیل بگایا۔ طاہرہ کو اندھیرے میں سرگوشی سنائی دی۔ ”میں تیرے انصاف پر قابض ہو رہی ہوں۔ تم مجھ سے آزاد نہیں ہو۔“

”نہیں، عفت! نہیں!۔“ طاہرہ کی اپنی ہستی سے فریادیں نکلنے لگیں۔ ”یوں نہ ہو کہے کا میرا تمام زلیزلے لو ہیں ارشد کو نہیں چھوڑ سکتی۔ ارشد میری روح ہے۔ ارشد میری جان ہے۔ تم جاؤ، عفت! اپنی راہ لگ جاؤ۔ آف ٹڈا! مجھے ارشد کا دھکا میری جی کو کجانت دلا اس اذیت سے۔ مجھے ارشد دے دے یا میری جان لے لے نہیں، عفت! یوں نہ ہو کہ.... میں اس قدر علم قرآنی نہ دے سکوں گی۔ میں بہت کمزور ہوں، مجھ پر احسان کرو، عفت! میرے لیے تم ہی قربانی کرو۔“

طاہرہ بلکا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی پشانی پسینے سے سترابو تھی اور دل سینے سے باہر کیا جاتا تھا۔ دیکھا کہ عفت گہری نیند سو رہی تھی۔ کمرے میں سر کوٹک اندھیرا تھا۔ وہ طاہرہ کو نے ہزار ہا مسلمانوں کو حوصلہ دے کر بند دقوں سے لڑا دیا تھا، کھول کر کپڑوں اور برقعوں کا مقابلہ کیا، جتنے گھر میں بھی خوفزدہ نہ ہوئی تھی جڑھے ہوئے دریا میں بنے تیرائی تھی، آج کی رات ایک آزد کے سامنے بے بس و مجبور ہو کر رو پڑی، وہ قنات تھی، اس کے ہر طرف سیلاب کی مہیب مہیب آنکھری تھیں۔ کاش! یہ لہریں پانی کی ہتھیں تو وہ ان میں خود جاتی۔ یہ خیالات و احساسات کی لہریں تھیں، وہ دل کو دبا کر ٹھک گئی۔

”آزاد ہو مجھ سے؟“ کمرے میں سرگوشی سنائی دی۔ ”کب؟ ہوو؟.... تم میرے ہاتھ میں مجبور محسوس ہو۔“

طاہرہ نے یکبارگی اپنے آپ کو ہلکا چٹکا پایا۔ سامنے اس کا اپنا عکس کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”میں نہیں بچرکتی ہوں کہ میرا دل کھٹو۔“ سایہ بڑبڑایا۔ ”مجھے ارشد کی محبت کی ضرورت ہے۔ یہ میری غذا ہے۔ درمیں تیرا خون چوس لوں گی اور اپنے آپ کو زندہ رکھوں گی۔ میں عفت کو جان سے مار کر اپنے آپ کو زندہ رکھوں گی۔“

"مجھے بخش دو۔" طاہرہ اکر لڑا اٹھی۔ "میری نیکیاں مجھ سے نہ چھینو۔"

"یہ میرے لیے گناہ ہے۔"

"وہ میرے لیے گناہ ہے۔"

"مجھے دوسروں کے لیے جینے دو۔"

"مجھے اپنے لیے جینے دو۔"

"عفت کوئیں نے بہن بنایا تھا میں ارشد کی خاطر اسے دل سے جدا نہیں کروں گی۔"

"عفت کھنڈا، جسے کیڑی ہے وہ کنے نالے کے کنارے چلی ہے۔ اس میں اتنی سوچ ہے ہی نہیں کہ میری ہی خاطر اسی قبولی کر دے وہ نفع کھریں پیانا جوئی ہے اور نفع ہی رہے گی۔"

"میں تو بچی نہیں۔" طاہرہ نے کہا میں عفت کو اپنی بندھی تک رکھوں گی۔"

"وہ اس قابل نہیں۔" سایہ ناکس نے سرگوشی کی۔ "وہ ارشد کے قابل نہیں۔ وہ تجھ سے مانگنے کی عادی ہے اس میں دینے کا سلیقہ نہیں۔"

"میں اسے دے کر دنا سکھاؤں گی۔"

"تم میری تو بن کر دو گی۔"

"مجھے اسی میں سیرت ملے گی۔ تم میری محروم کر دوں پابیکر ہو تم دھواں ہو۔" طاہرہ ایک بار پھر فرٹ گئی۔ "میں تو بارہ تمہارے ساتھ اچھے لڑتی تھی، یہ میری جھول تھی، جاؤ میں تمہارے منہ پر چٹوکتی ہوں۔"

"یاد رکھو، پاگل لڑکی۔" عکس نے ذرا آگے سرک کر کہا۔ "میں تمہاری خامیوں کا پلندہ ہوں میں وہ دلوں میں جوتیں بھی اپنے ساتھ ادا لے جاؤں گی۔ یہ مت بھولو کہ تم اکیلی ہو مجھے ارشد چاہیے۔ مجھے ہر اس عورت سے نفرت ہے جو ارشد پر حق بتائے گی۔"

"مجھے عفت سے محبت ہے۔" طاہرہ نے گردن اونچی کر لی۔ "میں نے اسے سہارا دیا ہے، اب یہ سہارا چھینوں گی نہیں۔ جو تمہاری توہین ہے وہ میرا ایمان ہے۔"

"تم اپنے ایمان کی حفاظت نہ کر سکو گی۔"

"تیسرا خدا میرے ایمان کی حفاظت کرے گا۔" طاہرہ نے سرگوشی کی۔ "میں اکیلی نہیں۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔" وہ بلند آواز سے بولی۔ "مجھے میرا خدا قوت دے گا میرے خدا! میرے خدا! مجھے استقلال دے، مجھے حوصلہ دے، اپنی راہ پر مجھے ثابت قدم رکھ۔ میرا ایمان تیرا دیں ہے، ذات باری! مجھے اس غیر محسوس سائے سے نڈرا ہوا ایمان سے لے، وہ ادا جلال! مجھے عفت سے پیار ہے۔ مجھے تیری راہ سے پیار ہے۔"

"طاہری! طاہری! طاہرہ! طاہرہ! کھڑا کھڑا اٹھ دو کھیا عفت اسے جھجھوڑ رہی تھی۔" کیا بٹو طاہری؟ خواب لوگ یہی ہو؟ آہیہ! لکھی سر پڑھ کر کوہ بدل لو۔ یہ دیکھو تو! تم لہجہ پسینہ بول گئی ہو۔ سو جاؤ! میری گویں سر رکھ کر سو جاؤ۔

اور تم تووری ہو، طاہری؟ خواب میں جلال آباد لے وہ خوشی منظر دیکھے ہوں گے؟

اور عفت طاہرہ کا سراپا ان خوش میں رکھ کر سہلانے لگی۔ طاہرہ کا سانس اٹھا اٹھا تھا اور وہ ابھی تک اندھیرے غلاؤں میں ٹنگی باندھے ہوئے تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے دونوں بازو اوپر کیے اور عفت کا چہرہ اپنے قریب کر لیا۔

"میری اچھی، عفت! ارشد تیرا ہے۔ میں اسے تیرے لیے ہی ساتھ ساتھ لیے پھر رہی ہوں۔ دل میں شکوک نہ رکھا کرو، میری اچھی! اور خواب آؤ! آؤ! میں بول رہی تھی میں تیری ہوں، ارشد تیرا ہے۔"

کیسپ کی ٹنگی ماندی فضائیں صبح کی اذان بلند ہوئی اور طاہرہ اونگھنے اونگھنے گہری بند سو گئی عفت نے جبک کر اس کی پٹائی پڑائی۔

ان کے گیارہ بج رہے تھے کہ ارشد اور مزمار باچھیں کھلائے کمرے میں داخل ہوئے۔ "بل گئے بل گئے۔" ارشد نے کمرے لگا تے۔ اسے دیکھتے ہی عفت پر حجاب سا طاری ہو گیا اور لہروں پر حجاب کو ڈھک کر گئے لگا۔ طاہرہ نے بھی ارشد کا استقبال ٹھکرا کر کیا۔ وہ سکڑا ہٹ چوہن لاسے ان ہونٹوں پر آجاتی تھی۔ آج اسے جہم اور روح کی ساری قویں بجا کر کے ذرا سی دیر کے لیے ہونٹوں پر لانا پڑی۔

وہ اس جہم میں اس قدر مصروف تھی کہ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ارشد کا چہرہ دھلا ہوا ہے۔ کپڑے بدلے ہوئے ہیں۔ وہ اصل دھل کر بچھڑا ہے۔ اسے اور وہ کیسپ والا ارشد نہیں رہا، جلال آباد والا ارشد بن گیا ہے، طاہرہ تو یہی اس کی صرف آواز سن رہی تھی۔ وہ ارشد کو دیکھا نہیں چاہتی تھی۔ وہ دنیاؤں میں ارشد سے دور ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہم تو سیرے سیرے ہی آجاتے۔" ارشد نے پرجوش آواز میں کہا۔ "میں اور ٹورا نہ مانے دھونے لگ گئے تھے جانے کتنے عرصے کی ٹی آج آمار ہے۔"

"اہ۔" طاہرہ کے منہ سے بے اختیار استعجاب کی آواز نکلی۔ ".... وہاں لے ارشد کو کھتی رہی۔ بولی۔" میں نے تو دیکھا ہی نہیں کہ تم کیا کرتے کیا کرتے ہو.... دیکھا عفت؟ پہچانا ارشد میاں کو؟

"تم دونوں نے ناشتہ کیا ہے؟" ارشد نے پوچھا۔

"کمال کیا ہے ناشتہ؟" عفت نے قدرے شرمناک جواب دیا۔ "ابھی ابھی تو سو کے اٹھی ہیں.... رات طاہرہ خواب میں ڈگڑکی لگتی تھی۔"

"ارے؟" ارشد نے اپنی مخصوص بے تکلفی سے طاہرہ کے گال پر ملکی سی چٹکی دے کر کہا۔ "اب ذرا بھی آنے لگا؟"

طاہرہ نے ارشد کے ماتھے کا گداز محسوس کیا تو اسے یوں لگا جیسے کسی نے سونیاں جھجھادی ہوں اس نے جاگ کر چہنیں مار کر دوڑے اور ارشد کو کہہ دے۔ ارشد آؤ ہم ایک دوسرے پر قربان ہو جائیں۔ آؤ اسی دور ہے پر جاؤ جو جاتیں۔

جانے طاہرہ نے کیا کچھ سوچا لیکن اس سوچ کا تاثر چھپانے کے لیے اس نے ایک بار کوشش کر کے کہیں سے مسکراہٹ کو ہونٹوں پر گھسیٹ ہی لیا۔







اور دل کے پائلے کپڑے پہنے ہوں اس میں بندہ خیالی کیسے آسکتی ہے؟ میں نے اسی وجہ سے کہہ دیا تھا کہ عفت کی ہل کو گھر لانا اسے باعزت کام دے دیں، ورنہ آج عفت سکھوں کے ہاتھ میں ہوتی اور دونوں مال میں جو بھی اپنے آپ کو کاغذوں کے واسطے لکھی ہوتی۔ اس قسم کی پسماندہ اور غلط عورتوں کو کیا چاہیے؟ وہ وقت کی روٹی اور کپڑا، مرد و عورت کے لیے ایسا ہی مل جاتا ہے میں نے بڑے سچ کے عفت کو ان پستیوں سے نکالا ہے۔ تہیں تو انداز ہی نہیں ہو کہ قدرت پرست خیال تھی۔ اس میں اس بے چاری کا قصور ہی کیا تھا جن کے جینے کا مقصد صرف پیٹ بھرنا اور بھلا عورت، اکبر اور خوداری کو کیا جائیں۔ ان کی دخول پر یاد دہیے بڑھاتے ہیں، دروازہ کھول کر قدر حسین شکل و صورت کی لڑکی ہے۔ میں روداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کوڑے کرکٹ میں بڑی رہے۔ اس کی ماں بظاہر ریاضت و راجھی کسی حد تک خود راہی لیکن یہ کج عفت نفسی ایسا جرم ہے کہ اس میں سے سہم بھر مچھرتے اور پھلتے پھوٹتے ہیں۔ تم حیران ہو گے کہ اس سنگدستی اور اخلاقی غلطی میں عفت آنکھیں جماعت تک پہنچ گئی تھی اور ان کے بڑھنے کا بھی شوق تھا۔ ایک دن عفت نے مجھے بتایا تھا کہ اسے ال صراف لیے پھاڑی ہے کہ وہ اچھے داموں فروخت ہو سکے، شاید عفت کا اپنا مقصد بھی یہی تھا۔

ظاہر ہے آہلی اور کھنکی لگی۔ غیر ارشد یا ریشہ پل میں ہی میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس لڑکی کی دستہ داری میں خیالی اور قسم کھالی کہ اس کی روح کو خدا کی راہ پر ڈال کے دہوں گی میں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ میری اخلاقی بے بسی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا ہی اطمینان ہوا تھا کہ عفت میرا عاصی سمجھتی تھی اور اس نے مختصر سے ہی عرصے بعد میرے ساتھ تعاون و شریعت کو دیا تھا۔ اس کا یہ خیال ہے کہ اس نے جلدوں اور جلوں میں ہمارا پورا پورا ساتھ دیا۔ ذرا بڑا اور کچھ جلال آباد سے لاہور تک اس نے تمام راستے کہیں بھی پیٹھ نہیں دکھائی۔

”میں نہیں وہ بھڑپ یاد کرنا چاہتی ہوں، ارشد! ظاہر ہے وہ نے ٹھیکے ٹھیکے کوٹ بلی اور ارشد کے اور قریب ہو گئی۔ ارشد انہی کے سن رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نے کہا۔ وہ کس بات کو درمیان لیں، ایک سے ایک زالی ہے لیکن یہ واقعہ تو میں بھی فراموش نہیں کر سکوں گی۔ تہیں یاد ہے کہ ابھی دیا ہے ہم بہت دور تھے کہ شام کے وقت تین کھولنے ہم پر حملہ کیا تھا۔ دو کے پاس کر پائیں اور ایک کے پاس لمبی کلہاڑی تھی۔“

”ہاں! شام کے وقت۔ ارشد نے کہا۔ جس دن تم گر گئی تھی۔ ایک اور دخت کے پاس۔ سارا قافلہ در در وہاں دی۔ ظاہر ہے کہ اس نے تو صرف میرا خیال تھا کہ میں گر گئی تھی لیکن وہ عفت تھی کہ جسے تمنا رانیال تھا۔ ورنہ آج تم یہاں نہ ہوتے نہ ہم دونوں ہوتیں۔ میں تو کلہاڑی کی زد سے بچنے بچنے گری پڑی تھی اور مراد در میان میں آ گیا تھا۔ تم دوسرے رکھ سے لہجے ہو تے تھے۔ میں اٹھ بی رہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ تیرے سیکھنے کے متارے پیچھے لڑکے اپنا سر سے اوپر اٹھا لی تھی اور کچھ پانہ بندی کروان کی طرف چل پڑی تھی۔ جوان اور ہندی کروان میں وہی لکھوں کا ناصر تھا۔ میں تو گر گئی تھی اور بھی تھی۔ اس منظر کی تاب نہ لاکر میں نے کچھ چپک چپک کر دونوں ہاتھ کھول کر رکھ لیے تھے۔ میں نے انہوں سے ہاتھ ہٹا تے، دیکھا اور مجھے آنکھوں پر پتھر نہا۔ تم بہر طور اڑ رہے تھے۔ زخمی تھوکتے تھے۔“

”نہیں! ظاہر ہے کہ سینے سے جیسے آہ نکلی گئی ہو۔“ یہ پسند میں بتاؤں گی؟  
”کیا مطلب؟“ ارشد کچھ سمجھ نہ پایا۔

”عفتاری شادی عفت سے ہوگی، ارشد!“  
ارشد کے ہاتھ سے ظاہر کا ہاتھ چھوٹ کر اس کی گود میں گر گیا۔ ظاہر کا سر جھک گیا لیکن اس نے فوراً ہی سر اٹھایا جیسے ایک خطرے کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئی ہو۔

”مذاق کر رہی ہو ظاہر؟“ ارشد نے اپنے آپ کو غریب دینے کی کوشش کی۔  
”نہیں!“ ظاہر کے لہجے میں خود اعتمادی اور عود کا کڑواہٹ بولی۔ ”منو، ارشد! میں تہیں جذبات میں سے نکال کر کہہ رہی ہوں۔ حقیقت کی طرف لانا چاہتی ہوں۔ جذبات کو محبت سے اور احساسات کو ان دونوں سے الگ نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ ضرورت ذرا مختلف ہوتی ہے۔“

”نہیں! یہ غلط ہے۔“ ارشد زبک کر بولا۔ ”میں جذبات سے نہیں نکل سکوں گا۔ جذبات نہیں تو محبت بنا کر سیدھی بات کر دے کہ یہ کیا معصیت ہے۔“ ارشد نے ذرا آگے جھک کر چھپنے کے انداز میں پوچھا۔ ”شادی سے دور کیا؟“

”اے نہیں، بڑھو! ظاہر اس کی ذرا سی چھپڑ سے ٹوٹیں آگئی اور ارشد کے بالوں میں انگلیاں الجھا کر پیار سے کہنے لگی۔ ”ذرا میری بات سن لو۔ دل اور دماغ سے سارے خیالات نکال کر میری بات سنو۔ ذرا سی دیر مجھے اور میرا محبت کو کھول جاؤ۔“

”ہاں ممکن سا کام بتا رہی ہو۔“

”مجھے احساس ہے۔ میں خود ایک ناممکن کام سر انجام دینا چاہتی ہوں۔ یہ ایک اور ہم ہے، ارشد! ظاہر ہے کہ سینے سے پھر ایک آہ نکلی لیکن وہ منہ نہیں کھلی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ہم نے جانوں کو خطرے میں ڈال کر جھنڈے لہرائے۔“

”نہیں! لکھو! اور گولیوں کی بوچھاڑوں میں جلوس نکالے۔ ستر اسی میل کا سفر با یاد لے گیا اور وہ بھی سکھوں کی رچ بچوں اور ان کے سامنے میں ہم نے کس طرح سینہ تان کر ان کا مقابلہ کیا۔ پھر وہ دیا اور کرو، ارشد! ابھی ان کو اسے خوشی سمجھ کر ان کی گود میں لے لی۔“ وہ فاقے، وہ مصائب اور خطرات اور وہ ہم کہ ہم نے ان کا مقابلہ کیا۔ اس قیامت میں نکل کر میں نے اپنے آپ کو سب سے بڑا انعام یہ دیا تھا کہ چاندنی رات میں انہیں اپنے دل میں بٹھایا تھا۔ ہمارے تلے

ہمارے اور فاخت جسموں اور دھول کو ایسے ہی انعام کی ضرورت تھی، میں نے اسے خدا کا انعام سمجھا تھا۔“

ظاہر آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ ارشد نے ہلکے کے تھکے کی ٹیک لے لی اور رات کے بے پادوں گزرتی گئی۔

ظاہر کبھی تھی۔ ارشد، ذرا اپنے سینے میں وہ دھول تازہ کر دے۔ وہی عزم اور استقلال کو جمال کی موت کی طرف اشارہ ہے چہرے کے ہر ایک نقش سے شکر رہا تھا۔ ظاہر نے ارشد کے چہرے کا جائزہ لیا اور بولی۔ ”عفت متعلق نہیں بہت کچھ معلوم ہے لیکن تم تفصیلات سے آگاہ نہیں۔ وہ بہت غریب تھی جس لڑکی نے زندگی کے چہرے

ان ہی عزت ہے، ارشد امیری نیکیوں کا گلزار گھونٹ دینا۔ ایک طرف میرادل ہے۔ دوسری طرف ایمان ہے اور بچے ایمان عزیز ہے۔

”ظاہرہ! ارشد مکرے کے وسط میں رک گیا اور بولا۔ ”کیا کر رہی ہو! کہنے سے پہلے سوچ کر میں یہ مہم سر بھی کر سکوں گا؟“ وہ آہستہ آہستہ پلنگ کے قریب آ گیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ظاہرہ نے آگے ہرکراں کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ ارشد نے طویل آہ لی معلوم ہوتا تھا جیسے وہ درد پر ہے گا۔

”محبت بہت ساری قربانیاں مانگا کرتی ہے، ارشد!۔ ظاہرہ نے ایسے پیار سے کہا جو اکثر ماں باہن کے ہی ہوتوں سے سنا دیتا ہے۔“ میری محبت کی خاطر قربانی دو۔“

ظاہرہ کاغور فرما دل گیا۔ ارشد کے ہاں سے اٹھتی ہوئی چھینٹی چھینٹی خوشبو نے ظاہرہ کے لب دلیے میں تھما دیا۔ ایک نئے خودی سی طاری ہو گئی۔ اسے والٹن ریفیورجی کمپ کے باربر میدان میں پھیلی ہوئی چاندنی یاد آگئی۔ وہ محمور سے بلے میں بولی۔ اس محبت کی خاطر قربان ہو جاؤ جو ہمارے دلوں میں چنگاکیوں کی طرح سنگد رہی تھی اور دیوے لائن کے کنارے شعلہ بن کے ظاہرہ کی تھی۔

”کاش! وہ چنگاریاں اس دیوانی سیلابی لہروں میں سمجھ جاتیں جو ہم نے تیر کر بار کیا تھا۔“ ارشد نے جذبات سے منہ بولا۔

”وہیں سے تو یہ بھڑکی تھیں۔“ ظاہرہ نے اس کے سر پر اپنا کال رکھتے ہوئے کہا۔

”میرا سب کچھ مل جائے گا۔“ ارشد نے کہا۔

”جی ملنے میں ہی قربا ہے۔“ ظاہرہ نے کہا۔

”یہ ظلم ہے، ظاہرہ! یہ فریب ہے۔“ ارشد نے آکر کہا۔

رات آہستہ آہستہ رنگ رہی تھی۔ لآلانات سکوت کی آغوش میں سو رہی تھی۔ نیند کے بوجھ نے اور جذبات کے ابال و تزلزل کے لیے خود اور مدوش بنایا دیا تھا۔ لیکن دونوں کی مدوشی میں ایک فرق تھا۔ ظاہرہ پر چندہ اشار غالب تھا اور ارشد پر فطرت۔ ایک کو اپنے اوپر قابو تھا دوسرا بے بس و مجبور۔ خاموشی، طویل خاموشی۔ ظاہرہ کے دوا سنوارش کی پیشانی پر کمرے کے دروازے کے دوا سنوارش میں جذب ہو گئے۔

وہ تم سنگدل ہو، ظاہرہ! محبت کا خون نہ کرو۔“

”یہ محبت ہم دونوں کا خون مانگ رہی ہے ارشد! زندہ رہنے کے لیے۔“

”مرنے کے لیے ظاہرہ!“

”محبت تو بہ حال زندہ رہتی ہے، بہن کے دل میں، ماں کے دل میں اور میرے دل میں ہی اسی طرح زندہ رہے گی۔“ ارشد نے اس کی خاموشی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور کہا۔ ”ماں جاؤ، میرے عزیز! عفت کو قبول کر لو اس کی خوشی ہے، در نہ میں سمجھوں گی میرے ارشد نے مجھے کانٹوں پر ڈال دیا ہے۔“ ارشد خاموشی سے اس کی آنکھوں

ساعتے کر رہا تھا اور دم چمکا اور ہونے والے سکھ کی قربان کر سکتی تھی۔ عفت کی بھی اس کے پہلو میں داخل ہو چکی تھی۔ اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت عفت تم سے دوسری معلوم نہیں کی بھڑتی سے اس نے پھیل کر اڑا کر مٹا دی تھی اور بر بھی سکھ کے پہلو میں اسی طرح داخل کی کہ اس سے اب باہر نہیں نکل رہی تھی۔

ارشد نے ظاہرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ظاہرہ نے عموں کی کہ ارشد کا ہاتھ کا پتہ رہا تھا۔ یہ لرزہ جہاں ایک خیال تھا وہیں یہ عفت کی بہادری کی غماز داؤ بھی تھی۔

”مجھے معلوم نہ تھا۔“ ارشد نے ایسے لمحے میں کہا جیسے اب بھی ایک کرپان اس کے سر پر پلنگ رہی۔

”اب غور کرو، ارشد۔“ ظاہرہ نے کہا۔ ”یہ دیر سی اس لڑکی نے کی تھی جس کا دھیان پیٹ سے آگے نہ تھا۔ جو سنا سنا اس نے جب پاکستان میں محض میری اور دنیا کی خوشنودی سے لینے ہی حقد کیا جو میں سوال دے کر نہ جھٹکا اور اپنا حق خوب ادا کیا کسی موقع پر اس نے یہ نہیں کہا کہ میں تھک گئی ہوں۔ بھوکے ہوں یا پیاسی ہوں۔ بولے کہ اسے قائم کر سکتی ہوں کہ اس نے جو کچھ کیا ہے اس کی مقصد و دعا کو سمجھ کے کیا ہے۔ ارشد! میں اس لڑکی کو بہت برا بھلا چاہتی ہوں۔ میں اسے بہت زیادہ علم و لانا چاہتی ہوں۔ زلیلات میں سے جو کچھ اسے پسند ہو گا دے دوں گی۔ اس میرا ارادہ تھا کہ اس کی شادی اپنے ہاتھوں کرواؤں گی لیکن عفت نے مجھ سے بہت برا انعام مانگا ہے۔“

”یعنی وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔“ ارشد نے ذرا گھڑے ہوئے بلے میں کہا۔

”ہاں!۔“ ظاہرہ بولی۔ ”میں نے یہ خواہش ایسے رنگ میں ظاہر کی ہے کہ ارشد! میں انکار نہ کر سکی۔“

”کس رنگ میں؟“

”اس رنگ میں جو میں سمجھتی تھی کہ اس پر سے تار پکی ہوں۔“ ظاہرہ نے کہا۔ ”اس نے اس یقین کے بڑے کی تھی کہ میں اور تم ایک دوسرے کو چھوڑ نہ سکیں گے اور وہ اپنے آپ کو ہم دونوں کے درمیان بن باقی رہا۔“ ارشد نے بھڑکا، ارشد! جب عفت نے باہر شہر میں توین توڑ گئی تھی کہ شاید اس پر کوئی درد ہو گیا ہے۔ مجھے اس پر ہنس آیا جب ہم رات باہر جایا کرتے تھے تو وہ ہمیں دیکھتی رہتی تھی۔۔۔۔۔ وہ بہت کچھ کہتی رہی اور دوتی رہی پھر گئے گی میں نے کاہلہ اسی طرح دے سکتی ہوں کہ مٹا رہا وہ سے ہٹ جاؤں۔ ایسے میں، ارشد! مجھے بہت خیال آئے ہیں کہ میں کہیں ایسا نہ ہو رہی ہوں کہ ہاتھ سے ہی نکل جائے۔ آج کل کے حالات تم جانتے ہو اس قسم کی شکل دار اور نوجوان لڑکی کا کہاں پہنچ سکتی ہے یا پہنچائی جا سکتی ہے۔“

”عجیب وغریب قربانی ہے ظاہرہ!۔“ ارشد نے آہ لے کر کہا اور مکرے میں شلتے ہوئے بولا۔ ”اپنے“

”قابل کرنا چاہی شکل ہے۔“

”میری شکل مجھے بھی دیش ہے، ارشد! لیکن میں یہ قربانی دینا چاہتی ہوں۔ میں نہیں کہ سکتی کہ جب میں اپنے ہاتھ میں ایک اور لڑکی کے سر کو دوں گی تو میرا کیا حشر ہو گا میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا ہے اور اکثر اپنے حوصلے دیتی رہتی ہوں لیکن میں نے جو دیا ہوا تھا اسے اپنے خون سے سینہ پنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے تیار ہے۔“

میں ہلکی باز دھڑے رہا۔ جیسے طاہرہ نے اسے پہنا کر لیا ہو۔ طاہرہ بولی۔ ”عفت میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ شکل دیکھ لو۔ قد قریب دیکھ لو۔ میں نے اس کے ذہن سے وہ پست خیالات دھو ڈالے ہیں۔ دیکھ لیا تم اسے پا کر دیا کرو۔“  
”ہمیں نہ بھول سکوں گا۔“

”میں بروقت تمہارے ساتھ رہوں گی، ارشد!۔ طاہرہ نے اس کا کال چھپا کتے ہوئے کہا۔ میں بھی تمہارے ساتھ رہا کروں گی۔ کہو گے تو تمام عمر شادی نہیں کروں گی، آج رات کی طرح جب چاہو گے تمہارے رہا کروں گی۔ دودھ کرتی ہوں۔“

ارشد آہستہ سے اٹھا اور انکڑائی سے کرکھرے میں شیلے لگ گیا۔  
”میں نہیں ایک بار بچہ یاد دلانا چاہتی ہوں۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”نکھٹے نختے ہماری بہن بچانی تھی۔ آج عفت پر الجھنوں میں الجھ کر صرف اس لیے اندھیرے میں واپس جانا چاہتی ہے کہ تمہاری زندگی میں بے مرگی پیدا نہ ہو۔۔۔۔۔۔“  
”تمہارا کتنا خیال ہے۔“

”ہمیں یقین ہے کہ وہ تمہارا نعم البدل ثابت ہوگی۔“ ارشد نے صلیح چڑی میں پوچھا۔  
”مکمل یقین۔“ طاہرہ نے خود اعتمادی سے کہا۔ ”میں نہیں تو ہوں۔ کوئی غامی دیکھی تو در سیرت کر دوں گا۔“  
”مٹ مجھے بھول تو نہ جاؤ گی، طاہرہ؟“  
”نہیں۔“

”وہاں کرنا، طاہرہ! کہ خدا ہم دونوں کو ثابت قدم رکھتے۔“  
”آمین۔“  
”تو میں جاتا ہوں۔“ ارشد دروازے کی طرف بڑھا۔

”ذرا کھٹو۔“ طاہرہ بولی۔ ”میاں آؤ۔“ وہ طاہرہ کے قریب گیا تو طاہرہ نے اس کے دونوں ہاتھ لے کر دیکھا۔  
”یوں دل پر بوجھ لے نہیں۔ ہنسی خوشی۔ درنہ ہماری محنت اور اس ہو جانے کی۔ جاؤ! شب بخیر۔۔۔۔۔۔“  
ارشد جانے کے خیال میں مسکرا دیا۔ اس نے طاہرہ کا چہرہ ختم کر اوپر اٹھایا اور کہا۔ ”عجیب بے تکلیف اور طاہرہ نے اٹھ کر دروازے کی چابی چڑھا دی اور لیب سجھ کر لیت گئی۔ اس نے سکون آمیز آواز میں اور سارا آنسو لے آئے۔ اس نے آنسوؤں کو شکل ہی جانے دیا۔ دودھ روئی خوب روئی اور روتے روتے سو گئی۔

ارشد اپنے کمرے میں جا کے لیٹ گیا لیکن اسے نیند نہ آئی۔ طاہرہ کا ایک ایک لفظ اسے از سر نو سنائی دینے لگا۔ اس نے اپنے سامنے طاہرہ کو کھڑے دیکھا۔ پھر اس نے اس تصور کو سامنے سے ہٹا کر اس کی جگہ عفت کو کھڑا کیا اور اس تصویر کے ہر پہلو کا جائزہ لینے لگا لیکن وہ آنکھ جھپکتا تو اس کے سامنے عفت کی جگہ طاہرہ کھڑی ہوتی۔ اس نے سوچ و فکر کی تمام قوتیں بیکار کر کے کیسوٹی سے عفت کا خیال تصوروں میں جمایا لیکن دوسرے ہی لمحے یہ خیال طاہرہ کے روپ میں تبدیل ہو گیا۔ اس کا سر دیکھنے لگا اور اس نے کر وٹ بدل لی۔

دوسری صبح باجان نے اسے گھسیٹ کر لبر سے نکالا اور تیار کر کے دفتر لے گئے۔ دوپہر کھانے کے بعد طاہرہ عفت کے کمرے میں گئی۔ عفت لٹیٹی ہوئی تھی۔

”بگم صاحبہ اب لیٹنا چھوڑ دو اور شادی کی تیاریاں کر دو۔“ طاہرہ نے ایک دھک کو مسکراہٹ میں چھپا کر کہا۔ ”ارشد میاں آج اپنے عہدے کا چارج لینے گئے ہیں اور ایک ہفتے کے اندر شادی بھی ہو جائے گی۔“  
”چچ طاہری؟“ عفت باچیس کھلا کر اچھل پڑی۔ ”ارشد کے ساتھ تم نے بات کر لی ہے؟ بات طے ہو گئی ہے؟“

”اری! وہ تو پہلے ہی طے ہو گئی تھی۔“ طاہرہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”صرف سبھی باتوں کی ضرورت تھی، وہ بھی طے ہو گئی ہیں لیکن یاد رکھو عفت!۔“ طاہرہ نے تنیدگی سے بولی۔ ”ہمیں ذرا سنبھل کے رہنا ہو گا۔ دیکھو کتنا بڑا گھر اور کتنا اونچا خاندان ہے۔ اپنے آپ کو اونچا ہی رکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ میری ساری محنت برباد کر کے رکھ دو۔“  
”طاہری۔ عفت طاہرہ سے منسلک گیر ہو گئی۔ ”میری بہن غم نہ دیکھنا اگر قدہ بھر تمہاری بات پر آئج آئے دے تو۔“

مجھے تمہارے سارے سبق یاد ہیں۔“  
”شام گھر میں ایک نئی رونق تھی۔ ارشد ملازم ہو کر گھر گیا تھا۔ اس کی اتنی، بھابی اور طاہرہ نے شادی کی تاریخ بھی مقرر کر لی تھی۔ دیر صرف کچھ دنوں کے بنوانے کی تھی۔ زلیوہ موجود تھا۔ امی اور بھابی کو عفت کے متعلق بتایا گیا تھا کہ وہ طاہرہ کی چچا زاد بہن ہے اور سندھوستان میں دونوں گھروں کی وسیع زمینداری تھی جلال آباد میں تو وہ طاہرہ اور عفت کو ارشد کی زبانی غائبانہ طور پر جانتی تھیں۔ خاتون کے ساتھ ان کی علیک سلیک ہوتی تھی لیکن محکم پاکستان کے منگناؤں کی وجہ سے علیک سلیک

یہ نہ بڑھائے۔ اس طرح عفت نے وزن کے حاب سے نصعت سے کہیں زیادہ سولے پر قنبد کر لیا۔ ظاہر نے غفٹ کو گری نگاہوں سے دیکھا اور وہ اس کے چہرے کا اثر دیکھ کر جو یک آن بھی گھبرا کر خاموش رہی۔

ارشاد کی بجائی سے رہا نکلیا۔ اس نے کہی دیا۔ یہ زیور آج کل کون پہنتا ہے؟ یہ پائیس کیوں نہیں پہنتیں؟ بچوں کے قد پر کھینچے اور کھینچے جھلکے ہیں۔

”ہیں۔ عفت نے منہ بنا کر کہا۔ ”وہ بہت ہلکے ہیں۔“ اور وہ اپنے کیے جو تھے زیورات کو جلدی جلدی سے اٹھا سیٹ کر کر کے سے نکل گئی۔

بجائی نے ظاہرہ کی طرف دیکھا۔ ان نظروں میں ایک سوال تھا لیکن ظاہرہ نے صورت حال پر قابو پاتے ہوئے

نہ شادی کا چادر بھی عجیب پہن رہی تھی۔ مجھے معلوم ہے وہ کل ہی ساری چیزیں چینک کر نئی چیزیں لے جائے گی۔ میں اس بات جانتی ہوں۔ گھر میں بھی اس کی حرکتیں کچھ اسی قسم کی ہوا کرتی تھیں۔

”وہ شادی کا موقع ہے۔“ ارشد کی اتنی نے کہا۔ بچی ہی تو ہے جو جی چاہے پہنتے۔

اور بات لگائی نہ ہو گئی۔

شادی کا دن آیا گھر میں ایسی جہل پل کہ جسے کوئی کام نہیں وہ بھی مصروف نظر آ رہا تھا۔ مہمانوں کی فہرست نہ ہونے کے باوجود رشتے برادری والے مانے کہاں کہاں بھر گئے تھے۔ اس کے علاوہ ارشد کے آبا جنان کا خیال تھا کہ ملک کے موجودہ حالات

نہ زیادہ شور مارتا نہ لگا جائے۔ انہوں نے کہا۔ گھر کے افراد جمع ہو کر جی بھر کر ناچ لو۔

اور یوں ہی کیا گیا۔

دوپہر کو حاجی منشی خوشی اور خاموشی سے نکاح پڑھوا دیا گیا اور یہ تعزیت بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔ ظاہرہ نے دونوں کے لیے

پہلوں کے دوسرے بنائے تھے جو اس نے اس وقت چھپاتے رکھے۔ گھر کے ہی تو لوگ تھے سارے۔ کوئی رسم اور عفت تھا نہیں۔

عفت میری بیوی بنی ہوئی تھی۔ وہ ذرا کم عمر ہے میں ردا تھی۔ انہوں کی طرح لپٹی بیٹی رہی۔ پھر وہ بھی اٹھ کر عورتوں اور بچوں کے جگہ جگہ میں شامل ہو گئی۔ ارشد کچھ الگ الگ رہا جسے گھر والوں نے شرم و حجاب سمجھا لیکن ظاہرہ کو معلوم تھا کہ کیا

بات ہے؟

ظاہرہ گلی میں سے گزر رہی تھی کہ ارشد سے ٹکرائی ہوئی۔ وہ سر جھکانے چلا آ رہا تھا۔ ظاہرہ نے ادھر ادھر دیکھا اور اس کے منہ پر ہلکا سا حقیرانہ کمرسرت بھرنے لے۔ لیجے میں ارشد کے ہی مخصوص انداز میں کہا۔ ”سُن چٹھے! اگر مانتے پڑا سا بھائی آیا تو بارگاہِ دولت توڑ دوں گی۔“

ارشاد نے خالی سی نگاہوں سے ظاہرہ کو دیکھا تو ظاہرہ نے کہا۔ ”ایسے نہیں! ابھی میں جھیل کے رکھو فٹ لکاس

ولگی دی ہے تیس۔“

ارشاد شاید جذبات میں اُجھٹنے والا تھا کہ ظاہرہ کے ہنسنے جو تے ہنسنے چہرے اور مذاق نے اسے کچھ کہنے

105

بے تکلفی تک نہ پہنچ سکی تھی۔ دونوں کے گھر دور دور تھے۔ پھر فحاشات ہوئے اور بات ہی ختم ہو گئی تھی۔

عفت شاد زیادہ دیر گھر سے میں چھپی رہی تھی اور ارشد کچھ دیر کھینچا سا رہنے لگا تھا۔ حرف ظاہرہ بھی جو اس کی اندر

کیفیت کو سمجھتی تھی۔ وہ سن رہی تھی اس نے اسے سنائی میں ہوا کہ جو صلہ عفت کی توقع نہیں کہیں اور اس رات کی ملاقات کی

ایسی ایسی باتیں کہیں کہ ارشد کا بھانجا بدل دیا۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ ارشد کو بھی اندازہ نہ تھا۔ عفت کو تو معلوم ہی نہ تھا کہ

کے دل پر کیا گز رہی ہے اور اس نے وہ قربانی دی ہے جو صورت نہیں دے سکتی۔ اس گھر میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ

روح اور عجبات کا آخری قطرہ بھی پڑا تو اس شادی کو ایک کا سیاب شادی اور ایک مثالی ازدواجی زندگی بنانے

مصرفوت ہے۔

اس نے ارشد سے سادہ کی تصویر کے اپنے سوٹ کس میں لکھی تھی بعض اوقات وہ اس تصویر کے ٹکرات

خود خال میں کھو جاتی جیسے اپنی ٹھکی ہوئی روح کو سلاسی ہوا اور تروتازہ کر رہی ہو۔

شادی میں ایک دن باقی تھا۔ گھر کا بچہ بچہ کسی کی گھر میں مصروف تھا۔ عورتیں کپڑوں کا آخری معاہدہ کر کے دوزخ

جان بھاری تھیں۔ ظاہرہ کو عروسی کی سواٹ میں بلان ہو رہی تھی۔ بچوں کا یہ حال کہ جھنڈیاں بنانا کر رہی ہو

رہے تھے۔ عفت کا یہ حال کہ کسی نے بازو پکڑا اور گھسیٹ کر ایک طرف لے گئی تو دوسری نے پیچھے سے قہقہے پکڑ

طرح کھینچ لی۔

دن کے پچھلے پہر ظاہرہ عفت کو اپنے گھر سے لے گئی۔ پھر ارشد کی امی اور بجائی کو ٹھکانا ملا۔ میز پر خاتون کا بنا

سارا زہر پڑا تھا۔ ظاہرہ نے دونوں عورتوں کی موجودگی میں یہ زیورات عفت کو دکھائے اور کہا۔ ”جو چیزیں نہیں لینیں

”صرف کل کے لیے۔“ عفت نے بغیر سوچے سمجھے پوچھا اور ظاہرہ کو دھچکا سا لگا۔

”نہیں، عفت!۔ ظاہرہ نے بڑی بہنوں کی طرح کہا۔“ ”جو شے کے لیے۔ تم تو یوں پوچھتی ہو جیسے میں

کی مالک ہوں۔“ اور ظاہرہ نے اٹھ کر عفت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

عفت نے جب اپنے سامنے بھرے ہوئے طرح طرح کے زیورات دیکھے اور یہ سنا کہ وہ چاہے لے

اس کے چہرے کی نگاہ ہی بدلنے لگی جیسے اسے غشی آجائے گی۔ وہ سب سے پہلے اس ڈار پر کی جو خاتون نے

کو دکھائے بغیر ہوا کہ اس کی شادی کے لیے چھپا رکھا تھا۔ پھر عفت نے وہ بی بیوں کو اٹھا اٹھا کر ایک طرف کرنا

کر دیا۔ ارشد کی بجائی نے اس کے انتخاب پر ذرا سناں کی سیڑ پر چیزیں خاتون کے زمانے میں ہی تھیں۔ جب ان

ان کے ڈیزائن میں نہیں وزن پر ہوتی تھی۔ موٹے موٹے نقی چھڑے ہوئے اور یہ جڑی موٹی عفت نے انہ

کو پسند کیا۔ لائنیں وہ اٹھاتے جہاں کو کسی دہر کر کے کندھوں تک لے آئیں اور بناوٹ ایسی جیسے ہونے لگا۔

ان زیورات میں صرف یہ بخوبی تھی کہ سونا اصل تھا اور وزن زیادہ۔

ظاہرہ کو ارادہ تھا کہ اس وقتا تو سی زیور کو فروخت کر دے گی لیکن عفت کی پسندیدہ بی بی ثابت ہوئی

زمانے کی بی بی ہوئی ایک بھی چیز سواتے ہار کے اس نے پسند نہ کی۔ ظاہرہ صلیحہ مازم نہ ہوئی۔ اسے ڈر تھا کہ عفت

106

نے خیر خواہی... نہیں سمجھے، ارشد؟

”مذاہبانے تمہیں فلاسفر کس نے بنایا ہے۔“ ارشد نے مسکرا کر کہا۔

”قدری محبت تھے۔“ طاہرہ نے اس کے جسم کو اپنے بازوؤں میں دبا لے کر کہا۔ عفت میں گھل جانا اور میرے پاس کم از کم ایک بار۔ اپنا آپ اس میں جذب کرو۔ اس طرح تمہارے دلوں میں عفت میری جگہ لے لے گی اور یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہوگی جب تمہارا پیلا چھوڑ دیا ہوگا تو مصروف حال بالکل سی بدل جائے گی... کیوں؟“ طاہرہ نے شرارت آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”پیر پیرا ہوگا؟“ اگلے مرتبہ جب وہ جانا چاہتے۔ ایسے کاموں میں دیر اچھی نہیں ہوتی۔ ”باتوں کہیں کی؟“ ارشد نے اسے ہلکا سا دھکا دیتے ہوئے کہا۔

”وہ جانے کیا کیا دھم لے کر آیا تھا۔ طاہرہ نے اسے اٹھا کر کونویں زبدا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا لڑکی ہے اور کیا اس کا مانع ہے۔ ابھی جتنا میں بڑی ہے دیکھتے ہی دیکھتے بچہ بن جاتی ہے۔ ارشد کو اس کی یہ غویں بل لگتی تھی۔ اسی غویں کا اثر تھا کہ ارشد جو بچہ بدل لے کر آیا تھا وہ بغیر کچھ دے دیا ہوگا اور اس نے اپنے آپ کو ہلکا ہلکا پالا مگر اسے یہ خیال بھی آیا کہ طاہرہ کا مانع ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو ناراض نہیں۔ یہ لڑکی دیوانی کے قریب ہے۔

شام کو عفت طاہرہ کو کمرے میں آئی۔ طاہرہ نے اس کا استقبال اس سے قبل گریہ ہو کر کیا۔ رات کی بات پوچھی بات کی تفصیلات پر نہیں چھوڑنا۔ کیونکہ اس کی جرم میں اس نے اپنی جگہ لی اور عفت کو خوب پریشان کیا۔ اس چھوڑ چھوڑا اور ذہنی مذاق میں طاہرہ نے اپنے اچھلنے دل کو نبھال لیا تھا۔ ایک دکھ دہا لیا تھا اور اس دویے نے اس پر یہ کم کیا کہ وہ بھول گئی تھی کہ ارشد کے ساتھ کبھی اس کا تعلق تھا۔ یہ رویہ پیدا کرنے کے لیے طاہرہ کو بڑے بڑے سبق کرنے پڑتے تھے اور اب اسے اپنے اوپر فتح کے آثار دیکھ کر دینے لگے تھے۔

”دیکھ عفت؟“ اس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”ارشد تو مارتا ہے تم پر۔ میں تو تمہاری محبت پر حیران ہوتی رہتی ہوں آج میرے پاس آیا تھا تمہاری ذہنی اور جھانڈا منڈی ہی باتیں کرتا رہا۔“

”پتہ طبری؟“ عفت نے بے لگائی سے پوچھا۔

”ہاں؟“ طاہرہ نے کہا۔ ”لیکن عفت اب یہ خیال رکھنا کہ وہ بعض اوقات چپ چاپ سا ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی عادت ہے۔ اس کی ایسی خاموشی کو غلط نہ سمجھنا اور دیکھو اسے اپنے ساتھ فوری طرح بے تکلف کرو۔ اینڈ لکھو اس کی طرح بلاوجہ شرم اور جھجک میں نہ رہنا۔ خداوند سے کیا شرم؟ جب وہ دفتر سے آئے اسے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لے جایا کرو۔ چائے خود لاکر اسے پلا کر دو۔ اسے پاس ٹھاڑو اس کے پاس بیٹھو اور اس کی تھکان دور کر کے دم لوٹنا۔

”میرا باتیں کس نے بتائی تھیں طاہرہ؟“ عفت نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”میری ماں نے۔“ طاہرہ نے پناہ پر غصے سے کہا۔ ”بھلا یہ باتیں کس کی کے کھانے کی ہوتی ہیں؟ تم خود نہیں سوچ سکتیں کہ تم ایک مرد کے جسم اور روح کی مالک ہو اور مرد بھی وہ جسے دل و جان سے چاہتی ہو اور وہ تم پر جان نثار کرتا ہے۔ کیا تم اسے خوش کرنے کے لیے اس کے ٹوٹل کے لیے بھی نہ کھو لو گی؟

نہ دیا بلکہ اس کا موڈ ہی بدلنے لگا۔

شام کو ارشد اور عفت اکٹھے لان میں گھوم رہے تھے۔ ہمیں نے دیکھا تو تائیاں سجائیں۔ اتنی اور بھائی لگی تھیں اور جی بھر کے دونوں کی باتیں لیں۔ طاہرہ اور عفت دیکھ کر دونوں سرے نکال لائی اور سب کے سامنے لان میں جا کر ایک انڈیا اور دوسرا عفت کو بٹھایا۔ اس کے دونوں کے ہاتھ پکڑے۔ کچھ گنگنے لگی لیکن سہنٹ کا نپا اٹھے کچھ ایسی ہی کیفیت ارشد کی تھی مگر دونوں نے ایک دوسرے کو ڈوبنے سے بچایا اور طاہرہ صرف اتنی ہی کہی۔ ”مبارک ہو۔“

دوسرے دن شادی کا بیگانہ راقم جو کچھ تھا لیکن اس تقریب کا سرو آتش بھون پڑ چھا۔ بھانجا بھانجا صاف مسکوں ہوا تھا۔ تمام چہرے ہنسانش تھے۔ رجواخت سونہرے تھے وہ بھی مسرت تھے۔ تروتازہ تھے۔ شب بیداری نے آنکھوں کا گرد جوشان چھوڑ دیا تھا۔ ان سے بھی رومان ٹپکتے تھے اور لان کے چھوٹے اس تقریب کی زد سے بچ گئے تھے۔ ”ابھی مسکرا رہے تھے۔ طاہرہ اپنے کمرے میں لپٹی ہوئی تھی۔ ذہن خالی تھا۔ شاید سوچ سوچ کر تھک گیا تھا ارشد اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ ابھی۔ پیشتر اس کے کہ وہ کوئی بات کرتا (اسے توقع تھی کہ وہ کیا بات کرے گا) طاہرہ نے اپنے کچھ شروع کر دیا۔

”میں مانتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”اب یوں کر کہ ایک از کم ایک ہفتہ مجھ سے دور رہو اور اس سے زیادہ وقت عفت کے ساتھ گزارو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو دل سے دور کروں۔ میں ایک مل کر رہی ہوں۔ سات آٹھ روز بعد تم دیکھو گے کہ تمہارے دل کا بوجھ کس قدر ہلکا ہو گیا ہے۔ میرے پاس بیٹھو گے تو تمہارا دل میں بھر دی کش کش پیدا ہو جائے گی۔ سو سکتا ہے میں بھی ہنسا جاؤں۔ تم اپنے آپ کو عفت میں جذب کر لو۔“

جہاں تمام ہلڈرے فوجی تم کی محبت میں زبیر نہیں دیتی۔ میں اپنی سطر سے نیچے نہیں آنا چاہتی۔

”تو کیا ہماری محبت محض مذاق تھا؟“ ارشد نے کہا۔ ”ہنگامی سا جذبہ تھا وہ؟“

”نہیں؟“ طاہرہ نے جواب دیا۔ ”محبت برقرار رہے اور رہے گی لیکن ہم چھپ چھپ کر اس محبت کا آواز کیوں کریں؟ میں کیوں چوری چھپے تمہارے کمرے میں آؤں؟ ہم چوروں کی طرح کیوں بچھے تھناؤ میں بیٹنے کی کوشش کر رہی ہوں؟ کیوں؟ ہم میرے دلی کو بہت اچھے گنتے ہو اب میں حقیقت کو لوں سے کیوں چھپاؤں؟ ہمارے گھروں ہی محبت پر قائم ہے۔“

طاہرہ باتیں کرتے کرتے ارشد کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور دونوں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر اس گئی۔ گنگنے لگی۔ ”عفت تمہیں دیرانہ اور چاہتی ہے۔ تم اس کی محبت کو عرصہ تک پہنچا سکتے ہو۔ اور میری محبت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ میں نے اپنی محبت اور ایمان کو بھی برقرار رکھا ہے اور عفت کو بھی اس کے مقام تک ہے۔ وہ طاہرہ ہاتھ کر کے ارشد کے سینے تک لگتی اور گال اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس میں چوری کی کیا بات ہے؟ کھول دو اور میرے قریب ہو کر بیٹھو۔ کوئی پوچھے گا تو میں کہوں گی کہ کیا تمہارا ارشد دوسری ماں کے بیٹ سے پیدا ایک پیٹ کی پیداوار وہ بہن بھائی ایک دوسرے کے قریب بیٹھ سکتے ہیں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں کہ مجھے کسی دور

”ہاں ایہ تو ٹھیک ہے۔“

”مگر شام ارشد کو مجبور کر کے پھر پرے جانا۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”شاید وہ انکار کرے لیکن تم لے ہی جانا۔“

”انکار کیوں کریں گے وہ؟“

”مردوں کا مزاج ہی ایسا ہوتا ہے۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”سو سکتا ہے وہ تمہیں گھر سے میں اپنے پاس بٹھانا چاہے تم غصہ کر کے اسے پھر پرے جانا۔“

ایک دن باتوں باتوں میں طاہرہ نے عفت سے کہا۔ ”عفت ایک بات انور پر زور آج کل اچھا نہیں لگا رہی۔“

پرانے نمونے کی ساخت ہے تم باہر جاتی ہو تو لوگ دیکھ کر کہتے ہیں کہ کوئی دیہاتی لڑکی ہے۔“

”بڑی ہی! عفت بچوں کی طرح بولی۔“ اب میں واپس نہیں کر دوں گی۔“

”میں واپس نہیں مانگ رہی بچی!۔“ طاہرہ نے ترش روٹی سے کہا۔ ”اسے تبدیل کر لو اور دوسری چیزوں سے نئے نمونے کی چیزیں لے لو۔ آج کل چھوٹے چھوٹے ٹاپس پہننے کا رواج ہے۔ یہ اتنا دلفریب زیور تم کیوں لٹکا رہے ہو۔“

ہر خود بخود اپنا مذاق بنارہی ہو۔“

عفت کے دماغ نے اس بات کو قبول نہ کیا۔

طاہرہ اپنی اس مصروفیت میں سب کچھ فراموش کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ارشد غلاموں میں معقول رہا۔ شرمنا شروع میں اس کے پاس عفت کو ناپسند کرنے کی نگاہ کوئی وجہ نہ تھی سوائے اس کے کہ اس کے قصورتوں اور اعصاب پر غلام بھائی مڑتی تھی۔ اس نے بار بار کوشش کی کہ طاہرہ کو دل سے اٹھائے لیکن وہ تنہا ہوتا تو طاہرہ کا قصور چوری چھپے اس کے ذہن میں گھس آتا۔ اب تو کوئی راہ فراموش تھی۔

کئی بار یوں بھی ہوا کہ وہ عفت کے ساتھ تنہائی میں باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔ عفت نے اس بلاوجہ خاموشی کو محسوس بھی کیا لیکن اسے فوراً طاہرہ کے الفاظ یاد آ گئے کہ ارشد بعض اوقات چپ سا ہو جاتا ہے، یہ اس کی عادت ہے۔ عفت کسی غلط فہمی میں نہ الجھی لیکن وہ تین موقعہ ایسے آئے کہ عفت نے وہاں انچھ مہذبیت سے شرمنا ہو کر ارشد سے کوئی باز شروع کی اور ایسی حرکات کیں جیسے ارشد کو سینے کی تہوں میں بٹھالنا چاہتی ہو لیکن ارشد کو جیسے ہوش ہی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کوئی ہم کلام ہے۔ ایسے میں عفت نے محسوس کیا جیسے وہ ہدف کے تودے کے ساتھ کھیل رہی ہو۔ اس کے دل میں درد سا اٹھتا ہے وہ طاہرہ کے ان الفاظ سے بدلتی تھی کہ مردوں کا مزاج ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔

ایک دن عفت نے ارشد کے اس رویے کی طاہرہ سے شکایت کر دی۔ طاہرہ نے منہ نہیں کر دی غصہ دہرایا۔

”میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ یہ اس کی عادت ہے؟“

ای رات اس نے ارشد کو بھی کھینچا لیکن ارشد مجبور سا ہوتا جا رہا تھا۔ طاہرہ نے اسے بہت کچھ کہا لیکن ارشد کے پاس دیکھ بھولنے کے احساسات کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ ”عفت میں اچھے خاندان والی بنی ہوئی ہوں۔“

نہیں۔ لیکن طاہرہ نے یہ دلیل قبول نہ کی۔

”میں نے بہت متنب کیے ہیں طاہرہ!۔ ایک دو روز بعد ارشد نے تنگ کر طاہرہ کو بتایا۔“ لیکن اس میں وہ بات پیدا ہی نہیں ہوتی معلوم نہیں تم نے یہ راستے کس طرح قائم کر لی تھی کہ اس کی پابندی خیالی ختم ہو گئی ہے۔ سبب اس میں تو اس چیز کو مانتا ہی نہیں کہ جس ماحول میں وہ جی بٹی جاتی اور جس تاریکی میں اس نے چودہ برس گزارے ہیں اس کے اثرات تم نے دو تین سال میں دھو ڈالے ہیں۔“

یہ باتیں سن کر طاہرہ کو آفوس ہو رہا تھا۔ ایک اس لیے کہ عفت اپنی اور ارشد کی زندگی اجیڑ بنارہی تھی ڈپر اس لیے کہ اس نے طاہرہ نے خود ارشد کو وہیہ دانستہ اس اذیت میں پھینک دیا تھا اور اپنی محبت کو بھی قربان کر دیا تھا۔ لیکن طاہرہ اپنی مدد پر ماننا نہ چاہتی تھی شکست خوردگی اس کا شیوہ نہ تھا۔ اس نے ارشد کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”غصا کے لیے اس قریب سے منظر طاہرہ جو تم نے اپنے اوپر بنایا ہے نام سے اڑھ رکھا ہے۔ ارشد نے ٹپا لڑکا۔“

”میں نے اسے نزار بار کا ہے کہ یہ دنیا بھر کا جزیرہ لٹکا ہے پھر کیا جہاں آباد ہو۔ اب ہمارے گھر میں اچھے اچھے خزانوں کی عورتیں اور دولت لگے ہیں۔ تم کل کے نوٹ میں کیا کہہ دو لڑکی جو بھائی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی عفت کے زیورات کو دیکھ کر منہ نہیں رہتی۔“

اس نے بھی اس کا تھکا لڑکی دیہاتی معلوم ہوتی ہے۔ پھر تم نے مندر کے اس کارٹر بھی اترا دیا ہے۔ اگر برقع پہننے تو اس سے اس زور کے بھونڈے ہیں کو تو چھپایا جاسکتا ہے۔ اس پر ہنسنا ہی یہ ضد کہ ہم دونوں باہر بھی ملنا کریں۔ ارشد ہانتا ہے کہ راستے میں لوگ بھی دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ آج کل بھلا لوں اتنا اور اس قسم کا زور نہ ہوتا ہے۔ یہ مینا دل میں بیٹھے زور دے رہے تھے پھر کے متعلق پوچھتی رہتی ہے۔ اُدھر کچھ چل رہی ہے اور حرم صاحبہ کو بھی آواز میں سوالوں پر سوال کیے جا رہی ہیں کئی بار اگلی سبیل دالوں نے پیچھے گھوم کر بھی دیکھا ہے۔“

”سوال کیا پوچھتی ہے؟۔“ طاہرہ نے پوچھا۔

”ٹھاک پوچھتی ہے۔ حالانکہ اور اچھی طرح سمجھتی ہے۔“ ارشد نے کہا۔ ”جب ایک سین تو ہوتا ہے تو پوچھتی ہے اب کیا ہو گا ایک دن اس نے اسے غصے میں آکر کہا کہ یہ بدلتے ہے لیے تو میں نے ڈھنکٹ غریب سے کہ اب کیا ہو گا اگر پہلے تیر ہوتا تو پیسے کیوں خرچ کرتے! لیکن وہ سمجھنے والی کہاں۔ پہلے دن کو چوڑے رنگ کے ٹوٹے میں بیٹھے چوڑے سوار کی بوجھ کر دی۔ ریکارڈ اور بیوہ سوال۔ مجھے بڑی شرم آئی تاں گئے والابار بار بیٹھے دیکھا تھا میں نے بات کاٹ کر بدلنے کے لیے کہتی باتیں لیکن وہ اپنی باتوں سے نہ جیتی۔“

”ارشد! یہ کوئی شکل نہیں۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”میں جانتی تھی تمہیں یہ وقت ہوگی۔ بہت کیسے جاؤ اور تھوڑے ہی دن میں وہ سنبھل جائے گی۔ ابھی تو شادی کوکل ڈیڑھ مہینہ ہوئے۔“

”قطع ہے۔“ طاہرہ بالکل غلط ہے۔“ ارشد نے کہا۔ ”کونسا۔“ وہ دن بلن پیچھے جا رہی ہے۔ بہت کے مرد اور لڑکیوں نے وہ بہت دور پہنچے تھے گئی ہے۔ وہی نشوونما کی خاطر اس کی مدد چند ختم ہو گئی ہے اور اب ذہنی اور روحانی تیزن شروع ہو رہی ہے۔“



زین بہت وسے نانا

خاکِ محبت ہے! — ارشد نے کہا — طاہرہ! بات کرتے فرم آتی ہے لیکن میں اب تم سے شرفِ اول کا نذر یہ باتیں مجھے پریشان کرنے کی ہیں۔ خدا اسیری ساری باتیں سن لو۔ اسے بھواس سمجھ کر ہی سن لو۔۔۔۔۔ جانتی ہو، طاہرہ! غفلت محبت کیا ہے؟ صرف جھانی، یہ اس کی محبت کا عروج ہے۔ معلوم ہوتا ہے اتنی عمر تک اس کے دل و دماغ میں صرف جنسی رجحان پرورش پا کر رہا ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں کہ روح اور روحانی لذت بھی کوئی شے ہوتی ہے، یہ بیوقوفہ بنے معائنہ رکھنا۔ طاہرہ! میں اب نکل گیا ہوں تو مجھے کھل کر بھاس کرنے دو، غفلت کی محبت حیوانوں سے ذرہ بجز کم۔ اسی کو وہ زندگی کی مسرت سمجھتی ہے اور یہی میرے لیے موت ہے۔“

”نہیں! اور صاحبِ کون؟ طاہرہ نے اداس سے لہجے میں کہا — چند ماہ تک متنازعہ ایک پتھر پھیلایا جاتا ہے گا پھر۔۔۔ ایک نہیں! — ارشد نے کھل کر کہا — یہ حال رہا تو چند ماہ تک دوپٹے پھیلایا ہوں گے۔“  
طاہرہ خوب ہنسی اور ہنسنے جھٹکتے کہا — ”تم تو باہل ہی بھواسی ہو گئے ہو۔“  
”بھواسی کتنی ہوشیار ہے، سزا مجھے تو اس بیوی نے فٹ اور جھگی بنادیا ہے اور ٹیڑھی ٹیڑھی ہے طاہرہ کو میری روح ہی ہے۔ خدا کی قسم نہ دیتے ہیں کوئی سرور رہا ہے نہ لذت۔ ایسی پتی کہ اب حیرانیت ہی شدہ فوجی جا رہی ہے اور اس کا جسم جنگاہی بے خودی کا مادی ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد وہ محض گوشت پوست کا پیکر ہوتی ہے۔“  
سرور — اس کا جسم رُوح سے بیزار ہو چکا ہے۔“

”اچھا بہتر جو تم نے مجھے نہ لکھی سے بتایا ہے۔“ طاہرہ نے گہری سوچ سے جاگتے ہوئے کہا — ”میں اس رجحان تبدیل کروں گی۔“

”خیال ہے، طاہرہ! — ارشد نے کہا — ایک بیکار خیال میں تو اب متنازعہ غلطی کی سزا جھگت رہا ہوں۔ بے آدمی گرتا ہے تو کتنی ارگرتا ہے لیکن ہاتھوں کے بل عقل مند آدمی گرتا ہے تو ایک ہی بار لیکن سر کے بل۔ پھر اٹھ؟ سکتا کچھ ایسی ہی غلطی تم نے کی ہے۔“  
”میں تو اسے اب بھی غلطی نہیں کہوں گی۔“

”تم خفت مٹا رہی ہو، طاہرہ! اپنے آپ کو فریب دے رہی ہو۔ میں ای اور چھائی کے سامنے مجبور ہوں کہ غفلت کے امیڈین کو چھپا کر انہیں دیکھیں وہ بھی اس کا دنیا بانی بن محسوس کرنے لگی ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ۔۔۔۔۔ خاموش ہو گیا۔“

”دیکھیں ایسا نہ ہو کہ؟ — طاہرہ سر ہلایا سوال بن گئی۔“  
”کچھ نہیں، طاہرہ! — ارشد نے آہ لے کر کہا — یہ گاڑی چل نہ سکے گی۔“  
”یوں نہ کہو، ارشد! — طاہرہ نے اٹھ کر اس کے ہاتھ پکڑ لیے — اس گاڑی کو چلانا ہے۔ میری خاطر۔۔۔۔۔ اسے اپنی باتوں اور اپنے خیالوں میں الجھاؤ۔“

”متنبہ! اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ میں کس قدر تھک گیا ہوں۔“ ارشد نے کمرے میں ٹپکتے ہوئے کہا۔ ذرا وقفہ سے اس لیے میں بولا — ٹوڑا ٹپٹل کہیں جیسے ہے ہی بیزار نہ ہو جاؤں۔ اب تو میں اس کے ساتھ بات ہی بہت کم کرنا نہیں ہزار کوشش کے باوجود طبیعت، آبل نہیں ہوتی کہ اسے کچھ بھی کہوں، ڈیڑھ مینڈک منہ نہ نہیں ہوتا۔

دونوں اس موضوع میں ایسے اٹھ کر کہ نہیں خیال ہی نہ رہا کہ رات کے دس بج رہے ہیں۔ غفلت کمرے میں ارشد کا انشکار رہی تھی کبھی غریبی پر تھی کبھی پلاگ پر تھی۔ اسے ارشد کے بغیر چین نہیں آ رہا تھا۔ چند دنوں سے وہ ارشد کی خاموشی اور بے ادبی کو محسوس کرنے لگی تھی۔ ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں اسے تنگ ہوئے لگا تھا کہ یہ خاموشی ارشد کی عادت نہیں۔ اس کی کوئی ذوقیاد ضرور ہے۔ اس کی عموماً نگاہی اس سے آگے دیکھنے سے قاصر تھی چند دنوں سے ارشد نے اس کے ساتھ بات چیت بہت کم کر دی تھی اور رات اس کے کمرے میں، جواب ان دنوں کا کمرہ تھا، ارشد نے بہت دیر سے آنا شروع کر دیا تھا۔ ورات نے تک اپنے پڑھنے کے کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ گزشتہ رات غفلت اسے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لائی تھی۔

غفلت کو ایک اور خیال اس کی طرح پریشان کرنے لگا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کیمپ میں طاہرہ اور ارشد جراتوں کو باہر نکل بانے تھے اس میں کوئی ناخوشا۔ طاہرہ نے اسے بتایا تھا کہ — ”ارشد مجھے ہی چاہتا ہے۔ اور میں اسے متاثر سے ساتھ شادی کے لیے تیار کر رہی ہوں بلکہ ارشد نے یہ خواہش ظاہر کر رکھی دی ہے۔ لیکن دو ایک روز سے طاہرہ کی ان باتوں سے اسے ملک کی لڑائی لگنے لگی تھی۔“

آج رات ارشد بھی غفلت کے پاس نہ آیا تو غفلت نے سوچ سوچ کر دانت میں لیے۔ وہ ہراس انسان کو کچھ چاہنا اپنی جی جاس کے اور ارشد کے درمیان آنے کی کوشش کرے۔ اس نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر ارشد کے کمرے کا طرف دیکھا۔ اس کے کمرے کے سامنے بائیں طرف میں اندھیرا تھا جس سے طاہرہ رہتا تھا کہ ارشد یا تو کمرے میں ہے یا نہیں وہیں سو گیا ہے۔ اس کمرے کی کٹل میں طاہرہ کے کمرے کی کھڑکی میں سے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں سے نکل کر ارشد کے کمرے کی طرف چلی۔ اس نے ارادہ کیا تھا کہ اگر وہ سوچ بھی گیا ہے تو اسے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لے لے گی جب وہ طاہرہ کی کھڑکی کے سامنے سے گزر رہی تھی تو اس کے کانوں میں ارشد کے یہ الفاظ پڑے۔  
”ہزار کوشش کے باوجود طبیعت مان ہی نہیں ہوتی کہ اسے کچھ بھی کہوں۔“

غفلت وہیں گئی کہ اس کی آواز کان بھر کر لے لی۔ ارشد کی آواز طاہرہ کے کمرے میں سے آرہی تھی۔  
”ارشد! میں نے متنبہ کیا ہے۔ یہ طاہرہ کے لرزے ہوئے جذباتی الفاظ تھے۔ میں نے تم سے محبت کی۔ خدا را میری محبت کو نہ چھوٹا۔ اس محبت کی خاطر سب کچھ برداشت کرو۔“

”طاہرہ! — ارشد اس سے زیادہ جذباتی لہجے میں کہ رہا تھا — ”میرے لیے اب کوئی راز نہیں میں متنازعہ محبت ہی جڑ میں کرنا چاہتا۔ میں دو چہروں کے درمیان پس رہا ہوں۔“  
”کچھ ارشد! وہ جھگی سی۔ امیڈ سی۔۔۔۔۔ طاہرہ کا فخر نہ پڑا نہ ہو سکا۔“  
”کاش ہم دونوں کو پہلے سے علم ہو جاتا — ارشد نے طاہرہ کی بات کاٹ کر کہا — ”ان جذباتی باتوں کی بے لوث

”پلے مجھے شک تھا۔ اب یقین ہو گیا ہے کہ تم اپنی محبت کی خاطر ارشد کو مجھ سے دورے بارہا بھی ہوئے۔ عفت نے لڑائی جڑی اور میں کہا۔ ”اگر ایسی بات سچی تو مجھے اس کے حوالے کیوں کیا تھا؟“

”تم بھول گئی ہو کہ میں نے خود تمہاری شادی کا بندوبست کیا ہے۔“ طاہرہ نے منہ پھلے ہوئے کہا۔ ”یقیناً نہیں، بلکہ میں نے سب سے پہلے ارشد تمہیں چاہتا ہے اور وہ تمہارا ہے۔ یہ بھی سوچا ہے کہ میں نے ایسے کیوں کیا تھا؟ ایسے کیوں کیا تھا؟ میں پاگل بھی تھا یا؟ اگر مجھے اس سے محبت ہو تو میں اسے ہمتا رہے حوالے کیوں کرتا؟ آخر کیا وجہ تھی کہ میں نے تمہیں اس بات یقین دلایا تھا کہ وہ تم کو چاہتا ہے؟ فدا سوچو عفت! وہ جو بھی کہیں گے تم دونوں کو اکیلے باہر جاتے اور رات باہر گزارتے پڑا لیا تھا۔ عفت نے خود اعتمادی سے کہا۔ ”وہ جو بھی کہیں گے تم اس وقت غم متیں اور تم کو کھلا گئی تھیں۔ تم جو کم کچی تھیں۔ طاہرہ! اسی اچھی طرح جانتی ہو کہ عورت مرد سے کیا چاہتی ہے۔ عورت اور مرد کا ملاپ ہونا ہے۔ مجھے معلوم ہے۔“

”تم چنگلی کی چنگی رہیں۔“ طاہرہ نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھی تھی میں نے تمہیں اندھیرے میں سے نکال لیا ہے لیکن تم اس سے بھی زیادہ گہرے اندھیرے میں جا گری ہو جس میں تمہیں راہ دکھانی اور جس نے تمہاری برتن پوری کی تم اس پر بستان لگا رہی ہو کہ وہ جو تم سے میں ہمتا رہے ساتھ ہی بات کرنا چاہتی تھی کہ اپنا خیال بدل دو کہ عورت اور مرد کا ملاپ چاہی ہوتا ہے۔ ہمتا رہے اسی رحمان اور وہ نے لے لے ارشد کو اپنا سر خودیاسے میں تمہیں ایک ہنسی تھی اور تم نے ایک ہی جہت میں اپنے آپ کو گم کر دیا۔ میں نے تمہاری جا بجا بیان سنی تھی جس میں روح کو بیدار کیا تھا اسے ہمتا رہے جسم نے گل لیا ہے۔ مجھے شرم آ رہی ہے کہ میں ایسی باتیں کر رہی ہوں لیکن میرا مطلب احسان کنو؟ نہیں؟“

”ہمتا مطلب حشر احسان جتانے سے ہے۔“ عفت نے اسی طرح کھڑے کھڑے کہا۔ ”میں تو اس زور کا مجناؤں جو رہا ہے جو تم نے مجھے دیا ہے۔ اسی لیے تم میرے پیچھے پڑ گئی تھیں کہ وہ زور داپس کر دو تمہیں اچانک لگا۔“ طاہرہ کو غصے نے آگ بولا کر دیا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ موقع کا تقاضا تھا اور ہے۔ اس کا دل زور دے دھر کر رہا تھا ہے اس نے منہ نکال کر کہا۔ ”بھول گئی ہو کہ میں نے اس کے بدلے تمہیں نئی اور اچھی چیزیں پیش کی تھیں؟“

”وہ اس لیے کہ وہ بھلی ہیں اور خاص سونے کی کینیں... طاہرہ! عفت نے پھر سے ہنسنے لگے۔ ”میں تمہارے دور سے دیکھ رہی ہوں کہ ارشد مجھ سے دور رہتا جا رہا ہے۔ میں اس کی بے وفائی اور سردہری سمجھ رہی ہوں لیکن رات بیدار کھل لیا ہے۔ میں نے تم دونوں کی باتیں سنی ہیں؟“

”کیا سنا ہے تم نے؟“

”یہ کہ ارشد! میں نے تمہیں چاہا ہے۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ خدا لا میری محبت کو کچل کر دنیا میری محبت کی خاطر سب کچھ برداشت کر رہا ہے۔ یہ تم نے کہا تھا اور ارشد نے کہا تھا کہ میرے لیے اب کوئی راہ نہیں۔ میں تمہاری محبت کو جوڑوں میں نہا ہوتا ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ عفت چنگلی اور ابلہ ہے اور ارشد نے کہا تھا کہ ان چاندنی راتوں کی محبت بے بس ہو گئی ہے۔“ اور مجھ؟

محبت بے بس ہو گئی ہے؟

عفت نے یہ الفاظ سنے تو بے ہاؤں دواں سے مٹی اور دھڑام سے اپنے چنگ پر لگی۔ اس نے ہاتھوں پر اس کے اپنے آپ سے کہا۔ ”میری آنکھوں کے سامنے میری محبت کا خون... طاہرہ! میں کا سانپ ہے۔“

”خدا کے لیے ارشد! طاہرہ ارشد سے کہہ رہی تھی۔ طمان چاندنی راتوں کو بھول جاؤ۔ جذبات میں الجھ کر اور عفت کی زندگی تباہ کر دو۔ وہ وقت گزر گیا ہے۔ اب اس وقت کو صحن بناؤ۔ میری خاطر میری محبت کی خاطر عفت کو دل و جان سے قبول کر دو۔ میرا ایمان ہے۔ اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔ یہ ایک نظمیں لکھی ہے۔ خدا لا ارشد اس کی کو زیادہ کر دو میں اتنے جلدی ہوں۔“

عفت غصے میں پھری ہوئی۔ پاگل کی طرح لیے لیے دنگ بھرتی کمرے میں ٹپ رہی تھی۔ ارشد طاہرہ کے کمرے سے نکلی کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور رات وہیں گزاری۔

دوسری صبح عفت طاہرہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے بچے پر شب بیلاری کے اثرات نمایاں تھے۔ بچے کے ہونے اور انہیں اس نشی کی آنکھوں کی مانند مقصود جرات بھرنے سے ٹوٹا اور اس وجہ سے بے حال رہا ہوا تھا۔ اس غصے کو دیکھ کر طاہرہ کو اطمینان ہوا۔ اس نے سجا کر ارشد اور وہ تمام رات جاگنے سے بچے میں اور وہ یقیناً مطلب کی باتیں رہے ہوں گے۔

”آؤ عفت! طاہرہ نے سرو کے عام لمبے میں کہا۔ صبح صبح اٹھ کے نہا دھو لیا کرو۔ تمہیں شاید یہ تجلیہ اچھا۔“

طاہرہ نے شرات کے لیے عفت میں کہا۔ اس صبح میں ارشد کے پیار کے نقوش ملتے ہیں نا! اس لیے تم اس پلنگر کی جو رہے نا ہی بات؟

عفت خاموش پھڑکی رہی جیسے اس نے طاہرہ کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ طاہرہ نے اس کی اندرونی کیفیت کو برسرے کہا۔ ”بیٹھو! میں آج تمہارے ساتھ ایک اور بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”یہ کہ تم ارشد کو چاہتی ہو اور تمہیں دیکھ رہا ہے کہ ارشد نے تمہارے ساتھ شادی کر لی ہے۔“ عفت لہجے میں ایک طوفان چھپا کر نظر پھلنے سے کہا۔ لیکن اس میں طنز کے جوہر تھے وہ پوشیدہ نہیں تھے اور طاہرہ کی جیسے ہیں دل میں محسوس کی۔

”کیا سچی ہے عفت؟“ طاہرہ نے مخصوص بے تکلفی سے کہا۔

”جیسے تمہیں پتہ ہی نہیں۔“ عفت نے اپنا لب و لہجہ نہ بولا اور کہا۔ ”سنو طاہرہ! میں نے تمہیں کیسے پتہ کہ میں تم دونوں کے درمیان نہ رہوں تو بہتر ہے۔ روز میں تم دونوں پر ناگوار ہو رہی رہوں گی لیکن تم نے جانے کیا مجھے اپنے ساتھ چپکا دیا۔ آج ارشد پر میرا قبضہ ہو گیا ہے۔ تو تمہیں دیکھ ہونے لگا ہے اور اب مجھ۔“

خاندان چھین رہی ہو؟

”اوہ؟“ طاہرہ کے منہ سے جیسے استعجاب کی آواز نکلی ہو۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔



بات میں اپنی محبت کا واسطہ دیا ہے لیکن ہم اس چنان کی طرح اپنی جگہ سے نہ ہٹیں جو چہرے سمندر کے نیچے ڈوب جاتی ہے مٹی نہیں اس میں طبعی اور ابھر نے کی سکت سی نہیں ہوتی۔

عفت نے سر اٹھتوں میں تمام لیا۔ اس نے اپنے آپ کو دنیا کی مہیب لہروں میں بہتے پایا۔ وہ لہریں جنہیں وہ ہجرت کے دوکان مزارعہ کے سہارے بغیر عبور نہ کر سکتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر سہارے کی ضرورت محسوس کی اس پر ڈوبنے کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ سینہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔

..... تم ارشد سے صرف جہانی آسودگی چاہتی ہو۔ طاہرہ نے اسی لمحے میں کہا۔ یہ نہ مارا مقام ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ ارشد اس مقام سے بہت آگے ہے بہت بلند ہے۔ وہ ارشد جس نے تعلیم چھوڑ کر صرف سبز جھنڈے کی خاطر

اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی۔ وہ ارشد جس نے جلوسوں کی قیادت کی ہے اور عورتوں کو منظم کیا ہے۔ وہ ارشد جس کے ارادوں کا لگی کو خواہن لوگوں کی تھکین کی طرح بھینھناتی رہتی تھیں اور اس کی نظر سبز جھنڈے سے ہٹتی نہ تھی جس مرد کے سینے میں یہ دلوں پرورش پا رہے ہوں وہ جہانی آسودگی کے قائل نہیں ہوا کرتے۔ اس کے بال پر پلٹے ہوئے نہیں رہتے۔ تم عفت! ارشد کے پوچھ رہی ہو جس نے پاکستان کی خاطر اور قومی پرچم کی خاطر۔۔۔

طاہرہ! عفت پیچ مار کر اٹھی۔ ایک دل خراش چیخ۔ اور طاہرہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اس کے سامنے دوڑا تو گونگی۔ ایک طرف ان جو اس کے سینے سے اٹھ رہا تھا سینکڑوں گلوں کی صورت اختیار کر گیا اور عفت نے بس اور بے سہارا ہر طاہرہ کے سامنے لگئی۔ اس نے بچوں کی طرح روتے ہوئے کہا کہ جاؤ پناہ پاکستان..... جاؤ یہ سبز جھنڈے مجھے میرا ارشد دے دو..... مجھے میرا ارشد دے دو..... طاہرہ! اور اس کے باقی الفاظ سکین اور پکپک میں گھول گئے۔

پاکل نہ ہو عفت! طاہرہ نے دبلے ہوئے غصے سے کہا۔ ہوش میں آؤ۔

تم نے میرے ہوش اڑا دیئے ہیں، طاہرہ! عفت نے طاہرہ کے سہارے اٹھتے ہوئے کہا۔ میری ایک بات مان جاؤ میں آخری بات پھر تم سے کچھ نہ مانگی گی۔

طاہرہ خاموشی سے سنتی رہی۔

”تم یہاں سے چلی جاؤ“ عفت نے اسی طرح روتے ہوئے تجنی لمحے میں کہا۔ اپنا سامان زور بے جاؤ۔ جب تک تم ارشد کے سامنے ہو وہ مجھ سے دور رہے گا میں جان گئی ہوں وہ تمہیں چاہتا ہے اور تم اسے چاہتی ہو۔ تم ہمارے زمینان سے ہٹ جاؤ۔ یہاں سے چلی جاؤ۔“

کہاں؟

”جہاں تمنا راجی چاہے۔ یہاں سے نکل جاؤ۔“ عفت کے لمحے میں التجا تھی۔

”درد شکوہ کی تمنا کے لیے۔“ طاہرہ نے اطمینان سے پوچھا۔ میں اپنی کہاں رہوں گی؟ عفت! بات کرنے کچھ تو سوچا کرو کو تو واپس لغیر جو کمیپ میں چلی جاؤں۔ وہی ایک ٹھکانہ ہے۔

طاہرہ کی باتوں میں نرمی تھی جسے عفت نے اس کے لیے ہی سمجھا لیا۔ اسے عفت کو جیسے کسی نے کان میں کہہ دیا ہو۔

ایک عورت میں اس سے زیادہ سننے کی تاب ہی کہاں ہوتی ہے۔

”میں تم نے اسی قدر سنا تھا۔“

عفت خاموش رہی۔

”کیا تم نے ان فقراتوں سے پہلے اور بعد بھی کچھ نہ سنا تھا۔“

سننے کی محنت ہی کہاں تھی۔

ولا ش! تم اس سے پہلے اور بعد کی باتیں بھی مٹی نہیں۔ طاہرہ نے تحمل سے کہا۔ ”اور! عفت! آپ کو دیکھو اور سمجھو میری عمر تمام مشکل پر پانی پیر دیا ہے۔ میں اب بھی کتنی ہوں..... طاہرہ کی آواز بلند اور درا اور اس میں ایک جہاں جھلک اٹھی۔ میں اب بھی کتنی ہوں۔ ارشد نے نہیں بہرہ دونوں نے مل کر میری انگلیوں اور ٹوئیں ڈالا ہے۔ میں وہی الفاظ تہیں کتنی بول جرات ارشد کو کہتے اور مٹا رہے آگے کے جڑو جڑو بول کر میری ہر غصہ سب کچھ برداشت کرو۔ سو عفت! یہی نہ جانتی تھی کہ ایک رات تم پر قاتل کر دیں حالات نے مجبور کر دیا ہے۔“

نے تلخ سا گھٹن اطمینان سے منگل کر کہا۔ ”ارشد! وہ میں ایک دوسرے کو دلوں پر چاہتے تھے۔ ہم نے کتنی ہی بات سے دو دیکھ کر گزار دی ہیں جب ہماری محبت عروج پر تھی تو اس حسین منظر میں ہم داخل ہو گئیں اور تم نے اپنے جذبات مخصوص رنگ میں میرے سامنے پھیلا دیئے۔ اب ایک طرف میرے جذبات اور احساسات تھے اور دوسری طرف اخلاق اور کردار..... جانتی ہو کہ ہمارے کسے ہیں؟ بھول گئی ہو میرے تمام سبق؟

عفت کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس نے بے بسی کے عالم میں اپنے سہم کو کرسی پر پھینک دیا۔ اس کی خاموش طاہرہ کے باوجود ارشد کے سامنے۔ ریت کے گھونڈے سے زیادہ خضوع نہ تھی تھی۔ طاہرہ کا اخلاق اور شخصیت اس کی طرح غالب تھی عفت بھی شاید سایہ بہت کیا ہے۔ دوسری طرف عفت کی شخصیت کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ طاہرہ اس کے نیچے بنیادیں کھی جھیں لیکن ان نمادوں کے نیچے ریت اور پانی تھا۔ صرف ایک جھلک کی ضرورت تھی عفت کچھ سوچ کر آتی تھی لیکن طاہرہ نے بات کی تو عفت نے محسوس کیا عیسے طاہرہ کا سینہ ایک طلسمی دیوار کی طرح کھل کر جانے کس قوت کے تحت عفت اس میں سما تی جا رہی ہے۔ دیوار کا ٹکاف بند ہو گیا اور عفت اسی میں گم ہو گئی۔

”میرا ایمان میرا کردار ہے اور تمنا! ایمان ارشد کے سہم کو مڑ دے۔“ طاہرہ نے طلسماتی سے آواز میں کہا کہ سامنے وہ طاہرہ کو کتنی جس میں جہاں آدے کے تھانے کے سامنے ہزاروں پیپا ہوتے مردوں کو سالار کے گھونڈے پر ہوا کر لٹکا رہا تھا اور اس غلوں کا رخ بند دلوں کی طرف کر کے بند دلوں کے دلوں سے نکلتے ہوئے آگ کے شعلے بچھاؤ عفت! اپنے اندر ہی اندر تڑپ اٹھی۔ اس کا جسم ساکت تھا۔

”تم ایک پورا سوچے میں نے اپنی محبت کے خون سے بیچ لیا ہے۔“ طاہرہ کو کہہ رہی تھی۔ ”میں نے ارشد پر کرار سے تمہارے حوالے کیا تھا۔ تم نے تو صرف ایک رات کی دوپٹی بخشی میں۔ میں نے ساری ساری رات بخشی۔“

اپنے قریب رتجہ کرانے میں آ رہی تھیں اور وہیں اس میں جذب کر لینے اور جذب ہو جانے کے سبق پڑھاتے ہیں میں نے

لیے کس جی رہا تھا؟... وہ طاہرہ کے ساتھ لپٹ گئی اور روتے روتے بولی۔ ”مجھے تنہا چھوڑ کے نہ جانا میں بھٹک جاؤں گی  
ن اندھیرے میں، مجھے اکیلے نہ چھوڑ جانا“

خاموشی، سکوت جسے دونوں لڑکیوں کے آنسو قعرش نہ کر سکے۔ دوستی بعدِ عفت نے سکوت توڑا۔ ”طاہری!  
مرحبت رہا ہے۔“

طاہرہ نے اسے ہلک پڑھایا اور اس کے سر پر نے بیچ کر اس کا ہاتھ سسلانے لگی عفت نے طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ  
نے پر دایا عفت کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور بند ہو گئیں طاہرہ اس پر جھکی اور اس کی چٹائی چوم کر زیر لب کہا۔ ”رشتہ تمہارا ہے۔“  
عفت گہری نیند سو گئی تھی۔

”رشتہ تمہارا خداوند ہے اور اس کو بھٹی کی مالک تم جو طاہرہ کا بیان کیا کام ہے۔ عفت کی سچی کی دو عورت جسے طاہرہ نے  
”طاہرہ!۔ عفت نے لب و لہجے میں فوراً ایک تبدیلی پیدا کر کے ٹنگوں والی ٹیگول کے انداز سے کہا۔“  
جاؤ اور کس ٹھکانہ کر لینا میں اپنے گھر میں کسی بے مزگی کو رہائش نہیں کر سکتی۔ فورے طرار کو ساتھ لے جانا میں اس  
طاہرہ خاموشی سے عفت کو دیکھتی رہی عفت نے اس کی طرف دیکھا تو طاہرہ نے آنکھیں اس کی آنکھوں میں  
چہرے پر اطمینان، سکون، خود اعتمادی، وقار اور جلال کے تاثرات لیے کمرے کے وسط میں کھڑی عفت کو گھٹی تار  
مہوڑوں پر ایک لطیف تبسم تھا۔ کھاری مسکراہٹ جس طرح اتنیں کا چاندنی بھری دلکش لکیر کی طرح افی سے اجرا  
ایک ایک نقش کا حق اس طرح نکھڑا تھا جیسے قدرت نے اپنی تمام تر عنایتیاں اور محسوسیت ان غدوغل میں  
نے نکالیں تھیں کمرے میں اس کی آنکھیں فراہمی اس طرح اوپر اٹھ گئیں جیسے غمی قوت نے اتحادی ہوں عفت  
بارہجہ طاہرہ کی طرف دیکھا اور اسے ایک بار پھر یوں لگا جیسے طاہرہ کی جتنی طلسمی دیوار کی طرح کھل گئی ہو اور عفت جبکہ  
سوئی اس میں داخل ہو رہی ہو۔

عفت نے اپنے اندر ہی اندر اپنے آپ کو پیچھے کھینچ لینے کی جدوجہد کی لیکن وہ تھکا ہوا ہو گئی اس نے آواز  
کی اور تیزی سے کھوم کر کمرے کے دروازے کی طرف چل پڑی۔ طاہرہ اسے اسی طرح گھٹی رہی عفت نے دروازہ کھ  
جیسے ایک جادو نے اس کے پاؤں زمین کے ساتھ پیوست کر دیئے ہوں۔ وہ دوسری کی، طاہرہ کی طرف پیٹھ کیے ہ  
کوڑو کو تھا کہ جھک گئی جیسے اس پر غشی طاری ہو رہی ہو۔ طاہرہ اسے اسی طرح دیکھتی رہی عفت نے جھکے جھکے خا  
دیکھ اور ایک بازو آنکھوں کے گروپٹ کر دو سر بازو طاہرہ کی طرف پھیلا دیا پھر اس کے سینے سے ایک دلدوز چیخ نکلا  
”طاہرہ!۔ عفت نے چیخ کر کہا اور طاہرہ کی طرف گئی ایک بازو آنکھوں پلٹ لیا جیسے اس کی آنکھوں میں  
دھتال پڑ گیا جو درد و دہرا بازو ہوا میں معلق، طاہرہ کی طرف بڑھتا ہوا جیسے اسے کچھ نظر نہ آ رہا ہو۔ طاہرہ غلے کے لیے  
میرے قریب آ باؤ۔ میری طاہری! میں ڈوب رہی ہوں۔“

طاہرہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھی۔ ایک ایک قدم چوک چوک کر گھٹی ہوئی وہ جا رہی تھی چلی ہو گی کہ  
بھلی کی سرعت سے طاہرہ کے قریب آگئی اور اس کے ساتھ لپٹ گئی پھر اس کے سامنے ٹھٹھوں کے بل کر تے  
اس کے دونوں بازو مضبوطی سے پکڑ کر اور اس کے دامن میں چسپو پیچھا کر چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی۔  
طاہرہ کے لیے یہ صورت حال تکلیف دہ تھی لیکن سکون آمیز بھی۔ وہ عفت کی ہنسی کی تفسیر سمجھ گئی تھی۔ طاہرہ پر تیز  
گئی۔ وہ کچھ کہنے سی والی تھی کہ آواز صلی میں آگئی اس نے عفت کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ سینے سے لگا لیا اور  
اپنے پاس بٹھا کر اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔

”طاہرہ!۔ عفت کی سسکیوں نے رک رک کر کہا۔ میں نے کیا کہا تھا؟ میں نے کچھ کہا تھا؟۔ وہ اٹھ بیٹھی  
کی طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے گہری نیند سے چونک اٹھی ہو۔ طاہرہ کے آنسو جاری تھے عفت کی آنکھری سوئی آواز میں  
”تیں یاد ہے میں نے کیا کہا تھا؟ تم جی تو نہ جادو کی طاہری؟... تم نے کہا نہیں تھا کہ میں جی جاؤں گی۔۔۔۔ نہ جانا، طاہری

جوئی، بچہ کے لئے بوجہ تھا کہ طاہرہ کی کھٹکھٹ نے کس طرح لے لی۔ وہ عفت کی کچلی زندگی سے پوری طرح آگاہ تھی۔  
طاہرہ نے بچہ کو اپنی کوٹھی کا منبر اور پتہ بتایا اور اس کے رشتہ داروں کے مکان کا پتہ لے کر اسے دوسرے دن دوپہر  
لے کھانے پر مدعو کیا۔ بچہ آئے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

واپس آئے ہوئے تانگے میں طاہرہ نے بچہ کے متعلق بہت سی باتیں سنائیں۔ اسے سنایا کہ بچہ کا ایک جوان بھائی  
فریاد پاکستان میں شہید ہو گیا ہے اور مرحوم ارشد کے ساتھ اس قدر مشابہت تھا کہ ایک دن بچہ ارشد سے بھل کر بکر بہت  
آئی اور اس نے ارشد کو بھائی بنا لیا ہے۔

”وہ عفت کی شادی کا سن کر حیران ہی ہو گئی تھی۔“ بھائی نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”نہیں، دو حیران نہیں بنوئی تھی۔“ طاہرہ نے بات پر دو دوائے بنوے۔ جواب دیا۔ ”ارشد کا نام سن کر اسے اپنا  
مردم بھائی یاد آ گیا ہوگا۔ اچھا بھرا کہ بچہ نے شادی کر لی ہے، درخت تہائی اور فراغت میں بھائی کے لیے یہی رتی تھی۔  
دوسرے دن بچہ آئی گھر میں خوب رونے لگا، جلال آباد سے بھٹنے کے قصبے تھیں، قصبہ نے سنا تو گئے انہیں  
بھی یاد آ گیا کہ جوڑے تھے اور انہیں بھی جوڑہ تھے لیکن کہاں؟ کسی کو کسی کا علم نہیں تھا۔ دن کے پچھلے پہر بچہ ارشد کو طاہرہ کو اپنی گھر سے  
میں بچے گئیں پھر دل کی باتیں شروع ہوئیں۔

”عفت کو کیا ہو گیا ہے؟“ بچہ نے پوچھا۔

”شادی ہو گئی ہے۔“ طاہرہ نے شگفتہ لہجے میں جواب دیا۔

”اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ یہ شادی ہوئی کیسے؟“ بچہ نے پوچھا۔ ”میرا تو خیال تھا کہ۔۔۔“

”آپ کا خیال درست تھا۔“ طاہرہ نے بچہ کی بات پوری نہ سونے دی اور اسے سارا واقعہ سنایا کہ کس طرح اس  
نے عفت کی ایک متاثرہ اور ارشد کی تباہی کا خون کر کے پوری کی ہے لیکن اس نے بچہ کو یہ بتایا کہ اب ارشد اور عفت کی  
کس طرح گرد رہی ہے۔ بلکہ یہ کہا کہ وہ آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ طاہرہ اپنے مخصوص رنگ میں باتیں مانتی جا رہی تھی اور بچہ  
چپ چاپ اس کی باتیں سنتی جا رہی تھی اور طاہرہ کے سینے میں مدد خاں میں اس عورت کو ڈھونڈ رہی تھی جیسا سب  
بچہ قربان کر دیتی ہے لیکن دل کی اسلگ کسی کو نہیں دیتی۔ بچہ کو طاہرہ کے خدو خال میں وہ عورت نظر نہ آتی۔ بچہ کی آنکھیں  
فلکی جا رہی تھیں۔

”وہ باتیں کر رہی رہی تھیں کہ ارشد کا کیا بچہ اس سے بھل کر ہو گئی اور میں بھائی نے دل کھول کر باتیں کیں۔

ارشد کے جانے کے بعد بچہ نے طاہرہ سے کہا۔ ”عفت میں، میں ایک تبدیلی محسوس کر رہی ہوں۔ وہ کچھ گھٹن  
ی ہے جسے اپنے آپ میں نہیں۔ اس میں جلال آباد والی شوخی رہی نہیں میں نے اسے علیحدگی کی شادی کی شہداد  
ی اور فراموشی کی یاد تھوڑے بھر کے بولی کیا شادی ہوئی ہے جانے خدا کو کیا منظور ہے۔ میں نے بہت کر دیا لیکن ناگہری  
لہجہ اور ادھوری باتیں کرتی رہی۔“

”میں اب بھی کے درمیان ہی کچھ ہوگا۔“ طاہرہ نے لٹے ہوئے کہا۔ ”میں نے تو پوچھا نہیں سنہل جاتیں گے۔“

اسی دن کھانے سے دو پہلے ارشد کی بھابی طاہرہ کو سوئیڈوں کے لیے آؤں خریدنے کے لیے بازار کی  
عفت ابھی تک سو رہی تھی۔ راستے میں بھابی نے طاہرہ سے کہا۔ ”ارشد الگ کھوٹا کھوٹا رہتا ہے۔ عفت بھی  
سی نظر آتی ہے۔ کچھ گڑبڑ تو نہیں؟“

”نہ بھابی!۔“ طاہرہ نے جواب دیا۔ ”گڑبڑ کیا ہوگی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ دو چار دن تک آپس  
جائیں گے۔“

”بچے شک ہے۔“ بھابی نے کہا۔ ”کہاں وہ صبح و شام کی سیریں اور کہاں یہ حال کہ ارشد شام دیر  
ہے میں نے دیکھا ہے وہ اب کئی راتوں سے سو جا رہا ہے اپنے کمرے میں ہے۔ دیکھا نہیں تم نے ارشد کی تہ  
اور کھنڈر تھا۔ اب بالکل ہی کچھ کے روگیا ہے میں نے تو پوچھا سب نہیں سمجھا۔“

”ابھی نہ ہی پوچھیں۔“ طاہرہ نے مشورہ دیا۔ ”کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو عفت مجھے ضرورتاً بتائے گی۔  
طاہرہ فکر مند ہو گئی کہ دونوں کی ناجاک دو سڑوں کو بھی نظر آنے لگی ہے۔ اگر حالات زیادہ خراب ہو گئے،  
سوچا۔ تو وہ کس طرح سنہل کئے گی۔ وہ ایسی گھریں گم ہو گئی کہ دونوں میں کوئی بے مرگی پیدا نہ ہو جائے۔

دونوں بازار کی ایک دوکان میں آؤں دیکھ رہی تھیں کہ طاہرہ نے اپنے کندھے پر بیک جھنڈا سا ہاتھ منسوک  
تو وہ بازوؤں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ طاہرہ اس اچانک لپیٹ میں آنے سے پہلے یہ بھی نہ بچے کی کہ کو  
جب گرفت ڈھیلی ہوئی تو دیکھا۔ وہ بچہ تھی۔ اب طاہرہ کی باری تھی۔ وہ بچہ کے ساتھ لپیٹ گئی۔ چہرہ بجا  
کرایا۔ طاہرہ کو ان کی پسند و ناپسند کا تو ہوش ہی نہ رہا۔ بچہ کے ساتھ باتوں میں ایسی الجھی کر جانے لگا تو وقت گزر گیا  
سے سولوں کی پوچھا۔ سو رہی تھی اور دونوں بیک وقت جواب دے رہی تھیں۔ جلال آباد کی آخری ملاقات۔  
اس ملاقات تک کی بیشتر باتیں پوچھی گئیں اور سنائی گئیں۔

بچہ نے اسے بتایا کہ وہ ان دنوں راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ اس نے شادی کر لی ہے اور راولپنڈی ایک سو  
ہے۔ وہ اپنی نئی زندگی پر مطمئن تھی۔ اس نے طاہرہ کو بتایا کہ وہ ایک بہت سا بوجھ ٹھہرے گی کسی رشتہ دار کی شادی پر  
طاہرہ نے اسے بتایا کہ عفت کی شادی ارشد کے ساتھ ہو گئی ہے۔ تو بچہ کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا اور وہ





تھا انہوں نے سبز چرم کو خن سے سلجھا تھا اور دایوں میں لڑھکاری کر دینے والے نعروں سے نبواہی تھی۔ کہاں گئے وہ  
نرے؟ ہندوستان کے کونے کونے سے اٹھتی ہوئی وہ کردگار لوگوں کہاں گئے؟ کبھی کو جہینوں سے لہانے والے آج  
مریے سے اڑ گئے ہیں۔ ان کے جنم خلک ہوتے جارہے ہیں۔ یہ بارود مفلوج ہوتے جارہے ہیں۔ یہ قوت سلب ہوتی نظر  
آتی ہے۔ یہ انسان مرتے جارہے ہیں۔ ان کی زمین بھی نظر آتی ہیں شکاری ہیں۔

ظاہر ہے زمین میں ایک شور مٹا رہا ہے۔ سینے میں کچھو رینگنے لگے اور وہ بے چین ہو گئی۔ منجہ نے اسے  
اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن ظاہر اپنی دنیا کے اٹھتے شورش سے بردہنی دنیا کے خاموش سنگاموں کو بگاڑ رہی تھی۔  
”نہیں! نہیں!“ ظاہر جیسے دل ہی دل میں چیخا اٹھی ہو۔ یہ زمین نہیں کی نہیں۔ یہ انسان مفلوج نہیں ہوں۔

اے! انہوں نے پاکستان بنایا ہے۔ انہوں نے اس چمن کی خاطر اپنے آشیانے چھوڑ کر ڈالے ہیں۔ ہندوستان کی گلیاں ہمارے  
لیے مٹی تھیں۔ وہ گھر ہمارا نہیں تھا۔ ہمارا گھر جیسے۔ یہ۔ پاکستان۔ پاکستان۔ ہمیں ان گھروں کا غم نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں  
اس مٹی کو ذہن سے اگل دینا چاہیے۔ ہمارے مٹی پر انگریز اور ہندو کا آسیب سوار ہے۔ ہم اس آسیب کو جھٹکا آتے  
ہیں۔ لیکن... لیکن... یہ مفلوک جوفٹ پاتھوں پر پڑی ٹھٹھ رہی ہے؟

ظاہر کے جذبات حقیقت کے سامنے ماذ پڑنے لگے۔ دوسروں کی دعوں کو جگانے جگانے اس کی اپنی روح کو گھٹنے  
لگی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی کہ شرم زون میں اس کا ذہن خالی ہو گیا۔ جموت سے دیران گھر کی طرح۔ اس نے سر کو جھٹکا۔ زور سے  
جھٹکا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا اچھا لگا تھا۔ اندھیرا اچھٹھ لگا تھا۔ — دھندلا ہٹ۔ بھرا جالا۔ اور اس نے  
دیکھا کہ اندھیرا دیا تے راوی کے بل پر جا رہا تھا۔ نیچے دریا بہ رہا تھا۔

دریا خاموشی سے بہ رہا تھا۔ پانی کی دیو سی لکیر سرگوشیاں کرتی۔ بل کھاتی، کشتیوں کو دھیسے سڑوں میں لوریاں تانی  
اور دریا سے دیتی، آہستہ آہستہ، نہایت آہستہ ہی جاری تھی۔ دریا کے دونوں کناروں پر سیلاب کے بعد کے نشان اس طرح  
نظر آ رہے تھے جس طرح بحیرہ ریت کے مہلوں سے شکار کھانے کے بعد ازل ٹپک رہی ہوتی ہے۔ راوی بھی فٹ پاتھ  
پر جامہ جرم کی طرح بے بس دکھائی دے رہا تھا۔ مرا بٹو سا لیکن ظاہر کو معلوم تھا کہ چند ہی مہینے پہلے یہ دریا یوں مرا بٹاؤ  
بے بس نہیں تھا۔ اس نے ہزاروں انسانوں کو لہو لڑاٹھا اٹھا کھینچ دیا تھا اور جانے کہاں سے کہاں بہا لے گیا تھا۔  
کے پیٹ میں کاؤں کے کاؤں کم ہو گئے تھے۔ اگلے سال یہ دریا پھر اٹھڑائی لے گا۔ ایک بار پھر جاگے گا اور چٹانوں کے بل  
چپ کے رکھ دے گا۔ آؤ! لہجوں کو سندر میں جا چھپکے گا۔ یہ ٹھٹھرا بٹو اڑا۔ فٹ پاتھ چٹھرا بٹو یہ جوم۔ دونوں جاگیں  
گئے۔ ان کے ہنگامے ایک ہیں۔ ان کی قوت ایک ہے۔ دریا بھی ستا رہا ہے۔ انسان بھی ستا رہا ہے۔ انسان بھی دریا ہے

... دریا؟ ... اور وہ... انسان دریا ہے!

ظاہر کے داغ میں کبھی سی کو نہ گئی۔ اسی قسم کی کبھی اس کے لبوں پر کھچی۔ ”میرے پاس اتنے ہزار روپے ہے۔  
ہزاروں کا زور ہے۔ یہ زور، یہ روپیہ! اس نے دو فراسی روپے سوا جاتا۔ جھٹکے سے سرگھرا کر بکھر کے کندھے پر فاختہ نمازا  
سے چھکی دی۔

چار باتوں کے نیچے ہانس رکھ کر چھت بنائے ہوئے تھے اور زمین پر کھل اور بدمال بچھا کر سر لک پر جاتی ہوئوں ہانگا  
اور لوگوں کو بچھتی چھتی مناہوں سے دھیر رہے تھے۔ ان میں سے ہفتہ کی کل جاتا دیکھی کھل اور بدمال، ایک حقہ، ایک  
ایک گھرا اور کسی کسی کے پاس ایک ہندیا بھی تھی۔ پیچھے چہروں پر سرودی کسمیری، جھوک اور بے سروسامانی کے گہرے  
تاثرات لیے ہوں کم گرم گٹھراں میں بن کے بیٹھے تھے جیسے یہ بچے ہیں کی نہیں اور ان کی ننھی ننھی زندگیوں سے کھل  
شوخیاں لڑچ کی گئی ہیں۔ وہ علاؤ الدین ان گھروں اور گلیوں کو دیکھ رہے تھے جو ان کے قہقروں سے گونجتی رہتی تھیں  
دیکھ رہے تھے اور دیکھ ہی رہے تھے۔ ہر آنے والے کو اور جانے والے کو۔ کبھی کے کھقروں کو۔ انہوں  
اب ماؤں سے روٹی مانگتی بھی چھوڑ دی تھی۔ ان کی محسوسیت جان بچی تھی کہ ان کے ماں باپ خود بھوکے ہیں۔

تاکڑا راوی رڈ پر جا رہا تھا۔ آگے ظاہر، عفت اور بچھتی تھیں۔ پھر ظاہر کو جانے کہاں کہاں کے قصے سنار کی  
ابرہہ سرک کے دونوں طرف اُجڑی ہوئی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ منجہ نے باتیں کرتے کرتے محسوس کیا کہ ظاہر کو کین گرم گرم  
اس نے آہستہ سے کہا۔ ”بیچارے مہاجر ہیں۔“

”کیا راستے عرصے سے یہیں پڑے ہیں؟“ ظاہر نے پوچھا۔  
”کچھ تو اتنے عرصے سے پڑے ہیں۔“ منجہ نے جواب دیا۔ ”اور زیادہ تر چند دن ہوئے آتے ہیں بجز  
سلسلہ ابھی تھا نہیں۔ قافلوں کے قافلے چلے آ رہے ہیں۔“  
”یہ کیسے ہیں کیوں نہیں جاتے؟“ عفت نے پوچھا۔

”وہ! جگہ جی کہاں ہے؟“ منجہ نے جواب دیا۔ ”وہ وقت اور تھا جب تم وہاں پہنچی تھی۔ اب جا کے  
کیسے کی بارکوا، برآمدوں، میدانوں اور سرنگوں پر انسان ہی انسان نظر آتے ہیں۔ اس سرک کی راتوں میں وہ سو  
طرح ہیں؟ ہبی لو! جانتے ہیں یا اللہ جانتا ہے۔ دن کو دھوپ میں سو لیتے ہیں اور رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔  
نے کب لہجہ کیے تھے کہ تین پانچ سات انسانوں میں ایک کھل لیا کرے گا۔“

”ہندو کھچو کھچو! چھوڑ گئے ہیں وہ انہیں کیوں نہیں دے دیتے جاتے؟“ ظاہر نے پوچھا۔  
”مہاں اب لٹھی! جی نہیں کا معاملہ ہے۔“ منجہ نے جواب دیا۔ ”جس میں جنت تھی وہ ٹھکانے لگا  
دونوں ہمت اسی میں ہے جس کے پاس بیہ ہے یا شاخاں۔ ایک وہ ہیں جنہوں نے دو دین میں مکانوں پر قبضہ جما  
اور ایک یہ ہیں کہ آسمان کے نیچے دوڑ جگہ کے بلے بھی سرخ رہے ہیں کل ہی پولیس انہیں یہاں سے اٹھا دے  
منجہ بولتی رہی۔ تاکہ چلتا! اور اس سے زیادہ تیز رفتاری سے ظاہر کے خیالات کا سلسلہ چل رہا۔ اس نے  
جہوم ہے جس کے سکوت میں جہنگلے اور نرے سے سو رہے ہیں۔ ان کی بے بسی میں چٹانوں کا بھر جاک کرنے کی قز  
رہی ہے۔ یہ وہ انسان ہیں جنہوں نے انگریز کی کولیوں کے سامنے سینے کھول دیتے تھے ٹھٹھری ہوئی سرودی میں بل  
گٹھرا دیں وہ بچے ہیں جنہوں نے جلال آباد کے ریلوے سٹیشن پر لگائی روک کی انگریز گمشدہ کا سر جھکا دیا تھا۔ یہ وہ لڑکیاں  
نے تھا لے کی تھیری دیواروں کو بل کر رکھ دیا تھا۔ یہ تھے وہ مسلمان جنہوں نے انگریز کے آہنی نظام کو درہم برہم کر کے

و خفگی عفت نے بھر کے بھر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ادھر ادھر دیکھا اور کہا۔ ”آپ نے جو کچھ کہا ہے اسے میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔  
 کون ہے جان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا لیکن میں پیٹ میں نہیں دل پر ایک بوجھ اٹھاتے پھر جی ہوں۔ میرے سینے میں آگ لگ گئی ہے۔  
 یہ ہے کس سے کموں؟ کون سے گاہ؟۔ اس نے اپنی اس سے انسو پونچھے۔  
 ”عابرہ تمہاری سہرا ہے۔“ بھرنے شہید کی سے کہا۔ ”میں ایسی باتیں عابرہ سے کیا کرو۔“

”اری آیا آپ۔“ عفت نے دکھ دکھ کر اس سے کہا۔ ”اگر میرے دل کا بوجھ عابرہ کا وجود ہی ہو تو کس سے کموں؟  
 ابرہہ ہی تو وہ ہے جس نے میری اور شہد کی محبت کو بچا جو کر کے رکھ دیا ہے۔“  
 ”عابرہ؟“ بھرنے لپٹن نہ کر کے ہوئے پوچھا۔ ”عابرہ؟ میں تو سمجھتی تھی کہ عابرہ نے ہی تمہیں لیا ہے۔“  
 ”ہاں کے اہل اڑا ہے آپ۔“ عفت بولی۔ ”عابرہ نے میرا نصیب بنا کے بگاڑ دیا ہے۔“ بھرنے کہا۔ ”آپ عفت کے انسو  
 بے جا رہے تھے۔ اس نے ایک بچی بھی لی۔“

بھرنے اس کا ہاتھ دیا اور پوری بات سننے کو تیار ہو گئی کسی اور لڑکی کا ذکر تو بات قابل فہم تھی لیکن ارشد اور عفت  
 کا ازدواجی رشتہ کا عابرہ کے ہاتھوں پر بڑا بوجھ تھا اس کے لیے ممتحنہ اسے معلوم تھا کہ اس پودے کو عابرہ نے ہی برباد  
 کر دیا ہے۔ ”یہ بچی اننگوں سے سینچا ہے لیکن یہاں تو قصہ ہی مختلف نظر آ رہا تھا۔“

”بھرنے آیا؟“ عفت نے بھرا ہوا اپنے آپ کو سنبھال لیا لیکن وہ لے لے ہو گئی اور اس نے بھرنے کا روحانی سہارا لیا تھا۔  
 ”خدا کے لیے مجھے راہ دکھاؤ۔ میں بہت دھمکی ہوں۔“ عفت نے التجا کے انداز میں کہا۔ ”عابرہ پر آپ کا بہت  
 ہے۔“

”ساری بات سناؤ تو کچھ پڑے۔“ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟۔ بھرنے اس کے قریب مرک کر پوچھا۔  
 ”قصہ یہ ہے۔“ آپا، ارشد مجھے چاہتا تھا۔ عفت گویا ہوئی۔ ”اور میں ارشد کو آنکھوں کا نور سمجھتی ہوں۔ شادی کی پہلی  
 ہفت روزہ راتیں تھیں جن میں میری ساری عمر کی مسرتیں سمٹ گئیں اور اب انہی چند راتوں کی یادیں تنہائی کی باتیں گزار رہی ہوں  
 راتوں کی یادگار کو پیٹ میں زندگی دے رہی ہوں۔“ عفت کے لہجہ میں روانی آ گئی اور بھرنے ہرگز ہرگز۔ ارشد میرے  
 بے ہوش ہونے بھی کوسوں دور چلا گیا ہے۔ عابرہ نے مجھ سے میرا ارشد چھین لیا ہے۔“  
 ”آخر کیسے؟“

”وہ ایسے کہ میں نے شادی سے پہلے عابرہ کو بتایا تھا کہ مجھے ارشد سے بے پناہ پیار ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ عابرہ  
 ارشد سے محبت ہے۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میں عابرہ اور ارشد کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ آپ تو جانتی ہیں آپا میں کیا  
 میری حقیقت اور وقت کیلئے میں نے دل کو بھانسنے کی بہت کوشش کی۔ میں نے کوشش کی کہ دل کو سینے  
 زبان کو دانتوں سے دبا کر رکھوں لیکن ناوان دل ایسا چمکا کہ عابرہ کو کھانا اٹھا لیا کہ دیکھا کہ میں ارشد کو دلاؤں اور چاہتی  
 وہاں یہ بھی میرے سینے میں رہ نہیں سکتا۔ آپا، میں نے نظر کو ہر دو تین گنا کیا کہ ارشد مجھے دے دو۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے  
 سے دور کرو، اتنی دور جہاں سے میں تم دونوں کو آپس میں بٹنا نہیں دیکھ نہ سکوں۔ تم ارشد کے لیے اور وہ تمہارے

”بھرنے آیا۔“ عابرہ نے غیر معمولی مسرت سے کہا۔ ”میں نے کچھ پہلے ہمارے ہاں آنا۔ اس طرف چڑھ کر  
 ”دیار ہے؟“ بھرنے پوچھا اور کہا۔ ”مجھے بھی کشتی کی سی کا بہت شوق ہے۔“

”ہاں دیار ہے۔“ عابرہ نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر فوٹو کھینچنے سے اطمینان سے کہا۔ ”اس خاموش دریا کو بڑا  
 آتش گئے۔“ اور زرباب اپنے آپ سے کہا۔ ”اس دریا کو میں دریا سی زندگی تو دے ہی سکوں گی؟۔ اس نے بھرنے  
 کے ساتھ لگا لیا اور سکون آمیز آہ لی۔

”کیوں؟“ بھرنے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”میرا کھانا آ رہا ہے؟“  
 ”پاکستان ابھی بے بسوں کی بیڑوں پر زندہ رہے گا۔ آپا، اسی انسان کے خون سے جو فٹ پاؤں پر پھیر رہا ہے۔  
 نے ذرا دھتے سے کہا۔ ”ہاں، آپا، اسیر کا خوب لطف آ رہا ہے۔“

”مناجعت جانیر کے مقبرے کے باہر لگا اور چند لمحوں بعد چھ لڑکیاں مقبرے کے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ دوسرے ہر ایک کا  
 پھرتی میں پھر کھانے کے لیے ایک گھنٹہ درخت کے نیچے جا بیٹیں۔“ کھانے سے فارغ ہو کر وہ دو لڑکیاں میں  
 ادھر ادھر لگ گئیں۔ عفت کی طبیعت کو بھل ہو رہی تھی۔ بھرنے اس کا ساتھ دینا پسند کیا اور اس کے پاس بیٹھ گئی عابرہ  
 کی ایک رشتہ دار لڑکی کے ساتھ اور بھائی دوسری لڑکی کے ساتھ سیر کر لگ گئیں۔ بھرنے عفت کو باتوں میں لگا چاہا لیکن  
 نے فوراً ہی ٹھوس کر لیا کہ عفت کا دماغ حاضر نہیں۔

”اری اے دل کوں چھوڑتی ہو۔“ اور اٹھنے کے بعد قلم کو لپیٹ لی گئی۔ ”بھرنے نے کھینچ لیا ہے کہ میں کہا اور عفت کو جھنجھو  
 ”آغا میں لوں ہی تکلیف ہو کر کرتی ہے۔“ لینے سے طبیعت اور زیادہ غراب ہو گئی۔ دریا چلو پھرو۔ دل ٹھکانے آیا ہے گا۔  
 ”میرے طبیعت اب مشکل سے ہی سنبھلے گی۔“ عفت نے آہ سے کروڑوں سے بھلے ہیں کہا۔

”کیوں نہ سنبھلے گی؟“ بھرنے عفت کے دل کی کیفیت محسوس کیے بغیر کہا۔ ”تم تو صحت مند لڑکی ہو۔“  
 سے اچھلا کھڑا جانتے۔ تم پیٹ میں اس مرد کے پیچھے کو زندگی دے رہی ہو جسے تم دل و جان سے چاہتی ہو اور جو تم  
 نہ کرتا ہے تم تو اپنے جسم میں اپنی محبت کو بھل رہی ہو عفت!

عفت نے کھاس پر لیٹے بیٹھ بھرنے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں طنز اور سکوت تھا۔ دیوانی اور بے سرحال  
 بھرنے عفت کی جذباتی کیفیت کو محسوس کر لیا اور بولی۔ ”جی تو شادی کا روانی ہیلو ہے۔ ان جوان بیڑوں کا  
 کو جو زبردستی ایسے مردوں کے ساتھ زندگی بھر کے لیے باندھ دی جاتی ہیں جنہیں وہ ایک جھٹکی ہوئی نگاہ سے بھی نہیں دیکھ  
 ”وہ بھی تو عمر تین ہی ہیں انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ پیٹ میں کس مرد کا بوجھ اٹھاتے پھر رہی ہیں۔“ اور تم ہو کہ محبت  
 یادگار کی طبیعت پر بوجھ پھر جی ہو۔ ارشد اچھی زندگی کو عشق و محبت کی بنیادوں پر بکھڑی ہوا میں یہ پیچھے سنگ میل ہوتا  
 تم جیسی خوش نصیب کون ہو گی جس کے پیٹ میں ارشد کا بچہ چل رہا ہے۔“

”بھرنے آیا۔“ عفت بولی لیکن اس کے الفاظ طعن ہی ہی ملک گئے۔ اس نے ایسی آہ لی جیسے ادھیوں کی  
 نچوڑ مار کر بھانسنے کی کوشش کی ہو۔ وہ غامض ہو گئی اور اٹھ بیٹھی۔ بھرنے دیکھا کہ عفت کی آنکھوں میں دو آنسو تیر رہے۔

تھی جو عفت کی باتوں سے الجھتی ہی جا رہی تھی۔

عفت کر رہی تھی..... چند روز بعد ارشد مجھ سے کچھ گپچا سار بننے لگا۔ رات آتے تو اسامیٹھے یا لیٹے اور سر درد یا کام کا ہانڈ کر کے میں دے، بعض اوقات تو وہ اس طرح آتا اور آکر چلا جاتا جیسے کوئی بڑھی کے کھٹے کا ٹکڑا پکڑ کر کھانے آتا ہو۔ حد یہ کہ وہ دو تین تین راتیں بالکل ہی نہ آتا اور اپنے کمرے میں سو جاتا۔ آخر ایک دن مجھ سے رُخ نہ لگیا، میں رات ساڑھے دس بجے گیارہ بجے کے قریب ارشد کو اپنے کمرے میں لانے کے لیے کھلی میں طاہرہ کی کھڑکی کے سامنے سے گزرتی تھی کہ اس کے کمرے سے مجھے ارشد کی آواز سنائی دی۔ میں وہیں رک گئی..... سچہ پایا، وہ باقیات سننے کے بعد تو کسی شک اور شبہ کے بغیر فوراً باہر نکلی۔ خدا امیر ہی بہت کو بولیں نہ چلو۔ اور ارشد نے کہا: ہماری چاندنی راتوں کی محبت بے بس ہو گئی ہے۔ چاندنی رات کی وہ ساری باتوں سے عود ہونے لگا۔ ارشد کو یہ کہہ کر..... عفت اجاڑ چکی ہے..... وہ کیا بتاؤں، یا قبول ہو کر کتنی جوں۔ طاہرہ نے اس رات ارشد کے ساتھ وہ باتیں کیں جو ایک کنواری لڑکی ایک شادی شدہ مرد کے ساتھ کبھی کر سکتی ہیں۔ طاہرہ سب کچھ کر رہی تھی اور اگر میں یہ کہوں کہ اس رات طاہرہ نے ارشد کو اپنے کمرے میں ملا ہوا تھا تو جھوٹ نہ ہوگا۔ مجھ میں تو اب بھی نہیں رہتی تھی کہ اس سے آگے دو کھلے اور بھی سستی۔ خدا جڑ میں اپنے کمرے تک کس طرح پہنچی تھی یہ پوش تھی یا ہوش میں؟ عفت کے جا رہی تھی اور سچہ پایا، اسے آٹھ گھنٹہ رہا تھا۔ اس نے صبر پر عفت کی کیفیت محسوس کی، ٹیڑھا سا سوال اسے پریشان کرنے لگا۔ عفت کی باتوں کا یقین کرے یا طاہرہ کی پاکدامنی کو پیش نظر رکھے؟ جب اسے عفت کی ادائیگی کی زندگی یاد آئی تو اسے اس کی باتوں میں شک کی تو آگے لگی۔

”طاہرہ یوں نہیں کر سکتی۔“ سچہ نے اپنے آپ سے کہا اور آہ لے کر عفت کی باتیں سننے کی عفت اس دوران بہت کچھ کہہ چکی تھی کہ کس طرح وہ دوسری صبح طاہرہ کو رات کی بات یاد دلانے لگی تھی، زور بھی دیتا ہے کہ اسے کوشش کی تھی اور اس نے طاہرہ کو ہر ایک بات صاف صاف کہہ ڈالی تھی۔

”سچہ پایا؟“ عفت غامض ہو گئی اور اس کو کھٹے سے زمین کر رہے تھی۔ سچہ قدرے لمبی لمبی کے لیے ہی گیا بیٹھتی۔ طاہرہ کی آنکھوں میں ایک جادو ہے جس کا میں سامنا نہیں کر سکتی۔ میں جب بھی اس کے سامنے جاتی ہوں۔ دل کے شکوے سینے میں ہی گم ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھے ہر طاہرہ کا سایہ آسب کی طرح غالب ہے اور میں بے بسی ہو کر اپنے آپ کو اس کے سپرد کرتی ہوں۔ میں نے طاہرہ کو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میں اس سے علی جاؤ اور مجھے میرا ارشد لوٹا دو۔ میں نے اسے کہا تھا کہ جب تک تم یہاں موجود ہو، ارشد مجھ سے دور رہے گا..... آپا! میں کیا ہوں؟ آپ جانتی ہیں۔ اب تو ایک ہی صورت ہے کہ ارشد مجھے طلاق دے دے اور طاہرہ کے ساتھ شادی کر لے اور میں..... اور میں..... عفت پر رقت طاری ہو گئی اور وہ سوکھ لے لے کر دھونے لگی۔

سچہ نے اسے اپنے قریب کر کے مال کی طرح دلاسا دیا۔ شادی کے بعد سچہ پہلی عورت تھی جسے عفت نے حال دل دنیا یا قیام غبار سے بے حال کیے ہوئے تھا۔ اب سچہ نے سچہ کے ساتھ جو کچھ تو عفت کے سینے کا قش قش پہاڑ بیٹھا تھا اور وہ عفت سے بڑھ کر بے بسی ہوئی۔ آپا! مجھے اور کچھ دے، میں انہی سے میں شکوہ کر رہی ہوں۔ آج کئی دن سے میں نے دلی نہیں سمجھی۔

لیے پیدا ہوا ہے۔ تم دونوں غریب عورت ہو اور دونوں جوان ہو اور امیر ہو میرا کیا ہے، میں نے دل کی خوبصورتی اور جوانی کا میں ہی گھونٹ دیا تھا۔ پر اسے گھونٹ کے بھولے برتن دھونے والی کو اپنے مکانوں میں رہنے سے کیا واسطہ ہے مجھے کیا؟

سچہ عفت کی باتوں میں محسوس ہونے کے ساتھ عفت کے غم و غل کو بھی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہلکا سا ہنسی کے ساتھ عفت کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا اور اسے از سر نو یقین ہو گیا کہ عفت یہیں ہے اور اس کی آنکھوں میں ہلکا سا ہنسنے والی ہی دل میں کہا۔ کاش! اس لڑکی کی دُور سے عفت کی کھٹانے سے اسے آرتا جاتے اور اس کی روح بھی حسین ہوتی؟

”بھلا میں نے طاہرہ سے ارشد مانگا نہیں تھا۔“ عفت نے کہا۔ میں نے اس سے الگ ہونے کی اجازت میں نے یہ عرض کیا تھا کہ میں ارشد کی صحبت کو دل سے اتار نہیں سکتی تھی۔ اور یہ سچہ کہہ دیا تھا کہ میں پستی میں ہی جاتی ہوں۔ نہ ہو کہ میرے سینے میں وہ پست خیال اور مظلومی کی ماری ہوئی عورت جاگ اٹھے اور میرے ہاتھ سے تم دونوں کی گرد بے طاہرہ سے جانے کیوں ارشد کو میری گردن ڈال دیا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ عفت! سچی بات ہے ارشد چاہتا ہے کہ میں نہ رہوں۔ سچہ نے اپنے آپ کو کمر میں پھینک لیا۔ یہ سچی بات تھی یا سچہ نے اپنے آپ کو فرسوس سے نکال دیا؟

”لیکن یہ بتا کیسے؟“

”یہاں اس طرح کہ جب طاہرہ نے مجھے ارشد کو الگ کر کے میں رات بات چاہے تو بھی جب اس نے ہر ایک کچھ کر جاتے اور سچہ تو کسی کے لیے کھٹے دیکھی تو طرہ سے وہ عورت ہی نہ رہی جس نے مجھے کیوں کے کورسے سے اٹھ کر رخصت کر دیا تھا۔ سچہ پایا! طاہرہ کو کچھ سہمی وہ ہلکا سا خیال ہی تھا لیکن وہ آج عورت بنے جوان اور میں اس کے ساتھ بات و صحبت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سچہ اس بات کا کہہ دیا کہ میں نے طاہرہ کو اپنے لیے کہا تھا کہ میں تم سے مل جاتی ہوں۔ میں اس سے بول نہ سکتی تھی۔ وہ نہ اس وقت مجھے سوچا نہ اب سوچ رہی ہے۔ شادی کے دوپ۔ دار نے سچہ کو دیکھا کہ وہ آگے بڑھ گیا اور ارشد کو شیشے میں آٹانے کی کوشش شروع کر دی۔

مجھے یقین نہیں آتا کہ طاہرہ نے ایسی حرکت کی ہوگی۔ سچہ نے غلامی دیکھتے ہوئے کہا۔ تب سوکتا نہیں۔ آخر اس کی عمری کیا ہے۔ ایسا کہہ کر اس نے اپنے سینے میں ہاتھ دھکیں مگر یہ کار ہے۔

”یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا۔“ عفت نے کہا۔ لیکن حالات نے یقین دلا دیا ہے۔ صرف ایک بار ہو گیا، طاہرہ نے غم و غل سے غم و غل اور چند دنوں بعد سچہ نے سچہ کی گردن پر اس کے ہاتھوں میں غلامی دیکھ کر دیکھا۔ میں نے اسے نہیں کہا کہ کتنی گریہ و فانی زبانت چکے۔ اپنے سینے لٹکتے۔ ان کی جگہ ملکی جڑیں سے لوتے۔

میرے پاس لوٹ آئے۔

”کوئی بھی کہہ رہی ہیں۔“ بھرنے لگا۔ ”دل کو قاتلوں کو لو اور سب کے ساتھ بھس کر لو، کسی کو تپتی ہی نہ چیلے کر تم روتی رہی ہو، کسی کو کم نہ ہوئے دہن کی کر تم نے میرے ساتھ کوئی ایسی وہی بات کی ہے، میں انشاء اللہ حالات کو سہارا مل گیا۔“

دن کا بچلا پھر گزر رہا تھا۔ سبھی میرے تنک چکی تھیں۔ سبھرا اور عفت نے ننگ لنگی کا مٹھارہ کر کے چند منٹ پیشہ کی اہیت مال خنیا پر دو ہال لیا۔ دو ساری رات وہ تانہ ایک بار پھر اس سرنگ پر چار رہا تھا جس کے دونوں طرف منگول اطلال خانان برہانہ لائوں نے انہوں کی پیدل اور خالی کلاہوں سے تپتے جاتے ہوئے کوئی کچھ کہتے تھے۔ طابہ دہنے کی تھی کہ ان کو تنک چیلے دیں کہ ایت با رہی لیکن اب وہ بخیر نہ روتی تھی۔ اس کے دماغ میں ایک منظر بڑھ چکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس منصوبے کو برابر ہی سمجھتی ہے پھر ابا جان پر مار کر رہی ہو۔

”تم نے کہا تھا کہ پھر ادھر آئیں گے؟“ بھرنے نے طابہ کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

”ابا! آپ طابہ کو نے قدر سے چونک کر جواب دیا۔ ”کل دوپہر کے کھانے کے بعد تار سے ابا آجائے۔ ارشد کو بھی کہوں چھٹی نے کھانا کھا آجائے۔“

بھرنے نے کھل کر عفت کی طرف دیکھا۔ عفت اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سیٹ پر سے چھٹی سے کروٹ بلی۔ اس کی اندر کی غصہ کو سمجھ گئی اور کہا۔ ”عفت بھی آئے گی۔“

”ابا! کیوں نہیں۔“ طابہ کو نے معمول کے لیے بھی کہا۔ ”عفت کو تو بہر صورت ساتھ لائیں گے کیوں عفت؟“

لیکن عفت گھوڑے کی اچھلتی ہوئی پیٹھ پر نظر نہ پڑے رہی۔ اس کا دل بھی اسی طرح اچھل رہا تھا۔

کہاں وہ ارشد جو شام ساڑھے چار بجے آبا جان کے ساتھ گھر پہنچ جایا کرتا تھا اب کئی روز سے شام کے کھانے کے وقت نہ لگا۔ وہ بھی خاموش اور چپ چاپ۔ گھر والے اس کی اس تبدیلی کو گہری غفلتوں سے دیکھ رہے تھے۔ دو چار مرتبہ بجائی نہ بھی آکر قہر کیا ہے۔ لیکن ارشد نے ادا سول اور نامزدی کو ایک جواں سکرابٹ میں چھپا کر بجائی کو ٹال دیا۔

ارشد کا بیٹھائی پہلے ماس قم کا کوئی تھا۔ نمازی اور پرہیزگار اس نے اپنے بیوی بچوں کے سوا کسی کے معاملات بھی دخل نہیں دیا تھا۔ اپنی بیوی کے ساتھ اسے محبت تھی اور اس محبت کا بھی اثر تھا کہ اس نے پرہیزگار ہونے سے بڑے بھی عبادت مند کا اور آزادانہ میر تقی میر سے کبھی نزاد کا تھا۔ بیوی نے اسے بھی کہا تھا کہ نہ جانے ارشد شادی کے فوراً بعد اس قدر اکیلا گیا ہے۔

”نئی شادی ہوئی ہے۔“ وہ بولا۔ ”وہ شکر و راقوت بعد گھلتے پھٹے ہیں۔ ایسی باتوں میں بھی بیارہ ہونا ہے تم

نہ ارشد شرع میں تم نہیں روٹ جاؤ گی تھیں؟“

ارشد کی بجائی نے جانے کیا سوچ کر بات شرع کی تھی کہ اس کے خاندان نے اسے اس طرح سوچ سے نکال کر داناؤں میں

بائے کتنی باتیں جاگتے گزر گئی ہیں۔ اس روز میں نے ارشد کے پاؤں پر ذکر الہی کی کتنی کر مجھے یوں نہ کھڑا۔ مجھے پاؤں کا ہر نماز کی توجہ دے دیا کہ لیکن اس پتھر دل نے جواب تک نہ دیا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ یہ طابہ کا ہوا ہے یہ ہے جس کے سامنے میں بھی گنگ ہو جاتی ہوں۔ طابہ پر چڑل ہے آبا! وہ شرم و حیاء تم کر چکی ہے۔ ارشد اب میرا نہیں ظاہر کیا ہے۔ وہ آدھی رات کے وقت طابہ کے کمرے میں جاتا ہے۔

عفت کے لیے میں غری کی جاگتے رہا گیا۔ اس کی روتی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ اس کے دانت آج میں کڑا اور بھڑک کر خشک گئی کہ عفت کی کٹھیاں بدعتیں اور کانپ رہی تھیں۔ یہ کیفیت بلاشبہ وہ شہدہ دوسرے کی کہ یا غصے کا عروج۔ وہ دانت میں کڑی۔ طابہ سے کوسوں سے چلی جائے چلی جائے۔ رات میں اس کا اپنا خور کیا میں نے یہ عید بھی بھائی اور اتنی سے چھپا رکھا ہے۔ اس کا کوکب تک چھپائے رکھوں گی۔ میری نظر کے سامنے ہر خون سہا ہے۔ اب نہیں آبا! اب بداشت نہیں ہوتا۔

عفت ایک گھنٹہ چپ سوئی اور عفتوں میں کوسے لگی۔ اس کے زرتے ہونوں کے کوئی سے ملے ملے چھا گئے۔ بھرنے نے دیکھا کہ عفت کی آنکھوں میں جھٹی جھٹی ہیں اور ہاتھ جڑتے جا رہے تھے۔ بھرنے اس کی حالت وہ سوچ رہی تھی کہ اسے تسلی دے دے یا کیا کرے کہ عفت نے دونوں ہاتھیں اس زور سے اپنے منہ پر ماس کر کر مال چرے پر لگا رہی تھی کہ لیکن بھرنے نے پکٹ کر اس کے ہاتھ پڑے۔ عفت کے زور و ناک سے بازوؤں کا کی طرح اکڑا لیا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ نیلا ہوتا جا رہا تھا۔

بھرنے کا توروں سوا میں بھی پسینہ نکل آیا۔ اس نے بھرا کر ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی بھی لڑکی اس پاس نہیں تھی۔ عفت کانپ رہا تھا اور وہ زمین پر پیٹھے کے بل لیٹ گئی تھی۔ بھرنے اس کی کایاں چھوئیں تو عفت نے دونوں ہاتھوں سے دلچز لیا اور سیٹ کے بل کروٹ لے کر کب تک کھڑے لگی۔ بھرنے اس کا سر دیکھا شروع کر دیا۔ پھر اسے یہ دعا کی پیشانی مسلائی۔ چند منٹ بعد وہ بھرنے کے لیے چند گھنٹے تھے۔ عفت کا جسم معمول پر آئے لگا اور دوسرے کی ریکہ ہوتے تم بھگتی۔

عفت نے اپنے اوپر چھکی ہوئی بھرنے کو اس طرح دیکھا جیسے وہ ابا تک اس کے پاس آ بیٹھی ہو اس کی آنکھیں پرکھی ہوئی تھیں۔ وہ چند لمحوں بھرنے کو دیکھتی رہی اور زرب کہا۔ ”اوہ میرے خدا! اوہ خدا! مجھے بخش دے۔“ بھرنے کر دینا میں بہت دیکھی ہوں۔ اکیلے میں اپنے آپ سے یوں ہی باتیں کرتی رہتی ہوں۔

”یوں حوصلہ نہیں دیا کہ عفت نے۔“ بھرنے نے ایسی آواز میں کہا جس میں گھبراہٹ اور حیرت کا تاثر غالبہ نے اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”میں طابہ کے ساتھ بات کر دوں گی اور اسے اچھی طرح کان کھینچے گا کہ تو ارشد کو بھی سمجھا دوں؟“

”پانی نہ سے گزر چکا ہے۔ آبا! عفت نے دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے کہا۔“ اگر طابہ بیچ میں نہ

ظاہر کے سینہ میں تامل اٹھ کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اس کی ذات میں ایک عورت جاگ رہی تھی۔ ظاہر نے اس عورت کا لگاؤ کیا تھا۔ اس کی آخری چمکیاں بھی اُنہیں اور ظاہر کو خوش تھی کہ وہ مرد گری سے لیکن خواب میں وہ چہرہ جاگ رہی تھی۔

طاب روی آنکھ کھلی تو اس نے جوش میں اگر بے اختیار چاہا کہ ارشد کو بلایے یا اس کے کمرے میں چلی جائے۔ اس نے پتے  
 ٹہرنے والوں پہلی سی موسیقی کی۔ بیکہ لکھتا تو آرتھروں کے دو قطرے تھے۔ دوڑ پکڑا کھڑے بیٹھی۔ بے کلی رشتی جاتی تھی جب لائبر  
 نے لکھنا خیال بن چلا تھا۔ اخلاق کی بلندی گہری گنجائی کے منہ پر کھڑی قدم آگے۔ کھینے کو تھی۔ حرفت ایک قدم۔ آخری حرف ایک  
 ارشد کے کمرے میں پہنچنے کو حرفت ایک قدم دیکر بیٹھا۔ طاردا اور ارشد کے درمیان حرف ایک انش کا صفحہ جاری تھا۔

اس نے رضائی بستانی اور لک گئی۔ بھر کے لکری خاموشی میں اسے اپنے دل کی دھڑکن بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اُدھر سے اُٹھ کر وہیں لکھو اور گھبرا گئی۔ دل پر ہاتھ رکھ کر کچھ بالیاں رضائی لپیٹ لی اور تر و کار کھرے میں ایک تپتی ہوئی سرگوشی کو بھیجی۔ میرے لئے کچھ محاف کر دو بھئی۔ میں نے کہا کہ کیا ہے میری تعزیش مجھ کو جانو۔ ذوالجلال! ہم کس روز انسان ہوں۔ مجھے رادو کھا یا تباہ یا بقیہ عطا فرما تو میرے اللہ! میں اپنے آپ کو آپ کے خالے کوئی ہوں یا ماضی! یا بعد!..... سرگوشیاں بھر کے کے سکوت کو بھر رہی تھیں۔

ظاہرہ کو محسوس ہی نہ ہوا کہ وہ اکوچکی آواز میں دعا کر رہی ہے اور اس کی آواز دھڑکے کے برابر کھجور کی جھلکی سے لکڑی کے آتش بھونکے  
 پہل پہل نہ کی ہی نہیں ہوتا تھا۔ ظاہرہ لیٹ لیٹے لیٹے یا نہ ایا یا نہ ایتھی کہتی رہی۔ اسے ایسا لگتا کہ محسوس مجبور اس نے زندگی میں پہلی بار پایا تھا  
 اور عزم کے کرکڑی کی کہ وہ اتنے تھکائی میں ارشد سے جو کلام نہیں ہو گی۔

ارشادِ عفت کا ہے۔ خدا عفت کو ارشاد کے قابل بنائے۔ امین۔ خدا دونوں کی زندگی کو پیار و محبت سے سرشار کرے۔ آمین۔  
 دُعا کرنے سے پہلے یہ دعا اس کے جوتلوں سے پھیلے گی۔

اس رات کے بعد عابد نے محسوس کیا تھا کہ یہ آگ آتی آسانی سے بجھ چکی تھی نہیں جاسکتی تھی آسان دوسجھتی تھی۔  
اس رات اسے اندازہ ہوا کہ اس نے ارشد کو کس قدر ٹھن راد پر ڈال دیا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ارشد کبھی مشائیم  
بنامہ جناح کی پہاڑی پر پھولوں کو گھونڈتے اور پھولوں سے پیار کرتے گزرا کرتا ہے یا رادی کے کنارے جا بیٹھتا ہے اور اداسیوں  
کی لڑائی کی جمل ترنگ میں مہمانے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ تیغ سے حق تعالیٰ اب ارشد کے دل کی زندگی کو بچھتا ہے تبار ہے  
تھے۔ عابد نے اس سے عفت میں گھل جمل جانے کی جرم میں تھیں۔ وہ دل کی زندگی کے ساتھ ساتھ ایک ایک کر کے بیوہ کی  
چوڑوں کی طرح ٹوٹی جاتی تھیں۔

عفت اب ایسی دہی حالت کو پہنچ گئی تھی کہ رات اسے نیند نہیں آتی تھی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے ٹھک جاتی تھی۔ انت میں کہ اٹھ بیٹھتی تھی اور ٹھٹھان بچھتی تھی، ایک بار نصف شب کے قریب اس نے جسم میں اکڑن سی اور اعصاب کی تناؤ سامعوس کیا۔ اس نے لیٹے لیٹے سر کو زور سے جھٹکے دے لیکن جسم کی حالت بدلتی ہی گئی اور اس نے سر میں دو کی ٹیس

171

کھسیٹ لیا اور بات رات کے اندھیرے سکوت میں آئی گئی ہو گئی۔

ارشاد کی، تہی چند دنوں سے خاص طور پر پریشان تھی، اس نے ارشد سے قہر کی، ایک دن عفت سے پوچھا کہ عفت نے بھی بھید پر پردہ ڈال لیا۔ یوں تو اس بھید کو صرف تین انسان جانتے تھے۔ ارشد، طاہرہ اور عفت اور تینوں نے اپنے اپنے خیال اور توجہ کے مطابق اس پر پردہ ڈال رکھا تھا، لیکن وہ ایسے بھید کی رکھوالی کر رہے تھے جو بھید کے چھپ نہیں سکا۔ کی ناشوق اور عفت کے خمرے اور اس کے حیر سے کا اجازت نہ ملے جا کر رکھتا تھا۔

ارشاد کے دیہ سے گھر آنے کے اب بھانے بھی ختم ہو چکے تھے۔ سرزد دوست پھر پیرا کیف میں نہیں لے جایا کرتا۔ سرزد پکچر دے جوئے دوست سر اسے نہیں مل جایا کرتے۔ پھر جوئے کے پکچر کا وقت نہیں ہوتا لیکن ارشد نے اب پنا پیچور دیا تھا کہ وہ ان دس سٹے کیوں آیا ہے۔ محنت کے عمر سے میں جاوا دسوا تو پنا باندھ جو کیا تھا۔ اس نے بغیر بھرتے الہ ساتھ مات بھی نہیں کی تھی۔

ظاہر نے بھی اب ارشد کے کمرے میں جانایا سے اپنے کمرے میں ملانا چھوڑ دیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ ارشد کے دل میں عنف و بیچہ نہیں کیں گے اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ ارشد کے دل سے ظاہر کو نام نہان ممکن ہو گیا ہے۔ ظاہر کو اپنے دل میں علم تھا۔ ایک بار نہیں متعدد بار ایسا ہو گا کہ ظاہر نے ارشد کے ساتھ یہ کرنے کے دوران شدت سے چاہا کہ وہ ایک بار پھر کے کمرے کے ساتھ اس طرح لگ کر بیٹھے جس طرح وہ کمپ کے بار چاندنی اتوں میں بیٹھا کرتی تھی۔

ایک راست تو ظاہر ہوا یہی اسی دینی اور جہاد کی کیفیت کو محسوس کر کے چونک اٹھی، وہ دہل کر ارشد کی خادی کے چند رات ظاہر ہوا کہ اپنے محرمے میں بیٹھ لیٹے ارشد کا خیال آگیا تھا۔ چاند کی چلی جوتی تھی اور موسم سرما کے بچوں کی کمک دھواں پھیر رہا تھا۔ ظاہر کے ذہن میں، ربوے لائن کی کچھتی کیریں لگتی تھیں۔ دو کیریں جن کا کوئی سرا نہ تھا۔ ظاہر کے تصورات اور خیالات کا ان دو کیریں پر بیٹھنے پر بیٹھنے بہت دور و درازوں کی وادی میں پہنچ گئی جہاں ارشد کی مسکراتیں اس کی فقط تھیں، ظاہر کو کوادو عین علیین میں بند گئیں، اور وہ پنڈوں کے دیس میں جا پہنچی جہاں ارشد کا محسوس پیکر اس کے قریب ترین اس کی عطر مز سائیں ظاہر کے سینے میں ساقی جا رہی تھیں۔ ظاہر کو ایک بازو بڑے ہتھار ارشد کی گردن کے گرد لپیٹ گیا اور لمحے، اس کے ہتھار ارشد کے کالوں کا گداز محسوس کر رہے تھے۔ ارشد نے گردن گھٹی تو ظاہر کی گردن خود ہی اس کی طرف تھی۔ جوتوں نے ایک دوسرے کو محسوس کیا یہ تھا کہ ایک دھندلکا دونوں کے درمیان آگیا۔ اور تہا تہا نہر نہایت آہستہ ظاہر کی آنکھ کھل گئی۔

دو چھٹے کے بل لیٹی ہوئی تھی اور سان کی رضائی کے ایک کونے نے اس کے چہرے کو ڈھانپا ہوا غماز ظاہر کیا تھا۔ وہ غم سے میں چاروں طرف دیکھا، پچھلے چھٹیوں سے انہوں نے اس کی طرف سے اچھلتے ہوئے دل سے اس کی گرم سانس کے ساتھ نکلنے والا اس کے ہونٹوں کو لگا رہی تھیں، غماز کو لیں لگا جیسے اس کے غم سے ابھی ابھی کو بھیج کے نکلا۔ لیکن یہ واقعہ دو تین سے زیادہ نہ رہا۔ غماز نے پستی پر یہ پتہ پھیرا تو اس کے ہاتھوں کو خشک پسینہ محسوس ہوا اور ایک لمحہ کے بعد اس کے کمر پر غم کی گھڑی۔

خواب میں ارشد کے پاس منٹھی جھٹی تھی عفت ارشد کے عمر سے کے دروازے پر پہنچی تو دروازہ باہر سے بند تھا کھول کر اندر گئی۔  
بتی جلائی اور ارشد کو غائب پایا۔ یہی کچھ کر وہ واپس لوٹ رہی تھی تو اسے طاہرہ کے عمر سے میں سرگوشیاں سنائی دیں۔ ”بڑا  
خدا! مجھے سماعت کر دیو جو میں نے گناہ کیا ہے میری لغزش مقبول جائیو، ذوالجلال....“

پیشتر اس کے کہ وہ طاہرہ کا یہ فقرہ بھی سنتی — ”ارشد عفت کا ہے رشتہ عفت کو ارشد کے قابل بنائے“ میں نے وہ  
بھیری ٹوٹی شہری کی طرح وہیں سے چل پڑی ادا اپنے عمر سے کے وسط میں اکٹری جھٹی چاندنی کی پرچھائیاں عمر سے میں چھائی  
تھیں اور عمر سے کی ہر چیز اس کے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

وہ عمر سے میں کھڑی تھی اور ارشد اس رات میں رومی کے قبل ترنگ کی روانی میں کہہ پا رہا تھا۔ چاندنی بھی چھٹی ہوئی  
تھی فضا بھی کانب رہی تھی لیکن ارشد کے سینے میں ایک تش تھی۔ اس نے کوٹ اٹا کر کندھے پر ڈال لیا تھا اور دریا کے کنارے  
کنارے نسل رہا تھا۔

عفت کی سانسیں بے قابو ہوئی جاری تھیں۔ وہ تیزی سے گھومی اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ آج طاہرہ کو دروازہ توڑ کر ارشد  
بازو سے کڑ کر باہر نکلے گی۔ اس نے بھی یہ بھی سوچا کہ بھائی کو بگاڑ لائے اور امی کو بھی جگاڑے۔ سب کے سامنے ارشد کو طاہرہ  
کے عمر سے سے نکالے اور سب کو دکھائے کہ.... اس نے بہت کچھ سوچا۔ وہ اپنے عمر سے کے دروازے تک گئی بھی لکھا  
ایک فٹ اس طرح لگتی جیسے کوئی اس کے سامنے آگیا ہو۔ اسے طاہرہ کا وہ عمر سے پیر کی صورت میں نظر آنے لگا اور یہ  
اس کے خیالوں اور پرجہاں ارادوں پر آسیب کی طرح چھل گیا پھر اجیرا، برصاوند حیران۔

دوسری صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ پلنگ پافندے سے منہ لیٹی ہوئی تھی۔ رات کی واردات اسے یاد آئی لیکن خواب کی  
طرح کہیں کہیں سے۔ اس کا عضو عضو درد کر رہا تھا۔ سر پھٹا جا رہا تھا اور منہ کی کیفیت نے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ کروت بدلا  
پڑنے کے بل ہو گئی۔ طاہرہ جتنی مسکراتی عمر سے میں آئی اور عفت کے لہرے پڑا ہوا تھا اور اسے زبردستی لہرے سے نکالنے کی توقع  
کورات کی ساری بات یاد آگئی۔ اس کے جہرے کی رنگت پھر بدلنے لگی اس کے دل میں آئی کہ طاہرہ کو کسافت صاف کر دے  
نات ارشد اس کے عمر سے میں تھا اور اس کے بعد ہم نے ہمارے جھوٹ نے مجھے نکل لیا تھا لیکن عفت پر طاہرہ کا سایہ آئید  
کی طرح غالب تھا۔ رات کی ہی طرح عفت چھوڑ دے گی اور اگلے کے سینے سے نکلا پناہ جتنے تھے اس نے سینے  
میں ہی قید کر لیے اور وہ بے بس ہو کر بولی — ”طاہرہ سر جھٹ رہا ہے۔“

طاہرہ اس کے سر ہانے بیٹھ گئی اور اس کا سر ہانے لگ گئی۔

یہ اعصاب زدگی کا پہلا دور تھا اور اس کے بعد دوسرا دور اسے آج جاگیر کے مقبرے کے باغ میں عمر کے ساتھ آیا  
کرتے پڑا تھا۔ عفت اس کیفیت کو غم و غصے کا عروج سمجھ رہی تھی لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ وہ اعصاب زدگی کی شکار ہو گئی ہے  
گھروالوں کو ابھی اس کی اس حالت کا علم نہ تھا عفت نے منہ کو آج بہت کچھ سنا لیکن اس رات کا یہ واقعہ نہ سنا۔ طاہرہ اور ارشد  
کو کبھی علم نہ تھا کہ عفت منہایت سرعت سے ہر طریقہ کے منہ میں جاری ہے جب کہ اس کے پیٹ میں پتھر ہے۔

”اٹنا جھون“ کی فضا میں چوری چھپے ایک تلخی پرورش پا رہی تھی جو گھٹائی کی طرح افق سے اٹھ کر اس خاندان کی مسترتوں

دونوں تانگے جھانکے مقبرے سے لوٹے تو آٹنا جھون کے سامنے آ کر کے۔ سمجھا اور اس کی رشتہ داروں کیوں نے  
اجازت چاہی اور چلی گئیں۔ ارشد خلاف معمول گھر میں تھا۔ بھائی اور طاہرہ نے اسے گڑبوشی سے سلام کیا۔ ذرا سانا کی کیا کیفیت  
بیگانگی کی طرح سیدھی اپنے عمر سے میں پئی گئی۔ اس نے ارشد کی طرف دیکھا نہ ارشد نے اسے دیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔  
اس نے ادا میں سے ابھر کر جوتوں پر ایک کمر بٹھ پیدار کی جد بکتھی سی دیکھتے غائب ہو گئی۔

نہاتے دھو تے اور کپڑے بدلنے شام کے کھانے کا وقت ہو گیا اور ارشد رات ہی دیر باغیچے میں ہی شملتا رہا۔ عفت نے  
بے دلی سے ذرا سنا کھا یا اور طبیعت کی خرابی کا سہاڑہ کر کے اپنے عمر سے میں چلی گئی۔ کھانے کے بعد تھوڑی سی دیر گپ شپ  
ہوئی۔ یہ کی تفصیلات سنائی سنائی گئیں اور سرنگ کے کنارے آباد نازک بڑوں کی حالت کے تکرارے ہوئے۔

کچھ دیر بعد طاہرہ ارشد کے عمر سے میں چلی گئی۔ اس نے ارشد کے عمر سے میں نہ جانے کا تم ارادہ کر رکھا تھا لیکن آج کا جانا  
دور نہ رہا جانا بارمی ملاقات نہیں تھی آج طاہرہ ارشد کے ساتھ ایک پروگرام بنانا چاہتی تھی۔ ارشد مل لیمپ کے سامنے جھکا  
میز پر کھائیں لگا کے جانے کی سوچ رہا تھا کہ طاہرہ اس کے عمر سے میں داخل ہوئی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آؤ، طاہرہ! — ایک آہ تھی جو ارشد کے جوتوں سے تڑپ کر نکل گئی۔ ”کوہا طبیعت کیسی ہے؟“  
”میری یا عفت کی؟ — طاہرہ نے پوچھا۔

”اوندہ! — ارشد نے طنز آمیز مسکراہٹ سے کہا۔ ”ہی کوہا اس کی طبیعت تو میں جانتا ہوں کیسی ہے۔“

”ارے بٹاؤ اس پر متوجہ کو۔“ طاہرہ نے طلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔ ”بتیک میں میرے کتنے رپے

ہوں گے؟“

”کیوں؟“

”پوچھ رہی ہوں جی! — طاہرہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”ایک ضروری کام کے لیے آئی ہوں۔ تمنا ہے  
ساتھ اور آبا جان کے ساتھ مشورہ کر کے کچھ روپے نکالو ارشد کی راہ میں خرچ کرنے میں۔“

غافلانہ ساڑھے سات ہزار ہوں گے۔ ارشد نے میز کی دروازے سے اکوشت بک نکال کر دیکھی اور کہا۔ ”اٹا!

سات ہزار ساڑھے سات سو روپے۔ کماں خرچ کرنے ہیں؟“





مخلون کرنے والی بات تھی۔  
 ”چھ سات مکان تو میں الاٹ کر سکتا ہوں۔“ ارشد کے بھائی نے کہا۔ ”لیکن سوچنا ہے کہ ان بڑا بڑا مکان

میں سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟“  
 ”یہ ہم تلاش کر لیں گے۔“ ارشد نے کہا۔ ”ظاہرہ اور اس کی ایک آستانی بھگت رکھ کر روڈ کی طرف جا رہا

ہیں۔ جہاں ارادہ سے کہ جن گھر لوں میں فوجاں لڑکیاں ہیں۔ پہلے انہیں شکانے لگایا جاتے۔“  
 ”عجیب نم ہے۔“ ارشد کے آبا جان نے کہا۔ ”سمت کے روڈ پر اور زیادہ سے زیادہ خانہ لڑکیوں کو لگا کر

دیکھ کر بوسٹ میاں! آبا جان نے ارشد کے بھائی سے کہا۔ ”کل ہی شاہ صاحب سے ملنا اور انہیں میری ہڈ

سے لٹا کر ہارے تھے اور شہ دار آئے ہیں اور چھ سات مکان الاٹ کر دیں۔“  
 ”خود دیکھ لیں۔“ ارشد کے بھائی نے کہا۔ ”اسی کے ہاتھ میں ہے جتنے چاہیں الاٹ کر سکتے ہیں۔“

”اور تم ارشد میاں! آبا جان بولے۔“ دیکھ لیا کہ ظاہرہ کا کتنا وسیع مجمع ہے۔۔۔ اور سونو۔“ انہوں نے

قدرے نکل کر منہ لہجے میں پوچھا۔ ”ظاہرہ اپنی مرضی سے یہ روپیہ صرف کر رہی ہے نہ؟“ بھی آخر تو عریضی ہے۔ کہیں تم نے

تو اسے نہیں لگایا؟“  
 ”نہیں آبا جان!۔“ ارشد نے خود اعتمادی سے کہا۔ ”چاہیں تو اسے بلا لیں۔ وہ تو عمر تو ہے لیکن اس کا

پختہ ہے۔“  
 ”خیر دیکھ لو۔“ آبا جان نے کہا۔ ”میں سوچ رہا تھا سات آٹھ ہزار روپیہ معمولی رقم نہیں۔ مکان الاٹ ہونے

پر تقسیم کر دینا کیس چوراکوں کے ہی حوالے نہ کر دیتا۔“  
 ”نہیں آبا جان!۔“ بڑا بھائی بولا۔ ”میں ساتھ رہوں گا۔ اچھی طرح دیکھ جا لیں گے۔“

لوڑو وہ دھنسنے بھٹ بھٹا ہوا تاج تیز میں ہوتی رہیں منٹو بے ہمتے رہے۔ نوشتے رہے۔ زمینیں ہوا

اور آخر قیٹوں نے بل کر ایک سکیم بنائی۔  
 ”خدا کرے کہ چند ایک اور دو لکھ لکھوں کو بھی اسی قسم کی عقل آجائے۔“ آبا جان بولے۔ ”ہمارے بھتیجے

اپنی مدد آپ کے اصول پر چل سکتے ہیں۔ میٹریاں سے ظاہرہ کو اس قدر روپے کی ذاتی طور پر ضرورت بھی نہیں ہوتی جا۔  
 وہ قواب ہماری ہی بیٹی ہے اور اب ہم ہی اس کے نیک و بد کے ذمہ دار ہیں۔ اس کی شادی پرانٹا انڈیہ کو لیں کر

گے۔۔۔ ماسٹر باغا و پڑھانے آتا ہے؟“  
 ”جی ہاں!۔“ ارشد کے بھائی نے کہا۔  
 تھوڑی دیر بعد ارشد ظاہرہ کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر آج ایک عرتے بعد اطمینان اور

کی جھلک آتی تھی۔ وہ کہتے ہی دونوں بعد اپنے مخصوص لب و لہجے میں تیس کر رہا تھا۔ آج وہ باتوں باتوں میں کھل کر ہنس کر

ہے وہ غنٹ کو بھول گیا ہو۔ وہ اس قدر بلند آواز سے بولنے لگا کہ گائیاں غنٹ کے کمرے تک پہنچنے لگیں غنٹ

میں بھری ہوئی باتوں نے آنسوؤں کا لالچا سبب رونا کر دیا۔ بھابی کچھ نہ سمجھ پاتی حمل کے علاوہ اسے یہ خیال بھی آیا کہ ارشد عفت سے سرد مہری برت رہا تھا۔

”لیکن اتنی سی بات پر یہ حالت؟ بھابی نے سوچا اور بیچی ٹٹوں کی ایک عفت کے دل پر یقیناً کوئی بوجھ ہے جسے اُنہو کا کر دینے کے عفت، روتی رہتی اور بھابی محبت اور شفقت سے اس کی پیشانی سسلا رہی تھی عفت کی کبھی ہندہ گئی۔ پھر کبھی نہیں۔ بس کیا ختم ہوئے لیکن اور چند ہی منٹ بعد عفت کی حالت معمول پر آنے لگی۔ آنسوؤں نے بہت کام کیا۔ بھابی کے ہاتھوں نے عفت کے جسم کو پسینے میں مشغول کیا۔

”کچھ کبھی عفت! — بھابی نے ایک جہاز اور دروند منال کے نماز سے پوچھا — آخر بات کیا ہے؟ یہ غلط یقیناً بیٹ میں پسے کی وجہ سے نہیں۔ بات کچھ اور ہے۔۔۔۔ ارشد ناراض ہو گیا ہے؟ کم تو اس کے کالی کھنپوں؟ بابا جان سے کسوں وہ سیدھا کر دیں گے؟“

”بیکار سے بھابی! — عفت نے ہنستے ہوئے کہا، اس نے ہلکے کے ”بھیکے“ کے ساتھ پیٹھ لگائی اور بولی ”جس مرد کے لیے ظاہر ہوئے کھنپے لیے ہوں اور اس کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی جو اسے کیا سانی دے گا اور کیا غلط کرتے گا؟“

”کیا کہا؟ ظاہر ہے؟ — بھابی کو دھچکا لگا۔

عفت نے طویل آہ لی جو زمانے کب سے اس کے سینے میں آزاد ہونے کو تڑپ رہی تھی بولی — ”بھابی! ڈرتی ہوں بات کر کے کچھ چھپانا نہ پڑے۔ سو سکتا ہے۔ آپ ارشد کے خلاف کوئی بات سننا نہ چاہیں۔ وہ آپ کا قریبی عزیز ہے اور میں انہی ہوں۔ ایک شرافت یوں ہی کر جاؤں گی کچھ نہ کسوں تو سبب ملتا ہے۔“

”بات تو کرونا، عفت! بھابی نے اس کے قریب سر کر کر رضائی اپنے اور عفت کے اُنہو پر اڑھ کر لکری جہاز سہیلی اسی نے تلکھی سے کہا۔ ”خدا گواہ ہے میں ارشد کے خلاف ایک ایک بات سنوں گی۔ مجھے متار سے ساتھ بھی دینی پڑی ہے ارشد کے ساتھ ہے میرا خون ہے۔ ماں نہ باپ نہ بھابی۔ دو دینیں تھیں۔ دونوں اپنے اپنے گھر والی بن کر اپنی راہ لگ گئیں ہیں۔ اب میرے خون کے رشتے دار تم لوگ ہی ہو میرے لیے عیا ارشد ویسا اس کا بڑا بھائی، تم اور طاہرہ بھی ویسی ہی ہو؟ تو چاہتی ہی ہو کہ میرے ساتھ کوئی کدھ ٹھہرائے۔ بھابھائی سے اس گھر میں اتنا اور طاہرہ کا اضافہ بھابھائی سے میری ٹیڈل کی تو حد ہی نہیں رہی تم اپنے دل کی مجھے نہ سناؤ گی تو میرے دل کو بھی رنج ہو گا کہ تم نے مجھے بیکار نہ سمجھا۔“

”بھابی جان تو نہیں آجائیں گے؟ — عفت نے پوچھا۔

”آگے تو دوسرے عمر سے میں بھیج دوں گی۔“ بھابی نے جواب دیا۔ ”تم کھل کر باتیں کر ڈینگے! یہ حالت تو خدا نہیں کی نہ کرے جو ابھی ابھی تمہاری ہو گئی تھی معلوم ہوتا ہے تم اندری اندر کڑھتی رہتی ہو؟“

”اُوں تو بھابی تو کیا کروں! دل کا رونا کس کے آگے دوں؟“

”ظاہرہ جو ہے۔“

”اگر میرا سہاگ ابا جان نے والی طاہرہ ہی ہو تو سر بھوڑنے اور دوسرے پڑنے کے سوا رہی گیا جاتا ہے؟“

ایسا تھا جس کی قسم کی ذمہ داریاں تھیں۔ سہاگ ابا جان پر ایک گھٹنہ خیرات کو سنا لانا نہ تھا کہ مرے میں ڈالا اور گل لانا۔ قرآن صورت پر تھی کہ وہ پیر ایک اللہ وارث لڑکی کا تھا جو ابھی غرضادی شدہ تھی اور ان کے خیال کے مطابق عمر کی کچھ کو بھی نہ پہنچتی تھی۔ گو دونوں بزرگ طاہرہ کی سکیم کو منظور کر چکے تھے اور لاکھ عمل بھی تیار ہو چکا تھا پھر بھی وہ دونوں ابھی تک اسے ہر سبب سے دیکھ رہے تھے۔

عفت نے بھابی کی آواز سن کر بھی کمرے کو نہ بچا۔ جب اچھی طرح جائزہ لے چکی تو اسے خواب میں پہنے پھرنا کا دھچکا لگا۔ اسے وقت کا کچھ بھی اندازہ نہ تھا۔ ابھی طرح کمرے کو پہچان کھینے کے بعد وہ سوچ میں پڑ گئی کہ وہ کس کمرے کی طرف کس طرف گئی۔ شرمندہ ہونے کی ایک اور دھچکا یہاں سے کی گئی کہ نہیں تھی۔ اس کی قوت برداشت اڑھ ہزار پڑی تھی۔

”بھابی! — یہ حیرت زدہ سرگوشی نہیں تھی۔ دہی ہوئی ایک دروازہ کوئی تھی جو عفت کے سینے سے نکلی۔“ دوسرے لمحے عفت بھابی کے سامنے آدھی ہلکے پراد آدھی فرش پر گر پڑی تھی۔ بھابی نے سلاتیاں اور اون پر پھینک کر عفت کو چنگ پڑایا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی عفت کا سارا جسم کانپ رہا تھا تبس پڑا تھا رکھا تو اکر اُنہو تھا بھابی کا دل گیا۔ دھچکا عفت کے ہاتھ پاؤں مڑتے جا رہے تھے۔ ہاتھ پڑا تھا رکھا تو اُنہو تھا ہاتھ پڑا تھا۔ ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھیں بے چینی سے ادھر ادھر ٹپ رہی تھیں جیسے اُٹنی جگہ کو پہچان رہی ہوں۔ بھابی شاید حمل کے آغاز کا خوف رہے۔

اس نے اتنی کو بلا کر چاہا لیکن خیال آیا کہ وہ تو کبھی کی سوچی ہوں گی۔ تکلیف چہ نہ کرنا نہ قسم تھی اس لیے اس خاندان یا ابا جان کو بلا کر مناسب نہ سمجھا۔ سوچا دراپیت کل دوں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ عفت کے پاس بیٹھ گئی اور یہ لکنا شروع کر دیا۔

”عفت! عفت! اس نے ماوراز پیار سے عفت کو جھنجھڑا۔ عفت نے کھوئی کھوئی رحم طلب نگاہوں سے بھابی کو دیکھا تو بھابی نے اس کی پیشانی سے ہاتھ بٹاتے ہوئے پیار سے پوچھا۔ ”کیا تمہاری چھوٹی ہی بہن کو؟ یہاں تکلیف ہو رہی ہے؟ — اس نے عفت کے پیٹ پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔“

”دلی نہیں! — عفت نے زیر لب کہا۔ اس کی سرگوشی دکھ اور دوسرے لرز رہی تھی۔ اس نے بھابی کی آہستگی سے کانپتے اور مڑتے ہوئے ہاتھوں سے پکڑ لی اور اس کا ہاتھ اپنے دل پر رکھ کر کہا۔ ”یہاں میری ابھی اور وہ چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی۔“

بھابی نے اس کے دل پر قمیض کے نیچے سے ہاتھ جو بھیرا تو عفت نے اس نسوانی لمس میں ماں کا پیار بڑا۔

”دل ڈوب رہا ہے؟ — بھابی نے پوچھا۔

”ڈوب چکا ہے۔“ عفت نے روندی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بھابی!۔۔۔۔ اس سے آگے عفت کچھ نہ کر سکتی۔“

”خدا کے لیے مجھے پوری پوری بات سناؤ۔“ بھائی نے جھنجھلا کر کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے یہاں اچھا رہا ہے۔ مجھے بتا دیا کہ گورکھ دھندا ہے پھر دیکھنا میں کس طرح سارے مسئلے حل کرتی ہوں؟“

”بھائی! قصہ یہ ہے کہ ارشد مجھے دوا نہ دیا جتنا تھا..... اور اس عہد سے اس نے بھائی کو وہ قصہ سنا دیا روز بھائی گھر کے مقبرے کے سامنے میں بکھڑو کھڑا کھڑی تھی۔“

لیکن بھائی کو اس نے یہ بتایا کہ وہ قیوم اور غریب لڑکی تھی اور طاہرہ نے اسے گھر میں لبا کر اپنے کنبے بنالیا تھا۔ یہ بتانے کی غالیاء وجہ یہ تھی کہ اس بات سے طاہرہ کے کردار کے قابل تحسین پہلو نکلتے تھے اور اس کے احساس کمتری کا ثبوت ملتا تھا۔

اس قصے میں اس نے یہ اضافہ کیا۔ ”بھائی! یقین مآں تو دل کے دیکھ لو اس وقت ارشد صاحب کہاں بھی اتنے عورت سے دیکھ رہی تھی کہ اس طرح مجھے مجھے سے رہتے ہیں، جیسے وہ اس گھر میں موجود ہی نہیں لیکن گھر کہاں گئے ان کے ہر کسی کے ساتھ ٹھٹھے مذاق، مزہ و سکراہٹ رہی نہ وہ لطیفہ رہے میرے گھر میں پہلے سا پھر آنا بھی چھوڑ دیا اور اب گھر آنا بھی چھوڑ دے میں کیا میں اتنی بری ہو گئی ہوں؟..... میں بری نہیں ہو گئی طاہرہ زادہ!؟“

جیسے..... لیکن تو بھائی! میں کے بارے میں سنیں کہ وہ دیکھ مے ہوئے ارشد صاحب طاہرہ کے پاس بیٹھ کر رہے ہیں میرے لیے تو اب پکی سی سکراہٹ بھی نہیں رہی ان کے ہونٹوں پر اور اس گھر سے میں ان کے قہقہے سا رہا ہے۔“

عفت بولتی جا رہی تھی، اس کے آنسو سینے کی ہلن بے شک کڑا لے تھے۔ بھائی حیرت و استعجاب کا پیکر تھی۔ طاہرہ کے متعلق یہ انکشاف پہلی بار ہوا تھا جس پر وہ یقین کرنا نہ چاہتی تھی لیکن احوال و محالفت، ارشد کا مگر بھانا یہ حالت اور قرآن پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ ارشد اور عفت کی محبت کی سیب زدہ ہے۔ اس کا مٹی کے آگے کیا ہے؟ اور یہ پھر طاہرہ کے سوا کون ہو سکتا ہے؟ بھائی نے اپنے آپ سے کہا۔

”کیا وہ لڑکی جس نے مردوں کے دوش پر دوش مردوں کی طرح جھا دیا ہوا اس قدر آوارہ بھی ہو سکتی ہے؟“

انہی آہستہ سے کہا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔

”طاہرہ نے مردوں کی طرح جھا دیا تو کیا تھوہ مرد تو نہیں بن گئی؟“ عفت نے کہا۔ ”ہے تو عورت ہی۔“

بھی تو عورت ہیں، دل پر ہاتھ رکھ کر محسوس کریں اور ذرا غور کریں اپنے آپ کو میری جگہ لائیں میں نے بھی جھا دیا تھا۔ طاہرہ نے ہم پہنچے میں وہ آپ سن چکی ہیں لیکن جب میں نے اپنی محبت کو مخرج ہوتے دیکھا ہے تو خدا کی قسم تمام جھا دیا اب تو میرے سامنے صرف ایک ہی جھا دے کہ اپنی ازدواجی زندگی کی راہیں آئے دے اور انسان کی بولیاں ”تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟“ بھائی نے عفت کو جذبات میں سے نکال کر مٹا لانے کی کوشش کی۔

”ایک ہی طریقہ ہے۔“ عفت نے کہا۔ ”طاہرہ کو کہیں بیاہ دو۔ دو جب تک اس گھر میں موجود ہے۔“

دھڑکے گا۔

”اوی! ہم صرف اپنی اور ارشد کی بات کر رہی ہوں۔ بھائی نے فکرمند خندگی سے کہا۔“ اور میں سوچ رہی ہوں کہ جس اہم کمپنی جو کہ ارشد اور طاہرہ کے تعلقات بھی ایسے ویسے ہو گئے ہیں تو یہ طاہرہ کو اپنی اور گلی نہ بھلا بیٹھے خدا نخواستہ اس لت تمہارے والی ہو گئی تو اچھے بھلے شریف خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ طاہرہ کو بیاہ دینے میں ہی بھلا یہیں عفت!..... بھائی کو اپنے ہی الفاظ اس قدر چٹھے کہ اس نے اپنے آپ کو ایک بار پھر فریب سا دینا چاہا اور کہا۔

”نہیں تمہارا یہ شک محض دھم ہو۔ ارشد اس کے گھر سے میں جاتا ہوں سو گا کہیں.....“

”بھائی! اٹھو! اٹھو! عفت یہ مخالفہ جوٹ برداشت نہ کر سکی اور رستہ سے اٹھ بیٹھی، اس نے بھائی کو بھی بازو سے دھکیلتا دیا اور اس کی گھسیٹ کر دئی اس نے غم سے میں سے حال نہ لے لی۔“

ارشد اور طاہرہ دینا بھر کی باتیں کر رہے تھے جب باتیں ختم ہو چکیں تو طاہرہ نے کہا۔ ”مٹھو جناب! میں آج تمام دن لی جاتی ہوں۔ جانا اپنی عفت کے پاس۔ طاہرہ نے کیا تو مذاق تھا لیکن وہ غبیہ ہو گئی اور کہنے لگی۔“ ارشد معلوم ہوتا ہے تم ساتھ مجھے بھی رسوا کرنا گے تمہیں کو کرنا اور سمجھا بھی کریں تو عاجز ہو گئی ہوں۔“ ان آرحانی تین گھنٹوں کی باتوں میں یہ پہلی ت کا ذکر آیا۔

عفت اور بھائی دبلے پاؤں طاہرہ کی کھڑکی کے ساتھ کان لگا کر کھڑی ہو چکی تھیں، کھڑکی کے پردے کے پوسے ہوئے اور طاہرہ کی آواز آتی تھی۔ ”ماتم نے اپنی حالت ایسی بنائی ہے کہ کمر کی کوشش ہوتا ہے، ہم حجاز میں سننے میں دباتے ہوئے آخر طاہرہ جو کمری رہے گا۔ مجھے ڈر لگتا ہے گھر کے لوگ شک میں نہ آجائیں تم سے بدتر حالت عفت کی ہے کہیں میں ہو جاؤں؟“

”دیکھ تو ان کہتے دنوں بعد تمہارے گھر سے میں آیا ہوں۔“ ارشد نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ”مڈا کی قمر طاہرہ بہت کویں اب دفن نہیں کر سکتا بہت کوشش کی ہے، دل کو بہت سمجھا یا ہے لیکن عفت نہاری کچھ نہیں لے سکتی۔“

لے سکے گی۔

”مجھ میں اب زیادہ باتوں کی تاب نہیں رہی ارشد!۔“ طاہرہ نے بھائی لے کر کہا۔ ”میں میری محبت کے ساتھ میری پاکی بھی ہونا چاہتی ہے۔ یہ زار فاش نہ ہونے پائے تمہاری اور عفت کی ناجائز کا زلہ آخر گھر پر ہی گرے گا۔“

ہو گیا تھا کہ۔“ ارشد نے کہا۔

ارشد جانے کے لیے اٹھا تو کمری کی آواز آئی عفت اور بھائی خاموشی سے وہاں سے بہت آہیں برآمد سے میں بھائی نہ کو بوجھ دل سے کہا۔ ”اب جا کے ہوجاؤ۔“ مجھے تمہاری باتوں کا یقین ہو گیا ہے۔ کل بندوبست کر دوں گی کسی اور سے ارشد کو تھارے قدموں میں نہ ڈال دوں تو.....“

آخر کچھ لہجہ میں پڑی جوتی تھی عفت کی داستان روزہ کر اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اسے طاہرہ پر غصہ بھی آ رہا۔ اس کی سوچ اور فکر و حصول میں بٹ گئی۔ ایک مختصر طاہرہ کی وکالت میں پہنچ کر رہا تھا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔“ طاہرہ

جنت نے رات اسے سنا کہ تین اس نے غفلت کی اس وقت کی حالت کا تفصیل لکھتے تھے چنانچہ جوں جوں کمانی عروج کو پہنچ جاتی تھی کہ چہرے کی بھریاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ اس سے فرش معروض ہلتے دکھائی دے رہے تھے۔ اسی عمر میں اس نے عشق و محبت اور گناہ و بدکاری کے بیگانوں قصے سنے تھے۔ دودھروں کے قصے ہونے کی وجہ سے دل چپ ہو کر گئے تھے لیکن جو کمانی اسے بھائی سنا رہی تھی وہ اس کے اپنے گھر میں اپنی نظر کے سامنے بہت رہی تھی اس لیے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ یقین نہ بھیجی تھی چاہتی تھی کیونکہ یہ اس کے اپنے گھر کی چار دیواری کا دور تھا۔ بار بار پوچھ رہی تھی۔ "تو؟ غلام ہو؟ اوی زینت کس کی بات کرتی ہو؟ میرے ارشد کی؟"۔ یہ سوال اس نے کی بار بار پوچھا اور بھائی نے وضاحت سے جواب دیا جواب بے شک صاف اور قابل فہم تھے لیکن ارشد کی ماں کو تو قوت تھی کہ بھائی ابھی کے کیو یہ بات ارشد اور غلام کی نہیں لڑائی۔ اس وقت سب بچے سو رہے تھے۔

"بھائی! بھائی! ارشد کے بھائی ماں کو بتا دوں اور وہ ارشد کو سمجھائیں"۔ بھائی نے کہا۔

"بھائی! آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ گم سم جانے کہاں نظر اٹھاتے ہوئے تھی۔

"یہ غلام میں ختم ہو جائے تو بھلاقی اور نیریز راڈا کس چھپائے پھر اس کے"۔ بھائی نے رازداری سے کہا۔ ایک عرصہ غلام کا اتنے نیراز و پرہیز اور زلیو گھر میں رکھے بیٹھے ہیں۔ پھر اس کی یہ جوانی۔ یہ کیا کم زور داری ہے۔ اتنی؟ میں تو اب اس کے ساتھ بات کرتے تھے بھی ڈرتی ہوں۔ چلاک لڑکی ہے۔ کہیں ہم پر ہی محبت نہ لگا دے کہ میری دولت ہتھم کر کے لے جائے وہاں کر کے گھر سے نکالنا چاہتے ہیں؟

"لڑکی تو بڑی چالاک ہے۔ ارشد کی اتنی نے آہ لے کر کہا۔" تو بھائی کس طرح آنکھوں سے باتیں کرتی ہے۔ لوں کے ہونٹ مسکراتے ہیں، اس کی آنکھیں مسکراتی ہیں مجھتے جاؤ گے کہ یہ ارشد تو چہرہ جو اس ہے۔ ارشد کا بھائی اس طرح نہیں کرتا تھا۔

"ارشد کے بھائی جان کا بھی یہی حال ہے۔" بھائی نے اعتراض کیا۔

"بس جی بس۔" بوڑھی اسی ایک لذت غصے میں لگتی اور بازو لہراتے ہوئے فیصلہ دیتا۔ اسے صاف کہہ دو کہ یہ لو بڑا پیر اور زور اور اپنا ٹھکانہ نہ کرو۔ یہ کوئی تیرہ ماہہ تھوڑے ہی ہے کہ ہم لاوارث لڑکیوں کے ناز اور چو پٹلے اٹھاتے پھر؟ غرض یہاں نہیں چلے گا۔ بڑھاپا بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ ذرا وقت کے بعد رازدارانہ لہجے میں بولی۔ "اوی زینت تو اپنے کانوں سے غلام کو یہ باتیں ارشد سے کہتے سنا ہے؟ تو کہتی ہوں یہ قصہ غلط ہو گا۔ سچی بات ہے کہ غفلت کی بہت بھگے غلام کو زیادہ دلچسپی ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ اتنی گہری سوچ میں پڑتی۔

اتنی کی اندھا دہی اتنی۔ بھائی نے ہنسنے لگا کہ اس نے غفلت کی حالت دیکھی۔ اس کی باتیں نہیں اور ارشد کو ہر کے گھر سے مل پایا۔ وہاں وہوں کی باتیں نہیں۔ جانے دو کہب سے وہاں بیٹھے تھے اور کہ ارشد وہاں سے نکلا۔ اتنی اور بھائی چند منٹ خاموش اور اپنے اپنے خیالوں میں کھوئی تھیں۔ یہ کوئی دین و دلت تھی گھر کے افراد پر اسے نے کٹھنہ و عذرت تھے مگر یہ کوئی اور اس کو بھی میں رہتے والے انسان چار دیواری کی دنیا کے گھناؤنے اسباب اور سڑک دھاج

ایسی آوارہ لڑکی نہیں۔ اور دوسرا حصہ کہہ رہا تھا۔ "وہ آخر عورت ہے۔ نوجوان جوانی اندھی ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی تو غصہ دکھا رہا اور ارشد ایک دوسرے کو دیرانہ جا رہے ہیں۔" بھگہرہ آواز میں سننا نہ چاہتی تھی لیکن غفلت کی حالت اس کے آتی تو پھر سوچ میں پڑ جاتی۔ یہ وہ وہ ملا وجہ بھی نہیں ہو سکتا۔

بھگہرہ نے ایک بار تین کی بار غلام اور غفلت کے بچپن، لڑکپن اور متضاد تربیت و ماحول کا تجزیہ کیا مگر بالآخر اس نے اگر وہ پھر اچھی تھی۔ رات سوئے سے پہلے وہ دیرانہ بچوں جیملوں میں جھپکی رہی اور اس نے فیصلہ کیا کہ اس غصہ ہی مار سکتی ہے۔ کل اسی کو ساری بات ٹھکانہ کو چھوڑ کر اس کا دوسرا رخ بھی تو دیکھنا چاہیے۔ دوسرے رخ سے اسے واقفیت تھی کہ غلام نے اپنی محبت ارشد اور غفلت پر قربان کر دی ہے۔

ادھر بھائی آنکھیں کھولے اندر سے ملے ایک ڈرامہ دیکھ رہی تھی جس کے قالب اور کردار ایسے ہیونڈے طرح تھے۔ غلام جو رہے تھے کہ لڑکی کا کچھ سراغ اور سر ملتا تھا اور نہ کرداروں کی ادکاری قابل فہم تھی۔ بھگہرہ کے لیے یہ مسئلہ مشکل ضرور نہیں تھا اور وہ غلام اور غفلت کو اچھی طرح جانتی تھی۔ بھائی کے لیے ایک مشکل یہ تھی کہ اس نے غلام کے کردار کی لذت کے صرف قصے سنے تھے۔ اس کے علاوہ وہ غفلت کے اداس اور اس کی اصیت کے متعلق کچھ بھی نہ جانتی تھی کہ وہ لڑکی نہیں ہیں اور اب اسے غفلت کی زبانی یہ معلوم ہو کر ارشد ان کے درمیان وجہ پکا رہے۔ ۱۵۰ پنے کانوں غلام کی آواز آتی تھی جو وہ ارشد کے ساتھ کر رہی تھی۔

بھائی جوں جوں اس قضیے کی گہرائی میں جاتی رہی وہ بے چین سے بے چین رہ جاتی تھی۔ اس کا خامدہ گر سولیا تھا۔ زندگی بلی کی جانی بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ غفلت کی باتوں کو سچ مانتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس سلسلے میں کیا اقدام کار لے سکتا ہے۔ غلام کے ساتھ برا راست بات کر لی جائے؟.... وہ بگڑ نہ بیٹھے۔ اس نے چاہا کہ خداوند کو جگا کر سارا ماجرا لیکن وہ اس مصلحہ بازی سے بھی باز رہی۔ اسی اطمینان میں رات جانے لگتی تھی۔ سر تو بھل ہو گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بات سناؤں گی۔ معاملہ عورتوں میں ہی طے ہو جائے تو چاہیے۔

صبح معمول کی طرح طلوع ہوئی۔ محروان بامدوں اور باوچی خانے میں روزمرہ والی چل پل تھی۔ پچیسے ہر روز کی طرح جا کے۔ نو دین نے حسب معمول جھین کا دودھ دیا۔ نماز اور نماز ہر روز کی طرح۔ باغیچے میں چھوٹوں کی خوشبو بھی دہی روز کی طرح بھیجی اور آنکھوں میں شہب بداری اور بے چینوں کو کھٹے ہوئے تھے۔ لیکن ارشد کا رنگ بھگہرہ اور ارشد کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ غلام نے بھائی کو روزمرہ کی طرح سلام کیوں کہی اور بھائی نے سر دھری کا مظاہرہ کیا لیکن غلام غلام کی۔ مرد حسب معمول دفتر کے لیے تیار ہوئے اور نکل گئے۔

ارشد نے جاتے جاتے غلام سے کہا۔ "میں دوپہر کے لیے تم کو انگ لگا رہا ہوں گا۔ بھگہرہ بھی اچکی ہو گئی۔ بھی نکل گیا۔

مردوں کو دفتر اور بچوں کے سکول جانے کے بعد بھائی ارشد کی اتنی کو انگ لگے گئی اور اسے وہ ساری بات

”وجہ؟“۔ تجربہ اپنے موضوع کی طرف آنے لگی۔

”عفت اور عفت کی عادتیں...“ طاہرہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”اس کی عادتوں کے علاوہ تنہائی اور ارشد کی محبت بھی تو ایک وجہ ہے۔“ تجربہ نے بلا تاملت کہا۔ ”عفت تنہائی محبت کو اچھی طرح جانتی ہے۔“

”ہاں! یا یہ بھی ایک وجہ ہے۔“ طاہرہ نے جواب دیا۔ ”لیکن اس کی عادتیں ذرا سی بہتر بہتر ہیں اور مغرب میں ذرا سی بھی جان بوجھ کر ارشد کا دل وہ کبھی تھی میں نے ارشد کو قائل کر لیا تھا کہ میری محبت کی خاطر عفت کو قبول کر لے اور اس نے قبول بھی کر لیا تھا لیکن عفت نے کیا کیا یہ بھی آج صبح کو آپا... اور طاہرہ نے تجربہ کو وہ تہاہیں سنا دی جو ارشد نے طاہرہ کو عفت کے مستقبل کی

تھیں اور بتا کر وہی سے متی ملائی تھیں۔ عفت نے اس سے دل بھر گئی تھی۔ ارشد نے ایک روحانی محبت کو عفت محبت پر قربان کر دیا ہے۔ آپا ارشد کو جوانی آدھ کی سے اتنا لگاؤ نہیں تھا روح و قلب کی مسرت سے ہے۔“

تجربہ نے آج سچ سچ سہرا اپنے آپ کو طاہرہ سے محبت پایا۔ اس نے غصے سے کہا۔ ”طاہرہ! اس نے جو ارشد کو شکار دیا۔ طاہرہ کو رہی تھی۔“ وہ ایک پیاس ہے جسے عفت اس وقت ٹھونس کر رہی ہے جسے جب ارشد کی کئی باتیں اس کے کمرے میں نہیں جاتا، اور ایک دو پاس ہے جسے ارشد اس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ عفت کے کمرے میں جلا جاتا ہے۔ دونوں پیاسے اپنی اپنی جگہ حق بجانب ہیں اور اپنی اپنی جگہ بوجھ کر تجلایا ارشد اپنی روحانی تنظیم بچانے کے لیے میرے کمرے میں آجاتا تھا اور اس کے کئی کئی روز ہنس مانی سے سنجیدگی سے اور طبعاً اوقات پیدا و محبت سے سمجھا کر تھی جس کی عفت کو اپنا سنا اور اپنی تمام تر محبت اور توجہ اسے دے کر اس کے دل و دماغ کو اپنے قبضے میں لے کر وہ ابھی بچا پورا ہے، اچھا لکے جہاں جاوے گا کینہ ارشد کا دل جمانہ عفت نے اس کا دل جملے میں تعاون کیا۔

”ایک بات تو ارشد نے صاف جواب دے دیا کہ وہ عفت کو ان عادتوں اور اس ذہن کے ساتھ قبول نہیں کر سکتا۔“ طاہرہ نے انکشاف کیا۔ ”اس رات میں بھی جذباتی ہو گئی۔“ اپنے لیے نہیں، عفت کے لیے۔ میں نے ارشد کو بیان کیا کہ اگر تم میری محبت کو کچل دو لاہے اور وہ کہنے لگا کہ تم نے ہی مجھے اس ”دورخ“ میں دھکیلا ہے۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ عفت جیگلی اور اہل ہے، غلامی میری محبت کی خاطر ہی... اچھی کئی بات کا ذکر ہے کہ ارشد میرے کمرے میں آیا میں نے اسے خود ہی بلا تھا۔ یہی نہ کہ نہیں کے لیے روپیہ نکھانے کی بات کر رہی تھی۔ یہ بات تو آپ کو سنا ہی چکی ہوں میں نے تو کوئی ایک ماہ سے ارشد کے قریب بھی مانا چھوڑ دیا تھا۔ آپا یہ بات ہے وہ بکاسے میری سننے کے اپنی لے بیٹھا تھا اور مجھے وہ پیدا و محبت کے گڑے مچنے دن اور دلانے شروع کر دیا تھا۔ میں نے جب دیکھا کہ میرا اعلیٰ مقصد فوت ہو رہا ہے اور ساتھ یہ بھی درک میں آئی ہے کہ عفت اور اس کی باتوں میں نہ اچھے جادوں تو میں دونوں کو اللہ کے حوالے کر کے الگ ہو چکی۔

”ہاں! تو بات کا ذکر ہے کہ اچھی پہلی باتیں کرتے کرتے ارشد اپنی باتوں پر لگ گیا۔ میں نے...“ عفت نے معلوم کرنا ہے تم نے ساتھ مجھے بھی روکا کہ وہ کیا آہفت الگ بے حال ہے۔ ارشد الگ پریشان ہے۔ میں فری ہوں نہ گھر والے کس لیے نہ سمجھ میں نہیں آتا۔ ان دونوں کے درمیان لگتی ہوں میں نے ارشد کو ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”جو میں اسے کہوں کہ میں ارشد کی نظر کو دیکھتا لیکن وہ

کی بجز ہوں سے آراؤ نہیں تھے۔

”یوں کہو!۔“ اتنی سے سر ہلا کر کہا۔ ”ابھی طاہرہ اور ارشد سے کچھ نہ کہو ہم یوسف سے ذکر کر رہے اور یوسف کے بآواز سنا حال میں سنا ہی ہوں۔ وہ دونوں ارشد کو گھیریں گے۔ شاید یہ بات غلط ہو رہی ہے یہ بات درست ہے کہ لو کی ہوشیار ہے اور اس کا آسان سا زانو اور روپیہ ہمارے ہاں پڑا ہے۔ کہیں متاخر شدہ شک ہی نہ ہو جائے کہ لو کی انہیں ہی روک لے۔“

”تو ابھی طاہرہ بھی کنارہ نہ ہونے دیا جائے کہ ہمیں اس کی کڑوت کاظم ہو گیا۔“ عفت نے کہا۔ ”پہلے مردانہ سے بات کر لی جاتے۔“

یہ دن بروز کی طرح گزرا تھا۔ کبھی کے چہرے پر غیر معمولی تاثرات نہیں تھے۔ سوائے عفت کے جو ایک اگلے کیلئے تھے۔ زیادہ بے چین ہوئی تھی۔ وہ چہرہ لگا، سب کچھ کھینچ لیا۔ عفتوں نے آپس میں روزمرہ کی طرز عمل کر باتیں کر لیں۔ زیادہ دوستانہ خوشی طاری رہی۔ طاہرہ اس خوشی اور کچھ کو محسوس نہ کر سکی تھی اس کا ذہن بڑا کڑیوں کی خاطر بڑا بڑا اور نوکدار کی میں اٹھنا تھا۔ اسے تجربہ کا انتظار تھا۔ تجربہ کرنے کا اور داری روڈ پہننے کا وعدہ کیا تھا۔

”دبے کے قریب تجربہ پہن گئی۔“ پہلے تمام عورتیں اکٹھی بیٹھ گئیں۔ کبھی نہیں۔ آدھ گھنٹہ بعد تجربہ اور طاہرہ الگ ہو گئیں۔ تجربہ کے قریب تجربہ پہن گئی۔ اسے اپنے پردہ گرام کی تفصیلات سنیں اور اسے بتایا کہ ارشد ارشد کا بڑا بھائی اور ابا جانی پر گرام کو مستعد کر چکے ہیں اور اب ارشد کو ساتھ لے کر داری روڈ کی فٹ پاتھ سے پانچ ایسے گھروں کو کھنکھارے گا۔ نوجوان لڑکیاں ہوں۔

تجربہ طاہرہ کے ساتھ ارشد اور اس کے تعلقات کے متعلق تمام باتیں سننا سنا چا رہی تھی۔ عفت نے اسے جرح بتایا تھا وہ اس کی تحقیقات کرنا چاہتی تھی۔ وہ دل میں جانتی تھی۔ شوہر اور عفت بھر کے لائی تھی لیکن طاہرہ نے جہاں کی بات شروع کر دی۔ تجربہ کو جرات تک نہ ہوئی کہ اس کے ساتھ اس قدر گھٹیا اور گرسے جوئے سے موضوع پر بات کر رہی وہ تو اپنا مستقبل بھی ان کو راستے جوئے میں انہوں پر قربان کر رہی تھی۔ تجربہ طاہرہ کے اس روپ کو کبھی طرح پہچانتی تھی۔ تجربہ کو اس کے دل میں بھروسے تھے وہ انہوں کو لگے۔ تجربہ نے حال طور پر محسوس کیا کہ طاہرہ کی مسکراہٹ ایک عام انسان کی مسکراہٹ نہیں۔ اس میں فرشتوں کا نور اور روح کا جلال درخشاں ہے۔

”غلامی میری مراد پوری کر دے کہ میں اپنے ہاتھوں زیادہ سے زیادہ بڑا کڑیوں کو کھانا دوں۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”چرا ایک مراد اور دہرائی ہے جو غلامی پوری ہوتی نظر نہیں آتی میں اس کے لیے رات رات بھر خدا کے حضور دعائیں بکا گی۔ کاش! یہ مراد بھی روپے پہلے سے پوری ہو سکے۔“

”ایسی کون سی مراد ہے؟“ تجربہ نے جیسے بے خیالی میں پوچھا۔

”عفت اور ارشد کو ایک دوسرے میں شہر و شکر کر کے ایک جان کر سکوں۔“ طاہرہ نے بدتمیز کہتے ہوئے ”یہ پورا نہیں ہے اپنے ہاتھ لگا لیا ہے۔ آپ کو اچھی طرح علم ہے کہ میں نے اسے اپنی تہاؤں اور مگر کے خون سے سینچ کر شش کی ہے لیکن دیکھ رہی ہوں کہ پورا ہوا ہے اور میرے مگر کا کھنکھانے ہو رہا ہے۔“



مانتے تھے اور اس کی مٹی پلید کر کے کوٹافنی بچرے چاکر سرپیٹ لے لیکن وہ ہنستی رہی اور سوچتی رہی کہ اب وہ کس طرح اس فحش خیال کو اٹھال سکتی ہے۔ اگر وہ درودن عزمین نمک دہشتے لے جائے تو کس باتیں کرے تو ظاہر کی کلامت کے گنجائش نکل لی تو کس دہان تو ایک ایک لفظ بولے یقین اور بلا خوف تر وید لے لے گا یا لا سکتا۔

بجائی بار بار طابو دار راشد کے ابن و دو قتل کو دہرائی جس تمام نے عفت کے ساتھ طابو کے ٹکڑے کے بار بار ٹکڑے کر کے تھے۔ یہ بھی اچھا ٹکڑا طابو یہ فقرے بیکر کو بیٹے کی سنا چکی تھی۔ سمجھنے والوں عزتوں کی باتوں سے یہ بھی امانت لیا کہ انہیں اپنی طابو کے اس ایسا کا علم نہیں موجود نہ انگریزوں کے لیے کر رہی ہے۔ انہیں واقعی اس کا علم نہیں تھا۔ مردوں سے بھی طابو کے ٹکڑا کا عروتوں کے ساتھ ذکر نہیں کیا تھا۔

عجزی! - ارشد کی ماں نے طنز آمیز لہجہ کی کہ: "تو سب سے تم اور والدین میں سب سے جو بھی پرکرم کرو اور طابو کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔" ان فایک ایک پیمہ اور دو گونگن کو کمر سے دیں گے۔ انقدر تڑپا ہکا کرے میرے پیچھے کی زنگنی تباہ ہو رہی ہے۔

"کبھی تباہ ہے، کبھی نہیں؟" - بھائی نے تہیہ آ کر کہا۔ "اب تو ایک ہی علاج ہے کہ طابو یہاں سے چلی جائے

میں پیسے علم تو تاراشد کا مایہ طابو سے ہی کر دیتے۔"

”ظاہر کے ساتھ کہیں کر دیتے؟“ امی نے ناک چڑھا کر کہا۔ ”غیبا جانے کہاں ملی اور وہ ہمارے پلے پڑ گئی ہے۔“

بجز تو ترپڑی اٹھی۔ اس کے سینے میں جیسے زمر کو تیر کے پرست پہ گیا ہر عجب کا دامن ہتھ سے نکل گیا۔ بولی تـاـپ تو اس قدر جھجھی مں کہ بات کرنے کی کوئی گنجائش ہی نظر نہیں آ رہی۔

”جسٹری؟“ اتنی بے خوفی سے کہا۔ ”کچھ آتش آگے سے بھی کہاں سے میں تو اب کسی کی ایک نہیں سنوں گی جیتیں اس لیے نہایتی ہے کہ اُس کا بھلا جاہلی جہنم تو اسے ساتھ لے جاوے۔ درجہ عروج شام مردوں سے مشورہ کر کے لڑ خدایا اسے جواب دے رہے ہیں۔ یہ شریفوں کا گھر ہے۔“

ظاہر و بری صرف سیل نہیں۔۔۔ بحرِ برقت ظاہری ہو گئی۔ اس نے زمی کو جوتی آواز کو نبھانے کوئے کہا۔ وہ بری مرد ہلا ہی ہے۔ آپ نے تصورِ لاہرف ایک رخ دکھایا ہے۔ آپ نے ظاہر کو کچھ کسی میں نہ دھت کا اور نہ ہی اپنے سینے کو آپ نے جو کچھ سیاست ہے وہیں پھیل چکی سن گئی ہیں۔ اس حرف اتنا کہنا ہستی جنوں کی یہ سب جو اس ہے۔ مجھوت ہے اور نشان ہے۔“

”لوادرٹو“۔ ارشد کی اسی نے مرند و دوسری طرف کر کے اس انداز سے کہا جیسے طاہرہ کے حق میں بات کرنی بجا گناہ ہو کہ نہ لگی۔ ”یرمال و حویب میں سفید نہیں کیے“۔ بڑھاکہ کے چہرے پر غصے کی جھلکیں نمودار ہوئے۔ نکلیں۔

مخبر بھی آخر عورت تھی۔ اسے بجائی اور اسی پسینہ صفت پر غصہ سا رکھتا اور اڑا ہوا برقع اس کے جواب میں غصے کی بجائے ہنس دیتا تھا۔

کھسنے لگا۔ ظاہر وہاں سے بہت کوشش کی ہے لیکن تہذیبی محبت کو دفن نہیں کر سکتا۔ غفلت تہذیبی جگہ نہیں ملے سکتی۔ اسے بڑا سکھنے کی بات آئے گی۔ اسے اتنا ہی کہ کر نکال دیا۔ یوں میری محبت اور عزت کا پاس ہونا چاہیے۔ اور میرا راز افشاء نہ ہو جسے پاس کیا مجھے تو وہ جھپٹاؤں پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ ایک ارشد کی محبت اور دوسرے محبت کی خلاف ورزی اصلیت۔ سمجھنا میں نے بڑی مشکل۔ اس راز کو چھپا کر رکھا ہے۔ درنہ غفلت تو بڑا آپ کبھی کا ظاہر کر چکی ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ وہ انسان ہی لگتی ہے لیکن وہ تو دن بدن جوان ہوتا جا رہا ہے۔

طاہرہ، دہائی سے بولنے جارہی تھی اور نچر کا دل مسرت و شادمانی سے سرشار رہتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو کہا کہ وہی کر اس موضوع پر بولنے میں اس نے پہل نہیں کی اور نہ بات کا تاثر بھی بدل جاتا۔ اب اصل بات کھل کر خود بھی سامنے آئی کہ وہی

نمبر دل و دماغ پر عظمت کی کامرانی کے عجائزات لے کر آتی تھی وہ وصل گئے اور اسے بات کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اس نے سکون آزمیڑا لی اور گہری نکلنیں کھینچی۔ ظاہر ہوئے ہی مچا رہی تھی سبجس کی اس میں بھی اور سوچ بھی یہی تھی کہ کون کے گریہ باتیں ارشد کی بجائے یا ہی کوئی ناخلائیں اور ظاہر ہو کے لیے بڑی پریشانی پیدا ہو جائے گی۔ اس نے ارادہ کیا کہ سخت سے جا کر لے کر اس نے کسی اور کے ساتھ کو تو نہیں کہا اور اس کی غلط فہمیاں دور کر دی تھیں۔

بجھرنے ہائے بیانیے سے ظاہر کو نالایق شروع کر دیا لیکن ظاہر کو ایک ہزار ذلیل بل گئی تھی جس کے سامنے وہ اٹھا اور دل کا بوجھ اور غبار نکال دینا چاہتی تھی۔ بھگرنے سے علیحدگی میں ملنا نہایت جزوی سمجھا۔ ظاہر کو دل نہ دیکھ کر اس نے کہا: — یہ باتیں تو کبھی تم بہن کی ہیں اور اعفیت کے پاس بھی پانچ سو منٹ بیٹھاؤں، اگر وہ مزاحیں سبوتی تو اسے سمجھانے لجا۔  
کوشش کروں گی!

”اگر آپ کو سچہ دے پایا۔ عابد نے مسکرا کر کہا۔ اسے سمجھیں، شاید آپ کا ہی جادو کار کام ہے۔“  
 ”تم ذرا کی دلائل بات۔“ سچہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”ارشاد بھی آنے والا ہوگا۔ میں عفت کو بھی تیار کر دوں گا۔“  
 سچہ عابد کو روانہ نہ کر کے عفت کے عرس کی طرف ”دبی قدم“ بھیجی کہ انہر سے بھائی نے انکراس کی ٹکائی بچلا،  
 عرس میں لگتی۔ سچہ نے کہا بھی کہ ذرا عفت کو دیکھ آؤ لیکن بھائی اسے بھی لگا اور کہا۔ ”ایک نہایت ضروری  
 کرنی ہے۔“

مختصر حبيب "اشباح" میں داخل ہوئی تھی تو ارشد کی اتنی اور بھائی کے کانچھو سی میں طے کر لیا تھا کہ مردوں سے بات سے پہلے پتھر سے کر کے آجائے۔ ان کا خیال تھا کہ مختصر طہارہ اور عفت کو ملال آباد سے جانتی ہے اور ارشد کے ساتھ بھی بنے ہے۔ شاید اسے کوئی پتہ ہے کہ بات معلوم ہو۔

بھائی بھو کو بوسے کر میں بے لکھی۔ اسی وہیں میٹھی بوٹی تھی۔ ایک دو دو اڑھریں تھیں تو بھائی نے زور لگا کر سسہ دے کر شروع کیا۔ جس ہی بھائی نے بات شروع کی بھجور کے پاؤں سے سے زمین گھسی گھسی۔ بھائی نے دوڑا۔ باتیں بیکار کرنا۔ بات نہ تھی۔ اس نے سانی مٹیں۔ ارشد کی اسی ساتھ ساتھ دھتے تھے جی جی تھی اور اسے بھی۔ یہ لکھنے اور اسے سب پرست:

سین لیتیں۔ کل ایک تو آپ اسی طاہرہ کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ آج اس میں کیڑے چرگئے عفت تو اس کے ہاتھوں کی خاک کے بارشیں:

”تو تو اُسے پر اترا آئی ہے۔“ اتی نے رونے کے انداز میں کہا۔ ”میں تو اس کا بچہ بھی تھا جوں جو میرے بچے کی راہ میں گئے ہوتے۔ خدا نے اچھی پہلی بہو دی جسے اور تیری طاہرہ نے اس کا شہناک اجلا دیا ہے۔ میرے بیٹے کو نہ ہا کر دیا ہے۔“ غصہ بڑے لگا۔

”دیکھ لینا کل یہ چیز کہاں ہوگی؟“

”ہوگی کہاں؟“۔ بچہ نے جوابی ٹھوکر کیا۔ ”خدا کے جڑوں کے لیے خدا کی زمین تنگ تو نہیں؟“

”تم تو اُسے دیکھ لیتی ہو۔“ بھابی نے دھل انداز کی۔ ”میں نے بات اس لیے کی تھی کہ اس مسئلے کا کوئی حل۔“

”الٹہ نہیں غفل دے، بھابی۔“ بچہ نے کہا۔ ”کیا یہ طریقہ مل سچے گا؟ کیا آپ ابھی تک طاہرہ کو نہیں سمجھ سکیں؟ اگر اس کے مشق کوئی نیا حائل نہ پیش کیا جاتا تو اسی کے ساتھ براہ راست کیوں نہ بات کر لی؟ اب بھی کچھ نہیں کیا۔ اسی سے بات کرو اور اس کی بھی سن لو۔“

”اس کے ساتھ بات کرتی ہے مری جو“۔ بڑھئی اتی کی عقل کی حدود ختم ہو چکی تھیں اور وہ منڈیر پر بیٹھ کر رونے والی عورتوں کی طرح اصل موضوع سے ہٹ کر اچھی باتوں پر اتر آئی۔

”نہا ایوں نہیں۔“ بھابی نے بچہ کو گرا بٹا دیا۔ ”آپ تو بات کو بگاڑ رہی ہیں۔“

”بہر حال اتی جان!۔“ بچہ نے غصے پر قابو نہ لے سکتے کہا۔ ”میں آپ کے گھر بیٹھی ہوں۔ شریفیوں کے گھر دار میں جرات ہے اس کی یہ خاطر نہیں ہٹا کرتی۔“

”ایک بار نہیں! سو بار آؤ۔“ اتی نے کہا۔ ”میں تو سیدھی سادی بات کی تھی کہ۔۔۔“

”لاٹھی تو میں نے بھی نہیں ماری تھی۔“ بچہ نے بات کا ٹھنڈے ہو گئے کہا۔ ”میں نے بھی سیدھی سادی بات کا سچا جواب دیا تھا لیکن آپ نے تو بچہ کی عمر میری زبان پر کی۔“

”اچھا بچہ! سن! اپنی سناؤ۔“ بھابی نے کہا۔ ”اتی جان ان کی بھی تو سن لیں؟“

”سن کیا سن!۔“ اتی نے اسی مزاحی کیفیت میں کہا۔ ”میں بھی طاہرہ بڑی شریف لڑکی ہے۔“

بچہ نے جب دیکھا کہ ضرورت حال بہت بڑھ گئی ہے اور بڑھا کر وہ تیرہ پہلا امید افزا اور ضلع جو نہیں تو اس نے مزہ چکھ چکے ہے گریز ہی بہت بڑھا اس نے فیصلہ کر لیا کہ طاہرہ کو گھر سے نکال دے جائے گی۔ روز بروز طاہرہ کو بڑھایا دیا جاتا ہے کہ لڑکی اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ عورت عفت جیسی لڑکی کی باتوں کی قائل ہو گئی ہے وہ عفت سے بڑھ کر عقل مند نہیں سمجھتی۔ اتنا عرصہ گزرا ہے اور وہ ابھی تک طاہرہ اور عفت کے درمیان ایک عیاں فرق کو نہیں سمجھ سکی۔ نیک اور بد کی تو جیسے وہ تیز ہی کوئی نہ تھی۔ بچہ نے طاہرہ کو اپنے ساتھ لے جانے اور اپنے پاس رکھنے کے امکانات پر بھی غور کیا اور لٹیب و فزا کا جائزہ لے لیا۔ بھابی کچھ کہنے لگی تھی کہ ارشد کو مرے داخل ہوا اور بڑھ کر دیکھتے کچھ نہیں اٹھا۔ بچہ نے حال دل چھپا کر کہیں کہ ارشد کا استقبال کیا لی نہ۔ اور بھابی کے چہروں کے رنگ بدلے ہوئے تھے لیکن ارشد نے اُدھر تو جی نہ دئی۔ داخل میں چھوڑا آجکا تھا وہ عورتوں۔

نہ نے کہتے کہتے موس کہ اس کے فارغ اور زبان میں رابطہ قائم نہیں رہا خیالوں میں انتشار پیدا ہو جا رہا تھا اور ایک دوسرے ایسے بھی آتے کہ اسے یہی احساس نہ رہا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ گپ بولتی ہی رہی۔ اسے پھر سامعوس مبرا اور وہ ملیات مسیحی سے حیران و ششدر رفت کو آخری نظر دیکھے انہیں مرے سے مل آئی۔

جب اس کے پیچھے دو دروازے کا کارخانہ سے بند ہو تو اسے محسوس ہوا کہ دروازہ اس نے خود بند کیا ہے۔ اس ہلکے سے دھمکے سے دو جاگ اٹھی۔ اسے پہلے یہ خیال آیا کہ اس نے عفت کو خدایا کہ ناگوار باتیں کر دی ہیں۔ اس سے معلوم یہ نہ لگاؤفت اعضاء زندگی کی ریفیہ ہے اور اس کی یہ مرض خفا ہو کر مندرت اختیار کر چکا ہے۔ اس کے بدل یہ عفت کی جہد یہی تھی کہ حالت نے اس کو ایک اختیار کر لیا تھا کہ اس کا مزاج پریشانی طور پر رکھ کر گھاتا۔

جبرئیل نے پلارڈ کو صبر و حوصلہ کی وقت اس خبر سننے حال راولپنڈی سے جانے پوچھی تھی۔ جبرئیل نے ظاہر کے کمرے کی طرف میں ٹری خانہ پر گئے کمرے کا دروازہ کھٹکا۔ ظاہر کو دروازے کی طرف بیٹھ کر بھی کنگھی کنگھی کر رہی تھی۔ جبرئیل کو ظاہر کے چہرے کا دایاں حصہ دھڑکا ہوا تھا۔ ظاہر کا رخ تھا۔ جبرئیل کے ریشمی بال جن میں مجبور سے پن کی لمبی کی جھلک تھی۔ ظاہر کے جن کو پانچا بند لگا رہے تھے۔ کندھوں کی مدھانی، گھمور لپک اور بازوؤں کی سید گولا کی ایک طلسمی سائمان تھا۔

ظاہرہ جو صورت تو تھی ہی مگر وہ بہت ہی حسین و کھانی دی۔ شاید اس لیے کہ اس نے اسے کھلے بالوں میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کا یہ بال مجھ سے بالوں کے درمیان اس کی گردن اور زیادہ نرم اور اور سفید و کھانی ہی تھی۔ یہاں سے لے کر کھنکی کی حرکت کے ساتھ اس کی گردن کا خم، ہر کی جگہ اور ہر مریز بازو کا رخ اور غم کی راہ میں کوئی نہ تھا۔ شاید اس لیے کہ مجھ کے قلب و دیگر میں ظاہرہ نے اسے ایک اور انحراف ہی لکھی۔ شاید اس لیے کہ مجھ کا یقین آج خیر خواہ تھا کہ ظاہرہ کا حسن ہی غری نہیں، اس کے اندر فعال میں روح کا رُخ ہو چکا ہے۔

ظاہر ہو کہ علم نہ سب کو سبھرا اسے خیر و کوار میں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ نگاہ میں مصروف رہی۔ اس کے بال خاموش ندی کی طرح لگی لگی چھوٹی چھوٹی لہریں بناتے رہے۔ سبھر کے خیالوں میں بھی تخیلی لہروں کا زبردست پیدا ہونے لگا۔

”بے چاری؟“ تبسمہ کے ہنٹول سے جیسے آہ اُٹھ گئی ہو۔ دوڑنے کے رکش میں بیٹھنا تو ایک ہی راہ۔ دوسروں کے لیے ان کا دل قربان کر کے والی آج دوسرے ان ہی جی جان کو سٹالنے پر توجہ دیتے ہیں۔ تبسمہ دل ہی دل میں کہہ کر رہتی تھی۔

یری یادی ظاہر! کاش تو میری بہن ہوئی میری بیٹی ہوتی۔ کاش آج تیرا پ زلف نہ ہوتا میری ماں زندہ ہوتی اور تو... تبسمہ کے آنسو پوٹ گئے۔ اس نے آسویں کھیلنے لگے۔ کچھ آنکھوں میں ہی جذب کر لیے۔ اس نے دکھوں سے لبریز آنکھیں اور اپنے آپ سے ہٹاؤنے اپنے اوپر اور شہ پر وہ ظلم کیا ہے کہ خوشی تب بھی لڑتا ہے ہوں گے۔... بے چارہ ارشد!

مجھ نے فرط غم سے سر دیوار کے ساتھ ٹکایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جانے وہ میکوں کے اندھیرے میں کیا دلچسپی رکھتی تھی کہ اس نام نہان قہقہے کی جھٹکیں۔ اس نے بھی ہوش نہ رہا تھا کہ وہ ایسی جگہ کھڑی ہے جہاں سے گھر کا کوئی نہ کوئی فریاد فوسکی وقت گزر سکتا ہے۔ اُن نے نہیں ماٹھ سے کواں کھولا۔ اپنے آپ کو سمجھا اور دروازہ کھٹک کر کہیں بی بی گئی۔ طارہ تو تقریباً سو رہی تھی۔ سمجھ گیا کہ کچھ بھلا ہوا ناہار ہو رہا ہے۔ بیٹھی تھی کہ طارہ نے پوچھا۔ ”معلوم ہوتا ہے عفت جانے کو تیار نہیں ہوئی۔“ بچہ کراؤنا خوش کر کے کہہ کر بارہ بولی

نہیں بدلے گا میں نہیں ٹھکرا ہوں سی ایگر میرے سہارے کی تلاش میں ہر دم میں تیں ایس میں مل کر تھی۔ ارشد کے جسم کو کھٹکنا، کچھ اس کے ساتھ ہر نسل کر مجھے ہے چاہتا ہے۔ ”درملیں ایگٹو میٹر“ اسے جس محبت کی ضرورت ہے وہ محبت کہ جس کا تعین روح سے ہوتا ہے۔ اگر اظہار کے جن میں ہندسی نیت صاف ہے تو سی سے ہیں تو“

”مجھے ارشد کے ساتھ دیوانہ وار محبت ہے۔ عفت نے تڑپ کر کہا۔ ”میں اس کے لیے جسم و جان قربان کر دوں گی۔“

”لیکن تمہاری محبت کا عروج و زوال کے لیے موت ہے۔“ — منجھ بولی — ”جسے تم عروج مسمیٰ ہرودہ محبت کی کہتی ہے۔  
 پیار کے لیے زہر ہے۔“

”مدا کے لیے مجھے کچھ سمجھاؤ، آیا اب— عفت لے التجا کی۔“ میں گمراہ ہوں، جب تک گستی ہوں۔“

”میں اب خدا سمجھا رہے گا۔“ بچہ نے جواب دیا۔ ”اب میرے بس کارواں نہیں رہے۔“ غلام کو دہانہ کر دیا ہے۔ اس کی تمام تر سکیاں ایک ہی دودھ محبت کی آگ میں جلا ڈالی ہیں۔ غلام تو ہمارا ایک گناہ بخش دے گی۔ خدا نہیں سمجھے گا۔“ بچہ نے گری ہوئی۔

”ایمانہ جاؤ“ — عفت نے سجدہ کا بازو پکڑ لیا اور اس کے آنسو بہنے لگے۔

منجبر کا دل ایسا پتھر تو نہ تھا لیکن عمارت کی رسوائی اور ارشد کی امتی کے قہر میں کمزیر ہو کر اس نے اسے بائیں بنا دیا تھا۔ عفت کیا ہے لے کر رونے لگی۔ منجبر بھی برداشت نہ کوسکی۔

”میں تبارے ساتھ صرف اتنی غیبی کرسکتی ہوں کہ تینیں سجدوں کہ ارشد زہدوں اور شگفتہ مزاج سے تم بھی اس طرز پر جاؤ۔“ منجھ سے عفت سے کہا۔ ”اے اندری زہد کہنے والوں سے نفرت ہے۔ دل و دماغ اور نظریں وصحت یکساں ارشد کھڑے نہیں جسے بوقت دلچسپے رکھوں اور اس پر جیسے کسی دوسرے کا حق نہیں ہیں۔ اپنے آپ سے باہر آجاتا ہے۔ ارشد مل جائے گا۔ ظاہر اب تبارے ساتھ نہیں رہے گی۔ اس گھر کی دنیا اس کے لیے تنگ ہوگئی ہے۔ تم نے اسے گھر سے نکلا دیا ہے۔ اب ذہن سے ظاہر کا سایہ اتارنے کے لیے کوشش کرو۔ تم نے خود کا تھکا ظاہر و کام پر مراد و سوار ہے۔ کوشش کرو کہ مراد و تر جائے۔“

بمجرکہ یہی تھی اور عفت بمجرہ لا باز و جھوکر آہستہ آہستہ پیچھے سرکل گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھل کر سائیں ہو گئیں تھیں اور سب کو  
 حار ی تھی۔ ”اتر خارو کے نرخی نہ سو گئی۔ اس کی بادا سیب کی طرح ستارے کے گونڈ مڑلاتی رہے گی۔“

نمبر کے انٹرویو میں آئے صورت حال اسے کائنات کی طرح چھوڑ بیٹھی تھی غفلت کو یوں کرنے میں بھی دل اس کا نہیں دے رہا تھا لیکن اسے پہنچنے سے گزرتے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ اس کی ذہنی اور فانی اور بے قراری میں اضافہ ہوتا تھا۔ اسی لمحے میں کہ رہی تھی یہ سچ تم ہوگی اور ارشد ہوگا۔ ارشد خواب کے سائے کی طرح تئیں دکھائی دیتا رہے گا۔ ہم بانی سوکھی۔ ظاہر کی مدد کے بغیر ہم ارشد ہو پائے نہ سوکھی۔ ظاہر و شہدای لایعنی تھی رہتا رہا چراغ تھا۔ ہم نے لایعنی ٹوڑ دی ہے بھکھا داسے۔ اب جنو اور اندھیرے میں چلو

”یوں؟ معلوم ہوتا ہے عفت پر آپ کا نہیں بلکہ آپ پر عفت کا اثر ہو گیا ہے۔ آپ تو یوں گم گم مٹی میں جیسے لوکر آئی ہوں کہتی ہے عفت؟ طبیعت خراب ہے؟“

”دفع کر گنت کو“۔ بھرنے دہی زبان میں کہا۔ ”وہ کیا سمجھے گی، وہ تو اسے سمجھانے بیٹھ جاتی ہے۔ میں تو آئندہ بھولے بھی اسے منہ نہ لگاؤں گی۔“

”زبانی؟ طاہرہ نے گفتمتہ سی بھنگی سے کہا۔ ”یوں نہیں میں چاہتی تھی کہ آپ میرا ہاتھ باتیں کی میں ارشد کو سمجھاؤں گا اور آپ عفت کو راہ راست پر لائیں گی۔ آپ نے توصیف جواب دے دیا ہے۔“

”یہ باتیں بعد میں کریں گے۔ بھرنے کو کہا۔ ”جس کام کے لیے بلایا ہے پہلے وہ کر آئیں۔“

پانی بولیں۔ طاہرہ نے بولیں۔ ”یہ کیا ہے؟“ میں نے لوکر کو کہا تھا وہ ہیں لے آئے۔

”اُمی اور بھابی؟“ میں نے کھلوا دیا تھا کہ میں اور آپ کمرے میں چاہتے ہیں گی۔

لوکر چلتے آئے اچھوت بھرا اور طاہرہ کے لیے تھی لیکن ارشد بھی دینا لگا اور لوکر کو تیسری بیالی لانے کو کہا۔ طاہرہ کو کچھ نہ کہا لیکن بھر کو لکھ کر فضا کے کمرے کو کھلا۔ اس نے بظاہر مذاق سے مگر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”جاؤ میرے بھائی! ام اُمی بھابی اور عفت کے ساتھ چاہتے ہیں۔ لیکن ارشد زمانہ اور مذاق مذاق میں ٹال گیا۔“

”غیب ہے تیخے انسان سو عورتوں میں بیٹھے شرم نہیں آتی۔“ بھرنے نے بڑی بہنوں کے پیار سے کہا۔

”پتی بیکر کے پاس...“ تم بھی ٹھنڈ دے لو آہا! ارشد نے لوکر کے ہاتھ سے پیالی لیتے ٹوٹے کہا۔ ”کچھ اس طاہرہ نے جو قوت بنایا ہے کچھ قدرت نے اور باقی جو کسر ہو گئی ہے وہ تم پوری کرو اور جو راوی رو دھپیں۔“

ارشد، بھرا اور طاہرہ ٹانگے پر سوار ہو کر آٹھ بھون سے نکلے تو ارشد کی اُمی اور بھابی نے انک بھوں پر چڑھائی پھر سر ہلاتے جیسے سی سانی بات پر غائب ہو گئی جو اس میں معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے تھے عفت نے لیٹے لیٹے کہنیوں کے سہارے اٹھ کھڑی ہو کر دیکھا اور اسے یوں لگا جیسے اس کی بیٹی میں ایک تیرہ سو ست ہو گیا ہو۔ وہ چند لمحوں کے اندر انہیں نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی پھر دھڑام سے بستر پر گر گئی۔

”کچھ دیکھنے جا رہے ہیں۔“ بھابی نے کہا۔

”اس اب مدد پر چکی۔ امی نے غصے میں کہا۔ ”یہ بھرا بھی مجھے ایسی دوسری نظر آتی ہے۔ کیا بے حیاؤں کی طرح ہاتھوں کے ہاتھ بنا رہے ہیں۔“ بھون سے باتیں کرتی ہے کج عفت، دیکھو ذہنت! امی نے تمکھانہ لہجے میں کہا۔ ”آج مردوں کو بھلا کر مادی واردات سنائیں گے۔ یہ آٹھویں دور ہے شری اس گھر میں نہیں چلے گی۔ یہ آٹھویں دور اور پھر حلال کے معلوم نہیں ہوتے ہیں تو کچھ بھی جی جلال آباد میں کبھی کبھار آ کر تھی۔“

”اس طاہرہ نے تو شکریا ہو گا کہ وہ مر گئی ہے۔“ بھابی بولی۔

”میں تو اس گھر کی کوکس رسی ہوں جب ارشد کو پیچھے رہنے کی اجازت دے دی اور ہم اوجھڑ گئے تھے۔ امی نے جلال آباد کے آخری دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے سوچا تھا کوئی بھلے ہاتھ لو لیاں ہوں گی جن کے لیے کدے ہیں ہمیں کہا معلوم تھا۔ ارشد پیچھے رہتا نہ ان کٹھنوں سے اس کے تعلقات... ہوتے۔“

امی اور بھابی نے فیصلہ کن حملے کی تیاریاں مکمل کر لیں اور اپنے طور پر طاہرہ کے لیے حلاوتی کی سزا کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت ہنگو راوی روٹے کے اس مقام پر جا کا تھا جہاں سے سڑک کے دونوں طرف پھلے آسمان تھے۔ بھرنے گھر نہا کر گزریوں کی دیوان آبادی شروع ہوئی تھی۔ وہ میزوں تاکنے سے اُترے اور ایک ایک کھینے کو بغیر دیکھتے ہوئے چلتے گئے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے پاکستان کے ہم پر فزبان ہوئے والوں کو رنج رات کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کرتے دیکھتے جا رہے تھے۔

دن دھلتا جا رہا تھا اور فٹ پاتھ پر بھرنے ہوئے بچے گل کے گڑو جن ہونے لگے تھے۔ نوجوان لڑکیاں جو جانے کتنے گھر پرے میں ہوں بھی رتی بھیں ٹھل کے دوکر دوپٹے سے بھی محرم تھیں جن کے پاس الکی دکی جا رہی تھی اسے وہ چھت کے طور پر استعمال کر رہے تھے شہر کے گھر گھر سے چلوں کے اور اس اجڑے ہوتے ہجوم کے سینوں سے آہٹاں کئے جڑیں

اُٹھ رہے تھے۔ ایک ایک جہتی جسے وہ آنسوؤں سے بھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

صبح غروب ہونے سے ذرا پہلے تین تانگے آشنا بھون کے سامنے رُکے، ان میں سے چھ آدمی اترا میں سے ارشد، بھمبر اور طاہرہ انڑے اور ان چھ آدمیوں کو سامنے لے کر کھٹی میں داخل ہوئے۔ ارشد انہیں اباجان کے گول کمرے میں لے گیا۔ اس کا بڑا بھائی بھی وہیں تھا، ان چھ آدمیوں کا حال عیسائی زندہ لاشوں سے ملتا جلتا تھا جنہیں کچھ ہوتے مکان کے طبقے سے نکالا گیا، ہر جھوک، افلاس، شب بیداری، سردی، ہجرت کی دہشت کے گہرے اثرات چہروں کو بھیاک بناتے ہوئے تھے۔ ہر جہت دوختے پن کے پاؤں میں جوتیاں تھیں۔ وہ بھی انہوں نے ٹھٹھکے ہوئے پاؤں کو فریب دینے کے لیے پن کھٹی تھیں اور زمان کا نہ پہننا زیادہ آرام دہ ہوتا۔ ان سب کو موصوں اور کڑیوں پر بٹایا گیا۔ ارشد کے اباجان اور بھائی نے ان سے زمیں سوال پوچھے۔ ان سب کی تان تقریباً ایک ہی جیسے فخریوں پرانی "دو نو جوان لڑکیاں اور تین بچے ساتھ میں حضور اصف ان کا ٹھکانہ بن جاتے، ہم تو بارہ فخریوں کے لیے سوچا گیا " میں لکڑی کا کام کرتا تھا۔ فرنیچر وغیرہ کا۔" ایک نے کہا۔

"میری تان کھٹیاں تھیں۔" دوسرے نے کہا۔  
"کپڑے کی دوکان تھی میری تو حضور۔" تیسرے نے کہا۔ "اگر بڑا ڈوڑھ ہزار روپیہ ہاتھ آجاتے تو میں کسی بڑے دوکان کر سکتا ہوں۔"

"میں نے پاکستان بننے سے تھوڑا عرصہ پہلے دوسو غریب کامرغی خانہ بنا دیا تھا، خاصی آمدنی تھی۔ جو تھوٹے " میں نے اس کا بار بار پرست سی نکاسی ہی دچی ہیں۔ یہاں بھی یہی کام لیا جاتے تو میں غریب شادی شدہ بہنوں کی زندگی کو غصہ " میری تو چھوٹی سی پان لکریٹ کی دوکان تھی۔ پانچویں نے کہا۔ "کلیئر بہت بڑا ہے۔ مرا کوئی بھی نہیں۔" جلے کٹے بھس میں کہا۔ "خود لڑکیاں اور تین چھوٹے چھوٹے لڑکے ہیں۔"

"میں امرسر میں ایک سٹکھ آڑھتی کے پاس فشی تھا۔" چھٹے نے کہا۔ "اگر تھوڑا سا سرمایہ مل جاتے تو کوئی دو لون دوکان چلا سکتا ہوں۔"

رات کا اندھیرا گہرا ہوا تھا جب ارشد کے اباجان نے انہیں اپنے دفتر کا پتہ اور وہاں پہنچنے کا وقت بتایا۔ نصف پوری آٹا کچھ پیو، نمک، مرچ، پیاز وغیرہ کو کھانے کے لیے روک رکھا تھا۔  
"طاہرہ ایک بات مانو گی؟" بھمبر نے کہا۔ "اللہ کی قسم بڑی امنگ سے بک رہی ہوں۔"

"کیا؟" طاہرہ نے پوچھا۔  
"میرے ساتھ تین بیوی ملی ہوئی اور باقی عمر میرے ساتھ گزار دو۔" بھمبر نے کہا۔ "یہاں اب ہمارے لیے ارشد اور عفت کا بیاد ہو گیا ہے۔ ہمارا دار و پیو بھی نیک کام میں صرف ہو جائے گا۔ چوتھیں اور تین میں اپنے استانی گھوڑا دوڑ گی۔ دونوں ہمیں کھٹی دیں گی۔ بڑی مزے سے کئے گی۔ تیری رقم فٹ کلاس شادی کروا دی گی۔ بالکل ہرے ساتھ مل چڑو گی۔"

اور نوکر کھانا لے کر آگیا۔

”آپ کب جا رہی ہیں؟“ طاہرہ نے غلاؤں میں تکتے ہوئے پوچھا۔  
”پرسوں!“

”پرسوں! — طاہرہ نے جیسے اپنے آپ سے کہا ہو۔

دوسری دیر کے لیے خاموشی چھا گئی، طاہرہ نے دکھ اور رنج سے بوجھل آواز میں کہا: ”آپ پرسوں کیا؟“  
ان چھ پناہ گزین کنوئیں کی جو ذمہ داری اپنے سر لی ہے اسے اپنے ہاتھوں پر راز رکھوں۔ میں گھر والوں کی روش بہت حالات بدتر ہو گئے تو اس آپ کو پہلے اطلاع دے دوں گی اور پینڈی پہنچ جاؤں گی۔ اس کے آنسو ٹپک ایک بار پھر رونے کی کوشش کی لیکن سینے سے غبار نے اٹھ کر حلق و دوح لیا۔  
نغمہ نے ٹھنڈی آہ لی اور کہا: ”یہ کچھ چھوڑتے ہیں اس قدر دکھ نہیں سہزادہ جیتے، طاہرہ! اہلکار گھر تو آئے گھر لائے لائے اپنے ہاتھوں آباد کروں گی۔“

”یہ بات نہیں آگیا! — طاہرہ نے آنسو پختے ہوئے کہا۔“ مجھے تو حلال آباد چھوڑ دینا دل پر ایک دو بھروسہ اور بھروسہ ہی جھٹک چکا تھا۔ مجھے دکھ اپنے کیے کا ہے میری نیکیاں ایک ایک ہیں۔ طاہرہ نے جو باتیں شروع کیں تو اس کا سینہ صاف ہونے لگا: ”آہ عفت! مجھے اپنی قربانی کے برابر ہونے انسو سے تو تیری بربادہ کا لاش! اور شہزادہ پناہ سکتی۔“ طاہرہ نے اپنے آپ سے بات کرنے کے انداز ایک موتی ٹپکی میں ملا دیا ہے۔۔۔ ایک موتی۔۔۔ اور اس کے آنسو پھر بہنے لگے۔

”اس موتی کو اب خدا کے سپرد کر دے طاہرہ! — نغمہ بولی: ”اور شہزادہ عفت کو تنہا چھوڑ دو۔“ اُس نے سوچ کر دہلی آواز میں کہا: ”یہ کچھ چھوڑتے ہیں ارشد کی نبیالی بھی عمر ہو گا۔“

طاہرہ کی آنکھیں معمول سے زیادہ کھل گئیں، وہ غلاؤں میں تکتے لگی۔ ہونٹ لرزنے لگی۔ اس کی ٹھیاں نے اس کی یہ تبدیلی اچھی طرح محسوس کی مگر میں سکوت چھانک گیا۔ طاہرہ نے پہلی کی سرعت سے سر کو زور دیا۔ وہیں سے جھجک کر سر نغمہ کی گود میں گزرا اور بچوں کی طرح رونے لگی۔ پھر فرش پر نغمہ کے سامنے دوڑاؤ بیٹھ گئی۔ پتلونوں کو ہاتھوں میں دو بچ کر دہلی ٹوٹی چیخ کے انداز میں کہا: ”آپا! مجھے ارشد سے بے پناہ محبت ہے۔ میر نہیں ہونے دوں گی! آپا! میری آپا! میں اور ارشد ایک دوسرے سے الگ رہنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے اس نے سر پھر نغمہ کی گود میں پھینک دیا۔

”اب کچھ پناہ بیکار ہے۔“ نغمہ نے پیار سے کہا۔ ”تم نے ارشد کو خود ہی قربان کیا ہے۔ اپنے آپ صرف عفت کی خاطر! — طاہرہ نے سر اٹھا کر جواب دیا: ”صرف عفت کی خاطر۔ اگر وہ ارشد کو میر سکتی تو بھلا میں فخر کوئی مگر میری محبت کو توڑے کر کٹ میں کھ گئی ہے عفت نے میری قربانی بھل کر اوائل دی سے مذبح الہی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر اوپر دیکھا اور بولی: ”تو ہی خیال رکھو میرے خدا تو نے ہر جگہ میری مدد ارشد کی جیتے۔“ آپا! یہ عفت اور ارشد کے دل میں قتل کر دینا میرے خدا!

کھانے کے بعد نغمہ نے شخصیت چاہی اور طاہرہ کے ساتھ طے کر لیا کہ طاہرہ ہفتے عشرے کے بعد راولپنڈی پہنچ جائے لیکن وہ گھر والوں کو اپنی منزل نہیں بتائے گی۔ یہ بھی طے ہوا کہ آٹا بھجوں کے حالات سدھر گئے اور غلامیاں کسی بے خبر کی کے بغیر دو گھنٹیں تو طاہرہ پینڈی نہیں جائے گی۔

ارشاد اس کے ابا اور ابا جانی آج رات پھر ان چھ غلامیوں کی آبادی کا پروگرام دہرانے لگے۔ ان کے پیشوں کے مطابق ناکے لیے وہ قحط نہیں اور اس پتلون بھی نظر رکھنے کا انتظام کیا گیا کہ یہ لوگ اتنے پیسے لے کر کوئی کام دھندا کیے بغیر ہی چپٹ لہجائیں۔ یہ ڈوٹی ارشد نے اپنے ذمے لے لی۔

نغمہ جلی جاتی اور طاہرہ کمرے میں بے چینی سے ٹپک رہی تھی اس نے سو جا عفت کے ساتھ صاف الفاظ میں بات کر باتے پھر خیال کیا۔ ”بے کار ہے۔“ جو اوجھے الفاظ وہ زبان سے نکال چکی تھی وہ تواب واپس ہونے سے رہے۔ اتنی بجائی کے ساتھ ڈاکر کیا جاتے؟ — لیکن بات کہاں سے شروع کروں گی؟ بات کہوں گی کیسے؟ — اس نے دماغ پر زور دیا حالانکہ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ ارشد کی محبت اس کے دل میں چور کی صورت اختیار کر گئی اور اس نے اپنے آپ کو ہر سمجھنا دینا کر دیکھی کے ساتھ کھل کر بات کرنے کا حوصلہ تھمہتا محسوس ہوا، اور یہ بھی کہ شاید اس میں اخلاقی جرأت بھی تھم ہو گئی ہے یہی محبت ایسا گھناؤنا جرم بن گیا کہ وہ گھر کی عورتوں کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگی۔

وہ مذبح الہی ہو گئی۔ اسے جلال آباد اور احوصلہ اور استقلال یاد آیا تو اسے یہ خیال بھی آیا کہ ان حالات کے لیے وہ اب احوصلہ مند ہے۔ پاکستان پر کوئی افادہ پڑی تواب بھی وہ مردوں کا مقابلہ کرے گی، جان اور مال قربان کر دے گی مگر عبادت الہی بانی کے اس ایک ہی دار نے اسے شہتہ اور بے بس کر دیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ عورتوں کی زبانوں کے دائرہ میں نہ سکے گی۔ مگر اس طرح چاہانی پر گڑی جیسے کوئی ترے ترے ہار کر جیسے ہم کو کوجوں کے سپرد کر دینا ہے۔

ارشاد کی اہلی اور بھائی عفت کے کمرے میں سر جوڑے منجی تھیں اور عفت بہت خوش تھی تینوں کمرے کے بند دروازے طاہرہ کے کمرے کی طرف گھور گھور دیکھ رہی تھیں۔

طاہرہ پرتلپڑی ہی تھی کہ نوکر نے آکر کہا: ”بڑے بابو جی بلا تے ہیں۔“ طاہرہ کو یوں لگا جیسے پھانسی کے قیدی بلائے گیا ہو۔

اُس نے ایک دو لمحے توقف کیا جیسے اس انتظار میں ہو کہ آبا جان کا بلاؤ افسوس ہو جاتے گا لیکن نوکر سامنے کھڑا تھا اور ازتے ہم کو نہ کھانسی لئی تو کمرے میں چلی گئی۔

”آپا! بھائی! — آبا جان نے اسے شکرا کر اپنے قریب بلایا۔ طاہرہ مجھوں کی طرح آگے بڑھی تو آبا جان نے اس پر ہاتھ پھیرا اور اپنے پاس صوفے پر بٹھالیا۔“ مجھے یقین نہیں آتا کہ تماری عمر کی لڑکی اس قدر شیار کے جذبے کی مالک ہے۔ آبا جان نے بڑگازہ مسکراہٹ سے کہا: ”ارشاد بتاتے تھے متعلق بہت کچھ بتا رہا ہے، لیکن ہمارے اس



لو کہ اس نے اپنے آپ کو قاتل کر لیا کہ اسے سب کا سامنا کرنا چاہیے، اور اگر اپنی صفائی میں کچھ کھینے کی ضرورت محسوس ہو تو دروازہ کی باتیں سن کر کچھ سوچا اور کچھ پرستے سے اس نے لباس لیا اور ایک جھکے سے اٹھ بیٹھی۔

بارہوی خانے میں گئے جہیز پہنچا؟ کسی تیار میں صرورت تھیں۔ بھابی امی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ انداز سے صاف پتہ چلتا تھا کہ کوئی گھر۔ بارہوی ہے۔ ظاہر ہے اسلام علیہ السلام کو بھابی چونک کر خاموش ہو گئی اور اس طرح بولے میں بھوکوں مارنے لگی جیسے چوری کرتے پڑی کئی تھی۔ اس نے دیکھے جن سے سلام کا جواب دیا اور وہی جگہ آؤ بیٹھی! بلکہ اسلام کا کیا کرتی تھی، آج صبح صرف خاموشی میں نہ رہی بلکہ اس کے بھائیوں سے بھرے ہوئے ماتھے پر دو بھریوں کا اضافہ ہو گیا۔ ظاہر کسی سلوک کی توقع تھی۔ وہ وہاں سے نکل آئی۔

”دھنت کے گھر سے یہی سی۔“ وہ بولی تھی جتنی ظاہر نے اسی سکرا جھٹ سے جو درستی مہربانوں پر لائی گئی تھی عفت کو سلام کیا لیکن عفت نے سلام کا جواب دینے کی بجائے کوٹ بدل لی اور اس کی طرف پیٹھ کر لی۔ ظاہر نے عفت کے چہرے پر ایک نمایاں تبدیلی دیکھی جس میں کسی حد تک غور اور فحش کی جھلک تھی۔ ظاہر وہاں سے بھی نکل آئی اور سفینا نے میں مل گئی۔ دھنو، غماز وغیرہ اس کا رومرو کا معمول تھا اور ہر گھنٹی وہ اس معمول کے مطابق سارا کام کر رہی تھی لیکن مشین کی طرح۔ اس کے جسم اور دماغ کا رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔

صبح کا اجالا نکلنے لگا۔ پیچھے باری باری جاگے اور گھر میں روزمرہ کی گنگھی شروع ہو گئی لیکن آج ظاہر کو لاڈلوں کا گنگھی سے الگ تھا۔ گنگھی جیسے کی تندہست اور جیتے جاگتے جسم کا ایک عضو کاٹ کر الگ رکھ دیا جاتے جسے مول گھر کے تمام افراد کھٹے ناشتے پر بیٹھے۔ اس خاندان کا پڑاوا دستور تھا کہ کھانا اور ناشتہ کھٹے میٹر کر رکھا جاتا تھا۔ یہ دستور اب روایتی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ ارشد کے ابا جان نے گھر میں کرکریٹ اور نظم و نسق برقرار رکھا تھا جیسا کہ وہ بھی کہ ارشد کا چاچا بھائی جان بچوں والا ہوتا ہے نہ پوتے بھی ماں باپ سے الگ نہیں بڑھا تھا۔ کھانے کے وقت زیادہ تر کھلی چٹلی اور پر مزاج باتیں ہوا کرتی تھیں۔

آج ناشتے پر بیٹھے ہوئے زیادہ تر افراد خاموشی سے ناشتہ کر رہے تھے۔ حوروں کی تکلیف دہ بلی بلی تھی جن مردوں نے جہات شروع کی تو وہ مردوں میں ہی ختم ہو گئی، ابا جان نے حوروں کی اس لاعلمی کو محسوس کیا لیکن ارشد کے بھائی نے کوئی قصہ شروع کر دیا تھا جس سے ان کی توجہ ادھر سے ہٹ گئی۔ یوں تو عفت ہر روز کچھ بھی کہتی تھی لیکن اس کی طبیعت کی خرابی ایسی وجہ تھی کہ کبھی اسے معذور سمجھ کر نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ امی اور بھابی بھی عفت کا روپ دھار کے میٹھی میٹھی اور صرف بھابی ہی تھیں۔ ناشتہ ختم ہوا تو مغل جو عمو اپنے کھیلے منتشر ہو گئی یوں بھگتی جیسے چند ایک امنی ہوئی میں سے نکل رہے ہوں۔ ارشد کے ابا جان کو کسی بے مزگی کی قوت آتی انہوں نے ارشد کی قی کو گھر سے میں بے جا کر ٹوچا۔ گھر میں کوئی خاص بات نہ ہوئی ہے اگرچہ ناشتے کے وقت نام کا منظر نہ بڑھا تھا۔

”جس گھر پر شیطان کا سایہ پڑ جاتے وہاں اس سے بھی بدتر حال ہوا کرتا ہے۔“ ماں نے کھڑا سا جواب دیا۔ ”آپ تو انہوں پر پٹی باندھے پھرتے ہیں۔“ اجڑے ہونوں کو بسانے کی ایسی فکر لگی تھی کہ اپنے گھر کے اچھڑنے کا کچھ خیال نہیں؟

”ابا جان! انھیں اور منہ حیرت سے کھلا ہوا آہستہ آہستہ کر رہی پر بیٹھ گئے اور کہا: بات صاف صاف کر رہی تھی۔“

تازہ جہاد نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے۔ کیا تم واقعی اپنا مقام روپیہ پناہ گزینیوں کے لیے صرف کرنا چاہتی ہو؟

”میکوں نہیں؟“ ظاہر کو حوصلہ عمو کر آیا۔

”مٹا ہوا بیٹا! ابا جان نے ظاہر کو پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اگلے جہان کو فضا تمہیں اور سارا یقین ہے مٹا نہیں اس قربانی کا صلہ اس دنیا میں بھی دے گا۔ مٹا رہے ایسا کرو کچھ کرسم نے دو ہزار روپیہ ہاتھ میں شامل کر دیا ہے۔ اس سے دو تین کپڑے اور کھانے لگ جاتیں گے۔“

ظاہر خوشی کے جھکے سے بل ہی گئی۔

”ڈیڈ ڈو گھنٹے انہوں نے ظاہر کو اپنے پاس بٹھائے رکھا اور مختلف موضوعوں پر باتیں سوچتی رہی ظاہر نے کے گئی تھی، اپنے گھر سے میں کوئی تول مسرت و شادمانی سے اچھل رہا تھا مگر تنگ سائیکہ خیال بگولے کی طرح سارا سکون اڑا لے گیا۔ اس نے سوچا یہ تو مردوں کے ساتھ بات نہ ہوئی ہے۔ ان کے کانوں تک ابھی عفت کی آواز سنائی دیتی تھی۔ لیکن..... وہ تو حوروں کا تکرار نہیں کی۔“

بھما سے یہ بتا گئی تھی کہ حوروں کو کیا سوچتے تھے ہیں۔ بکھرے خیال کے ساتھ ہی اسے راولپنڈی کا خیال آیا کہ اسے ”آشا بھون“ اور اس کے کمیزوں کو چھوڑنے کا خیال آیا اور ان خیالوں نے اس کو ظاہر کا یہ حال کر دیا جیسے وہ بچہ ہوا اور نیچے ہی نیچے جاری ہو۔

”نہیں! یہ غلط ہے۔“ اس نے اپنے آپ کو فریب دیا۔ ”اتی اور بھابی اتنی اچھی نہیں جو بلا سوچہ دھکا دیں گی۔“ آخر عفت کو بھی وہ جانتی ہیں۔

مردان رات چھر گھر کو گھر سے اس وقت اٹھے جب عورتیں سو چکی تھیں جو معاملہ انہوں نے ہاتھ کے ہر سہلو بہت سی سوچ اور فکر کی ضرورت تھی کہ کوئی قدم جلد بازی میں نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ ارشد ظاہر سے سامنے سے گزرا تو ظاہر کی بچی بچی ہوئی تھی۔ وہ ڈرنا سا کچھ اپنے گھر سے میں چلا گیا۔

رات گزر گئی۔ یہ صبح ہر صبح کی طرح روح افزا نہیں تھی۔ ظاہر کی اس کچھ معمول سے پہلے کھل گئی۔ پوچھت رہی دنیا میں دو جانے کمال گنگھی چھری رہی لیکن اس کچھ کھلتے ہی تیغ خیال کہ ”آشا بھون“ کے پیار سے پیار سے لے کیا تھا اور چھیکا رنگ بھر دیا ہے، اس کے ذہن میں اس طرح داخل ہوا جس طرح خالی بولن کا لاکر کھلتے ہو بولن میں داخل ہوتی ہے، اس کے جسم و جان کو کچھ تک نیند سے تازہ نہ ہو کر بیدار ہوتے تھے آج بیدار ہونا رات کے ساتھ ہی گم ہو گئی۔

اس نے اپنے وجود کے اندر سر سے پاؤں تک درد کی مٹی محسوس کی۔ یہ درد جہانی نہیں تھا، روح لہوا تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں مار کر جذبات سے نکل آئی اور اس نے سوچا کہ فرار ممکن نہیں۔ آخر کب تک۔ تمام تر جہانی اور

تو کچھ سمجھوں؟

”آپ کے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہے کہ کسی اور بات کی طرف بھی توجہ دے سکیں۔“ اسی نے خشکی سے انکار سے کہا۔

”خدا کے لیے طلب کی بات کرو۔“ اباجان نے غصے سے کہا۔ ”اے بہتار سے دل کی بات نہ کرنا۔ اباجان کا دل گمراہی پر پڑی ہندو متی تھی تو تم قادیانی نہیں تھیں۔ اگر بے پروا بن کر اٹھ کر آجائے گا۔ ہمارا گھر اجاڑا ہے۔۔۔ بات شروع کرنے سے پہلے یہ خیال رکھنا کہ اگر کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا سے کامیاب ہو جائے تو کیا کیا نہیں سنوں گا مجھے جو قصہ سننا ہے اس کے دونوں پہلو سننا۔“

”اٹھ اُڑنا ہے میرے بچے کا۔۔۔ ارشد کا۔“ اسی نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کون اجاڑا ہے؟“

”آپ کی حقیقی طاہرہ جس کی تعریفیں کرتے آپ تکھتے نہیں۔ دونوں پہلو سننے میں تو دونوں سناؤں گی؟“

اسی نے اس امید کے ساتھ کہانی کا آغاز کیا تو اباجان کے دل کو صدمہ مٹا۔ اس لیے نہیں کی طاہرہ کو مجرم بنایا جارہا تھا بلکہ کہ انہیں گھر کے افراد کے درمیان کسی بہت بڑی غلط فہمی پیدا ہو جانے کا شک جڑا۔ یہ ضرورت ان کے لیے بڑی ناگوار تھی کہ موقع تھا کہ اس سلجھ جوتے گھر میں جس کے نظام میں کبھی نہیں آتی تھی کوئی قیامت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ارشد کی اسی بات انہماک سے سننے لگی لیکن ایک مضمت بزرگ کے انکار سے، ان کا مزاج نہ بڑبڑا اور نہ ہی انہوں نے بڑھیا کی بات پر اپنے قابل ہوئے دیا۔

اسی نے وہ باتیں جو عفت نے بھائی کو سنائی تھیں اور بھائی نے اُسے سنائی تھیں، بزم کے ساتھ مختصر کی جو کہتی تھی اس کا بھی تفصیل ذکر کیا اور ایک آدھ جرم اس کے سر بھی تعویذ دیا۔ پھر وہ باتیں بھی سنائیں جو عفت سے اس نے تھیں۔ ارشد اور طاہرہ کے درپردہ تعلقات کو اس طرح بیان کیا جیسے وہ مٹی شاد ہو جاوے اور تعلقات کسی پہلو جاتا نہ ہوں۔ اُن نے اس سبب سنی سنائی باتوں میں زیب و اسان خصوصیت عفت کی، پھر عفت، طاہرہ اور بزم کے متعلق اپنی رائے دی اور حرف آخر سمجھتی تھی۔

آخر میں اس نے کہا۔۔۔ آج شام کا واقعہ ہی لے لیجئے۔ اُدھر سے بھڑائی، ادھر طاہرہ و تیار تھی۔ ارشد بھی وقت بڑھ گھنٹہ پہنچے۔ پھر نہ کسی سے پوچھا نہ بتایا اور نہ ہی عفت کی بات پوچھی اور دونوں لوگ ارشد کو اپنے ساتھ بچہ پر ادھر عفت بچہ کی کو دونوں پر ڈرے پڑے رہے جب تینوں واپس لوٹے تو ارشد کہ آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ اس کی طرح کھلا ہوا تھا اور اس طرح چکر زمین پر پاؤں نہیں دھرتا تھا۔ آپ کی آنکھوں میں دھول جمی تھیں کی خاطر پھر ساتھ لے آیا کہ یہ بے چارے بے گھر ہیں، ان کی مدد کرنی چاہیے۔

اباجان کے اعصاب جو قدرے کھج گئے تھے فوراً ہی اپنی جگہ پر آ گئے۔ انہیں تو اچھی طرح علم تھا کہ ارشد، بزم بچہ پر نہیں گئی تھیں اور بڑھیا نے بلا پوچھے بھالے فتویٰ دے دیا۔ انہیں شک ہوگا کہ اسی طرح اس کی باقی باتیں بھی۔

سکتی ہیں۔

”میں کس نے بتایا تھا کہ وہ بچہ پر گئے تھے؟۔“ اباجان نے نقل سے پوچھا۔

”میں بھی جھکا کسی کے بتانے پر پہنچتا؟۔“ بڑھیا نے تجربہ کارانہ لہجہ میں جواب دیا۔ ”ان کے چہلے اور ناز و انداز ہی بتا رہے تھے کہ۔۔۔“

”بہر حال تم نے پوچھا نہیں تھا کسی سے؟۔“ اباجان نے وکیلوں کی طرح جرح کے انماز سے پوچھا۔ ”یعنی ان میں میں سے کسی نے پوچھا نہیں تھا؟“

”میری بلا سے! میں کیوں پوچھوں؟۔“ اسی نے گردن کچیر کر یوں جواب دیا جیسے یہ سوال تو محض بیکار تھا۔ ”مجھے تو اپنے بچے کا دل کھاتے جا رہا ہے، اس کی زندگی تباہ ہو رہی ہے۔“

”سنو، ارشد کی ماں؟“ اباجان نے روماری اور دو راندیش کا مسافہ رو کر تے ہوئے کہا۔ ”ارشد، بزم اور طاہرہ ہماری بنائی ہوئی سیم کے تحت گئے تھے اب ان سچ سات مشنڈوں کی تلاش میں تھے جو واپسی کے وقت ان کے ساتھ تھے۔ ہماری سیم پر ہے۔۔۔ انہوں نے طاہرہ کی بڑبڑ اور مالی قربانی سے بات جو شروع کی تو بڑھیا اسی کے برہنہ کاجاب دیتے چلے گئے جس میں بزم اور طاہرہ کے اور لاکڑ غالب تھا۔ انہوں نے عفت کے متعلق بھی اپنی رائے دی اور کہل ”عفت کے شکوک اور الزام تراشی اس کی مدد و عزت کے پیش نظر نہیں لیکن میں سراسر غلط بہر حال میں ارشد سے اچھی طرح پوچھوں گا۔ مجھے یہ سارا قصہ محض غلط فہمی، بہتان اور بات کا بگڑا معلوم ہوتا ہے۔“

اباجان کے جا رہے تھے اور بڑھیا نے عین جوتی جا رہی تھی۔ اسے توقع تھی کہ ارشد کے اباجان بات سننے ہی بھوک اٹھیں گے لیکن ان کی فطرت میں بھوک سے اڑھانے والا بڑو باطل ہی نہیں تھا۔ ان کی عمر زیادہ اور تجربہ عمر کے لحاظ سے زیادہ تھا۔ انہوں نے بڑھیا سے کہا۔ ”تم صرف اتنا کہہ کر کہنا ابھی طاہرہ کو کچھ نہ کہنا میں یوسف کے ساتھ بھی بات کر لیتا ہوں۔ یہ معاملہ اب مردوں کے ہاتھ میں رہنے دو۔ اگر میں گھر میں کسی عورت کی زبان کے ذریعہ اس کی ناگوار گھڑن لیا تو اُفت لے آؤں گا۔ ارشد کا کچھ جس طرح نہیں ہے اسی طرح مجھے ہے لیکن بڑھیا لیا نہیں جسے کھی دل دماغ سے مل گیا جاسے۔ باقی رجب عفت کے ذریعے تو آئندہ جب اسے دورہ پڑے تو مجھے اطلاع کرنا میں دیکھ کر فائدہ نہ سوزہ کر دوں گا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی مرض میں مبتلا ہو گئی ہو لیکن عورتوں میں بیاد و محبت کا جذبہ اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ وہ خاندان کو اپنی ملکیت سمجھ کر اسے بھول کر اس طرح سے لگاتے لگاتے رہ جاتی ہیں۔ وہ برداشت نہیں کر سکتیں کہ خاندان کسی سے یا کوئی دوسری عورت، خواہ وہ خاندان کی سنی ہی لیکن نہ خود اس کے خاندان سے ہم کلام ہو۔ اس کے علاوہ سپٹ میں پتا مڑا بچہ اسے اپنی جگہ پر بیان کر رہا ہوگا۔ اس کا اثر بھی داغ اور اعصاب پر پڑتا ہے۔ ہم نے اس بات کو غلطی نہ کیا۔ سے دیکھا ہے لیکن بڑھیا خاصا مڑا جا ہے۔ اب خدا کے لیے دل کو بھل نہ ہوئے اور دوسری کارروائی کو برباد نہ کر دینا۔ جا بجا یوسف کو میرے پاس بھیج دو۔“

بڑھیا نے اگھر ہی ہوتی آہی اور بدل ٹوکا۔ آہستہ آہستہ کمر سے سے ٹکل گئی۔ وہ اس قدر بھوک کی ہوتی تھی کہ اس نے طاہرہ کے بات آٹھ ہزار روپے خریدت کر دینے کے ارادے کو نظر انداز کر دیا جلتی پرتیل تو اس چیز نے فلاں ارشد کے اباجان

نے سائل نے شدت کو ہی نہ سمجھا تھا۔

وہ بھائی کے کمرے میں داخل ہوئی تو یوسف کو بھائی کے سامنے گم سم بیٹھے پایا اور بھائی آگے چلکی ہوئی آگیا۔  
تصویر نہایت تھی۔ اس کمرے میں بھی وہی چوڑی جوتی تھی جو اباجان کے کمرے میں دکھائی جا چکی تھی۔

”یوسف! تجھے اباجان بلاتے ہیں۔“ اسی نے اٹھ کھڑے ہوئے لیجے میں کہا۔ ”اور سنا اپنے ابا کو بھی زار و مار  
گھر میں کیا لگ بھلائے جارہے ہیں۔ بڑھے کا مغز جواب دیتا جا رہا ہے۔“

یوسف غماشو سے کمرے میں سے نکل گیا۔ بھائی نے اس کے احساسات کو جھنجھوٹنے کی پوری کوشش کی تھی  
لیکن وہ نہیں بہت مددگار کامیاب تھی۔

نصرت گھنٹے بعد جب یوسف اباجان کے کمرے میں سے نکلا تو اس کے چہرے پر بیوی کے پیکار کردہ تاثرات اور ذہنی  
جانے کہاں لگوئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آگے بیٹھا اور بیوی کو ہار کر بیٹے کو سکون کی گہری اور طول سانس لی، پھر اسے غماشو  
اسی تم کی ہدایت دی جو اباجان نے اس کی ماں کو دی تھی۔ بھائی مان گئی۔ یوسف نے اباجان کی یہ ہدایت بھی بیوی کو دی۔  
تھے کہ اسی کا خیال رکھنا، اس کی زبان اس کے قابو میں نہیں رہتی۔

اباجان نے گھڑی بکچی، انہوں نے پھر یوسف کو ہار کر کہا۔ ”دفتر جانے میں ابھی ٹیڑھ گھٹکتا ہی ہے۔ ارشد سے آ  
کرو، امید ہے وہ تم سے کچھ چھپائے گا نہیں۔“

یوسف ارشد کے کمرے میں گیا۔

ظاہرہ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھی غمزدگی سے شب دروز میں الجھی ہوئی تھی۔ ذہن بھاگ کر ماضی میں پھنس گیا  
بہت دور پیچھے پہنچے۔ جو جانی تک کا ایک ایک لمحہ اس کے سامنے آ رہا تھا اور نہایت آہستگی سے گزرتا جا رہا تھا۔ اسے  
رات جیسے ماضی کی تمام رنگینیاں میں سرگم کے پچھلے موڑ پر گھڑی ہوں۔ اسی خانوں کے سانسوں کی آواز بھیجی تک اس کے  
تھی اور آج اس لذت میں آ رہا ہے۔ یہ بڑھو مانی لذت دے رہی تھی۔ غمیں سے بھاگتا ہوا ذہن ایسی ہی خوشگوار یادوں  
فوجیں لگاتے۔ ظاہرہ کو نہ تو تہ نہ آپ پاتا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے آپ کو بے آسرا اور آزاد محسوس کیا۔ ایسی بے  
نے ہندوستان سے ہجرت کے بعد ایک مغربین دریا کی لہروں میں بھی محسوس نہیں کی تھی مگر آج کے وقت نے اس پر ایسا اونچا  
کداس کے گھٹنیاں تک گئے۔

وہ غیر ارادی طور پر ہنسی اور سوٹ کس کھول کر اسی سادہ کی تصویر نکال لی۔ اس کی دوسری طرف لکھی ہوئی تحریر پر  
میں مرحوم باپ کے نقش و نگار آ رہے کرتے لگی۔ اس نے ایک نوروز مرد کا تصویر نکالا اور کچھ دیا اس تصویر سے بھلا م نہی آ  
اسی سادہ اور مرحوم باپ کو پہلو بہ پہلو کھڑے دیکھا، مسکراتے بھی دیکھا اور ظاہرہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس نے ذہن  
کو بھی مضبوطی سے پکڑا۔ مبادیہ حسین تصویر نکل جس کے سینے پر تصویر وہاں بن کر ذہن میں ہی اسطرح سیر سے خیالوں اور تصویر  
تخلیل ہو گیا۔

اس نے اسی سادہ کی تصویر کو ایک باہر دیکھا اور منگلا رہنے کے سامنے جا کر اپنی صورت دیکھی۔ پھر تصویر بھی اور اپنے

لہا لہل میں کہا۔ یہ تصویر ہی تصویر ہے۔ وہی ہال نقشہ، ہالوں کی بناوٹ، وہی مسکراہٹ، وہی ایک ایک نقش کس قدر  
ہے۔ میری اچھی اسی اس نے تصویر کو چوم کر دل کے ساتھ لگایا۔ پھر کھینچنے میں دیکھا۔ اس کے کس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے  
۔ مجھے اپنے پاس بلائے اسی آ۔ یہ ایک فریاد تھی جواہ کے ساتھ اس کے ہونٹوں سے پھسل گئی۔

آنسوؤں کے دھندلکے میں اسے خبر نہ لگا پھر اہم چہرہ اور اس کی مسکراہٹ دکھائی دی جس طرح اندھیرے کندھرات کے  
رہنے ہوئے روزن میں سے طلوع ہوتے سورج کی کرن آ رہی ہو۔ ”بھگت پاپا! میں تیرے پاس آ رہی ہوں۔“ وہ چونک اٹھی۔ پھر  
اس نے آنسوئی دلی دیکھی۔ دوسرے ہی ثانیے اس نے اپنی آواز کی کوچ بچپان لی، اور اس کے قصورات بھر گئے۔ اس نے  
بچپان کا ہاتھوں سے کمرے میں سر ہر دیکھا لیکن اس کمرے میں اب اسے حین اور سکون نظر نہیں آ رہا تھا۔

راندے میں اسے مردانہ قدموں کی آواز سنانی دی اور اس کے دروازے کے سامنے ارشد کے بڑے بھائی کی آواز آئی۔  
بہت جمالت اور بچپان کا مغناطیس ہے۔ کسی فکر کی کسی قسم کی جلد بازی کی ضرورت نہیں۔

ظاہرہ گئی۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دروازہ کھلا، بند پڑا اور اس کے سامنے ارشد کھڑا تھا۔ وہ دین بیکند نہیں  
اور ظاہرہ کو بھگتا۔ ایک نظر میں ہی اس نے پہچان لیا کہ ظاہرہ وہی ہے۔

ظاہرہ اسے دیکھتی رہی۔ اس نے ارشد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی تو فوراً جان گئی کہ یہ مسکراہٹ مستعار لی ہوئی ہے،  
بھگت کی روح کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ظاہرہ کو محسوس ہوا جیسے وہ چپ مار کر رو پڑے گی اور ارشد کے ساتھ پیٹ  
ہستے گی۔ اس نے شل داغ اور اندھاں جسم کی تنگی مافی قوت کو بروئے کار لا کر اپنے اوپر قابو پائے رکھا۔ ارشد کی مسکراہٹ  
رہنمایاں ہو گئی۔

دیر ہی پلکوں میں چمکتے ہوئے آنسو اے دوست! ارشد نے مسکراہٹ میں زندگی کی رتن ڈالتے ہوئے شاعرانہ لہجے  
کی ایک آواز بھرت کے سہارے تو نہیں۔

ارشد کو اطمینان ہو چکا تھا کہ جو فقر و غنت کی وجہ سے گھر میں پیدا ہو گیا ہے اس کا اثرا اباجان اور بھائی یوسف نے قبول  
لیا۔ اس پر وہ خوش تھا۔

”اؤس! ہو، ظاہرہ؟“ ارشد نے اس کے قریب جا کر آہستہ سے پوچھا۔ ”کوئی خاص بات؟“

ظاہرہ کے آنسو بے قابو ہو کر نکل آئے اور اس نے دلی سی چیخ کے لہجے میں کہا۔ ”مجھے جاؤ، ارشد! یہاں سے  
ماتے لیے چلے جاؤ۔“

لیکن ارشد نے اسے کندھوں سے تھام کر اپنے قریب کر لیا۔

”متر بیٹے سے ہی اداں ہو۔“ ارشد نے کہا۔ ”اور میں ایسی بات سنانے آ رہا ہوں جو تیریں اور اداں کر دے گی لیکن  
وہ اس کی گناہ سن رہی ہے۔“

اسید گلام جی سن کر ظاہرہ کا سراپی تان دھم ہونے لگا۔ اس نے ٹوڑ بانی ہوئی آنکھوں۔ ارشد کو دیکھا، ارشد نے اسے کندھوں  
پر پکڑ لیا۔ پھر چٹا یا خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ سانسوں کے نسل کو ایک لمبی سانس لے کر سنبھلنے لہوئے ارشد نے بات شروع  
کی۔

کی توجہ نہیں کر سکتا تھا۔ ارشد مگر سے نکلنے نکلنے گیا اور بلا توجہ دو چھ ہمارے دفتر میں آ رہے ہیں۔ امید ہے کہ انہی کے لیے مکانوں کا انتظام ہو جائے گا اور میں آج ہی تک سے سارا روپیہ نیکو کاروں میں تقسیم کر چکا ہوں۔ پرستار کو دینا اور وہ مگر سے نکل گیا۔

ارشد کے ابا جان اور بھائی جان باغیچے میں ٹہل رہے تھے۔ ارشد ان کے قریب پہنچا تو اس کا بھائی بات ختم کر کے اباجان اور بھائی جان باغیچے میں ٹہل رہے تھے۔ ارشد ان کے قریب پہنچا تو اس کا بھائی بات ختم کر کے اباجان اور بھائی جان باغیچے میں ٹہل رہے تھے۔ ارشد ان کے قریب پہنچا تو اس کا بھائی بات ختم کر کے اباجان اور بھائی جان باغیچے میں ٹہل رہے تھے۔

کی تو ظاہر ہو گئے کہ۔۔۔ بھگت بھگت سب کچھ سنا گئی ہے۔ مگر مجھے صرف وہ باتیں سناؤ جو تم کہتے ہو کہ اسی جان نے اباجان کی ہیں اور بھائی نے بھائی جان کو سنا ہی میں عفت نے جو کچھ کہا ہے وہ تو میں سن چکی ہوں؟

ارشد نے وہ ساری باتیں اسے سنائیں۔ پھر اباجان اور بھائی کا ٹھنڈا اور امید افزا رد عمل بھی سنایا جسے سن کر ان کی دھارس بندھ گئی۔

”یہ ہے تمہاری عفت؟“ ارشد نے ایسے لہجے میں کہا جس میں غصہ کم اور احتجاج زیادہ تھا۔ جس کے سن کر خوش فہمی بھی کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان بنتی جاتی ہے۔ اس اکیلی نے گھر میں دو گھر چھلایا دیا ہے جسے دور کرنا کتنا عرصہ لگے گا اس میں صلاحیت ہے ہی نہیں۔ مجھے یہ تو گمان بھی نہ تھا کہ اس کا رجحان اس قدر خطرناک اور زہریلا ہوگا۔

”یہ تو عفت کا معاملہ ہے جو مرد سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ظاہر ہے نہ مست خوردگی کے لہجے میں کہا۔۔۔ بھگت کیا کروں۔ اسی جان اور بھائی نے میرے ساتھ ایسی بے رحمی شروع کر دی ہے کہ صبح انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا کہ میں اس حال میں زندہ رہ سکوں گی؟“

”مردہ ہو گئی؟“ ارشد نے اس کو اخلاقی سارا دیتے ہوئے کہا۔ ”عورتوں کو ہم سنبھال لیں گے۔ میں نے کو اس بہت تنگدستی کا سارا پس منظر بتا دیا ہے جسے وہ سمجھ گئے ہیں۔ آج شام میں اباجان کو بھی تفصیلات سے گا گا اور بھائی کو بھی۔“

”عفت کے متعلق تم نے ساری باتیں تو سنیں بتا دیں؟“ ظاہر نے پوچھا۔ ”کیوں یہ تو نہیں بتا دیا کہ وہ اور کیا کرتی؟“

”ظاہر!۔۔۔ ارشد نے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔“ میں نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے قابلِ قیامت کر لیا ہے۔ سے سارا پردہ نہیں اٹھانا چاہتا۔ وہ نہ میں اس کی اصلیت بتانے ہی لگا تھا اور میں نے تمہاری اور اپنی محبت کو بھی رکھا ہے۔“

”پر تم نے اچھا کیا؟“ ظاہر اباحیان کا سانس لے کر بولی۔ ”تمہاری محبت چھپے نہ چھپے۔ یہ خیال بہ ضرورت کہ عفت کو ہم چھپاتے رکھیں۔ میں اپنا اصول اور ایمان برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ عفت کی طرح ہے اور یہ تمہاری طرح ہے اب بھی جانتی ہوں کہ عفت کی برتری میں فرق نہ آنے دوں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا ذہن بخیر کی دلہن لیا ہوا ارشد کی باتوں سے ظاہر ہو کے دل کو سما دیا اور اس نے جلتے ہوئے سینے میں سکون اور اطمینان کی ٹھنڈکی۔ اس نے راولپنڈی جانے کے خیال کو اٹھل دیا۔

”امی اور بھائی ہمارے ساتھ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گی۔۔۔ ارشد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ گارہ با تفصیلات سے پوچھ بھی نہیں، تو انہیں سب کچھ بتا دینا میں نے بھائی جان کو بتایا ہے۔ انہیں یہ بھی بتانا کہ ہماری باتیں ہم باہر گھر سے ہرگز نہ کہی گئی ہیں وہ کس سلسلے میں ہو رہی ہیں۔ میری اور اپنی وابستگی کا ذکر بے شک کر دینا بہت محنت کا نام نہ لیا۔ کہ تم مجھے عفت کے قریب لانا چاہتی تھیں اور میں اس سے دور ہٹنا جبار ہٹتا ہوں۔ میں نے بھائی جان سے کہہ دیا ہے کہ میں

دل اپنی رفتار سے کڑتا جا رہا تھا۔ ظاہر کے لیے یہ رفتار بہت مست تھی۔ ارشد نے اسے اطمینان تو بہت دے دیا تھا کہ وہ زبردستی کوئی کام نہ کرے گا۔ وہ اس کے سینے میں پرست ہو کر سارے جسم میں زہر پھیلا رہے تھے۔ ظاہر اس زہر کی کوئی توجہ نہ دے رہا تھا۔ لیکن یہ تیرا اباحیان میں واپس نہیں جاسکتے تھے۔ اسی اور بھائی کو مایات تو ہزاروں کی تھیں لیکن جن شک کے دلوں میں میوہ چکا تھا وہ کیونکر نکلتا؟ ظاہر کو یہ حقانیت پریشان کر رہے تھے۔ البتہ اس کی پریشانی میں اب فہمی نہ تھا مگر تھی۔

امی اور بھائی نے عفت کو بے ہمتا لیا۔ دے کر کہ وہ ہاتھ کا وہ ظاہر کو اس گھر سے نکلوا کر ہی دم لیں گی۔ یہ دونوں عفت بہت دیر تک عفت کے پاس بیٹھی رہی تھیں اور عفت نے خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے دونوں کا شکریہ ادا کیا تھا۔

مرد دفتر چلے گئے۔ عفتیں ادھر ادھر مصروف ہو گئیں۔ ظاہر نے اپنے آپ کو کھر سے میں بند کر لیا۔ عفت نے کی خاطر رات میں نکل لی۔ اس نے دیکھا کہ ظاہر کے کمرے کا دروازہ بند اور کھڑکیاں بھی بند ہیں۔ وہ نکلنے نکلنے سارے گھر میں گھوم لیکن اسے ظاہر کو نہیں نظر نہ آئی۔ وہ ظاہر کے پاس بیٹھنے کے لیے یاگ شپ کے لیے اسے تلاش نہیں کر رہی تھی بلکہ وہ ظاہر کا ذہن دیکھنا چاہتی تھی۔ ہر طرف گھوم پھر وہ گول گھر سے میں جا پہنچی جہاں امی اور بھائی بیٹھی سویرن رہی تھیں عفت کی طبیعت کی پھلکی تھی وہ ان کے پاس جا بیٹھی اور ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا جس میں ہمارے ہونے کا عنصر غالب تھا۔

امی اور بھائی جو مردوں کے ساتھ بات کرنے تک بھڑکی ہوئی تھیں اور مارے غصے کے ان کی زبانیں کانپ رہی تھیں۔

امی اور بھائی ہمارے ساتھ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گی۔۔۔ ارشد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ گارہ با تفصیلات سے پوچھ بھی نہیں، تو انہیں سب کچھ بتا دینا میں نے بھائی جان کو بتایا ہے۔ انہیں یہ بھی بتانا کہ ہماری باتیں ہم باہر گھر سے ہرگز نہ کہی گئی ہیں وہ کس سلسلے میں ہو رہی ہیں۔ میری اور اپنی وابستگی کا ذکر بے شک کر دینا بہت محنت کا نام نہ لیا۔ کہ تم مجھے عفت کے قریب لانا چاہتی تھیں اور میں اس سے دور ہٹنا جبار ہٹتا ہوں۔ میں نے بھائی جان سے کہہ دیا ہے کہ میں



والبتہ تھیں۔ تھک کر اسے طاہرہ یاد آئی۔

ظاہر جو ادا کی تو اسے یوں لگا جیسے ایک قندیل اس کی طرف بڑھتی آ رہی ہو۔ یہ تھا وہ موزوں پراس کی زندگی اور قندیل کی شمع میں۔ ایسے راستے پر چل رہی تھی جو سر پرشاداب وادی میں خاتمہ کرتا ہے۔ ماضی کا یہی عرصہ تھا جسے ہمارے اس کی تعلیم داری، شکست خوردہ شخصیت گھڑی دو گھنٹہ کی تصویروں سے دل پر مسلک تھی۔ محنت کو ظاہر کے گھر کی بنیادوں کے ساتھ گڑا رہا، ایک ایک لمحہ یاد آئے گا۔ اسے اسی خاتون یاد آئی۔ ظاہر کا مایہ ناز کپڑوں کا پہلا جوتا یاد آ رہا تھا۔

نہایا۔ وہ بچپن کی شیشیاں، وہ بچپن جو چوہہ بس کی عمر میں ظاہر کے گھر سے شہر پہنچا تھا۔

عفت کے تہنہ جوئے اعصاب نے ان حین یادوں سے لطیف سا قرا پیا اور وہ اپنے آپ سے بڑا  
ان یادوں میں ہل کھوئی جیسے خفید خفید بالوں کی گود میں فضا کی وسعتوں میں اڑ رہی ہو چہرہ اسے وہ گھر یاد آجا جب ارشد پہلا بار کہ  
انہی کی طرح اس کے سامنے آگھٹا۔

”اودھ! اودھ! جس ہی غفلت کو ارشاد کی وہ پہلی جھلک یاد آتی تو وہ یوں چونک اٹھی جیسے سوئے میک کی سونے کی چوڑیا۔  
یادیسے وہ سنا، خواب دیکھتے دیکھتے کسی دم اس کے سے جاگ اٹھی جو اس نے سوئے تھیں بیدار کیں جیسے قہر توں کو کلکوں کی گرفت کر لیں  
جہیز کی بیداری کے خواب بہاں میں گھل جہیز کی گتے تھے۔ اس نے خون کا گھر کو شہ چھان مارا مگر خون سبب زندہ مکان کی طرح غلام آباد  
”ارشاد اس روز بھی جہیز تھا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔“ وہ سن بھی مٹنی ہے۔“

اس روزِ اودا آج کے روز کے درمیان جہاں مغرب نشیں حالِ بگوشی تھیں وہ اسے غمزدہ آئیں، کلی اور آج کے درمیان ابے طاہرہ کھڑی نظر آئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے طاہرہ کی تلواریں اس کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیتے ہیں۔

اس کا دماغ سوچ سوچ کر تنگ کیا، اعصاب تو پیسے ہی درہ درہ تھے۔ اس نے نہ خال چوکر سرکسی کی ٹیڈر پر چبھ لیا۔ اس نے سوچنے سے گریز کرنا چاہا مگر ذہن ایک بار پھر جلال آباد جا بچھا ادا رہا۔ ایک بار پھر جلال آباد والی طاہرہ یاد آئی، اعصاب کا یہ عالم کہ اس کی روح بھی درہ درہ چاہنے آپ کو فریب دینے پر تہی ہوئی تھی۔ اسے پھر خیال آکا کہ وہ برس کی عمر میں جب ایک جوان ہوئی تھی۔ وہ بڑھی ہو چلی تھی۔ جوان ہوئے کی اسنگ تو اس میں تھی ہی نہیں۔ وہ تو بچنے سے ایک ہی پھلانگ میں عزت کی تھی، نہ اسنگ نہ ارمان، تنہا نہ خواہش۔ طاہرہ نے ایک معجزہ کر دکھایا کہ اسے... ”طاہرہ فتمتی اچھی جیٹ۔“ جانے کس نے اس کے کان میں کہا۔ ”فادہ سدا رہے تھیں روح کا سکون۔“ اسے یاد آیا کہ وہ کس طرح طاہرہ کے ٹن اکڑائی کی آؤتیش اور مجربہ منجول گئی تھی۔

اس مقام پر اگر اس کا ذہن گم گیا اور دنیاویوں کا کچر اس طرح ظاہر ہو کے گرد گھومتے لگا جس طرح کبوتر میں چھپی ہوئی شکاری کے پھیلے ہتھیلی کی بجائے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہو کے ساتھ اسے ارشاد کا خیال بھی آگیا اور اس نے سوچا کہ ارشاد اظہار کئے کھڑے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

”یہ سہارا بھی قریب ثابت ہوا۔ غفلت نے اپنے آپ کو پھر لے سہارا پایا۔ سچ کا خیال آیا تو وہ بھی ٹھٹھکتے سانس کے طرح گم ہو گئی۔ کچھ نہ جانتے ہی بھی کر دیا تھا۔ طاعن ارباب اس گھر میں نہیں رہ سکتے۔ جسے لڑکے اٹھا۔ ہر نہتہ عورت پر اس

148

لے۔ سرمہ کھیرانے لگا۔

”تو نے بہت بڑا کیا کارنامہ کرکے اس کو بلا سوچے سمجھے رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔“ کسی نے اس کی دنیا میں سے ہی اٹھ کر کہا۔

ظاہر کا نام اس کے تصور میں پایا غالب آیا کہ اس نے اپنے اوپر کسی مادہ کا اثر محسوس کیا۔ طبیعت بوجھل ہونے لگی۔ فنی کی کیفیت طاری ہونے لگی اور دل ایک آن جانے خوف کی گرفت میں آیا۔ آیا کہ اسے سنگنا مزین کے آئینہ میں اپنے عکس سے مجذوبانہ لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حالت اس پیمے کی سی ہو گئی جو اندھیرے میں اکیلارہ جاتے اور درونی قواؤں کی خیال سازیوں

اسے نکلنے کو آگے بڑھ رہی ہوں۔  
 ظاہر اپنے کمرے میں بیٹھی مینیجی انا گئی تو اٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔ وہ عفت کے کمرے کے دروازے کے سامنے تھے  
 لڑھکی تھی کہ اسے اندر سے کبھی سی جین کی آواز سنائی دی۔ اس نے عفت کی اس دبی گھنٹی جین کو پہچان لیا اور دروازہ کھول کر کمرے میں  
 آگئی۔ کچھ عفت اور وہ منہ پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کی پیڈرپوں کے کچھارے تھے جسے وہ پہچان لے لے کر درہری ہو جاہو ظاہر نے  
 اپنے جسم پر کہ دروازہ بند کیا تو کوہاد کے دھماکے سے عفت چونک اٹھی۔ لیٹھ لیٹھ اس نے سر اٹھایا اور کھوم کر دروازے کی  
 طرف دیکھا۔

ظاہر ہو کہ وہ اپنے استاد کا پیروکار ہے۔ اس کی آنکھیں جو ایک لمحہ پہلے اس کو ہر باطنی تپیل خشک ہو گئیں، اب آنکھیں حیرت اور خوف سے کھلتی ہیں۔ ہونٹ کچھ کھینٹنے کو اپنے نشانے لگے۔ ظاہر وہیں ٹھہری اسے کچھ تو سی رحمت نے بازو لہک کر کھٹکھٹا کر طرف انگلی کا اشارہ کیا لیکن کانپتے جوتے ہونٹ کچھ کر کے نہ ظاہر کو کوئی باطنی کچھ کی عفت کو دور سا پڑتا ہے۔ اس نے اسے جہانگیر کے متبرے کا حال سنا تھا۔ ظاہر کو ایسی صورت حال سے کبھی بالائے شانہ اور کبھی سوچ ہی نہ تھی کہ کیا کیا کرے۔

”تم؟“ عقبت نے بازو لہا کر کے طاہرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

”عفت! اے طاہرہ نہایت ہی سچی ہے۔“ عفت ایں تھاماری آواز سن کر اندر آئی ہوں۔ یہ تکلیف ہے کچھ؟

عفت کا باراجو ابھی تک ظاہر کی طرف بڑھنا تھا کہ ٹی ٹی ٹی کی طرح اس کے پہلو میں گڑھا اور اس کے نیم واہوٹ مندر گئے۔ ظاہر بولے کہ تو اس ٹی ٹی ٹی کو سر دالیں ..... عفت ا

معفت اسے پہنچتی معنی نظروں سے دیکھتی رہی ہونٹوں پر پھر کوئی بات آتی جو سینے میں نوٹ گئی۔ اس کے چہرے کی حالت دیکھتے ہوئے عامر نے اس کی اندرونی حالت کا اندازہ کر لیا۔ اس کی خناسی حالت بلاشبک دشمن پر غم مملو تھی۔

”عفت! آئی شمشیر چھپی نہیں ہوئی۔ ظاہر ہونے لگا۔ میں نے کہ تھا اپنی بہن کا سر وادوں؟ .... بولو عفت! مشن آ کر کہ ظاہر ہوتے آتے کنبھال سکتی، اگر اگر یہ سمجھ سکتی ک عفت اس رعلد آور ہو رہی ہے، شکست کا

اس کے سامنے گر پڑی ہے، عفت ایک ہی جست میں طاہرہ کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی اور طاہرہ کو اپنے بازوؤں میں دوپٹے کی طرح لپیٹ کر اپنے گھر لے گئی تھی۔

۱۴۹



یہ کڑی تھی۔ اباجان نے دوری سے کہا۔ ”وہ ظاہر ہوئی! خدا نے تمہاری تکلیف قبول کر لی ہے۔ آج ہی ان لوگوں کو مکان لاٹ  
برگئے ہیں۔ ارشد اور نوصت انہیں مکان دکھانے اور قبضہ دلانے کے لیے ساتھ لے گئے ہیں۔ اور اباجان ظاہرہ کا  
جواب سننے بغیر اٹھ چلے گئے۔ ظاہرہ نے سکون آمیز آواز لی۔

ارشاد اور اس کا بھائی رات ساڑھے آٹھ بجے واپس آئے۔ گھر کے افراد کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ آتے ہی  
اطمان کیا۔ سب انہیں ٹھکانے لگا کے آتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد دونوں بھائی منہ دھو کر کپڑے بدل کر کھانے کے لیے سب کے ساتھ شامل ہو گئے۔ کھانے  
پورے ناشتے کے وقت کی طرح خاموش تھیں۔ مردوں نے اس خاموشی کو محسوس کیا لیکن ان کے پاس ان چھپناہ کرینوں کی

آواز کا مومنہ تھا۔ وہ سی پر باتیں کر رہے تھے۔ اباجان دو اندیش اور بڑبڑا رہے تھے۔ انہوں نے اس مومنہ پر چند  
باتیں ارشد کی ماں سے مخاطب ہو کر کہیں اور اس طرح اسے باتوں میں لگا لیا۔ اسی طرح بھائی کو بھی کنگریاں کسبیت لیا گیا۔ ارشد کے  
بھائی نے عفت کو بھی ساتھ ملانے کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار بی جوتی کے سوا کچھ نہ بولی۔ ظاہرہ نے اس مومنہ میں خوب  
دلچسپی لی۔ وہ گھر میں پہلی بی جوتی بے مزگی کو جیسے بھول ہی گئی تھی۔ ارشد کا بھی یہی حال تھا۔ اس حال میں عفت کا احساس کمتری  
اور زیادہ گرا گیا۔

کھانے کے بعد ارشد اور اباجان علیحدہ کمرے میں چلے گئے۔ بھائی اور اس کا خاوند اپنے کمرے میں۔ ایک بچہ عفت  
کے ساتھ اس کے کمرے میں جا کھانا باقی دو ظاہرہ کو کمانا کا وعدہ یاد دلوا کر اسے اس کے کمرے میں ٹھیک کر لے گئے۔ ارشد  
کی ماں کو رکے کے ساتھ باورچی خانے میں جا پہنچی۔

”مجھے بھی کچھ سناؤ۔ ارشد میاں! گھر میں عورتوں نے کیا آدم چار کھا ہے۔“ اباجان نے ارشد کو اپنے کمرے میں لے  
جا کر پوچھا۔

ارشاد سی سوال کا منتظر اور جواب کے لیے تیار تھا۔ اس نے اباجان کے ساتھ کبھی بے تکلفی سے بات نہیں کی تھی۔ پہلا  
واقعہ تھا کہ ان کے درمیان ایسا موضوع اٹھا جس پر کھل کر بات چیت صرف بھولیوں سے ہی ہو سکتی ہے لیکن مومنہ میں جو نظرات  
بہاں تھے ان کا تھا تھا کھلا بھجک بات کی جانتے۔ ارشد کے کردار میں اخلاقی جرات تو تھی ہی۔ اس نے بلا تکلف وارادت  
ہلک ایک شوشنا شروع کر دیا۔ البتہ وہ عفت کی اصل حیثیت اور ظاہرہ اور اپنی محبت کو چھپا گیا۔ اس نے بیان تک نہ بڑا کہ  
عفت عورت اور محض عورت ہے۔ ظاہرہ پرست عورت۔ اس کی فطرت میں انسانیت کی بلندی بند ہے۔ وہ الگ تھک  
بلو کر ڈھنے کی عادی ہے۔ اس کے برعکس ظاہرہ کی فطرت پاک ہے۔ ارشد اس کی روحانی دنیا سے قدرتی ہے کہ اس میں لڑکان  
اور لڑکان کا دکھ اور درد جاتا ہے۔ ارشد نے اعزاز کیا کہ وہ عفت کو چھوڑ کر کئی با ظاہرہ کے کمرے میں گیا ہے اور اس وقت  
یہ لگتا ہے جب کہ اسے عفت کے پاس ہونا چاہیے تھا۔

”ہوں! اباجان نے ساری بات سن کر کچھ اذعان میں نہیں کی اور گری سوچ میں کھو گئے۔“

”میں نے بہت کوشش کی ہے کہ عفت کو اپنی راہ پر لا سکوں۔“ ارشد نے کہا۔ ”لیکن اس کی فطرت کے۔۔۔“

ظاہرہ نے اپنے آپ کو جلد ہی سنبھال لیا اور اپنے بازو عفت کی گرفت سے آزاد کر کے اس کے چہرے کو قہر کر  
انہیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ رقت کا عالم کہ ظاہرہ کی وجہ عفت کی گہائی ہی سبب ہو گئی تھی۔ آستوں نے آگے آگے  
عفت کا چہرہ دھندلایا تھا۔ ظاہرہ نے انہیں بند کر کے کہیں کو آٹھوڑ گئے۔ اور اسے عفت کا لالہ انکارہ سا چہرہ صاف  
دکھائی دینے لگا۔ ایک دوسرے کے کس قدر قریب تھیں لیکن ایک مرد نے درمیان میں آکر دونوں کو کہاں سے کہاں چبک  
دیا تھا۔ ظاہرہ الگ اور عفت الگ ہو گئی تھی اور اعصاب زدگی اور نفسیاتی خلفشار نے عفت کے کبھی دوسرے کر دیتے تھے۔ ار  
کی شخصیت دو حصوں میں کٹ چکی تھی۔ اس وقت اس کی شخصیت غالب تھی جو ظاہرہ پر کھیل رہی تھی، محبوب اور خدا اور کچھ بھی تھی  
”میری ابھی ظاہرہ۔ عفت نے روندھی ہوئی آواز میں کہا۔ کہاں تھیں تم؟ بھول گئی تھیں اپنی بہن کو؟  
رقت نے ظاہرہ کو بولنے نہ دیا۔

”جلی تو نہ جاو گی ظاہرہ؟ عفت کی لرزتی ہوئی آواز نے پوچھا۔

ظاہرہ نے نفی میں سر ہلایا اور جانے کہاں سے مسکراہٹ کی ایک کرن اس کے ہونٹوں پر لگی۔

”مجھے صاف کر دو گی، ظاہرہ؟

ظاہرہ نے سر ہلایا اور مسکراہٹ چمک اٹھی۔

”ناراض تو نہیں ہو، ظاہرہ؟

ظاہرہ نے عفت کو بازوؤں کے گھیرے میں لے کر زور سے بھینچا اور رخسار اس کے رخسار کے ساتھ لگا کر آہستہ  
رگڑنے لگی۔ اس کے نالوں میں سرگوشی سرسرنے لگی۔ میری پیاری بہن! مجھے اندھیرے میں چمکنے کے لیے درجہ بڑھا جاتا۔  
ظاہرہ نے اسے پتک پڑا دیا اور اس کا ہاتھ سہلانے میں لگی۔ عفت نے انہیں بند کر دیں اور دو چار منٹ بعد  
کا سر ایک طرف ڈھک گیا۔ ظاہرہ نے اس کے اوپر ڈرا سا جھک کر اسے آواز دی۔ ”عفت! ظاہرہ نے زیر لب کہ  
”عفت! سو گئی؟“

عفت ہو گئی تھی۔ ظاہرہ کمرے سے نکلی اور آہستہ سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ساتھ لے ہو گئے تھے۔ اباجان حسب مقررہ دفتر سے ٹوٹے لیکن ارشد اور اس کا بھائی ساتھ نہیں تھے ظاہرہ اور

ایسے ہیں جو میری فطرت پر رے نہیں کر سکتی۔

متو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم عفت سے الٹا گئے ہو؟ — ابا جان نے پوچھا — "تم کہیں اس سے علیحدہ نہ کیا؟"

جنہیں بالکل نہیں! — ارشد نے پر زور لہجے میں جواب دیا — آہا جان! اس کا صحیح حل تو سی ٹی ٹی تھا لیکن میں نے اسے وعدہ کر کے منہم راہ کر رکھا ہے کہ غنٹ کو راہ راست پر لایں گے میں کچھ کی پیدائش کا انتظار کر رہا ہوں۔ کچھ زور دے کہ غنٹ کی محبت کچھ کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ اس کے کہ راہیں جو جبریت پیدا ہو گیا ہے، کچھ کو پا کر مزید بھگوان ہو جائے گا! اس طرح میں غنٹ کی اس قدر شہید گرفت سے آزاد ہو جاؤں گا چیز اتنے آہستہ آہستہ سمجھ لیں لوں گا کہ وقت تو وہ بھی جانتا ہے کہ میں کسی دوسرے کے ساتھ خصوصاً ظاہر کے ساتھ بات تک نہ کر دوں!

”اگر اس کا دماغ ساتھ دیتا تو شاید میں بھی اسے سمجھا سکتا۔“ اب جان نے کہا۔ ”لیکن معلوم ہوا ہے کہ اس پر اصرار کے فورے پر نہ لگے ہیں۔ اس حال میں چند نصیحتیں عرض کر لے گا۔ یہ جارحانہ اقدام نہیں جاتا ہے اور مرض اپنے دفاع کرتا ہے۔ مجھے دوسرے اسے ہتھیار نہ ہو گیا جو۔ حیوانات کا بال اور قدامت اس سے دُور رہنا۔ یہ وجوہات اکثر ہتھیار کا ہوتے ہیں۔ امید کنی پائتے ہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد وہ بچے میں مگن ہو کر اپنا آپ بھجال لے گی اور قریب اس کے ساتھ کر دو کہ اسے یہ تسلی رہے کہ تم اس سے دل برداشتہ نہیں ہو جانا تم اس کے مرض کا تعلق ہے جس کی کمی اچھے لوگوں کے کہ کوئی کام نہ ہو تو نفسیاتی افسوس معلوم ہوتی ہے۔ اس میں سب سے برا ظہور ہے کہ کچھ بچے کیس میں کام کا ذہنی غفلت لے کر یہ تم غفلت کے لیے نہیں تو ہوسے والے بچے کی خاطر ہی غفلت میں دل چسپی اور اس کی یہ ذہنی حالت درست کر دینا، توقف کے بعد لوے میں سمجھ نہیں سکتا تھے یہ غلط انتخاب کیوں کیا تھا۔ دونوں لادکیوں کے درمیان اس قدر علم و فہم ہوسے تھے کہ غلطی کی۔“

”نہیں! باباجان! اے ارشدِ خداوندِ خود اعتمادی سے جواب دیا۔ شادی سے پہلے یہ فرقی کبھی اشارہ بھی ظاہر نہ کیا۔ آباد اور لاہور میں شادی کے دن تک عفت آج کے عفت سے بالکل مختلف رہی۔ میرا انتخاب نہ تھا۔ ظاہر و شادی کے بائیں تھی۔ آپ نے اسے دیکھ لیا ہے کہ وہ شادی سے کہیں زیادہ اہم مسائل کو سننے میں آگاہ ہے پھر بتی ہے میں خود اولوالعزم لڑکی کو یہی بنا کر طرزِ زندگی میں قید نہیں کر لیتا چاہتا تھا میں قوتوں کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ظاہر و شادی شہرِ ہوا یہ بچہ آج ملے ہوئے مہاجر خاندانِ سرنگوں کے کنارے سرور میں الوداع کر رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں عفت آج ہی ملنے نہیں سکتی لیکن وہ اتنی بہت خیال بھی نہیں جس جس کے مظاہرے وہ آج کر رہی ہے، اچھی خاصی سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔“

”پست خانی کی بھی مدد ہے بھی! اے باباجان! نے سمجھ دیا کہ اب سے کہا۔ میں اس قدر بہتان ظاہر و خلاف تو ماننے سے رہا۔“

”اباجان!“ — ارشد نے اباجان سے حوصلہ لیتے ہوئے کہا — ”طاسرہ بھی وہ جو مجھے کتنے کتنے گھنٹے مارے۔“

اے اسے اپنا دل ایسے بھی کسی وقت جب ظاہر میرے ساتھ عقدت کے ہی متعلق باتیں کر رہی تھی تو محفقت نے اور بات بھائی نے بھی میرے اور ظاہر کے دوچار فقرے سن لیے اور انہیں موضوع سے اور پوری بات سے الگ کر کے اپنا تجربہ کیا کہ ظاہر جیسی لڑکی کو وہاں اور بیڑن اور نہ جانے کیا کیا بنا دیا۔ پھر ان دونوں نے اسی جان کو بھی ساتھ لیا دیا۔ انہیں یہ اقبال کیا۔ اب ظاہر کو یہ حال ہے کہ اس میں وہ خوشی رہی جی نہیں ۛ

”اسے کس طرح پتہ چلا ہے کہ اس کے خلاف ہستان تراشی ہو رہی ہے؟“ — اباجان نے غصہ بھری سنجیدگی سے جواب دیا: ”میں نے عورتوں سے کہہ دیا تھا کہ منہ بند رکھیں۔“

”اسے مجھ پر تباہی ہے۔“ ارشد نے جواب دیا۔ ”عفت نے یہی باتیں پہلے مجھ سے کی تھیں۔ پھر اُمی اور بھابی کو سنائیں۔“

اگر وہ مجھ کی جوتی بھی... اہی جان اور بھابی نے اس کے ساتھ مجھ کی کس کوئی بھی نہ کی صرف اس لیے کہ اس نے طاہرہ کی وکالت کی ہے۔

”میں نے یوسف سے کہہ دیا ہے کہ وہ زینت کا منہ بند رکھے اور اسے صحیح بات سے آگاہ کر دے۔ اب جان لے کہ کیا تم میرے لیے کیا۔“ (تیسری اکی کو پہلے بھی سچا کچھابوں۔ پھر سمجھا دیا گا۔ امید تو ہے فضا صاف ہو جائے گی لیکن اب خود غور ہے۔) عورت اپنی کیا علاج کیا جائے؟ انہیں تو سنسنی خیز بات سے پیار ہو جائے۔ طاہرہ کو کم تسلی نشئی دیتے رہنا اور سب سے نکلنے نہنت کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کی نفسیات کی الجھنوں کو صرف فم ٹلجیائے گا۔ سوہن میں ڈاکٹر سے بات کیوں کا سا۔ جو تونڈا کر کو تم ہی بتا سکو گے۔ اس کا علاج جلدی شروع ہو جانا چاہیے۔

میں اس کی طرف پوری توجہ دینے کی کوشش کروں گا، آبا جانا؛ ارشد نے وعدہ کیا اور کہا: آپ مطمئن رہیں گے لیکن  
 لیے ایسی اتنی اور جہاں کا اعتراف میری بند بزرگیں بلکہ ان کے دل صاف کریں ورنہ ظاہر ہو کہ شیوخان اور دولہا تم جو جاسے گا:

”اس کا تم فکر کرو مریاں!“ — ابا جان نے کہا — ”یہ کلامِ مہاسبہ میں نئے نہیں کویا بات دی ہیں تم ان پریل کو لو  
 ہرگز کے ساتھ جے تھکنی سے اُٹھو پھرو اور اسے تسلی بخشی دیتے رہو۔ ایسی نون لڑکی کو پرگاندگی سے پاک رکھنا ہے، یہ چرچہ  
 ہوتے ہیں۔ ظاہر ہو گا کہ آل بھی کیا نہیں کر سکتا۔ وہ میری بی بی ہے اور دُعا بھی نہیں ہے۔ اپنے دلوں کو صاف رکھو جاؤ... تم سب  
 بڑے بڑے جلدی سو جانا اور سُناؤ... سیدے عفت کے کمرے میں جاؤ اور دین سونا بہنا ظلم ہے کہ تم الگ کمرے میں سو  
 راز اور لڑکیوں کی تعلیم کر گیا حال ہے؟

”ماستہ باقا عدد کی سے آرا ہے“

ارشادِ عفت کے کمرے میں داخل ہوا۔ عفت نے ارشد کو دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے ارشد اور وہ کہیں راستے میں ملتے تھے۔ خامی دراکھنے چلے، ایک دور اسے عظیمہ پرستہ گئے اور آج بھر اتفاق سے مل گئے ہیں۔ اگلے دور اسے پرائی اہلک جانے کے لیے۔ عفت کو خواب کا حلوہ سہرا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ ارشد کا استقبال کمرے کو کیونچرا استقبال کر کے جائے کیوں آیا ہے۔ شاید وہ کیو حیت میں اسے جھاننے کے لیے ہے۔ عفت کو طین اس سب کو کہلو اسی ہانے

ارشاد کیا ہے۔ کالی ہی دے گا۔ مخاطب تو بوجہ شادی ہی جان اور بھائی نے اسے سمجھا ہوا اور وہ راہ پر آگیا جو عفت کا راہ سے اچھلنے لگا۔ اس خیال نے اسے حوصلہ دیا صرف وہی سیکڑا گزرے ہوں گے کہ عفت نے یہ سب کچھ سوچا لیا اور سے کہا۔ آئیے نا اچھلنے دو اور اسے میں سرزدی نہیں ملے گی؟

”نہا تھا میرا جوہر! — ارشد نے دروازہ بند کر کے جوئے کہا اور آگے بڑھ کر عفت کے پاس بیگ بڑھ گیا۔

”آپ آگے ہیں تو میں پیار بھی نہیں رہی“ عفت نے قدرے بے تعلقی سے کہا۔ ”انہوں آپ سہری بہا

نہیں سمجھ سکے“

ان سات خب دروز میں ارشد طاہرہ کے ٹورے میں مہماندار اور کھل کر باتیں ہوتی رہیں۔ ہر موضوع پر اور ہر کسی کے متعلق اپنے متعلق میں اپنی محبت کے متعلق بھیجی۔

انہی اور بھائی کو اباحان اور نوسف نے قابل کو کیا تھا کہ عفت کی باتیں غلط فہمی کی پیداوار اور بہتان تراشی میں اور یہ لفظی معاملہ ہے۔ دونوں عورتوں نے طاہرہ کے ساتھ برتاؤ میں بغاوت بھی تبدیلی پیدا کر لی تھی۔ مردوں نے ایک حکم کے مطابق ہل سے یہ کھچاؤ ڈور کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اسی سلسلے میں ایک روز فورا خانہ خندان کپ بابک پر گیا ہر رات کھانے کے برتنوں سے زیادہ دیگر گپ شپ اور ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ عفت کو باتوں میں اس کی بنائی ہوئی دنیا سے گھٹنے کی کوشش کی گئی کہ وہ کچھ کے طور پر اپنے غلوں میں ہی گھس گئی البتہ ان سات دنوں میں اسے دورہ نہ پڑا بعض اوقات تنہائی میں وہ دوتی دیتی اور بعض اوقات آنے میں اپنے عکس میں محسوس ہوتی تھی۔

اس میں یہ تبدیلی بھی آئی کہ وہ اپنی افراتفری اور کچھ نہ سننے سے گھر کر وہ ٹھانے حضور رو کر دعائیں مانگنے لگی طاہرہ اول ہی دل میں کوسہی رہی۔ اس سے گھبراتی رہی اور جب طاہرہ اس کے سامنے آتی تو عفت نے ہزار کوشش کی کہ اس بات پر نہ کرے لیکن اس کے سامنے مسخور ہوجاتی رہی اور اس کی اپنی جتنی کی یہ آکا دلب نہ سکی۔ طاہرہ کے بغیر ہر کسی کوئی عفت کی شخصیت کو وصول میں تو بہت ہی کمپنی تھی۔ اب دونوں جیسے ایک دوسرے کے ساتھ شدت سے مل رہے تھے۔

طاہرہ کی صبح جو طبیعت نے جب پرانگندہ فضا کو صاف ہوتے دیکھا تو اس نے اس کے مکمل طور پر صاف ہونے کا اندازہ کیا۔ کالی ہی جیٹس، انہی اور بھائی کے رویے میں جو تبدیلیاں ابھی باقی تھیں، طاہرہ نے اسے نظر انداز کر دیا اور پہلے کی طرح باہر نکل لی گئی جیسے کچھ مجبوراً ہی نہیں تھا عفت کے پاس وہ جب بھی جاتی اسے اس کی افسانہ پچی کیوں سے بحال ہی لیتی ہیں وہ محسوس نہ کر سکی کہ وہ اسے مزید پیچیدگیوں میں ڈال آتی ہے۔ طاہرہ نے ماحول کے ساتھ سمجھ کر دیکھا لیکن کبھی کبھی انہیں محسوس کرتی تھی جیسے ایک کشش ہی باقی ہے۔ اس نے اس غلط فہمی کو بھی قبول کر لیا تھا۔

آٹھویں دن طاہرہ کو کچھ کا خط ملا جس میں اس نے طاہرہ کو راولپنڈی آئے پر قابل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ اسے تیار کر کے گھر کے حالات سدھر گئے ہوں لیکن جو چنگاری سلگ چکی ہے وہ بجھ نہ سکے گی جس گھر کو کم پناہ بنا رہی ہو کہ وہی دن دونوں زندہ رہ جائے تم نے اپنے آپ کو اس گھر کے ساتھ جھپٹائی یا بنا دیوں میں جکڑ دیں۔ اب وہ بچوں کی آواز میں نے تیار سے بھائی جان (اپنے خاوند) سے تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ وہ بڑے دل سے نہیں اپنے گھر میں رکھنے

ارشاد کیا ہے۔ کالی ہی دے گا۔ مخاطب تو بوجہ شادی ہی جان اور بھائی نے اسے سمجھا ہوا اور وہ راہ پر آگیا جو عفت کا راہ سے اچھلنے لگا۔ اس خیال نے اسے حوصلہ دیا صرف وہی سیکڑا گزرے ہوں گے کہ عفت نے یہ سب کچھ سوچا لیا اور سے کہا۔ آئیے نا اچھلنے دو اور اسے میں سرزدی نہیں ملے گی؟

”نہا تھا میرا جوہر! — ارشد نے دروازہ بند کر کے جوئے کہا اور آگے بڑھ کر عفت کے پاس بیگ بڑھ گیا۔

”آپ آگے ہیں تو میں پیار بھی نہیں رہی“ عفت نے قدرے بے تعلقی سے کہا۔ ”انہوں آپ سہری بہا

نہیں سمجھ سکے“

”آپ کہاں آگے، چچا جان! ہم کہانی سن رہے تھے۔ رضائی میں سے ارشد کے چھوٹے بھتیجے کے کداز

بند ہوئی عفت اور ارشد نے اسے نظر انداز ہی کر دیا تھا۔ عفت منہس چڑی اور ارشد نے لپک کر پیچھے کورضائی میں سے گھر گھومیں لے لیا۔

”جاؤ، ننھے میاں! اب سو جاؤ عفت نے پیچھے کو ہار سے کہا۔ بھائی کئی کل سنائیں گے۔“

”نہیں ہی! — پتھر مند پر آ کر آیا۔ تم پوری کہانی سن کے باتیں گے۔“

عفت جانتی تھی کہ کچھ جال مانتے اور ارشد نے شکر کیا کہ پیچھے لے آئے اور بے سے بچا لیا تھا وہ بچا تھا۔

”اُس غلط فہمی سے کہا۔“ یوں نہ کہ کہانی نہ سادہ اس میں آج بہت تھا کہ بڑا بھول۔ کل یہیں سوں گا۔“

”جانیے جانیے۔“ عفت نے ارشد سے کہا اور اچک کر رضائی میں لیٹ گیا۔ ”اُٹھئے بھائی گئے یہاں“

”آپ آئے کسی۔“ عفت نے اس سے کہی میں پوچھا ارشد اٹھ کے جانے کو تھا۔ رستہ بڑھ

تھے کیا؟ عفت نے سنا نہ کی کوشش کی۔

”یہی تانے آیا تھا کہ کل یہاں سوں گا۔“ ارشد نے جانیے کہ جواب دیا اور کہا۔ ”اپنے آپ کو قابو میں رکھو“

پیت میں اس بھی سی جان کا خیال رکھو۔ تم نے اپنا جو حال بنالیا ہے اس کا آخر پیچھے پر پڑے گا۔“

پیشتر اس کے کہ عفت کو ہی جواب دیتی ارشد جانچکا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا پورے سات دن اور سات باتیں اس دوران طاہرہ کو ساڑھے سات سزار روپیہ تک۔

ایک دن دو سزار روپیہ ارشد کے اباجان نے شامل کیا اور ان پر مہاجرنا قانون میں سانا روپیہ تقسیم کر دیا گیا۔ فوراً کوئی دیا وہ وقتاً فوقتاً جا کے دیکھتا رہے کہ وہ لوگ روپے کو کاروبار میں صرف کر رہے ہیں یا توں ہی اڑا رہے ہیں۔ ان سب کو لٹی لٹی میں اور نوین ہر شام ان کی دوکانوں کو ایک نظر دیکھ آیا کرتا تھا اور وہ لوگ اسے دیکھتے ہی اس پر دعائوں کی بار کرتے تھے۔ ہفتے کے آخر میں اباجان کو یقین ہو گیا کہ یہ پناہ گزین اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ہیں تو نوین کی ذہنی پانچ سو روپیہ طاہرہ نے اپنے نرنگ میں غور نظر کر لیا تھا۔ ارشد نے کہا کہ ابھی کہیروپیہ تک میں جمع کرادو لیکن طاہرہ نے اس ہفتے کے دوران ارشد نے چند سات عفت کے ساتھ گزرا لیکن ان کے درمیان اذیت اور بیگ



بوں کلم گئے۔

ارشاد بھی تک ناموش اور ساکت بیٹھا سوچ رہا تھا کہ عفت کے ساتھ کیا باتیں کرے۔ وہ آنکھوں کی زبان میں طاہرہ کے لاکھوں کے ساتھ وعدہ کر گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو عفت پر قربان کر دے گا۔ کیا بات کہوں؟۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا: "اب نہ پا کر بیٹھے بیٹھے بے مصلحتی سے کوٹ دلی۔ اگر اس کا دل اس کو سے میں جتنا تو باتوں کی کیا تھی لیکن وہ اپنے اور بڑی کر رہا تھا۔ اندرونی کشش کا اثر چہرے پر بھی ظاہر ہوا چند منٹ پہلے سکراتی ہوئی ضرورت سنجیدہ ہو گئی۔ دل کی بے قراری فعل دل کی کھینچ کشی، ایک بے مصلحتی اور بے اطمینانی کی ضرورت چہرے کے ایک ایک نقش پر نمایاں ہو گئی عفت کو یہ اس قدر لگا کہ اس نے آج کھل کر باتیں کر لینے کا تہیہ کر لیا۔

اگر دل اس قدر اس سے ہو گیا ہے تو تو خود ہی یہ اور طاہرہ کے کمرے میں گزرا کرتے۔ عفت نے شگفتہ گزرتیہ دیکھے ہیں کہا: "اب کو خوش دیکھنا جانتی ہوں یہاں نہیں تو وہاں سے ہی اپنے لیے خوشیاں چن لائے۔"

ارشاد بڑی مشکل سے اپنے آپ کو عفت کے ساتھ کبھی اچھے موضوع پر باتیں کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا لیکن عفت کے نکالنے سے اس کی کوشش کے پرچھے اٹا دیتے۔ اس کا دماغ چشم زدن میں غالی ہو گیا۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔

لے آہستہ سے گردن گھما کر عفت کی طرف دیکھا۔ اگر عفت اپنے آپ میں ہوتی تو بات کا رُخ بدل کر ارشد کے مزاج کو سنبھال لیتی اس کے سینے میں "عورت بیدار ہو چکی تھی اور آج یہ عورت فیصلہ کن حملے پر تیار تھی۔

آپ طاہرہ کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ عفت بولی۔ "میں آپ کو دیکھ کر خوش ہوتی ہوں مجھے آپ کی خوشی چاہیے۔"

طاہرہ کے تصور میں ہی جو میں نے توبہ یہ ضرورت قبول کر لی ہے کہ میں آپ پر غنا ہوں اور آپ طاہرہ کے تصور میں ہوں۔

ارشاد ایک سے ایک تار پر تپ رہا تھا۔ ذرا سے دھکے کی ضرورت تھی جو عفت کی اس طنز اور رشک نے دے دیا اور ارشد نے اپنے اپنے انا صلیح سمجھو کہ تو وہاں گنجائش ہی نہ تھی عفت کی بات سن کر ارشد نے اس کی طرف دیکھا عفت کے چہرے کا رنگ تھوڑا کالا۔ ان نعوش میں نہ اسے زوہایت نظر آئی اور نہ وہ پاکیزہ خیالی جس کا وہ تلاش تھا۔

ارشاد نے غصے سے گرو جی اڑا دیں کہا۔ "تمہاری کھوپڑی میں کبھی اچھی بات بھی آئی ہے؟ کبھی تم نے خیالوں کی غلط آنکھوں کی کوشش بھی کی ہے؟ تم اس پر اگندگی میں اس طرح گھس گئی توجس طرح...؟

جس طرح آپ طاہرہ کے کمرے میں گھسے رہتے ہیں۔ عفت نے سنجیدہ سکرا ہٹ سے فخر کاٹتے ہوئے کہا۔

ارشاد کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سینے کے بندھن ٹوٹنے لگے اور ارشد جو باتیں نہیں کہنا چاہتا تھا، سیاہ بادلوں کی طرح برسنے لگے اس کے سینے میں سے اُٹا آئیں۔

عفت کا۔ ارشد نے اچھ کر کہا۔ "آج میں تمہیں وہ باتیں صاف صاف کہ دینا چاہتا ہوں جنہیں میں سنبھالنے کی تیار نہ ہوں۔ میں تمہیں انشدوں میں سمجھا رہا لیکن میں بھول گیا تھا کہ ارشد صرف عاقل کے لیے ہوتا ہے نہیں اس حقیقت پر غور کیا ہے کہ میں نے تمہیں کبھی بھی نہ چاہا تھا۔ ارشد نے قابو نہ لے لگا۔ "میں نہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے

تیرے ساتھ ہیں۔ ارشد فاسی دیر طاہرہ کے سامنے کھڑا رہا۔ اس کے سینے میں ٹپک سی رہ گئی۔ آنسوؤں نے ان سرخی آنکھوں میں بالادہ دیتے تھے اور ارشد نے گ کے دینے میں اس مادہ کو محسوس کیا۔ یوں نہیں کر وہ ان آنکھوں میں کھوجا بنے بلکہ یوں کہ یہ آنکھیں جس کے لیے روئی ہیں اس کے پاس چلا جائے۔

ارشاد کی کلاسیاں طاہرہ کے ہاتھوں کی گرفت میں تھیں۔ اُس نے کلاسیوں کو ذرا سی جنبش دے کر طاہرہ کے ہاتھ اپنے انگوٹھ میں لے لیے۔ انہیں دیا اور ایک بار پھر طاہرہ کی فنک آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زبان غاشی کہا۔ "تمہاریہ مجاہد میرے سر کھرا۔"

پہر میں ان آنسوؤں کے کچھ کی تھیل کرتا ہوں۔

اور دوسرے لمحے ارشد عفت کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ اس پر طاہرہ کی باتوں، آنسوؤں اور اس کی وارفتہ کیفیت کا غامض تھا۔ وہ اس کے زیر اثر نہ رہی کسی کیفیت میں عفت کے کمرے میں داخل ہوا۔ عفت نے ایک عرصے کے بعد ارشد کے چہرے پر آواز کیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے دل میں آج مسرت اور بیاد ہو جوں ہے عفت مسکرا دی۔ یہ مٹی مسکراہٹ میں چہرے اور ہنسی ہوئی۔ ارشد نے مسکراہٹ کا جواب مسکرا کر دیا اور ارشد جان ہی نہ سکا کہ وہ کس وقت اور کس طرح عفت کی گرفت میں گرفت بھی ایسی جو گنگ تار اور مضبوط تر ہوئی جاتی تھی۔ ارشد نے اپنے ہونٹوں پر گرم سانس بھی محسوس کیا اور یہ احساس بھی ہو گیا کہ اس کی اپنی نہیں۔

آج تو آپ عفت کی آگے ہیں۔ عفت نے ارشد کو کندھوں سے پھیل کر چٹک پڑھا ہے جو نے کہے کہا۔ آج بڑے دل نہیں چا رہا تھا کیا...؟

"ہاں؟"۔ ارشد نے یوں کہا جیسے فخر سے جاگ رہا تھا اور اسی بوکھلاہٹ میں بولا۔ "یوں ہی چلا رہا ہوں... ہاں... ہاں... طبیعت آہل نہ ہوتی تو... طاہرہ کے کمرے میں چلا گیا تھا... نہیں تمہاری طرف آ رہا تھا تو طاہرہ... وہ اس طرح گھبرا گیا ہے کرتے ہوئے لگا ہوا۔

عفت پر یہ بوکھلاہٹ عیاں ہوئے بغیر نہ رہی۔ وہ بہتر سمجھ گئی کہ یہ گھبراہٹ غرض اس لیے ہے کہ ارشد نے اس کے میں بائے خودی میں غلط چلے گیا تھا۔ اس پر بھی طاہرہ کے چمکنے ہوئے نورانی آنسوؤں کا سحر طاری تھا کہ طمس کوٹ لیا اور وہ ان کے بازوؤں کے گھیرے میں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ابھی طاہرہ کے تشن کی توبہ تھی کہ اس کی بو کو عفت کے سانسوں نے عفت نے ارشد کی گھبراہٹ محسوس کر لی۔ طاہرہ کا نام بھی نہ اور ارشد کا ٹونا چڑھنا جواب بھی نہ سنا جیسے وہ کچھ پھپھار رہا تھا۔ عفت طبیعت کو صدمہ نہ ہوا اور وہ سمجھنے لگی۔

و پھر وہی قصہ۔ عفت نے اپنے آپ کو ایک خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے سوچا۔ "تو پھر وہاں آ۔"

ٹوٹ رہی ہے۔

ارشاد بھی غاشی تھا اور یوں خلاؤں میں دیکھ رہا تھا جیسے اندھیری رات میں کبھی چمک کر اس کی آنکھوں میں ٹپک رہی تھی۔

کچھ کچھ بڑی جوار وہ اس کی آنکھوں میں غمخوار دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ عفت سمجھ گئی کہ طاہرہ کا مادہ بھی سرے نہیں آتا اپنی مسرت اور فخر کا مذاق عفت کا اگر گزرا۔ خیالوں کی مٹی تیزی سے چلنے لگی۔ ایک دو لمحوں میں جانے لگا کچھ اور کتنے ہی خیال

اور اصرار میں وقت اتمام طہارہ کی آغوش میں مسکرا رہے ہوئے جوں وقت میں تمہاری یاد کو سینے سے لگا کر رہی ہوتی  
 رہا کرتے تھے جاکھڑوں کے پردوں کی آواز میں جس منازارے قدحوں کی آہستہ سستی جوں۔ ہوا کی سرسراہٹ سے میری نظریں اٹھ کر  
 باقیانہ لکھ کر آگے دروازہ نہیں کھولتے۔ کھولتے ہی کیسے اہم تو ایک اور بند دروازے کے پیچھے قید ہوتے ہوئے  
 محنت اس لیے کہ اس دروازے میں پاک محبت ہے اور یہاں تم نے غلاطت اور بدلو کو محبت کا نام دے رکھا ہے  
 وارنہ نہ لگا۔ وہاں روحانی محبت ہے اور یہاں صرف جہانی۔ اگر تم میں ذرا سی بھی پاکیزگی رہتی تو میری روح کے مہلچلے  
 وہاں اگر تم میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو گو وہ پیش کے انسانوں میں نہ ملتی۔ میں نے تیس ہزار بار سمجھا ہے کہ انسان انسان  
 لایا جاتا ہے اور انسان کو انسانوں میں کس طرح رہنا چاہیے لیکن تم نے اپنے گوشہ نشینی میں مجھے بھی قید کرنا چاہا اور اپنے  
 دلچسپی جیوان بنانا چاہا۔ حیرانوں میں بھی کچھ اعتدال ہوتا ہے لیکن تم نہیں۔۔۔

مہش تم بھی انسان ہوتے۔ عفت نے کہا۔ وہ حیران ہی ہوتے ہیں جنہیں اپنے رائے کی زیریں ہوتی۔ وہ بریلینڈی  
 کا ہونے نہیں۔ اگر یہی قوت اچھی تھی تو میرے ساتھ شادی کیوں کی تھی؟ طہارہ میں جہاک تو نہیں گئی تھی؟ لیکن تمہاری  
 نین فوراً ختم مجھے یوں بنا کر میرے جسم سے کھینک چاہتے تھے اور میری آنکھیں طہارہ کے ساتھ۔  
 انوش روجو ہے وہ وہ اندھا۔ ارشد آپ سے باہر ہو گیا۔ بے حیا آئیں ہزار گھنٹوں میں سلایا، تمہاری اہلیت دی رہی،  
 وہاں سے زیادہ بات کی تو زبان کھینچ لوں گا۔  
 عفت کے ہونٹ پکپکا نے۔ اس نے کچھ گھونپا چاہا لیکن غصے سے بھر کے ہونٹے جذبات نے اس کا گلا دبوچ لیا۔  
 غولی دروازہ کھلی رہتی تو اس کے دل کا غبار نکل جاتا۔ وہ اپنے آپ میں آسانی لیکن ارشد میں صبر کی تاب درہی عفت کی  
 ادا کی تھی سمجھتا ہوں وہ اپنے غصے سے مغلوب ہو گیا تھا۔

وہاں نے اور طہارہ نے تم پر اپنی محبت قربان کی اور تم نے اسے پاؤں تلے مسل دیا۔۔۔ وہ قہر میری آواز میں بولا۔ طہارہ  
 بے اپنے کمرے میں بٹھا کر گھنٹوں اس قربانی پر قائل کیا ہے کہ میں تمہارے قریب ہو کر تیس اپنا بنا لوں۔ تم نے مجھ میں طہارہ  
 نہیں اپنا تھا۔ طہارہ نے دروازہ اور اپنی محبت کا واسطہ دے دے کر مجھے تمہارے کمرے میں بھیجا ہے اور تم نے  
 بہاری اور پرانی کے الزام لگاتے ہیں۔ تم نے اسے کچھ نہیں بنایا کہ رکھ دیا ہے اور اس نے تمہارے اکھر سے ہونٹے  
 لٹال دی ہیں۔ اس نے تمہارا سرو پایا تمہاری تیار داری کی غم بھتی جو کھر والے اندھے ہیں؟ جاہلیں؟ ان کے دامغ  
 ہاں، انھیں نہیں میں اس کی؟ وہ نہیں بھی سمجھتے ہیں۔ اور طہارہ کو بھی جانتے ہیں تم نے ان کی بیک وقت بنایا جانی کو مگر وہ کیا  
 لاکھ دیوں کو خزانہ خر کے اپنے ہی راستے میں کاٹتے ہوئے۔ طہارہ کا اندھا اس کے ساتھ ہے اور تمہارے ساتھ کوئی  
 نہیں۔

عفت کی شخصیت ٹوٹ کو پھوڑ ڈھکڑے ہو گئی۔ مگر وہ کیا ان تراخ تراخ کر کے ٹوٹ گئیں۔ اس کے اھصاب کچلے گئے۔  
 اناں ہو گیا۔ ارشد کو وہ کچھ کہہ نہیں سکتی وہ ایک عورت کے لئے تھا۔ وہ عورت جو عفت کے سینے میں قید ہوتے ہوئے  
 نازیبا ہو کر ان کے ہونٹے تھی۔ یہ عورت ابک گئی اور عفت اھصابی لکھش میں جلا ہو گئی۔ پھر کچھ لکھش اھصاب زدگی بن گئی۔

میں چاہنے کی کوشش کی تھی لیکن میں تیس محض برداشت بھی نہ کر سکا۔ میں یہ بھی معلوم ہے کہ میں طہارہ کو چاہتا ہوں۔  
 کو چاہتا ہوں۔ ارشد کی آواز بلند ہوئی گئی۔ مجھے طہارہ سے محبت ہے۔ طہارہ کی روح سے، عفت اس کے کمرے  
 تک بھوت بول رہے ہیں۔ عفت نے تڑپ کر جواب دیا۔ اس کے چہرے پر گہری سرخی پھا گئی تھی۔  
 کسی اور کو دینا۔ آپ نے اس کے کمرے میں مائیں لگادی ہیں۔  
 وہ محض رعب و قریب۔ ارشد اذیت میں کرا رہی تھی۔ اس قدر ہنگامی سے کہ اس کی آواز کمرے سے باہر  
 لیے میں بولا۔ "میں تمہارے شرم نہیں آتی جس لڑکی نے تم پر اپنی محبت اور دل بٹھا کر دیا ہے، جس لڑکی نے تم  
 سے خیال کر دیا کہ وہ انسان میں لیا تھا اور جس لڑکی نے تمہاری زبان سے بدنام اور رسوا ہو کر تیس ایک لفظ تک نہ لکھا  
 لگا رہی ہو کہ۔۔۔"

"اور مجھے ارشد سے کہنے کہ عفت تمہاری غریب تھی عفت بھول کر آؤنگی تھی اور اسے طہارہ نے پناہ دی  
 اور سے کہنے کہ عفت طہارہ کی روٹیوں پر پڑی ہے۔ عفت غم غصے سے بھر پور لیے میں بول رہی تھی۔ یہی میری کمر  
 میں تم لوگوں کی نظروں میں بھی تک غریب اور غمناک ہوں۔ اس کے آئینوں کے آگے اور وہ دھڑکی ہوئی آواز میں بولی  
 احسان جلتی ہے، ارشد صاحب طہارہ کو بلا لیتے، وہ بھی احسان گناتے۔ اسے بھی افسوس ہوتا ہے کہ اس نے  
 دیا تھا۔ وہ بھی جانتی ہے اور آپ بھی جانتے ہیں کہ مجھے میری نفسی اور بے کسی کے دن باڈا لے رہی تاکہ میں آپ  
 غلام بنی رہوں۔ احسانوں دلی تیروں اور آپ عجائبات کو کسے رہیں اور میں ہونٹ سی کر گھٹی رہوں۔ آپ دونوں  
 سمارا لے کر میری غریب کا مٹاؤ لایا ہے۔  
 اگر تم میں عقل ہوتی تو۔۔۔"

تو میں خاموشی سے تیس اور طہارہ کو ایک ہی کمرے میں سنا دیکھ کر گڑ گڑاتی رہی ہوتی تھی میری عقل؟ عفت  
 عروج تھا کہ وہ آپ کی کج فہم ہے؟ اگر آپ کو یہاں لگے تمہارے وہ پاکستان زندہ باد کے نعرے؟ تمہارے وہ جیسے  
 گئے؟ ایک طرف تم اور تمہاری طہارہ پناہ گزینوں کو بلانے کی غرض میں ہوں، ہزاروں روپیہ خرچ کر رہے ہو اور دوسری  
 کو جا رہے ہو۔ یہ غریب ہے تم بھی مگر یہ تمہاری طہارہ بھی مگر ہے۔  
 عفت اٹھ کھڑی ہوئی اور پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں کہا۔ اگر میرے پاس اتنی دولت ہوتی تو میں  
 کے لیے چند ہزار روپے خرچ کر کے پاکیزوں میں شامل ہوجاتی اور ان کے اندھروں میں ہر حرکت پر پردہ ڈال دیتی؟  
 دیکھتے ہیں تو پھر میں بکواس کر لیتا۔ تم غصہ سے زیادہ۔۔۔

مجھے آج بکواس کر لینے دو ارشد! عفت نے ایسے لمحے میں کہا جہاں ارشد کے لیے بالکل ہی نیا اور  
 دب سا گیا عفت بڑھتی تھی۔ میں نے یہ بکواس اس طرح سینے میں چپا لے دی تھی جس طرح تمہارے بچے کو  
 جوتے پہن سیکھ ان دونوں سے پیار ہے۔ میں ان دونوں کو مگر کا خون دے کر زندگی دے رہی ہوں۔ ان دونوں  
 ارشد وابستہ ہے۔ مجھے ارشد سے محبت ہے اور ہر چیز سے محبت ہے جس کے ساتھ ارشد کا سامنا بھی ملتا۔



اس کی اندر دلی غفلت اور کشمکش کا تاثر اس کے چہرے پر گہری سرنی، خشک آنکھوں اور لرزے ہوئوں سے ہوا ہوا تھا۔  
 ارشد نے سمجھا، غفلت کی ٹھوڑی کا پٹنے لگی اور خوشحال بندہ جو بے گلیں، آگ میں سے جو سگ رہی تھی، محرک اچھی، زہر خور مشور  
 دوسے کی طرح بڑھلا۔ ارشد کی غصہ بھری باتیں اور طعنہ زنی اس کی آگ کو ہوا دے رہی تھیں۔

”تم سننا ہو۔ ارشد بے قابو ہو کر اپنی طبع سے بہت نیچے آگیا اور غور تو لیں کی طرح طعنہ زنی پر آمنا کیا۔ ”تم سننا ہو  
 تم اس قدر بیچ ہو کہ اس کا لنگ بھایا ہے۔۔۔“

غفلت کی عثمانی بند ہو گئیں اس نے دونوں گھونٹے اپنی کپٹیوں پر مارے اور زور سے چیخ ماری، وہ کمری کی  
 ہوا میں لہراتے ہوئے پورے کی طرح ہلنے لگا۔

”جھجھکا اور زور سے تجرنا۔ ارشد کے غصے نے اس پر بیچھی ظاہر ہوئے دیا کہ وہ انداز سانی اور اذیت پرستی کی علامت  
 کیا ہے، راتی زور سے جھجھکا رہے۔“

لیکن غفلت اب اس کی باتیں نہیں رہی تھی، وہ بہت دیر بیچ چکی تھی اس نے دونوں بازو پھیلا دیئے، مٹھیاں بند  
 اور سر اُپر کر کے انھیں بند کر لیں، ایک بار پھر دونوں گھونٹے اپنی کپٹیوں پر مارے، ایک بار پھر چیخ ماری، اس کی چیخ کو گھر کا  
 ایک چیر لڑا اٹھی اور غفلت خنجر کو ہڑام سے فرش پر گر پڑی، اس کا جسم لپ رہا تھا۔ اچانک وہ اپنا دل مڑنے مار پڑے تھے۔

ارشد کو یوں لگا جیسے وہ کوئی خدا کا خواب دیکھ رہا ہو۔ وہ گھبرا گیا، معنا سے خیال آیا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار وحشی  
 کیا ہے۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آگے لگانا۔

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے کہ گھر کے کارواز اور زور سے کھٹلا اور ظاہر ہو گئی ہوئی داخل ہوئی۔ دو منٹ بعد ہی  
 اور ان کے پیچھے پرست گھر میں داخل ہوئے، ان میں سے کسی نے بھی نہ دیکھا کہ ظاہر ہو کس وقت اس گھر کے

”اسے صبح دو، وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔ غفلت نے خدا بلند سر کو شکی۔“

رات کے بارہ بج رہے تھے جب ٹاکر بے ہوش غفلت کی بغض دیکھ کر اٹھا تو اس نے لڑ پڑا پڑنے لگا  
 جو تے کہا۔ ”میں ایک نئے انگشت لگا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس سے مزید ہوش میں آجائے۔ اگر ہوش میں نہ آئے  
 گا۔ سمجھنے کو سگی ہے۔ خون کا بازو زائد ہے۔ بہر حال گھبراہٹ کی ضرورت نہیں۔ احتیاط کی ضرورت ہے۔“  
 ”چلیے ٹاکر صاحب! دریا میں گئے۔ آج جان کے کہا۔ ارشد اور اس کا بھائی بھی ٹاکر اور ابا جان کے  
 گھر سے میں چلے گئے۔ تم جہاں ٹکر جائے گی کیا لیاں رکھ رہا تھا۔“

”اس قسم کا دورہ اکثر کسی مذہبی تحریک سے پڑا کرتا ہے میں آپ کو ڈانا نہیں چاہتا۔ یہ ہیشہ رہا ہے۔ ٹاکر نے  
 آپ نے بتایا ہے کہ اس سے پہلے صرف ایک بار وہ مرتد ہوا تھا اور وہ چلا ہے۔ اگر آپ مجھے مزید کسی ہٹھری بتا سکیں  
 بہتر مشورہ دے سکتے ہیں۔“

”مزید نہ کی نفیات کا اس میں زیادہ دخل ہے۔ ارشد نے کہا۔ ”میں آپ کو تفصیلات بتا سکتا ہوں۔  
 ”صبح میرے پاس آجائے گا۔ ٹاکر نے فرما سوچتے ہوئے تے کہا۔ ”اُس بجے آپ کو میرے کلینک یا

”میرا تو سچ لیا بہت کارہ پہلے ہی کس حال میں ہے۔“ اتنی نے ظاہر کو دیکھا اور وہ بھی آواز دگر تھیکہ لے رہے تھے۔ ”میرا داشت کی بھی  
 دہرتی ہے۔ یہ سچہ باتوں کا تو نہیں۔“

”میں نے کیا کیا ہے۔ اتنی؟“ ظاہر نے فغان برداری کے لیے میں پوچھا اور کہا۔ ”میں بھی تو اس کی چیخ میں ٹکر آپ سے

ذرا پہلے اس عمر سے میں آئی تھی۔ ارشد کھڑا تھا اور غمت فزین پر پڑی تھی:

ظاہر ہے۔۔۔ بھائی نے غمت کے سہانے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ یہ گھر خیر نہیں ہے۔

فریضہ کہیں اور جا کر دیکھ جائیگا۔ اتنی نے پچھتے ہوئے کہا اور عمرے سے بچنے لگی۔ بھائی نے غمت کے اور پریشانی سیدھی کی۔

”قواب کی ہمتی میں کہیں شریفوں کے گھر میں بد معاشرت کر رہی ہوں؟۔۔۔ ظاہر ہے غم سے اس کا جیسے وہ رو پڑے گا۔ غماتی جرات نے اس کا ساتھ دیا اور وہ خود اعتمادی سے بولی۔ حیات کر کے سے پہلے سوچ لیا ہوتا قصہ کیا ہے، بزرگوں کے گھر میں یہ ادھیان نہیں ہوتا۔“

”لو اور سن لو۔۔۔ اتنی نے فوری جواب تیار نہ پاتے ہوئے کہا۔

لیکن ظاہر ہے اپنے عمرے میں جا ہی تھی۔

گھر کے ہر فرد پر شب بیداری کا ٹھہر چلا تھا، غمت انجمن کی کراڑ سے بے خبری کی نیند سو رہی تھی، آتشا جون کا اونگھ رہا تھا لیکن جو طوفان چندن پشیرہ ظاہر کے گرد منڈلا کر سواگیا تھا جاگ اٹھا اور گھر میں صرٹ ظاہر ہوئی جو مکمل طور پر بیداری کا بھی اور داغ بھی۔ وہ کبھی بھی غمت کی سن گھڑت کہانی مردوں کی بروقت مداخلت اور کشش سے دیکھتی ہے اور روز و صاف ہو گئے ہیں مگر ان کے آج کے طنز اور زور دینے سے اس نے یقین ہو گیا کہ یہ لگ ان کے سینوں میں بھی نہیں تھی۔ اسے بھی یقین ہو گیا تھا کہ اب مرد چاہے کچھ کریں وہ ان عورتوں کی زبانیں بند نہ کر سکیں گے۔ اب ان کی نیت اور داغ کو سنبھالنا تھا ظاہر دے سوا جاگ اب فرار کے سوا کوئی علاقہ نہیں لیکن۔۔۔ اسے خیال آیا۔۔۔ بول بے آواز ہو کر تڑپا نکلا جائے۔ کہیں اب آبا جان اور بھائی جان جیسے شفیق بزرگ بھی اس کی غیر معافی میں اس کے خلاف بیڑن ہو جائیں۔۔۔ وہ ان بزرگوں کو کسی قیمت غلط فہمی میں نہیں لکھنا چاہتی تھی۔

ظاہر افسردہ نہ ہوئی، نرمی اسے اپنی نیکیوں کا کام کرنے کی شوقی، ایک ارادہ اس کے سینے میں جاگ اٹھا تھا۔ وہ تھی کہ اس کا دل بے شکا کے لگ چکا ہے اور اپنا بچہ سو رہا پھرٹ کیس میں رکھا ہے جو ہنگامی حالات میں کام دے گا۔ ان بھائی کے دو فقرہ دل سے اس کی گون گونے ہوئے دیکھ کر دیا تھا۔

اس نے خدا کو یاد کیا۔ وہ دی دل میں وہ خدا کے حضور گڑ گڑائی۔ اس کی سوچ و فکر میں اب بابت اور اداسی نہیں تھی۔ ”مجھے تیرے طوفانوں کی تہم میرے خدا۔۔۔ وہ انھیں بند کر کے غم سے نمٹنا ہے۔“ ”مجھے استقلال دے کہ تیری راہ میں ان طوفانوں کا تھا کہ کسوں طوفان کو اور تیر کر دے۔ اور مجھے ثابت قدمی دے۔ مجھے ایمان کی مضبوطی دے۔ آمین، آمین۔“

اور غمٹا لے اسے اپنے نور کی ایک کرن دکھائی۔ ”بھو۔۔۔ ظاہر وہ غم سے ہوا جیسے اس کے ہونٹ مسکرا رہے۔ کے رگ دیشے میں ایک اونگھی سی لہر دو گئی اور اسے یوں لگا جیسے اس میں بجلی کی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ اچانک یہ ارادہ۔۔۔ جو عمر کو اطلاع دے کر غمٹا خوشی سے نکل جاتاں گی۔“

اسے پھر آبا جان اور بھائی نے غمت کا خیال گایا اور اس نے یہ ارادہ دیا اس اتقان میں ڈال کر فیصلہ کیا کہ بزرگوں کا یہ رد عمل کچھ ہے۔ وہ اس کے لیے اتنا کچھ کر رہے ہیں۔ ان کو راضی کا موقع نہ دیا جائے۔ اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ اپنی زبان سے شکایت نہیں کرنے گی۔ ایک دو دن محتاج ظاہرہ کے خلاف یہ الزام تراشی چلی جاتی تھی تاہم وہ بالکل سے بھی نورانی ہو آوری کی صبح اس کے لیے بڑی کے احساس سے سرشار عمرے سے نکلی جیسے کچھ ہوا بھی نہیں عمل خانے میں گئی اور سب کے ساتھ مل جل کر لطافت نکاشت کی۔

ناشتہ پر تاج بھی وہی پروردہ جی جاتی تھی کچھ نیند کے بوجھ سے اور کچھ غمت کی حالت کی وجہ سے۔ ظاہرہ کو اپنے اور نہیں، سارے گھر پر غم سے ہوا تھا کہ یہ کما کھی کس حد تک کا شکار ہو گئی۔ ارشد بخاص طور پر خاموش اور گم سم تھا آبا جان نے ان کے متعلق ہی ہدایت دیتے رہے۔ صرٹ بچے تھے جو ان کی بات کر کے غل میں لطیف سا ارتعاش پیدا کرتے تھے۔ ”نورجی ابھی عورتیں سن لو۔۔۔ آبا جان نے کہا۔ غمت کے کمرے میں باہر کی کوئی عورت نہ جاتے، نہ ان کے سخت بات کی ہے کہ اس کے سامنے کوئی ایسا انسان نہ جاتے جسے وہ دبا بھی ناپسند کرتی ہو۔ اس کے داغ کو مکمل سکون کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات اردو سڑکوں کی عمریں ہی جمع ہوتی ہیں۔“

غمت ابھی تک سو رہی تھی۔ وقت گزر گیا، فضا میں اذیت لگ چھا پیدا ہو گیا تھا۔ ہر کوئی مل لگا رہا تھا۔ مرد و خیر چلے گئے۔ ارشد کو ان کی طرف، اتنی اور بھائی باورچی خانے اور غمت کے کمرے کے کچر کاٹنے لگیں۔ ظاہرہ اپنے آپ کو ہر باندی اور راجن سے آزاد کھڑی تھی۔ وہ رات کے سے میں ٹل رہی تھی، اتنی باس سے گزری اور داغ دم آہستہ کر کے ظاہرہ سے۔۔۔ کلا۔۔۔ غمت نے اسے میں نہ جانا۔ ڈاکٹر کی ہدایت تم نے سن لی ہے۔ اور جاتے جاتے بڑھا لے کے بے میں کبرگئی۔ ”کمرے میں کوئی اور نا آرام سے جینے دو۔“

ظاہرہ کے ارد گرد یہ دو فقرے کتنی ہی دیر اس طرح گونجتے رہے جس طرح بھڑوں کا غول اس کے گرد گونجنے لگا ہوا اور اسے سے کوئل کا گھر رنگ ہو رہا ہو۔ اس کے سینے میں دو کی ٹپ کی ٹپ بھی ہے اس نے وہیں دیکھ لیا۔ اب وہ ان میسوں سے بے ارادہ ہو رہی تھی اور درو بہت دوا نہ جانے کو بڑھ لڑ رہی تھی۔ بظاہر وہ پسپا ہو رہی تھی لیکن اس پستی میں ایک پیش قدمی تھی۔ رات والے ایک ہی میدان کے پائند نہیں رہتے۔ ظاہرہ نے نظروں سے اوجھل ہوتی ہی کی پیٹھ دیکھی اور زیر لب مسکرا دی اسے بالکل ایک خاموشی بہترین جواب ہے۔

ذرا سا ادھر ادھر ٹھہر کر وہ اپنے کمرے میں جا گئی غیر ارادی طور پر ٹوٹ کیس کھولا۔ سادہ اتنی کی تصویر نکلی۔ اس کے ساتھ ارشد کی تصویر بھی تھی، وہ بھی اٹھائی۔ اس نے دونوں تصویروں کو پہلو پہلو کر دکھا کر۔ یوں لگا جیسے وہ خود ارشد کے پہلو پر کھڑی ہے۔ اس کی نگاہیں ایک تصویر کو دیکھتیں پھر دوسری کو اور اس کے ذہن میں اتنی سادہ کا تصویر بیدار ہو گیا۔ اس اتنی کا تصور ہے اس نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

ایک اونگھا سا خیال، ایک ہمنی سا، بظاہر مضمر خیر خیال اس کے دماغ میں آیا۔ دکاش ارشد میرا اپ بھوتہ۔ اس نے ہم دو جان کے گوشے گوشے میں پیاد و محبت اور پدرانہ شفقت کی بر لطف اور پر سوز لہر دو گئی۔ ارشد اور سادہ۔۔۔ دو تین ٹپنے

”ہنس برداشت کرنا چاہیے تھا۔“ طاہر نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

”اگر تم جوتی تو جی برداشت نہ کر سکتیں۔“ ارشد نے جواب دیا۔

”انی اور بھائی کے دل میں وہ باتیں بھرتازہ ہو گئی ہیں۔“ طاہر نے کہا۔ ”دونوں مجھے علی کنی مناجی بھیج چکے ہیں، معلوم نہیں انہیں کیا ہوا؟“

”ارشد نے گردن کو درسا غم دیا اور زلیب صرف اٹانکا۔“ ارشد بھانے۔

”وہ کمرے سے باہر نکلتے دیکھتے کر کیا اور بولا۔“ طاہر و امیں فتنیں ایک بار پھر کتاہوں کے ثبوت قدم رہتا۔ ہمارا خیال تھا تم غلط ہو گئی ہو۔ میں آج اباجان اور بھائی جان سے بات کرتا ہوں غم زدان عورتوں سے دور رہنا۔“

”ارشد گویا کتاہو نے سوچا کہ ان عورتوں سے دور رہنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ وہ ان سے کسی دور چلی جائے۔ اس نے دہاں سے چلے جانے کا حمارہ کیا تھا وہ پختہ ہو گیا۔“

”وقت کا وہی روز انجیشن شروع ہو گئے۔ شام کو پندرہ گرا کر ایک انجیشن دے گیا۔ ناکھڑنے اسے باغیچہ میں ذرا سا ٹھلنے کے سوا اور کسی طرف جانے کی ممانعت کر دی شوگال کا چارٹ بنا کر بیچ دیا اور اول اسے مکمل طور پر صاف کیا۔“

”رات کھانے کے بعد گھر والوں کی محفل بلدی منتشر ہو گئی۔ اباجان کی سخت ممانعت کے مطابق ارشد کو حققت کے کمرے میں بیٹھا ڈالا۔ طاہر اپنے کمرے میں تھی۔ ذرا سا اڑھا لیکن کتاب میں طبیعت جرم نہ سبکی، ایسی تنہائی میں بھائی کے پتھے اس کا خوب ماتہ دیا کرتے تھے۔“

”وہ ڈھکڑ بھائی کے کمرے کی طرف چل پڑی کسی پتھے کو پھولا تے لیکن دروازے پر ہی رگ گئی۔ بھائی کے بندہ دروازے میں سے بھائی کی سخت تنگی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے خدا حافظ نے ہی طاہر پر موقوف سخن آتش کا کر دیا۔“

”بھائی اور اس کا خاندان ارشد اور طاہر کے درپردہ تعلقات، حققت کا تو عمل اس مرض کی صورت میں اور طاہر کے خلاف حققت کے الزامات پر بھگتا رہا ہے۔ بھائی حققت کو سچا اور غلط فہم ثابت کر رہی تھی اور اس کے حق میں طاہر کو بھی بھر کے لوس رہی تھی۔“

”یہ بت بھائی جو شاید اول سے اپنی بیوی کو سمجھا سمجھا کر خفا چکے تھے ایک لذت تیز ہو گئے اور بولے۔“ ”وہ کچھ زینت! بہت بھگ بھگ ہو چکی ہیں۔“ ”نئے پتھے بھی لگا تھا اور اب بھی کتاہوں کے کہہ بکواس وہاں مرنے کا دل میں نہ پڑے۔“ ایک شریف لڑکی کو بزم کر کے تیس شرم نہیں آتی؟ حققت کا دماغی نولان بڑھ چکا ہے۔ اس کے دل میں جوتا ہے کہ گزرتی ہے۔ جسے ذہنی بڑی سمجھتی ہو وہ پھر کمال ہو گئی ہے۔ اس کا باقاعدہ علاج شروع کرنا چاہتا ہے۔ طاہر کے خلاف میں آئندہ ایک لفظ نہ منوں گا۔“

”بے حیائی اور بد مزاجی کی کوئی حد نہ ہوتی ہے۔“

”وگھر میں سالانہ جم نہ تھی؟“ بھائی کہاں تھی اتنی جلدی مارا سننے والی، جوابی مملو کرے ہوئے بولی۔ ”ہماری نظروں کے سامنے جو کچھ ہوتا ہے وہ آپ لوگ نہیں جانتے۔“ ”اوتیں دیکھتے۔ آپ کی اس لڑکی کا بلیں شریفانہ نہیں ہیں ایک بار انہیں سو بار پوچھوں کہ کوئی رات وہ حققت کے کمرے میں کیا کر رہی تھی؟ میں یقین سے کہتی ہوں کہ وہ ارشد کو دہاں سے اپنے کمرے میں

لے لیے ارشد سے جہان لوگ کی مخلوق دکھائی دیا۔ اس نے کہا کہ ان دونوں تصویروں کے سامنے سجدہ کرے۔ پر غور عود تھا جمیت کی وہ جہاں تک صرف طاہر اور ارشد کی ہی جمیت پہنچ سکتی تھی، روعوں میں سوئی ہوئی جمیت۔“

”ذہن کے کسی کونے سے بگڑا سا اٹھا اور خیالوں کو بہت اور پڑا لے گیا۔ پھر ایک آدمی اس کے ذہن کے طول و پیمائش گئی۔ گردنبار سے جیسے طاہر کی آنکھیں بند ہو گئی ہوں اور وہ جھپک کر اندھا دھند آدمی کی سمت چل پڑی جو اتنی دورا نے اس کے آئینہ خیال دیتے اور ارشد کو پیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا ارادہ اسے پھونک کر طرح کر گیا۔ وہ استقلال اور جدوجہد نے یہ طاقت اور بلا کو کشش پایا تھا خیالوں کی جہاز کی ہوئی آدمی میں اڑ گیا۔ طاہر کے تو جیسے پاؤں اٹھ رہے تھے۔“

”وہ بے خیالی میں بلکہ بے بسی میں خوشی پر بیٹھ گئی۔“ ”دونوں تصویریں سلوم سلوم مزید پر یکدہ کامی اعمال کے پکڑیں لگیں اور دیکھتے دل سے اعتراض کیا کہ ارشد کو پھوڑ کر لگانا آسان نہیں۔ اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو حوصلہ دینے کی کوشش کی لیکن بہت تیز اور سختی اس کے سوچنے کی رفتار سے زیادہ تیز۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ اتنی مزاحمت کی تصویر پر پڑے ہوئے وہ کمرے گریں اور اس وقت سے لکیناں میز پر ٹیکے سر ماتھوں میں تھا سر پر پڑی ہوئی ہے۔“

”اس نے اتنی کی تصویر کو اٹھا تو دونوں آئینوں پر گئے جیسے اس کی اتنی اس کی بے بسی پر ردی ہو۔ طاہر نے بڑے ذرا نے دونوں تصویریں دل کے ساتھ لگائیں اور کھل کر خروارے اور جانے لگتی پر ردی رہی۔“

”جب نوکر کی آواز اس کے کالوں میں پڑی۔ بی بی جی! کھانا تیار ہے۔“ ”طاہر نے دیکھا کہ وہ چیلوں سمیت بیگ تھی کس وقت ٹیلی فون؟ کس وقت سوئی تھی؟ کیا خواب دیکھا تھا؟ اسے کچھ یاد نہ آیا۔ اسے تصویریں یاد آئیں۔ پلنگ پر دیکھا تصویریں الٹی پڑی تھیں۔“

”اور! ہم کھڑے رہا بھی؟“ طاہر نے نوکر سے کہا۔ ”ہیرا کھانا ہمیں لے آؤ۔“

”اسے معلوم تھا کہ مردوں کا کھانا تو قدر چاہیگا ہے۔“ ”انی اور بھائی کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں کیلک ہے۔ نوکر۔“ ”جائنے کے بعد طاہر کو پھولا جہاں وہ یہ تھا کہ اس کے بچہ کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس نے پانہ زہر سے گئی۔ اس کے جذبات اسے اس گھر سے نکلنے نہ دیں گے۔ اس کے ارادے، حوصلے اور محبت متزلزل اس نے ہر فیصلہ وقت کے کمرے کو کم پھوڑ دیا اور دماغ کو خالی کر کے غفلت میں لے آیا۔ منہ نہ دھوئے نہ پلے گئی۔ وہ اپنے آہ اس قدر بخوشی کہ اسے غفلت کا خیال تک نہ آیا۔“

”شام ساڑھے چار بجے مردوں کے آجانے سے گھر میں پھر چل پھر پھیل شروع ہو گئی۔ ارشد طاہر کے کمرے میں پتھے جوڑے جسے میں کہنے لگا۔“ ”داکر خفا متاثر ہے۔ میں نے حققت کے متعلق اسے بہت کچھ بتایا ہے۔ اس کی شکر کا خاص طور پر ذکر کیا تھا اور ذرا جیات کے متعلق اس کے نقطہ نگاہ کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس نے ذہنی امراض کے ایک ڈاکٹر دیسے اور کچھ انجیشن بھی کھ دیتے ہیں۔“

”آخر ہوا کیا تھا اس نے؟“ طاہر نے پوچھا۔

”ارشد نے رات کی بات سنائی۔“

اے کے لیے گئی تھی جسے عفت برداشت نہ کر سکی اور اس پر دورہ ہو گیا۔

”جیتیں کس نے تیا با؟ — ارشد کے بھائی نے پوچھا۔

”ابھی تیا نہیں کسی نے؟ — بھائی نے غصہ بھری خواہمندی سے کہا۔ عفت کو ذرا بہتر ہونے دو وہ خود تیار کیا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے یہ واقعہ فرض کر لیا ہے۔ یوسف نے کہا۔ قہقہہ خست کی کڑی کا اندازہ ہیں سے ہا۔

جسے اگر تم میں ذرا بھر اخلاق ہوتا تو مشن سے ہٹا کھانے کی بجائے حملی واقعہ کی بھان بن کر لیتے۔ لیکن زینت! اجنبی انسان

تم اس قدر پست خیال ہو جاتی ہو کہ شکل و صورت ہی بگاڑ لیتی ہو۔ اگر تیار مقابلہ ظاہر ہو کیا مانتے تھے۔

بھائی عورت بھی وہ اپنا مقابلہ ایسی لڑکی کے ساتھ کیسے برداشت کرتی جس کی تعریف اس کا خاوند کر رہا تھا۔ وہ کہے۔

باہر ہوگی۔ باہر ہوگی ایسی ہوتی کہ عقل کی حدود سے ہی باہر ملے گی۔ کیا سنت رہ گئی اور دوتے دوتے کھٹے لگی۔ میری شکل اور

خدا نے بنائی حوالی ہے کہ آج میرا مقابلہ ایک نوجوان لڑکی نے ساتھ کر رہے ہیں۔ مردوں کی نیت ہوتی ہی ایسی ہے۔

”اوہ خداوند! وہ میرے خدا ہے۔ یوسف پشیمان ہو لایا۔ زینت! تمہاری کوڑی میں ہرگز ہے کہ نہیں۔ میں کیا کہہ رہا

میں سب سمجھ گئی ہوں۔ — بھائی نے غم و غصہ سے لڑتی آواز میں کہا۔ مجھے پہلے ہی سے شک تھا۔

”کیا شک تھا؟

”آپ بھی تو ارشد کے بھائی ہیں نا۔ — بھائی نے دلیری سے کہا۔ ابھی معلوم نہیں ہے لڑکی اور کتنے مردوں کا گناہ

پرچھا ہے گی۔ یہ معلوم اور کتنے گھر اجاڑے گی؟

خدا کے لیے بات کرنے سے پہلے ذرا سوچو۔ — ارشد کے بھائی نے طنز آواز میں کہا۔ ہر شرم و حیا کا بھی خیال

تین چوں کی ماں بواور کیا پاک رہی ہو؟

ظاہر و دواڑے سے ذرا بہت کھڑکی ہنسی رہی جھگڑا جائے کب سے چل رہا تھا اور یہ مکالمے جھگڑے کا عروج

بھائی کے یہ آخری فقرے ظاہر و کو تیروں کی طرح لگے۔ رات سرد ہونے کے باوجود اس نے کپڑوں کے اندر پسینہ کی نمی لڑ

کی اور نہ سے سے ایک خیال اس کے دماغ میں آگھسا۔ اس نے سوچا کہ بھائی کے الزامات اور شک و دہشت ہوں یا نہ ہو

— سوال یہ ہے کہ گھر میں یہ فساد میرے جد کی بدولت شروع ہوا ہے۔ اس کے گھر سے گھر سے سوچا۔ —

جیسی دہشت اور مصلح پسند عورت آج اس ذلالت تک جا پہنچی ہے۔ کیوں نہیں ہی اس منتظر سے نکل جاتوں اور ہنستے جھپٹتے

لو اس کا سبب سے پاک کر دوں۔۔۔ اب تو میرا گل بنانا ہی بہتر ہے۔ راہ نجات ایک ہی ہے۔ میری بھی اور اس گھر کی بھی۔

ظاہر نہ کہ آئی اور اڑاں سے چل پڑی۔ تمام کمروں کے دواڑے بند تھے۔ وہ بہت آہستہ چلی جا رہی تھی۔ اپنے خیالوں

مگم گم میں اب یہ خیال لے جان خیال نہیں تھے۔ ان میں اڑان کی قوت تھی۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ کب سے موت کا جہاز ہے

اس کے کانوں سے ارشد کی ای کی غصہ بھری آوازیں نکلتے نکلتے۔ وہ چونک اٹھی۔ ادھر ادھر دھکا۔ وہ اباجان اورانی کے کمرے

کے پاس کھڑی تھی۔

”اب وہی صورتیں میں جو پسند ہو ویسے کرو۔ — اتنی فیصلہ کن جیسے میں اباجان سے کہہ رہی تھی۔ یہ اتنا اس کی ہر کو

ہے پلٹا کر وہ باہر ضرورت یہ ہے کہ ارشد اور عفت کو الگ کوٹھی الاٹ کر دو شہر کے کسی دوسرے سرے پر۔

”معلوم ہوتا ہے تم اب میری جان لے کے رہو گی۔ — اباجان نے تھکے ہوئے غصے میں کہا۔ اس بڑا چاہے میں

انہ مجھے لاکھوں روپے دیا ہے۔

”میں نے نہیں۔ — اتنی نے اور تیز ہر کو طعنے لگا۔ ”تمہاری اس لاٹھی نے۔ اگر اسے اس گھر میں رکھنا ہے تو میں کل

ہاں سے چلی۔ میں چپ تھی شاید آپ لوگ خود ہی اچھا بڑا سوچ لیں گے۔

اتنی کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اباجان بہت دیر سے لڑ رہی ہیں۔ ظاہر وہاں سے تیزی سے چل پڑی

ہا پنے کمرے میں آگئی۔ اس کا سینہ اٹھ اٹھ کر مٹھ رہا تھا۔ بظاہر وہ بھائی کی کیفیت میں تھی۔ اس بھی تھی لیکن اس کا دماغ لڑنے

نل سے سوچ و فکر میں مصروف تھا۔ وہ رنجیدہ تھی لیکن ایس دن مارا نہیں تھی۔ اس کا عزم اور دلولہ پوری آب و تاب سے بیدار

ہو چکا تھا۔ ظاہر سے سوٹ کس کھولا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بچھ گئی۔ ایک گھنٹہ بعد وہ پینا اور قلم کے کمرے کے سامنے

بھی ہوئی تھی۔

یہ تو قارات کے اسرار رات کی خاموشی میں طلوع شمع کی پہلی سپید کرن کے سہارے اتنے کے ”دوسری طرف چپ

لے ہوئے اچھلا اٹھا گا۔ گرجنے لگا اور سوئے ہوئے اسرار کو جگا اور خود اتنی کی ادٹ میں چھپ گیا۔

ایک اور رات اتنی اور آشا بھون کو تیرگی کے پردوں میں لپیٹ لیا۔

ماب کے پاس پہنچ جانوں گی۔ تاہم ٹھیل دیکھا اور میری گاڑی منزلوں نظر آتی۔ یہ رات ساڑھے دس بجے لہا ہورے ملتے جلتے ہے  
 ٹرکوں کا آجیتا رہیں نے خود دکھا تھا اور خود ہی مار کھجوا کر دیا تھا.... ہاں! انہیں آپا! اور آپ بھی جانی جان! ادو لوگ میری  
 نہیں بیان تک ضرور نہیں گئے بار شد کا خط ضرور آئے گا خواہ کچھ ہی ہو، آپ انہیں کہیں کہیں میں بیان نہیں آتی۔  
 ”اس کی فکر نہ کرو۔“ منجھ نے کہا اور غاند کو قلعی لانے کو بھیجا۔ طاہرہ سے کہنے لگی۔ ”جسم نے تھیں غولہ تھوڑے  
 ایسے ہر باغ ہو۔ اپنی مرضی سے آتی ہو۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ کم زمان کی رشتہ دار ہو نہ کچھ کی گئی ہو۔ پتہ چل بھی گیا  
 باجرا ہے لیکن گمشدش ہی ہو گی کہ انہیں تھارا سرائے نہ ہے۔“

”ہات یہ ہے کیا؟۔“ طاہرہ نے ملول لہجے میں کہا۔ ”میں اب ان لوگوں کو اور اس گھر کے بچے بچے کو دل سے  
 دیا جاتا ہی نہیں اور نہ میرے دل میں ایک ٹھیل بھی رہے گی اور سکون نہیں مل سکے گا۔“

تاہم میں طاہرہ نے مختصر آنکھ کو عفت اور گھر والوں کی مزاجی تبدیلیوں کا حال سنایا، چھ چار کڑیں کہنوں کی آباد کاری  
 مری سنایا۔ نجمہ کے خاندان، اطہر، نے یہ بات سنی تو ٹھکر کر ایک بار پھر طاہرہ کو دیکھا۔ وہ طاہرہ کے متعلق بہت کچھ سن  
 تھا کہ جس انداز سے طاہرہ یہ باتیں سناتی تھی اس کے لیے حیران نہ تھا۔ اس کے انداز میں خود سنائی اور خود دہائی کا مختصر  
 بچا۔ وہ اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے اس کا ہر اشارہ معنوی ہی بات ہو جیسے ایک چیز بیان سے اٹھا کر دہائی رکھ دی۔

منجھ کا گھر آگیا تھا۔ ”جیسا جگہ تو نہ تھا تاہم اچھا خاصا مکان میں تھا کبھی کبھار سے سبکی اور پانی کا انتظام  
 فریج بھی اچھا تھا۔ منجھ نے طاہرہ کا تار ملتے ہی اس کے لیے ایک کمرہ تیار کر دیا تھا۔ اس وسیع مکان میں منجھ، اس کا خاندان  
 لڑکی، ملازم اور ایک نوکر رہتا تھا۔ اطہر کو ٹیلی فون پوسٹ پر ملازم تھا اور منجھ ایک سکول میں پڑھاتی تھی۔

سکول امریکن کونینٹ کی طرز پر چلایا جاتا تھا جس میں اردو اور عربی اور انگریزی کے برابر اہمیت دی جاتی تھی بچوں  
 لیے اقاعدہ بینفاہم تھی۔ اُستائیاں تجربہ کار اور بچوں کی تربیت اور نفسیات کی سوجھ بوجھ رکھنے والی تھیں فیس زیادہ ہونے  
 وجہ سے سکول میں کھاتے پیتے گھر انوں کے پچھے آتے تھے جو چھٹی جماعت سے سکول کے دو حصے ہو جاتے تھے۔ ایک لڑکیوں کے لیے دوسرا  
 رخت اُستائیاں پڑھاتی تھیں۔ بچوں کی جماعت سے سکول کے دو حصے ہو جاتے تھے۔ ایک لڑکیوں کے لیے دوسرا  
 دل کے لیے۔ لڑکوں کو مرد پڑھاتے تھے اور لڑکیوں کو اُستائیاں سکول سے ٹھنی سکول کا سولہ بھی تھا جس میں معدودے  
 رخت اور لڑکیاں رہتی تھیں۔ ان کی نگرانی کے لیے چند ایک اُستاد اور اُستائیاں بھی وہیں رہتی تھیں۔

سکول کے نظم و نسق پر خاص توجہ دی جاتی تھی تمام اُستاد اور اُستائیاں صرف ڈگری یافتہ ہی نہیں تھیں۔ دیانت دار  
 تھیں۔ دواستائیاں کو محض اس لیے ملازم رکھا گیا تھا کہ وہ دیانت دار اور معنی تھیں در زمان کے پاس کوئی ڈگری یا سند  
 نہ تھی بچوں میں دل چاہی لیا، بچوں کو قورم کی امانت سمجھا اور اپنے کو سکول کے دوران میں محسوس طہوڑے دینا کہ وہ مال  
 سے الگ ہو کر بے اسرا ہو گیا ہے۔ کوشش ترین سند سمجھا جاتا تھا۔

طاہرہ بھی اسی زمرے میں آتی تھی۔ منجھ نے اُستائیاں میں طاہرہ کا خوب پوچھ گچھ کر رکھی تھا۔ اس کے قصے سب  
 مانتی تھی تھی۔ وہ دوسرے ہی دن طاہرہ کو سکول لے گئی۔ اُستائیاں سے تعارف کر دیا۔ چند سٹرکس اور بینڈا سٹرکے

راولپنڈی ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی گھڑیوں، ٹرکوں، بولروں اور گھڑیوں کی طرح کہنوں کی طرح  
 ہونے والوں میں ٹھیل جی گئی۔ صبح ٹھہری ہوئی تھی۔ یوں تو سوری موسم بہار کے آغاز میں دم توڑتی جا رہی تھی لیکن وہ  
 پہلے کے آدوں اور بہار کی آمد کا اعلان کرنے والی پہلی بارش نے سردیوں کو دو چار روز کے لیے روک لیا تھا۔ سولہ  
 فرس بہار کے پیغام کو سینے سے لگا کر راولپنڈی ریلوے سٹیشن کی عمارت کے مندریہ پیشی کانپ رہی تھیں۔ پلیٹ  
 پر کھڑی ہوئی غولہ بھی کانپ رہی تھی۔ انہی نے سٹیشن میں داخل ہو کر دل چوری تو لڑتے ہوئے جسموں میں ہلائی گئی تھی  
 لوگوں میں یوں ہلچل مچ گئی جیسے وہ گاڑی کو پلیٹ فارم سے باہر ہی روک لیں گے۔ منجھ اور اس کا خاندان کینڈا کلاس کے انتظام  
 کے بارے میں ہی کھڑے ہو گئے۔ گاڑی کی رفتار سست تھی لیکن منجھ کی نگاہیں تیزی سے گاڑی کی کھڑکیوں کو کھٹکے  
 ”تا تو اسی گاڑی کا دیا تھا طاہرہ نے؟“ منجھ کے خاندان نے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔“ منجھ نے جواب دیا۔ ”اسی گاڑی کا.... وہ رہی طاہرہ۔“ منجھ نے خاندان کو کلائی سے پکڑ کر گھینٹے ہو  
 کہا۔ ”اُس نے ابھی نہیں دیکھا۔“

دیکھنے دیتی اور دیکھنے کھاتی غولہ کو چیرتی منجھ نے کلاس کے ایک زمانہ ڈبلے می گس گئی۔

”یہ رہے تھارے بھائی جان، اطہر صاحب۔“ منجھ نے طاہرہ کو مسافروں کے بلے منجھ ریٹے سے باہر  
 اور ایک غالی جگہ روک کر تعارف کرایا۔ ”وہی ہے صاحب! یہ میری سگی بہن طاہرہ سے۔“

”تھارا تارگل شام باغ بچے ملا تھا۔“ منجھ نے کہا۔ ”منجھ آئی خوشی ہوئی کو صبح کے انتظام میں سمجنت دار  
 گزرنے میں نہیں آتی تھی۔“

”میں نے تو اسے لاواراد کر رکھا تھا۔“ طاہرہ نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”لیکن ہاں کے حالات اپنا  
 اس قدر گروہ گئے ہیں کہ....“

”جولوہ تھار۔“ منجھ نے اس کا فہرہ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ جگہ جگہ پھر نہیں گے۔“ اس کے کان پر  
 ”کیسی کو بتا کر آئی ہو؟“

”تھیں!۔“ طاہرہ نے غلاب دیا۔ ”ارشاد اور عفت کے ہاتھ خط چھوڑ آئی ہوں۔“ منجھ نے توقع ہی نہیں کہ آؤ  
 ۱۹۰

”ارے دیکھنا میاں! غل خانے میں ہوگی۔“ اباجان نے نوکر کو درمستی سے کہا۔

”سبھی ناشتے پر بیٹھے طاہرہ کا انتظار کر رہے تھے لیکن نوکر نے اس کا اطلاع دی تو طاہرہ کمرے میں نہیں ہے اور نہ ہی غل خانے میں ہے۔“

”بارہی خانے میں ہوگی۔“ ارشد کے بھائی نے کہا۔

”وہاں بھی نہیں! نوکر نے جواب دیا۔“

”ابا جانے گی۔“ اباجان نے سہل سے کہا۔ ”دراودھ کو۔“

انی، بھابی اور عفت اس توقع پر خوش ہو رہی تھیں کہ طاہرہ اور دیر سے آتے تاکہ اس کی خود سری نہایت کی جا سکے۔

نی کے دل میں اس قسم کی خوشی بھی آتی کاش! طاہرہ اکیلی سر کوئل کی ہو اور مردوں کے سرخدا سے توجھ جائیں۔“

”بائزنگل گئی ہوگی۔“ عفت سے راز نگاہ اور انی کے دل کی بات کہ ڈالی۔ ”سیر کو گئی ہوگی۔“

سب نے عفت کی طرف دیکھا۔ عورتوں کی آنکھوں میں تائید اور مردوں کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔

لحمے تیزی سے گزر رہے تھے۔ ناشتہ ختم ہوا اور ارشد نے گھڑی دیکھی۔ وہ بے چین تھا۔ اس قدر بے چین کہ

غریبی دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ ابھی ابھی گھڑی دیکھ چکا تھا۔ بائیں منٹ گزرے، اس بجی گزر گئے۔ ارشد کے دماغ میں ایک

خیال ابھار اور وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے اس بے قراری کو چھپانے کے لیے نوکر کو ایک بار پھر طاہرہ کے کمرے میں بھیجا تاکہ

ہاٹ لینی آئے۔

”کیا بیہوش کی ہے۔“ ارشد اپنے خیال کے تحت جھانک اٹھا اور طاہرہ کے کمرے میں پہنچا۔

ایک شٹل کے تحت اس نے طاہرہ کی میز پر نگاہ ڈالی۔ وہاں دو لفافے پڑے تھے۔ ایک اس کے نام اور دوسرا

عفت کے نام۔ ارشد نے اپنے نام والا لفافہ کھولا۔ دھتور سے کافور کی تھیں سیوگیں اور ایک بی فقور پڑھ کر کرے

کے اس کوٹے میں دیکھا جہاں طاہرہ کا ٹرنگ اور سوٹ کیں رکھا ہوا تھا۔ سوٹ کیں غائب تھا۔ خط میں لکھا تھا۔

میارے ارشد!

”آشا بھون“ کو جس دھج بھرے دل سے چھوڑ رہی ہوں آپ میں سے کوئی بھی اس کا صحیح امانہ

نہیں کر سکتا۔ میں نے حالات کے ساتھ سمجھ کر تنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن حالات نے تعاون نہ

کیا۔ مجھے کو تو بہت کچھ ہے لیکن وقت کم ہے اور یہ خدشہ بھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ میرے ارادے

ٹھنڈے نہ پڑ جائیں۔ گذشتہ چند دنوں میں میری جد کی کیفیت اسی ہے میں نے اسے کچھنے اور احوال کو

کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ حجاز اوقات بچہ پر لگاتے گئے تھے میں نے ان پر بس دینے کی کوشش

کی ہے۔ میں نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ تم عفت کو اپنے دل میں جذب کرو میں نے یہ بھی کوشش کی ہے

کہ عفت اپنی عادتوں کو ہماری پسند کے سانچے میں ڈھال لے تم دونوں کو ایک راہ پر چلانے کی تبصری سہی میں

نے کی ہے اسے صرف تم جانتے ہو کہ میں نے عفت کو تمہارے حوالے کر کے کتنی غمگین و مریہ دہی اپنے

پاس لے گئی۔ سبھی طاہرہ کی کسین شخصیت اور بھولی بھالی، شگفتہ اور خود اعتمادی سے بھرپور باتوں سے متاثر ہوئے۔

ہینڈ مسٹرئس نے صرف اتنا کہا۔ ”لو کہ بڑی ذہین ہے، ہنڈر لیکن سکول میں ملازم رکھنے سے پہلے یہ

سوچنا پڑتا ہے۔“ ہینڈ مسٹرئس نے ایک آٹھ سوچ کر کہا۔ ”کل سے طاہرہ کو پہلے درجے میں لگائیے لیکن

اگر ہمارے معیار پر پوری اتاری تو میں مستقل ملازمت کا وعدہ کرتی ہوں۔“

میں آپ کی بے حد مشکور ہوں مسز فاروقی!۔“ ہنڈر نے شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے گھر پر

رہوں گی جس لوہی کے سات آٹھ ہزار روپیہ انسانیت کی صلاح و بہبود پر خرچ کر دیا ہے، اس کی روح کا مہلتا

سکتی ہیں۔“

”ہاں مسز طاہرہ!۔“ ہینڈ مسٹرئس نے تعریف کے لیے کہا۔ ”یہ تفصیلات تو آپ مناسی چکی ہیں۔ میں اس

کی قدر کرتے ہوئے اسے اس سکول میں جگہ دے رہی ہوں ورنہ آپ نے خود دیکھا ہے کہ ہم نے کتنی ہی کڑ

کو صاف جواب دیا ہے۔“

اور طاہرہ کو سکولی میں پہلے درجے میں لگایا گیا۔

”آشا بھون“ کی صبح صبح کی طرح طلوع ہوئی رہا نیچے میں ہمارے آغا کی بُورمان، انگریز فتنہ بگڑا ہی تھی

گزرتی ہوئی رات کی طرح رخصت ہو رہی تھیں صبح کی سروی کے ساتھ ہمارے طبعیت سوز کا بھی تہ تھا۔ عفت

سے منجھلی جاتی تھی۔ دو ستر سے ابھی اور کھڑکی کھول دی۔ سورج کی ایک زور کران ٹوکلیش کے لیے ترنگے تھے۔

تھی۔ کھڑکی کھلتے ہی خوشبو سے مضطرب ایک بھونکنے نے عفت کی پیشانی اور رخساروں کو چومنا اور اس کے دل دوا

داتوں اور ایک دن کی اعصاب زدگی کے ابعاد کے اثرات اور نیند کے غما کو دھو ڈالا۔

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اس کے ہونٹ اس طرح مل گئے جیسے اس روح افزا بھونکنے کا دوسرے

اس نے انہماکی لی اور ہمارے اس پیغام کو جیسے اس انہماکی میں مویا ہو اس نے وہیں کھڑے کھڑے گردن گم

سیر پر کی جوق ارشد کی تصویر کو دیکھا۔ تصویر کھڑا رہی عفت کے ہونٹ بھی مسکرا دیتے۔ اس کا سہاوت میں پیا

تھا اور ملی طرز بھی تھی شکست کا عنصر بھی تھا لیکن اس کے سینے میں ایک تپش تھی جس نے اس کی ٹانگ و دو کو

ہونے دیا تھا۔

”پانی لوں گی شگھے۔“ عفت کے گرد ایک سرگوشی منڈلا نے لگی جو اس کی اپنی تھی اور یہ سرگوشی صبح بہ

میں ختم ہو گئی۔

”ناشتہ تیار ہے بی بی جی!۔“ نیم دار وازے میں سے نوکر کی آواز نے عفت کو اس عالم وارفگی میں سے

اچھے میں وہ باہر کی دنیا کا ایک لفظ نہ سنا جاتا تھی۔ اس نے پھر سے جوئے خیالات کو پھر اکٹھا کرنا چاہا لیکن یہ

تھا وہ سہانسی گئی اور آہستہ آہستہ باہر نکل گئی۔



کندھوں پر نال ہی تھی میں اس پر دوسرے کو اپنے خون بکھر سے پہنچتی رہی۔ میں تیس گھنٹوں عفت کا گردہ  
میں لگی رہی۔ میں نے عفت کے لیے ایک کچھ نہیں کیا مگر میں بدنام اور سزا ہوئی، صرف اس لیے کہ میں  
اپنی قربانیوں کو شہر نہیں کیا تھا تو میرے معذور تھا۔ میں اپنی روح کے تقاضوں کو پورا کرنے کی قائل ہوں۔  
مجبوری ہے اور جو کچھ عفت، اافی جان اور بھائی نے کیا ہے وہ ان کی مجبوری ہے۔ کاش ایہ عورتیں نہاس  
کے لیے میرے مقام تک پہنچ سکتیں۔ معلوم نہیں مقام کس کا اور پنچا ہے لیکن جب یہ دیکھتے ہوں کہ ان  
اور میرے مقام آسمان پر بچکر سے جو تے ستاروں کی طرح دور دور میں تو میں نے یہی بہتر سمجھا کہ بیشتر اس  
تین ستارے ایک ستارے کے ٹوٹ کر اسے اور اپنے آپ کو بھی فانی کر لیں۔ یہ نہ تباہی ستاروں کو ٹوٹ جا  
اور ان تینوں کی تباہی کی کو تمام کھنے کی خاطر آسمان کی وسعتوں میں کھو جاتے۔

ارشاد! مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ اب مجھے نہ پاسو گئے۔ مجھے ہمتارے گھر کا وہ اچھا ناول  
یاد آکر ہے جب بچے سے بڑے تک ہنستے پھلتے تھے۔ وہ تھا نہ کوئی غم جلال آباد کی تو یہادی مرزا  
گئی تھی پھر میں نے اپنے ماتحتوں میں اور عفت کو دلہا دلہن بنایا اور آتشا بھون کی کو بھی ایسی دلہن بن کر  
جس کے جوہر کو میں سدا بہار اور جن کی خوشیوں کو میں دائمی سمجھتی تھی۔ لیکن انسان کی فطری کمزوریوں نے کوٹھ  
سماگ اچاننا شروع کر دیا۔ اس تباہی میں میرے وجود کو کتنا دخل تھا؟ صرف تہی جا تے ہر مایہ اور  
خدا جاتا ہے۔ لیکن گھر میں یہ شک یقین کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ یہ بربادی صرف میری وجہ سے ہے۔ ابنا  
بھائی پان اور تم نے میری دلالت بھی کی اور گھر پر بھجائے جو تے تھکر کو دور کرنے کی پوری کوشش  
لیکن عفت کے کل رات کے دورے نے چنگاروں کو پھر سلگا دیا۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی کہ اس  
تلاطم کا بھی مقابلہ کر دوں لیکن انسان کہاں تک گوارا کر سکتا ہے۔ ایک انسان اپنی زندگی کو کوششوں کا ایک قفا  
سلسلہ بنا کر رکھتی تھا۔ عفت بھی جانتا ہے جس میں دماغ اور دل کو تو قیمری کاموں اور صحت مند سوچ کی طرف  
لگایا جاتا تھا۔ تھی اس پر فزنی چوٹی پڑنا شروع ہو گئی اور دماغ ایک مقام پر کرک رہی نہیں گیا بلکہ پیچھے ہٹ  
شروع ہو گیا تھا۔

تم سب کو اودھ کہتے دکھ رہا ہے لیکن سب سے بنا دکھ جو میں اپنے ابراہیم کی  
طرف لے کے یہاں سے نکل رہی ہوں وہ یہ ہے کہ تم اور عفت میرے سامنے فدا کر کے لیے بھی اگر  
طرف در ہے جس طرح میں نے سوا چھائی میں تم دونوں کو سنا سنا، راستہ اور ایک دوسرے میں شہر و شکر دی  
کی خواہ مخواہ جتنی صدا فوس اتم دونوں نے میری امیدوں پر بانی پھر دیا۔

ارشاد! بہت کچھ یاد آکر ہے۔ بہت ہی کچھ یاد آکر ہے۔ جی جی جاتا ہے کھتی ہی چلی جاؤں لیکن اگر  
قتال سے رک رہی ہوں کہ یہ غبار غل کیا تو میرے حرم کی حرارت ہی نہ رہ رہا تے۔ میرے سمندر کی موجوں  
کا اضطراب ہی نہ ختم ہو جاتے، سمجھے ایک زندگی مینا ہے۔ میں اپنی زندگی بندے جا رہی ہوں، اپنا ایک

فرہم لے۔ خدا ہمتار گھر بساتے۔ امین۔ اب دعاؤں کے سامنے رہے پاس کچھ نہیں رہا مایہ التجارہ گتی ہے  
کہ خدا اپنا گھر بابا کو عفت میں کچھ خوبیاں بھی ہیں۔ انہیں تلاش کرو۔ اس کی دعاؤں کو برداشت کرو۔ اپنے  
آپ میں خدایں تبدیلی پیدا کرو جب ہمتار، بچہ پیدا ہو تو اسے میرا پاد دینا۔ بہت سارا پیار کاش! میں  
اس پر دوسرے کی پہلی کوئل تو دیکھ سکتی جسے میری نساؤں نے مینا تھا۔  
ابا جان! امی جان، یوسف بھائی جان اور بھائی کو دست بزنہ سلام کہنا اور میری طرف سے معافی  
مانگنا میری ہی تھی۔ انہیں بہت دکھ دیتے ہیں۔ بچوں کو پیار۔ رونی کو تانا کہ ہمتار نے لیے مرنے کے دوسرے  
درازمیں جا رہا تھا ان رکھی ہیں۔ خدا حافظ! ارشد! تمہاری طاہرہ

ارشاد! خط چلا تو اس نے دیران اور اجازت کر کے کے کونے کونے کو بھجا۔ ہر ایک چوک کو بھجا۔ اس کمرے میں طاہرہ  
بانی بھی زندہ تھی اور ارشد کو لیں لگا بیٹھے طاہرہ پلنگ پر ٹھچی ہے۔ وہی کمرہ است و ہی سکراتی ہوئی انھیں، رخساروں پر شہاب  
ہی رنگ اور شہابی پونہ کو با تو۔ اس نے کمرے میں جیسے ہلکی سر سر ہٹ سہی جو۔ اس نے چوک کر اودھ اور دیکھا وہاں  
بھی نہ تھا۔ اس کی اپنی اہم جو تھی سے دیران کمرے میں دوپہر کو اڑتے چنگاڑ کی طرح دیواروں سے ٹھوڑی تھی۔  
اس نے سر جھکا دیا اور وہی ایک لمحے کے لیے کمرے کی طرح خالی پایا۔ اسے ایک خیال آگیا کہ وہ اس کمرے  
کہاں آیا تھا۔ وہ اپنے خط کو لفافے میں بند کر کے، عفت کے لفافے کو لٹا دیا۔ عفت کے کمرے سے نکل گیا  
میں نے تباہی سے نظر تھے اور سب کے چہروں پر بے تابی ظاہر ہونے لگی تھی۔ عورتوں کی قیادت میں حصے کا عنصر غالب تھا  
نہ اس نظر مشکل کے پاس ما کھڑا تھا اور اپنا لٹا فافہ ابا جان کے سامنے، دوسرا عفت کے سامنے پھینک کر دروازے  
طرف لپکا اور زور سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ابا جان خط چلا رہے تھے اور ان کے چہرے پر بڑھ چاہے کے آثار گرے جو تے جا رہے تھے عفت نے  
لفافہ کھول کر خط پڑھنا شروع کیا اور اس کے چہرے کی نہجت کو چھو دوں سے زردی مال ہوئی تھی جی سفید ہو گئی۔  
نہ خشک ہو گئے اور اس نے پیاس کی شدت محسوس کی۔ باقی افراد حیرت سے دونوں خطوں کو دیکھ رہے تھے۔ سبھی  
رہتے کر دیکھا ہے؟ ارشد کو کیا بڑا؟ وہ بتاتے بغیر کہاں چلا گیا؟ کسی کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ طاہرہ اکیلی کمرے سے باہر  
تی ہے۔

ابا جان نے خط ختم کیا تو ان کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ آنسوؤں کو روک رہے تھے۔ انہوں نے خط پوسٹ  
سامنے پھینک دیا اور آشتی کیے بغیر کمرے سے نکل گئے عفت کو غشی سی رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے خط ختم  
کر لیا اور اٹھ بیٹھی امی اور بھائی نے اسے چھٹی چھٹی نظروں سے دیکھا۔ وہ اچانک دروازے کی طرف چل پڑی۔ اس کے  
لڑکھارے تھے کسی نے اٹھ کر اسے سمانا دیا اور وہ کمرے میں سے نکل گئی۔

”آخر یہ ہے کیا؟“ امی نے بے صبری سے پوچھا۔ ”یوسف! اب میں بھی تو کچھ بتاؤ۔“  
”معلوم ہوتا ہے گھر میں کوئی ہی کارروائی ہوئی ہے۔“ بھائی نے قدرے طنز پر لمحے میں کہا مالا محلا وہ بھی حیرت

”اوندھے منہ فرش پر بے ہوش پڑی ہے“

ارشاد بھی کو بھی کئے چھ تک سے نکل ہی رہا تھا کہ اپنا جان نے اسے روک لیا اور قریب جا کر کہا: "واکرا کو بارہو کے متعلق کچھ نہ بتانا۔ اتنا ہی کہنا کہ عفت کو پھر دور پر لگایا ہے اور دورے سے پہلے قے آتی تھی۔"

میری پیاری عفت! آخری سلام قبول کرو۔

مقصود ہی تھا کہ میں معلوم نہ ہو۔ اس کا انجام بہت بھیاںک ہوا۔ اُس نے میری ماہیں جھٹنے کی بجائے مجھے ہی ہمتوں کی زد میں لے لیا جس سے ارشد اور زیادہ جھٹک گیا۔ اگر تہمیدی داعی قوتیں ازدواجی زندگی کو بہتر بنانے میں صرف کرتی تو آج کھل کر یہ حالت نہ ہوتی۔ گھر کا ہر فرد ایک دوسرے کو سچی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ ایک طرف اباجان اور ایک جان ایک دوسرے سے اچھے ہوتے۔ دوسری طرف بھائی جان اور بھائی دوست و گریبان ہو رہے ہیں میرے احوال ہوا اسے مجھ تک ہی رہنے دو اور اس بنگلے کا لاچار شدہ رہ ہوا، اُس نے ارشد کو تہم سے ارشد کر دیا ہے۔ میں نے اس صدمے کو اپنے دل میں جذب کر کے یہی گوشش کی ہے کہ ارشد اور تھارے درمیان جو دور احوال ہے اسے گرا سکوں کہیں غم نے تعاون نہ کیا۔ تھارے دوج کش کہیں۔ اور زندگی بھائی نے اس دوار کو اسے مضبوط بنا دیا۔ میرے غم پر

”کی اور کا گھر جانا ہے۔ یہ سب نے سخت تھکے اور طرز سے بھرے ہوئے ہیں مجھے جواب دیا ہے۔  
وہ گھر جسے تم نشانیں کا گھر کہتے ہو۔ وہ تمام ہی قاتل سے بھرا ہے۔ اسوچہ آدمی جان دیا سوچہ اس کا گھر کوسوچہ  
ایک لاوارث اور کنواری لڑکی پر کیا ہے۔ اس لڑکی پر جس نے پناہ گزینوں کو پناہ دی ہے اور خود جانے کہاں پناہ  
چلی گئی ہے۔“

عفت کا راجھی کسی کو خیال ہی نہیں تھا اور جیانی کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ بچے ناشترہ کر چکے ہیں، انہیں سکول کے لیے تیار ہے۔ اتنی بھر خطا کے اوپر جھک گئی اور انہیں سیکڑ کر پڑھنے کی یوسف شیلے شیلے منہ بڑھ گیا۔ ابا جانی کو اوائل لائبریری سے آ رہی تھی۔ ارشد کو انہوں نے دے دیں بلایا تھا۔ یوسف بھی ان کے پاس جا بیٹھا۔

”لیکن سوال تو یہ درپیش ہے! اب جان کہ وہ کئی کہاں ہے؟“ یوسف نے فکرمندہ لہجے میں کہا: ”وہ اس کا عمور کریں۔ جانے رات کبھر کہاں رہی رلا ہو میں جی کہیں رہی نہیں ہے یا کہیں باہر چلی گئی ہے۔“

”ہاں بی بی جان! — ارشد نے اٹھڑی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہ اتنی اوجھی و اجال نہیں۔ اس کے پاس سو روپے تھا۔ وہ گئی راولپنڈی ہے۔ جہابی کو بھجر کے رشتہ دار دل کے ہاں بھیجتے ہیں۔ وہاں سے بھجرا کا ایلرل منگوا دے کرو پوچھ لیتے ہیں۔“

”اگر شہزادہ! — ابا جان کو جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو۔ غفلت کے خطا میں تباہ ہونے جانے کی کچھ لکھا ہے۔ دُعا  
کے بغیر جو غفلت کی حالت کیسی ہے؟ اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا، اس حادثے کا رد عمل تو دیکھ آؤ۔“

معفت کی حالت اور طارو کی خوشگلی۔ اباجان نے غلامیں دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لیے میں کہا۔ ”دو دن سکے بیٹھے نظر آتے ہیں“

”اگر وہ راولپنڈی پہنچی گئی ہے اور ہم اسے واپس لانے والے چلے جائیں تو وہ واپس آئے گی نہیں۔ یوسف نے کہا۔ لڑکی ارادوں کی بڑی بچی ہے، اباجان، طاہرہ، معفت کی قسم کی لڑکی نہیں۔“

”مرثیقین ہوجائے کہ وہ بچہ کے پاس ہے۔“ اباجان نے ہاتھ دے میں تھلے ٹوٹے کہا۔ ”میں قتل ہو جائے گی جہاں تک واپس لانے کا سوال ہے، ہم زبردستی تو کر نہیں سکتے جو چاہی گئی ہے وہ آئے گی نہیں لیکن میں اس کی ملکوتی کے لیے کھڑی ہوں اور یوسف!۔“ اباجان کے لیے میں بلکا سا ارتعاش پیدا ہو گیا اور وہ تھوکر لگ کر فہلے میں طاہرہ

ایک بار دیکھ کر مڑا چاہتا ہوں میں اس کے سر پر الوداعی ہاتھ ضرور بچہ چاہتا ہوں کس قدر پیاری بچی ہے۔“

”میں تو اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا ہوں، اباجان!۔ یوسف نے کہا۔ ہمارے گھر کی عورتوں نے اسے بھام کر کے گھر سے نکالا ہے۔ معفت نے اپنی عمر و ذہنیت کا ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ۔۔۔“

”نہیں! معفت کا اس میں قصور نہیں۔“ اباجان نے ترمیم کی۔ ”فوجان ہیری کے احساسات بڑے نازک ہوتے ہیں اس کا یہ تو عمل قابلِ فہم ہے۔ جانتے ہو اس پر آج دورہ کر لیں!۔“ اباجان نے حالانکہ اسے خوش ہونا چاہتے تھا کہ اس کی لہ سے طاہرہ جھٹ گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی شخصیت فوٹ جھوٹ گئی ہے۔ ایسے فرائض کا دورہ اور ناؤ بھی غیر منظم ہوجائے، خیالوں میں انتشار، ذہن میں کشمکش اور ایسا ہنگامہ برپا ہوجاتا ہے جس سے اس کے اعصاب اس فساد کے قتل نہیں ہو سکتے۔ معفت طاہرہ کو ہزار دہن سمجھتی ہے لیکن اسے اپنی بی بی جی سے ایسی آواز سنائی دیتی ہے کہ میں طاہرہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اس کے ضمیر کی آوازیں ”دوا“ اور بعض اوقات دو سے بھی زیادہ ہوجاتی ہیں۔ سر اور دوسری آواز کی مخالفت کرتی ہے۔ معفت کے معاملے میں اس کا ضمیر ایک خیالی جرم کی گرفت میں آگیا ہے۔ یہ مرض لاشک و شبہ نفسیاتی ہے۔ ٹاکر نے ایک اہم فیاض کا پتہ دیا ہے۔ آج اس سے بات کروں گا۔۔۔ لڑکی کا صاحب آگئے ہیں۔“

ایک گھنٹے کے بعد ٹاکر، اباجان، یوسف اور ارشد نشے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹاکر بغیر ناشتہ کیے آگیا تھا اور یہاں بھی کسی نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔

”مرثیقین کو تندرست ہونے میں فدا وقت لگے گا۔“ ٹاکر نے کہا۔ ”میں اس وقت زیادہ ترجیح دے کر وقت دے رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ خیریت سے پیدا ہو، اور وہ مال کے مرض کے اثرات سے بچا جائے۔۔۔ یہ کتنا مہینہ ہے؟“

”ابھی تو چھ ماہ باقی ہیں ڈاکٹر صاحب!۔“ ارشد نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔ ”طویل عرصہ ہے۔ خدا لا آپ مجھے لاسبت خیال رکھیں میں آج آپ کے دیتے ہوئے ایڈریس پر پروفیسر عارف سے مل رہا ہوں۔“

”ہاں ضرور بیٹے۔“ ٹاکر نے کہا۔ ”نفسیاتی علاج بہت جلد شروع ہوجانا چاہیے۔“

مسئلہ تین دن معفت کی یہ حالت رہی کہ وہ رات کے چوبیس گھنٹوں میں گھٹنے ٹیڑھ گھٹنے کے لیے آنکھ کھولتی تھی جسم نارمل حالت پر آجاتا۔ آنکھ میڑی جوتی سائینس منجمل جاتی تھیں پشیر اس کے کہ وہ اپنے آپ کا ڈر گروپشیں کا بارہ

چونکہ تھماری غلامی بہرہ دہتی اور میں نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا، اس لیے میں نے آخری کوشش کی ہے کہ تھماری خوشامد کے مطابق اپنے وجود کو تمہارے سامنے سے، یا ارشد کے سامنے سے جھانکنا خیال ہے ہٹاؤں۔ یہ میری آخری کوشش ہے اگر یہ بھی ناکام ہوگئی تو یہ میری بہت بڑی شکست ہوگی مجھے اب فوٹ کے اس میدان میں نہیں آنا۔

حقیقت پیاری امیر مقصد احسان کو انہیں میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں اور یہ میری آخری امتحان ہے کہ میں نے تمہیں ارشد کے ساتھ بیاہ کر اپنی ان آرزوؤں کی تکمیل کی تھی جو میرے دل میں تمہارے لیے ترتیب دی تھیں تم نے مجھ پر جبر الوہام لگاتے ہیں مجھے ان کا وہ بھرا فسون نہیں علم ہے تو اپنی آرزوؤں کا کڑ

کا ہے۔ تم نے میری اسلگون کو بڑی بے دردی سے سلا ہے۔ اب مجھے کچھ نہیں بڑا میری بہن! اپنے آپ میں صرف اتنی سی تبدیلی پیدا کر کو محبت جہم اور جہانی آسودگی سے آزاد ہوتی ہے جسے تم محبت کا عروج سمجھتی ہو وہ اس پاک جذبے کی موت ہے۔ میرا مطلب جسم کو نظر انداز کر دینے سے بھی نہیں لیکن اعتدال کی ضرورت ہے۔ ارشد کو روحانی محبت کی ضرورت ہے۔ ذرا اس کے مقام کو سمجھو اور اپنے آپ کو اس کے سر پر کردار اس پر قبضہ کر لینے کی کوشش نہ کرو تم اسے اپنی گرفت میں لے کر اس طرح بیدار سے تھوڑا رہی ہو جس طرح کچھ کچھ کو کچھ کچھ میں دلیا ہے۔ ذرا چہرے کے احساسات کا تصور کرو۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اپنے آپ کو کمرے کی حدود اور تنگ دنیا سے نکالو اور پیش کے انسانوں میں اٹھو، بشیر اور ہنسکو، علم نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں قید کر لیا ہے اور تم ارشد کو بھی قید کر لیتا چاہتی ہو میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ارشد تمہارے قریب آنا چاہتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ خدا کے لیے، اپنے اور اپنے ارشد کے لیے اور پٹ میں پیتے ہوئے اپنے پیچھے کے لیے اپنے آپ سے نکلو اور طبیعت سے بچنے کی مثال دو۔

خدا تمہیں صحت یاب کرے اور پیچھے کی پیدائش بخیر و خیر ہو جائے۔ آمین۔ کاش! میں بھی تمہارے ننھے کا منہ چوم سکتی لیکن۔۔۔

پیاری معفت! میں صرف تمہارے لیے اپنے وجود کو آشامیوں سے دور لے جا رہی ہوں۔ خدا میری یہ کوشش کا مایاب کرے آمین میں اپنا تمام زلیخا تمہارے لیے چھوڑ چکی ہوں۔ تنگ کے بائیں کوٹے میں رکھا ہے۔ یہ سب تمہارے لیے ہے۔ پانے پونے کا زلیخا اور دنیا اور دلی چیزیں ہٹا کر نا۔ اگر میری بات مانو تو پورا زلیخا زلیخا ڈالو یہ پیسے تمہارے کام آئیں گے۔ ان میں سے اپنے کمرے کے لیے اچھا سا ریڈیو خرید لیں۔ تمہارے کمرے میں ریڈیو ضرور ہونا چاہیے۔ اچھا معفت پیاری! الوداع!

میں ہمیشہ تمہاری طاہرہ





بجھرا اور طاہرہ نے خط سنا تو دونوں نے پوسٹ کر دینے کی منظوری دے دی۔ طاہرہ کے دماغ میں ایک بات بولی — "اے بیٹی بھائی جان! اسی خط پر میں بھی کچھ لکھ دوں۔ تصدیق ہو جائے گی۔" اس نے اظہارِ کلام کیا اور اسی خط کا دوسری جگہ باقی تھی۔ وہاں لکھا۔

محترم ارشد صاحب! اسلام علیکم!

میں کبھی کہہ پاس آ رہی تھی کہ اتفاقی سے میرے ایک رشتہ دار بزرگ شیش پرل گئے اور ان کے اصرار پر میں ان کے گھر چلی آئی۔ یہ گھر میرا اپنا ہے اور اب اسی گھر کو اپنا بنالیا ہے۔ میں اب بچہ آپا سے نہیں بولوں گی۔ میں پرسوں صبح چچا افتخار صاحب کے ساتھ ایسٹ آکامیٹی جاتوں گی۔ انھوں سے کہہ رہا ہوں کہ مستقل ایڈریس دیں۔ مجھے غمت کی بیماری بہت خیال ہے۔ خدا سے صحت عطا فرمائے۔ آمین۔

والسلام  
طاہرہ

بھائی کی ہے۔  
ارشد کو کون تو ہوا لیکن دل کی بے چینی میں اضافہ بھی ہو گیا۔ اس بے چینی کو اس نے "افتخاریگ" کے آئندہ خط کے ذریعہ لکھیں دی شرمع کر دی۔

بہنیں طلوع ہوئی تھیں۔ ساتے بے ہو کر چھوٹے ہوئے رہے، چھوٹے ہو کر پھر بے ہوئے اور انوں کی تاریکی گہم ہوتے رہے۔ راتیں دن کے تقاب میں بھاگی تھیں۔ ارشد ایک انتظار کی مٹی میں سوتا رہا، اسی مٹی میں جاگتا رہا۔ طاہرہ کی اس کے دل و دماغ پر ان ہر نفس کی گئی اور اس کی زندگی ایک مسلسل انتظار کی رہ گئی۔ دل بے قرار نہیں بے چین۔ لاکھوں اداں، سانسوں کا تسلسل ہی جیسے بے رابطہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ شین کی طرح صبح و شام کے ٹکڑے کے ساتھ چلنے لگا۔ کچھ عذر و فرستہ ہسپتال۔ ہسپتال سے کچھ۔ اور اپنے کمرے میں وہی تنہائی اور طاہرہ کا سر کوشاں کرتا تھا تو غور۔ اعصاب بگڑ رہے تھے اور ایسا ہی ایک بوجھ منیر پر جیسے کسی عزم کا بوجھ ہو۔ طاہرہ کو ہم نے بدنام کر کے بھگا دیا ہے۔ پانچ سینے گر گئے۔ "افتخاریگ" کا دوسرا خط نہ آیا۔

غمت ابھی ہسپتال میں تھی جیسے ہسپتال میں اس کا گھر بن گیا ہو۔ اتنی جذباتی روز بعد گھر گئی تھی صرف ملازمہ وہاں انکار نے کہا تھا کہ مرض خضہ جا رہا ہے اور علاج میں کچھ عرصہ لگے گا۔ غمت کے دوروں میں تو بہت کمی آگئی تھی۔ دو تین دنوں میں بغیر دوسرے کے گزر جاتے تھے لیکن کمرہ داری اور خن کی کمی بدن بدھتی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی فوری طبی حالت بھی بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ غذا پوری طرح کھا نہ سکتی تھی۔ مثلی اور تھکی کی بھی شکایت رہتی تھی۔

پروفیسر عاقل اپنا درکار گزارا تھا کہ مریض کے لاشعور کے منہب ساتے دھوئے لیکن اس کی ٹوکشیں ضائع ہوتی جا رہی تھیں لہذا وجہ یہ تھی کہ ارشد نے اور نہ ہی غمت نے ہائپرنسیات کو پتہ چلنے والا کہ اس کے بچپن کے اثرات کی ہیں اور اس حال اور اس کے تجویز میں چودہ سال گزارے تھے۔ یہی مرض کی جڑ تھی اور یہی پروفیسر سے چھپائی جا رہی تھی ارشد طاہرہ کے لیے ہوتے دھڑے کو پورا کر رہا تھا۔

غمت خود بھی اس حقیقت کو ظاہر کرنے سے گریز کرتی تھی۔ ارشد نے اسے ایک بار کہا تھا کہ اپنے آپ کو طاہرہ کی جگہ لا کر دیکھو۔ اس سے غمت کو بڑا اطمینان ہوا تھا۔ اب پروفیسر عاقل نے کہنا جو شروع ہو گیا تو غمت نے بیک کر عیب پروردہ خال لیا۔ یہی اسباب تھا جس نے اس کے شعور اور عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس معاملے میں ارشد ساتھ دے رہا ہے اور یوں مریض کے اہم ترین پہلو کو مابہر نفسیات سے چھپا کر اسے مزید پیچیدگیوں میں ڈال دیا گیا غمت کی کہ دوسری بڑی وجہ طاہرہ اور ارشد کی محبت تھی جسے ارشد نے ظاہر کیا نہ غمت نے۔

مریض کو بچپن کے متعلق کوئی اہم بات یاد نہیں رہتی۔ ایک دن پروفیسر عاقل نے انکار کیا — "یاد ہے کہ اس کا دن ماضی نہیں دے رہا۔ نہ ہی آپ میں سے کوئی میرا مسئلہ حل کر سکتا ہے۔ یہ میری سب سے بڑی مشکل ہے جسے میں نے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

ارشد دفتر سے لوٹ کر ہسپتال گیا۔ غمت کی حالت بہتر تھی اور ارشد کو کچھ کہہ کر پھر سے کچھ روکنی آگئی تھی لیکن اندر کو جنس کی تھیں۔ غمت کو دیکھ کر ارشد کا انھوں سا بڑا۔

"طاہرہ کچھ تیز چلا؟" غمت نے مری سے لیے میں پوچھا۔

ارشد کے دل میں غمت کی ہمدردی زیادہ ہو گئی تھی۔ "دراستاسوں کو جواب دیا۔" پتہ تو نہیں چلا لیکن وہ آج — دراصل اس کو پوچھا۔ غمت طاہرہ یاد آتی ہے؟ — ارشد نے ایسے لیے میں پوچھا جیسے چاہ رہا ہو کہ کوئی اس سوال پوچھے اور وہ داستان دل کھول کر بیٹھ جاتے۔

ارشد کے لیے میں والدین پر کیا کچھک تھی غمت نے اس جھلک کو محسوس کیا۔ اس کا دل غم سے ڈوبنے لگا۔ "اس کو نکل آئے۔ اس نے سر نہ پر سر کو یوں بلایا جیسے کہنا چاہتی ہو۔" طاہرہ بہت یاد آتی ہے۔۔۔۔۔ اور تم بھی! ارشد پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے آنسو روکے۔ طاہرہ اس کے قصہ پر چھپانے لگی۔ ارشد نے! میں اپنا ہاتھ غمت کے ہاتھ پر رکھ دیا اور مہر دی سے بھر پور لیے میں کہا — "دوسوا، غمت! دوسوا بیکرو۔ تندرست ملک طاہرہ کو یاد نہ کر دو۔ وہ آجائے گی۔"

ارشد نے ظاہر غمت کو لیکن حقیقت اپنے آپ کو تسلیم دی تھی۔ اسے کچھ سکون سامعوس مبرا اور کچھ ایسا ہی غمت نے پایا۔ ارشدانی کے ساتھ دو باتیں کر کے نکل آیا جب وہ گھر پہنچا تو بھائی نے اسے خط دیا۔ اس نے بار بار کھڑے کھڑے خط کھولا اور پڑھ لیا۔

کہاں سے آیا ہے؟ — بھائی نے جو ابھی اس کے پاس کھڑی تھی پوچھا۔ طاہرہ کا تو نہیں؟  
آج کا ہے! — ارشد نے خط بھائی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "ایک مختصر دور مبرا۔ خدا کا شکر ہے۔"



لیڈی ڈاکٹر نیاز اور لگا رہی تھی سب کو زیادہ فکر زچگی کے وقت کی تھی۔ یہ ایک عجیب المیہ تھی۔ ڈاکٹروں نے انا کا اظہار کر دیا تھا کہ پیدائش کے وقت دونوں یا ایک جان کے ضائع ہونے کا امکان ہے۔ طاقت کے انکشاف پر رہے تھے۔

بچے کے پیدا ہونے میں صرف ایک ماہ باقی تھا۔ آخری ماہ!

ابن باج مینٹول میں طاہرہ قیسری جماعت کی اُستانی بن چکی تھی۔ چند لوگوں میں ہی اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ بچوں کو پڑھانے وصال کی تربیت کے متعلق ایک خاص صلاحیت رکھتی ہے جسے ذرا ابھارنے اور موقع دینے کی ضرورت تھی۔ سہیلہ بی نے اسے ایک تجربہ کار اُستانی کے ساتھ لگا دیا تھا اور ہر گھر میں اسے فریٹنگ دیتی رہتی تھی جس سے طاہرہ کو یہ فہم دیتی رہتی تھی کہ ایک بچہ کی تعلیم کی جگہ پر بھی ایک اچھی تعلیم دینی پابندی کے قابل نہیں تھے۔ انہی خاتون کی تربیت اس کے رگ و ریشے میں رہی تھی اور اظہار سے ہر سلسلہ سے جانچ دیکھ کر پہلی کی جگہ قیسری جماعت میں لگا دیا تھا۔

گو طاہرہ کی روح اور دماغ کسی بھی ذہنی پابندی کے قابل نہیں تھے۔ انہی خاتون کی تربیت اس کے رگ و ریشے میں رہی تھی مانے اس کے سینے میں سوز بھر کر کھاتا تھا۔ پھر بھی بعض اوقات اس کا ذہن کی گزری باتوں اور یادوں میں المیہ ہی جاتا تھا۔ اسے درفٹ یاد آ رہی جاتے تھے۔ اسے اسی ساجدہ، اسی خاتون اور جلال آباد کی گلیاں بھی یاد آتی تھیں۔ ان تصورات نے اسے سڑ بھلائی میں پسکائی بھی، اور اس بھی جڑی لیکن اس نے محسوس کیا کہ یہ تصورات اور یادیں اس کا وقت ہی ضائع نہیں کرتیں بلکہ ان کے اثرات روح کو مہیا دیتے ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو سکول کے بچوں میں جذب کرنا شروع کر دیا اور تمام نوجوان نوجوانوں کو اپنے گھر میں لایا۔

گھر میں بھر دیا اور اطہر کے ساتھ ہنسی مذاق اور کھیل کودیں لگی رہتی جس سے بھرپور اور اطہر نے اپنے گھر میں عجیب و غریب رونق پائی۔ وہ چند دنوں میں ہی بھول گئے تھے کہ طاہرہ وہ بچی لڑکی ہے۔ طاہرہ نے جلال آباد اور لاہور میں گزارے ہوئے شب و روز ان کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اسی ساجدہ اور ارشد کی تصویر دیکھ لیتی تھی اور یوں اس نے ماضی کے ساتھ بے مضر سا تم کر رکھا تھا۔

یہ طاہرہ ہی جانتی تھی کہ اپنے آپ کو سر کرنے کے لیے کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ منزل کتنی دور ہے جب فی تھی تو لوگ اس کی جاؤ بھری سکراہٹ دیکھ کر کھل اُٹھتے تھے لیکن کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ اس سکراہٹ میں ایک اور ناک کیانی کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ طاہرہ نے اب بلند قفسے لگانے شروع کر دیے تھے۔ یہی سکاڑا ڈالام نے رکھنے کی ایک کوشش تھی۔ وہ اپنے اندر سے ابھتی ہوئی ان آوازوں کو بلند قفسوں میں دہا لیتی تھی جس سے پوری چھپے اظہار جاتی تھیں۔ ارشد کو قریب نہ پا کر اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اسیے میں طاہرہ عجب کے پیچھے پڑ جاتی تھی، اور بڑا غراہ کبھی

ابک اور مرگا اٹھا بلکہ اس لیے کہ ارشد کی یاد اس کے دل میں ایک غلش پیدا کر دی تھی۔ اسے جلال آباد کا وہ دن اور وہ لمحہ یاد آگیا تھا جب ارشد اپنی کشتیت سے اس کے گھر سے میں داخل ہوا تھا اور طاہرہ اسے دیکھ کر کھڑکی پر تھی۔

نعیم کو دیکھ کر طاہرہ کی یادوں کی دنیا میں بھونچال آگیا۔ راجی کو بھڑی ہوئی منزل یاد آگئی۔ وہی شرم و حجاب اور ایک جھجک اٹھی جس پر طاہرہ کی ہونٹیں جو اس وقت طاری ہوئی تھی جب ارشد اس کے گھر سے میں داخل ہوا تھا۔ اس حجاب کا تاثر کچھ اور تھا۔ نعیم نے کچھ اور چیز یاد کر لیا۔ طاہرہ وہاں اس کی ہونٹیں ارشد کی یاد نے اسے تڑپا دیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ارشد کو بھول جانے کی گوارا شدہ تہبب کی نمائندگی کی روح میں موجود تھا۔

طاہرہ نے دیکھا کہ بوجھ بھی ارشد اور نعیم کے ساتھ گھر سے میں چلی گئی ہے۔ طاہرہ کو بھی ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا لیکن وہ جھجک کر دین کھڑی رہی، مگر طاہرہ اسے گھر سے میں ملازمت تو وہ فیصلہ ہی نہ کر سکتی کہ اسے گھر سے میں نعیم کے سامنے جانا چاہیے یا نہیں چھپ جانا چاہیے۔ وہ کسی ایسی چیز کی ایسے انسان کو نہیں دیکھنا چاہتی تھی جاسے ارشد یاد دلا دے۔

”آج تو طاہرہ آج آج آج۔“ طاہرہ کی آواز آئی جس کے ختم ہوتے ہی طاہرہ گھر سے میں چلی گئی۔  
”یہ جناب آپ سے شرمناک ہے۔“ طاہرہ نے نعیم کو توجہ نہ دے کر کہا۔ اسے معلوم تھا طاہرہ اور نعیم کی یہ تکلفی کڑائی ہے اور وہ خیر فہم کا ہنسی مذاق اور بات کر گزرتی ہے۔

طاہرہ کے لال گلابی ہونٹوں پر شرم سے بھر پور مسکراہٹ لگتی اور اس کی مسکراہٹ میں انھیں جھجکتیں۔ طاہرہ نے پہلی بار ان کے بلکہ طاہرہ اصل ہنسی سے زیادہ جھین ہے اور اس کے حسن میں ایک وقار بھی ہے۔ اس شرم میں ایک جادو تھا۔ نعیم کو بھی محسوس ہوا کہ اسے کہہ رہی تھی۔ ”بھائی جان! آپ پہلے نہ مایوس نہ ہو۔“ وہ طاہرہ کے شرم اور دھن اور دلکشی میں اس قدر کھو گیا تھا کہ بڑھ کر آواز اسے چونکا نہ سکی۔

تھوڑی سی دیر بعد طاہرہ کھل گئی اور جب اس نے باتیں شروع کیں تو سب نے محسوس کیا کہ ایک نعیم شرمناک تھا۔ نعیم جس روز وہ دل تھا۔ اس قدر شرمناک تھا۔ نعیم شرمناک اس کے مراد میں میں اٹھانے لگا کہ ارشد کا جب طاہرہ نے اس کے شرم اور ہلک کر دیکھا تو وہ اوکھل گئی اور براہ راست نعیم سے مخاطب ہونے لگی۔ وہ جوں جوں نعیم کے ساتھ باتیں کرتی جاتی تھی نعیم تو جیسے لڑائی جاتی تھا۔ طاہرہ نے جب مذاق شروع کیے تو وہ کھل کر ہنسنا اور تیرتی تھی جو طاہرہ کو بہت سی ہنسند آتی پھر طاہرہ اسے برا بھونچنے اور مہینا سے میں ہی لذت محسوس کرنے لگی۔

نعیم میں باب کا اکٹلا ہوا تھا اور دونوں کے لادو بیکار کر رہی۔ اسے پاس کرتے ہی اسے اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ اس ان بھی نکتہ کچھ کی طرح اس سے پیدا کرتی تھی جس نے نعیم کو بیکار سا دیا تھا۔ چودہ برس کی عمر تک ماں اسے اپنے ساتھ اپنے رہیں لایا کرتی تھی۔ باب حقیقت میں آدمی تھا۔ اس نے کئی بار نعیم کی ماں سے کہا تھا کہ لڑکا کو دیا جائے گا جو ان ہوتا ہے ایسا لہجے کا بچہ ہی رہ جاتا ہے لیکن ماں کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ”ابھی تو بڑی تو ہے۔“  
”بس کی ماں کو تو قائل نہ کر سکا تھا، اس نے نعیم کو اپنے طور پر تربیت دینی شروع کر دی اور اسے دنیا کے حقائق اور فطرت

بھی حالت میں ہوا جسے بچوں کی طرح چھیلنے اور شراپا کرنے لگتی تھی۔ طاہرہ نے بہت حد تک اپنے آپ کو سرجھکایا اور فریب بھی دے لیا تھا۔

ایک شام جب طاہرہ دفتر سے واپس آئی تو اس نے بھوکو تپا کہ اس کا ایک دوست پشاور سے آ رہا ہے۔ وہ ارشد اپنے ایک بھائی کو کورس کے لیے جس کی سیوا دینا وہ بھی آ رہا تھا۔ طاہرہ کے ساتھ اس کی گہری دوستی تھی۔

”کیوں نہ اسے تین ماہ کے لیے اپنے گھر لے لیا جائے۔“ طاہرہ نے بھوکے کہا۔ ”پنڈی میں اس کا کوئی ایلا نہ بارشتہ ملازمین جس کے ماں وہ گھر کے کہاں ہونٹوں میں خواب ہوا پھر کے کا نام اور طاہرہ نے پروے کی پنڈی کھی تو اسے اور اسے بھی وقت ہوگی۔ بھلا آئی ہے اور بڑے اچھے خاندان سے ہے۔“

”تو ہم پیسے کون سا پروہ کرتی ہیں۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”خواہ مخواہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو فریب دے لکھانے آدمی کیا ہے؟“

”آوی خوب ہے۔“ طاہرہ نے ملٹن جوکر جواب دیا۔ ”تکفیر مزاج آدمی ہے اور نہ ہی کھلی تکفل کو پسند کرتا ہے۔“

”ہاں کیا ہے اس کا؟“ بھونچنے پوچھا۔  
”نعیم۔“ طاہرہ نے جواب دیا۔ ”باب اس کا خاصا دانشمند اور سیدھا سادہ آدمی ہے لیکن اس کی ماں کچھ ایسا ایسا

نعیم ان کا اکٹلا ہوا تھا۔ ماں باب نے اسے بے جالاؤ و پیار سے کسی حد تک بگاڑ رکھا ہے۔  
”اکٹلا تو بڑھرا۔“ بھونچنے نے کہا۔

”اس کی ماں شکی مزاج بھی ہے۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”اس سے نعیم بھی بعض اوقات تنگ آ جاتا ہے مگر ان کے

بھی نہیں سکتا۔

”شادی شدہ ہے؟“ طاہرہ نے پوچھا۔

”نہیں، ابھی نہیں۔“ چوبیس برس تو اس کی عمر ہے۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”بہر حال یہ طے ہوا کہ وہ ہمارے ساتھ گا اور دونوں اس سے بڑھ نہیں کر دی۔ وہ آئندہ ہفتے کسی دن آجائے گا۔ میں اسے آج ہی خط لکھ دیتا ہوں۔ اس نے دارائش کے لیے یہ لکھا ہے۔“

دوسرے ہفتے کی شام طاہرہ کے ساتھ ایک خوش شکل خوش وضع، جانبدار کی زینت مٹی کی پیدار ایک جہاں اس گھر میں داخل ہوا۔ پیچھے پیچھے وہ قحط تھے۔ ایک نے دوایچہ کیس اور دوسرے نے بستر اٹھا رکھا تھا۔

”وہ بھی انعم صاحب تشریف لے آتے ہیں۔“ طاہرہ نے تھکا ہوا کہا۔  
”یہ میں جناب بھگت، جن کا آپ سے غائبانہ تعارف ہے۔“ طاہرہ نے تعارف کرایا۔ ”اور میں طاہرہ کی

نے رستے میں ڈک کر لیا تھا۔“

طاہرہ نے نعیم کو اپنی نگاہ سے دیکھا۔ پھر اسے گھر سے میں جاتے گہری نظر سے دیکھا پھر اسے گھر سے میں داخل اس کی پیچھے انجم کی ڈیل ڈیل دیکھی۔ طاہرہ کو مسمار شدہ یاد آگیا لیکن اس نے اسے یاد کو جھٹک دیا۔ اسے یہ نہیں اس کے ما۔

خزانہ کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح نعیم کا کردار پختہ ہوتا گیا اگر ممالک کے پیار کے اثرات بھی زندہ رہے۔ ممالک کا سبب رفت  
اس کے دل و دماغ پر سوار رہنے لگا۔ خواہی کی تعلیم پڑھ مال ہی کو یاد دیکر آتا اور مال ہی اس کے آڑے آتی تھی۔ اس سے وہ بھی  
طوریہ بالغ فرما رہا تھا۔

سرور، دیکھائی نہ دیا۔ اور یہی پہلی جگہ جہاں وہ ملے۔ دن کا معمول ہوتا تھا۔ باپ اسے یہ سکھانے کی کوشش کرتا تھا کہ  
تعلیم تو زندگی کا لازمی جز ہے۔ جو جانا توئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی لیکن اگر تعلیم کے لیے قیامت سے کم نہ جتنا قصداً  
وقت جب کہ مل دیکھ رہی ہو۔ نعیم کو گرتے پھٹتے تھے تو وہ چل کر طرح اس پر چھٹا کر اسے اٹھا لیا کرتی اور نعیم کے سارے جسم  
کا سامنا کیا کرتی تھی کہ کس جوت تو نہیں آئی۔ اگر جوت نہ آئی ہو تو بھی وہ جسم کے کسی نہ کسی حصے پر ہاتھ کرنا سے لے کر لگاتار  
اس کے رگ و ریشے میں مال اور مال کا سمارا سمیٹا جاتا تھا۔ شرعیہ لاپرواہی، بھجک، سہارے کی تلاش اور نامعلوم سا ایک خوف اور  
کی شخصیت کے لازمی جز بن گئے تھے۔

باپ نے اس کی ان خامیوں کو سمجھ لیا تھا۔ اسے اپنے ساتھ کونوں میں گھٹا پھر آتا رہتا اور اسے باتیں کرنے کا  
موقعہ دیتا رہتا تھا۔ باپ کی یہ کوششیں کسی حد تک کامیاب ہو جاتی تھیں لیکن مال کے جذبہ تعلیم کے جو اثرات نعیم پر  
اس سے بڑھ جاتے تھے۔ ان کوششوں کو اندر ہی اندر ختم کر دیا کرتے تھے نعیم مال کو کسی وقت بھولتا نہ تھا۔  
انہر کے گھر کا نعیم نے تین چار روز شرم اور گھبراہٹ میں محسوس کی خصوصاً طاہرہ کے سامنے تو وہ دہک رہا تھا۔  
تین چار روز بعد وہ سب میں گھل گیا اور اس گھر کی رونق اور جہاں کا حصہ بن گیا۔ طاہرہ اس میں خاص طور پر دل چسپی لینے لگی۔  
نے بھی یہی کوشش شروع کر دی کہ طاہرہ کے ساتھ یہ باتیں کیا کرے۔ طاہرہ کے انداز میں ہمدردی کی جھلک نمایاں ہوتی تھی  
کی عادت تھی نعیم کہ طاہرہ کی اس عادت میں شاید اپنی مال کی جھلک نظر آتی تھی۔ مگر وہ طاہرہ کے ساتھ بے تکلف ہونے  
گھبراتا تھا۔ یہ اس کی عادت بن گئی تھی۔

اس جھجک سے تنگ آ گیا اور اس سے گلو غلامی کرانی چاہی کیونکہ اس کے دل کی پیشہ واریتیں طاہرہ کے کارخانہ  
پہنچنے سے پہلے ہی اس جھجک کی نذر جہاں تھیں۔ بعض اوقات کسی بات پر نعیم کے دل میں طاہرہ سے کسی بات پر اختلاف  
رہا تو پیدا ہو جاتا تو وہ خود غفلت کی جرات ہی نہ کر سکتا تھا اور طاہرہ کی ہل چل ملاحظہ جاتا تھا۔ اس سے طاہرہ کو فوج کا سارا  
حاصل ہوتا تھا کہ زراعت پر نعیم کے ساتھ اور زراعت پر بھاری اور بے تکلفانہ باتیں کیا کرتی تھی۔

دو ہفتوں بعد نعیم کا گھر طاہرہ سے اپنی فمرداری میں لے لیا۔ اس کی صفائی، سجاوٹ اور دیکھ بھال طاہرہ کو  
ملی۔ ملازمہ کو دل میں حرف تھا تو دینے کی اجازت تھی نعیم کا رد عمل بھی طاہرہ کے لیے بہت پیارا تھا۔ ایک دور میں طاہرہ  
یہاں تک کیا کہ رات نعیم کو سونے کے لیے لے لیا تو طاہرہ نے چادر کھول کر اس پر ڈال دی۔ طاہرہ کی اس حرکت نے نعیم کے دل  
کو بھڑک کر رکھ دیا اور اس کے دل میں یہاں بیدار ہو گئی۔ طاہرہ کے انداز میں جو بے ساختگی اور اپنائیت تھی۔ اس میں نعیم کو  
کی وہ بھی چینی ہو آئے تھے جس نے اسے اس کو تک پہنچانا رکھا تھا۔

ایک رات جب طاہرہ نعیم پر چادر ڈال کر اپنے کمرے میں آئی اور اپنے اوپر چادر اوڑھ لی تو اس نے اپنے آپ

انہاں ایک احساس محسوس کیا۔ ایک مانوس جذبہ جو پہلے بھی کسی اس کے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ وہ خیالوں کے تانے بانے  
کے لیے ارغداؤں کا گھبراہٹا تصور جو ہزار جھلکے پر بھی نکلتا ہی گیا۔ اسے دماغ کے رعبیہ جی کیمپ کے قریب  
ناتواؤں کی دھڑکنے والی جھلکیوں کی جگہ یاد آگئی۔ ایسے میں طاہرہ نے محسوس کیا کہ ارشد کے تقصیر اور جسم کی بوجھ  
ہا کے سینے میں باقی ہے۔ اس عظیم تر ہونے طاہرہ کے سانپوں کا تسلسل اکھاڑا اور وہ تصوروں سے دل بھلائے لگی  
طاہرہ بہت کوشش کی کہ اس تصور کو وہیں سے نکال پیچھے لے کر اپنا چہنچاہا رہا اور جیسے اس کے اپنے  
مذہب کی جو۔ فوسری دیا اور۔ اس نے آخر محبت کی اور اس کو قیاد کیا جو اس نے عفت کی خاطر کی تھی۔  
فت یاد کیا۔ اس کا ہونے والا پورا یاد کیا اور طاہرہ نے اپنے آپ کو اس حقیقت کے سامنے جھکا لیا کہ ارشد اب  
بابہ اور عفت ارشد کے پیچھے کی مال ہے۔

ارشد جب یہی دسترس سے ہی باہر نکلے تو میرے خیالوں پر کون چھا رہا ہے؟ — طاہرہ نے اپنے آپ سے کہا۔  
میرا گھر ہے کہیں نے ارشد کو عفت کے حوالے کر دیا ہے؟ کیا میں اپنی قربانی کا ثمرہ کر رہی ہوں؟ — طاہرہ نے  
ملاؤں میں کیا میں تو ارشد کی نگہ نعیم نے لی۔ طاہرہ کو یوں لگا جیسے وہ کپ اندھیرے میں جھک گئی تھی کہ سیاہ بادلوں  
ہا ایک جگہ مل گیا ہو۔ اسے گرد و پیش کا فہرہ دکھائی دینے لگا۔

میں ارشد کو دھوکہ تو نہیں دے رہی؟ — اس نے اپنے آپ سے اس طرح کہا جیسے وہ غمیر پر ایک جرم کا بوجھ  
ہا میں نے ارشد کو عفت کے حوالے کر دیا ہے۔ اب مجھے اپنے آپ کو کسی کے حوالے کرنا ہے۔ یہ قانون قدرت  
مال میں خلاف ورزی نہیں کر سکتی۔ مجھے کسی کی پوری مٹا ہے۔ اپنا گھر یاد کرنا ہے وہ زمین ارشد کے تصور میں جھلکتی  
ہا ایک روز زمین کی کھیتی راو سے ہی جھک جاتا گی۔ مجھے ماضی سے رشتہ توڑنا ہے۔ مجھے مستقبل سے رشتہ چھڑنا  
ہے مال مٹا ہے۔ اور..... اور..... میرے پہلے بچے کا نام ارشد ہوگا۔

ارشد کے نام سے وہ چونک اٹھی لیکن وہ حقیقی دنیا میں لوٹ آتی تھی وہ سوچنے کی حد وہ اپنے جس بچے کا نام ارشد رکھے  
ہا کہ وہ ہوگا؟ کیا نعیم اس قابل ہے کہ ارشد کا باپ کہلا سکے؟ نعیم تو خود پتھر ہے۔

اس کے انسوئٹل آتے۔ اس احساس نے اسے رلا دیا کہ آج مال ہوتی تو وہ اسے کتنی۔ اپنی انڈل کا ہلکا بچہ اچھا لگتا  
ہا اسے تھارے لیے پسند کر لیا ہے۔ مگر وہ تنہا تھی۔ اپنے مستقبل کا فیصلہ اسے خود کرنا تھا۔

ملاؤں میں دیکھنے کی۔ دل پر ایک گھبراہٹ طاری ہو گئی اور پھر جرم کا احساس غمیر پر سوار ہو گیا۔ اس نے لینے لینے کو لڑا  
اسے ملا۔ مجھے دایت دے میں اپنی زندگی کی راہ نہا سکوں۔ مجھے میری منزل دکھا دے۔ طاہرہ نے اپنے نعیم  
ہا میں نے محسوس کی اور اس کے دل اور دماغ میں ایک کشش پیدا ہو گئی۔

طاہرہ کے ساتھ باتیں کر رہی لیتا تھا اور باتیں دہائی لیتا تھا۔ ایکے میں وہ سوچا جاتا تھا کہ طاہرہ آئے گی تو سے یوں  
ہا یوں بھی کون کا نہیں طاہرہ سامنے آتی تو زبان ہی نہ کھل سکی۔ سو اسے ایک شگفتہ مسکراہٹ کے ہا مسکراہٹ  
بت تھی جہاں کی امنگ تھی۔ ایسے میں تو اس کی آنکھیں بھی مسکرا اٹھتی تھیں اور پھر سے ایک ایک نقش کلاب کی پتلیوں

عالم بنامے کی خراب دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی، پھر سونے کی کوشش کی مگر سوز سکا۔ بے گلی سی تھی جس سے  
نار کاڑھ رہا اور دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو کر جاری تھیں۔ سانسوں کا تسلسل اکھڑا اور وہ اس بقیہ قری اور بے چینی  
مات میں گرفتار محسوس کر رہا تھا۔ اس کے سامنے طاہرہ کا نقشہ محسوس پیکر کی طرح آگیا۔ اب اس کے ذہن میں نہ زندگی نہ موت  
اندام تھا۔ نہ شرم نہ حجب اور نہ ہی یہ غرض کہ۔ کوئی کیا کہے گا۔ جذبات اور احساسات نے اُبل کر سب  
عالم ہوائے طاہرہ کے۔ اس کے اعصاب اور سوچ اور فکر پر طاہرہ ایک مسخر کی طرح چھا رہی تھی۔ خواب کا  
ہی عالم پارہا تھا۔

اس نے کرٹ بولی۔ اس بقیہ قری کی تسکین دینے کی خاطر گہرا سانس لیا لیکن یہ پر لطف بقیہ قری بڑھنے لگی اور وہ  
ایک سونے سے بے بس کر دیا۔ "طاہرہ! طاہرہ! طاہرہ!" اسے بہت سے ایک ہی سرگوشی سنائی دے  
رہی تھی۔ خود بخود اضطراب ہو گیا کہ بے قابو ہو کر بستر سے نکلا اور کمرے سے باہر آگیا۔ رات کی گلی کی کھلی نے اس کے  
گال اور کمرے کا ایک رومان پرورد تلمذ اُٹھایا اور وہ مدھال ہو کر اس تلاطم میں بہ نکلا۔ شعور اور عقل ایک غیبی گرفت میں  
آئے۔ خودی میں جل پڑا۔

انہیں آہستہ آہستہ جھلکی بولی ایک جھمی آواز نے اسے چونکا دیا اور پشیم تر اس کے کہ وہ جان کتا کہ وہ کہاں ہے،  
پہلی میں مل گئی تھی۔

اوپر آئے؟  
جہنم نے خراب آنکھوں کو دونوں آنکھوں سے مل کر دیکھا تو اسے خواب کا دھوکہ ملا لیکن طاہرہ کا محسوس پیکر اس کے سامنے  
رہا کرتا ہے اسے دیکھ رہا تھا۔

اسے دھوکا کھنا۔ نغمہ نے گھبرا کر کہا۔ میں اندھیرے میں آپ کے کمرے میں جا آئی۔ آپ..... وہ اسے اس کا  
راہ دکھانے لگا لیکن کبھی نہیں؟ بند کر کے سویا کریں۔ کوئی چور جس آئے تو؟۔ نغمہ نے جھلک چکا تھا لیکن اس کا سارا  
چہرہ ہلکا تھا۔

پوچھو نہیں۔ طاہرہ نے ایسے جیسے میں کہا جو نغمہ کے لیے کسی مذاک غیر متوقع تھا۔ آئیے! بیٹھ جاتیے؟  
اب طاہرہ کے استقبال نے اس کی گھبراہٹ ختم کر دی اور اس پر رومانی کیفیت طاری ہو گئی تھی اس نے  
برنگ کیا۔ طاہرہ نے اسے ملائی سے پھر کر بستر پر بٹھایا اور خود بھی بستر پر بیٹھ گئی۔ "طاہرہ!۔ اس نے طاہرہ کی  
گہلیں دل فوراً آنکھیں جھکا لیں اور کہا۔ "بچھے آپ نہ لکھا کرو، ہم لکھا کرو۔"

لفٹ آئی..... وہ جھپٹ گئی۔ "تم نے شروع کیا تھا۔ طاہرہ نے اسے پہلی دفعہ جو کہا تو ایک برق رو اس کے  
غیر رو گئی اور اس کے جسم نے جھجھری لی۔ طاہرہ دلی لالچ بنا دیا۔ "نغمہ! بھڑکی بھڑکی..... نغمہ لاول اس قدر  
دکھ لگا کہ کمرے کے کمرے اندھیرے میں، اسے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ "اے! تو پریشان نہ ہو۔ طاہرہ  
نغمہ کے قریب بیٹھ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ کیا واقعی مجھ سے چلے آئے ہو یا....."

کی طرح ٹھکر آتا تھا لیکن وہ جو کچھ سوچ کے بیٹھا ہوا اسی سکہا سب میں تسلیں ہو جاتا تھا۔ طاہرہ ہی بات شروع کرنے لگی تھی  
تھی اور نغمہ سب کے مطابق اس کا ساتھ دیتا اور کھل کر ہنستا تھا۔

نغمہ نے تمنائی میں کہتی بار بار طاہرہ کو اپنے کمرے میں لائے ہاں کے کمرے میں چلا جائے۔ اب بقیہ قری  
سے پہلے اسے بلاناغہ طاہرہ کا خیال آنے لگا تھا۔ پھر اس کی ہاں میں انگڑائیاں بھی لینی شروع کر دی تھیں اور طاہرہ سب  
وہ زربل سکہا بھی اٹھاتا تھا اور اپنے آپ میں جھنجپ بھی جاتا تھا۔ "نہیں! یوں نہیں۔ جانے وہ کس خیال سے ہے؟  
میں آتی ہے اور میں..... نغمہ کا مذہب اور شرم اسے آگے بڑھنے نہ دیتی تھی لیکن نغمہ اس احساس کو نہ ہی دبا سکا  
کے بغیر غرض نہیں رہ سکتا جب طاہرہ اس کے سامنے نہیں ہوتی تو جیسے کوئی بھی نہیں ہوتا۔

اس نے رفتہ رفتہ طاہرہ کی عقل میں کتا ہٹ سی محسوس کرنی شروع کر دی۔ وہ صرف طاہرہ کے ہاں  
تھا لیکن طاہرہ کے خیال کے ساتھ اس کے دماغ میں ایک نفوذ کا خیال بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اپنے  
طاہرہ کے خیال سے باز رکھنے لگا۔ دونوں خیال اپنی اپنی حقیقت بچتے جارہے تھے۔ پھر دونوں خیال آپس میں  
لگے اور یہ تصادم صرف اس وقت ختم ہوا جب طاہرہ اس کے کمرے میں یا وہ طاہرہ کے کمرے میں پہنچ جاتا تھا۔  
علیحدہ ہو کر نغمہ، اکھڑا اور کمرے سے یوں کترنا تھا جیسے اس نے ان کی جبری کی جوا اور انہوں نے اسے پھر دیا۔

طاہرہ اور کمرے سے پھرنا نہ چاہتے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ نغمہ اور طاہرہ ایک دوسرے کی عقلی دل  
ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ جبری نہیں تھی۔ تجربہ طاہرہ کے اخلاق کو جانتی تھی اور نغمہ کے اخلاق سے واقف تھا۔  
طرح جانتے تھے کہ دونوں میں آدھا گی ہے نہ ذہنی خیال۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ دل ایک پاکیزہ جذبہ لیے ایک  
کے قریب ہو رہے ہیں۔ نغمہ اپنی جن حرکات کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا وہ طاہرہ اور کمرے پر ظاہر ہوتی رہتی تھی۔  
دھواں پھپھایا۔ یا سکا نغمہ طاہرہ کی ملاقاتوں کو شرمیلے پن میں چھپاتا تھا اور طاہرہ شرم میں لیکن دونوں کی آنکھیں اور سکا  
راز فاش کرتی رہی۔ طاہرہ اور کمرے غرض ہوتے رہے کہ انہوں نے جو معجون نغمہ کے آنے کے تیسرے روز بنا  
ہی کامیاب ہو رہا تھا۔

"میں نے ایک بار طاہرہ سے کہا تھا..... مجھ نے ایک روز طاہرہ سے کہا کہ تمہارا بیاد اپنے ہاتھوں  
خدا کی قسم فٹ کلاس آدمی سے کروں گی..... شیفہ! مجھ نے طاہرہ سے پوچھا۔ "نغمہ! آدمی تو خوب معلوم ہوتا ہے  
نغمہ کا جو زان بھی خوب تھا اور بھیتا ہے۔"

"تم نے تو میرے دل کی بات کہنا ہی ہے۔" طاہرہ نے جواب دیا۔ "جانتی ہو نغمہ میرا کس قدر  
ہے؟ میرا اس کے ساتھ وعدہ ہے کہ تمہاری شادی میں میں کروں گا بلکہ ایک بار اس کے والد صاحب سے ملنا۔  
نے انہیں بھی یہی وعدہ دے دیا تھا۔ اس کے والد صاحب نے کہا تھا۔ "بیٹا! تم نہ کرو گے تو کوئی نہ کرنا گئے گا؟"  
تم انہیں تلاش میں رہو اور میں اپنے طور پر تلاش میں لگا رہتا ہوں۔" اس وقت تو طاہرہ کو خیال بھی دماغ میں نہیں  
نغمہ کو اس گھر میں آئے جس میں رات تھی۔ راتوں رات کی شہر کی نیند سو رہا تھا نغمہ طاہرہ کے خیال کو

”تم دی ہو طاہرہ؟“ نعیم نے گھبرا کر کہا۔ ”میں نے بہت بُرا کیا ہے۔“

”نہیں! طاہرہ نے نعیم کا ہاتھ اپنے ماتھے میں لے کر کہا۔ ”میں نے تم پر کوئی الزام عائد نہیں کیا۔ اپنے دل کی بات کہی ہے اور جوتی ہے وہ چند نظروں میں بیان کر دی ہے۔ اتنا بتا دینا ضروری سمجھتی تھیں کہ میں نے غلط کچھ نہیں کی تھی۔ اس لیے مکالمے میں لکھی ہوئی باتیں ہوں اور جو کچھ کہتی ہوں وہ کدوئی جملوں میں ہے۔ نظروں میں کوئی کبھی اظہار کیا ہے میرے دل کی بعض باتیں میرے اُسور کا کرتے ہیں۔۔۔ مجھے اپنے متعلق فیصلہ کرنا ہے۔ تم اپنے متعلق فیصلہ کر لیکن جذبات سے نکل کر زندگی کے متعلق میرا جو متقرر مافیہ اور مشاہدہ ہے وہی ہے کہ زندگی لاڈ اور پیار کا نام نہیں۔ ایک سے ایک بھر ہم انسان بننا ہے۔“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ نعیم نے کہا۔ ”اگر قبول کر لو۔“

”اگر میں نے نعیم سے کر لوں گی۔“

نعیم چلا گیا اور طاہرہ کی باقی رات کی نیند اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ اندھیرے میں ارشد اُسے اپنے کمرے میں چلائی مٹائی دینا تھا طاہرہ اس تصور سے آلود ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ ارشد کی جگہ نعیم کو کھرا کر کئی تھی کہ نعیم کا چہرہ ارشد کے چہرے میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ نعیم بھی لگا تھا لیکن اس حد تک کہ اسے مستقبل کا سا بھی نہ لگتا تھا۔ اس نے بہت سوچا کہ اسے نعیم کے ساتھ ارشد والی جگہ سے باہر کتنی ہے یا نہیں۔ وہ اس حقیقت سے بیگانہ نہیں تھی کہ ارشد کو وہ کبھی اور کے حوالے کر چکی ہے۔ اسے وہ اب کبھی نہیں پائے گا۔ اسے اب اپنے متعلق دو ٹوک فیصلہ کرنا ہے۔۔۔ اور نعیم بُرا نہیں۔

”معاذ! خدا کے لیے دعاؤں ارشد! آج کی رات میرے قریب رہو۔“ ہسپتال کے کمرے میں مفت ارشد کے دونوں ہاتھ پکڑ کر لڑائی تھی۔ ”یہ میری پہلی جوتی زندگی کی آخری رات ہے مجھے تنہا چھوڑنا میرے ارشد! ارشد نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ اس کے آنسو بھرت رہے تھے جن میں وہ آنکھوں میں ہی جذب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک رکھت کو اس کا نگاہ بیماری سے نکال لینا چاہتا تھا۔ محنت کی علالت اور یہ بے بسی ارشد سے کبھی نہ جاتی تھی۔

بچلے سانسوں میں صرف سات دن باقی تھے۔

محنت کے دورے اب بہت کم ہو گئے تھے۔ گزشتہ تین دنوں میں اسے صرف دو دفعہ دورہ دیا تھا۔ انجکشن لگ کر ہے نے اور پھر مریض داخل ابھی تک محنت کر رہا تھا۔ اس نے محنت کو کسی حد تک اپنے زیرِ اثر کر لیا تھا لیکن اس کی تعاقب میں کوئی فرق نہ پایا۔

بہانے نہ کرنے تازہ خون کے لیے کہہ رہا تھا اور خون کا انتظام ہو رہا تھا۔

مریض کی حالت کبھی کبھی دگرگوں ہو جاتی تھی۔ اب وہ ارشد کی محبت کو اتنا محسوس نہیں کرتی تھی جتنا طاہرہ کی بددلی کو۔ اس کے ذہن اب احساسِ جرم بھی شامل تھا۔ یہ احساس اسے پریشان کر رہا تھا۔ طاہرہ کے فوری ذمہ دار وہ ہے۔ اسے اپنے ہی ضمیر پر اس محنتِ ملامت کرتی رہتی تھیں۔ ایک بچتا ہوا اس کی ذہنی حالت کو بگاڑ رہا تھا۔ وہ تین دو قیوں پر ایسے ہوا کہ رات کو ہر ایک اشیاء اور کمرے میں چاندروں طرف دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ یہ کتنی۔ ”وہ آئی تھی۔“ ابھی میرے پاس آئی تھی۔۔۔ ملازمہ نے جو رات کے کمرے میں سوئی تھی۔ پوچھا۔ ”کون آئی تھی، بی بی؟“

اندھیرے میں طاہرہ کا دکتا چہرہ چھپ گیا تھا جس سے نعیم کو حوصلہ ہوا۔ درندہ بات نہ کر سکتا ہوا۔ گزرنے کو نہ دینا، میں چلا جاؤں گا میں بتا رہے ہوں کیا تمہارے بغیر دل گھبرا گیا تھا۔ طاہرہ! مجھے صرف اتنا ہی مجھ پر کیا جا رہا ہے۔ خدا کے لیے بتا دو۔ طاہرہ! آج بے بس ہو کر آیا ہوں۔“

وہ دگرگاہ تھا اور طاہرہ کا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پر رنگنا جاری تھا۔ وہ بے اختیار بولا۔ ”میں نے بہت کچھ طاہرہ کو کہا تھا کہ نوبت نہ پہنچنے دوں میں نے یہی سوچا تھا یہاں سے چلا جاؤں اور سبوں میں جاؤں میں نے۔“

تھا کیا کیا باتوں، میں تمہارے دل کو محسوس نہیں پہنچا نا چاہتا تھا میں صرف تمہاری یاد کے کمرے سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ آج تمہارے خیال نے بے بس کر دیا ہے۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ اس نے طاہرہ کی انگلیوں کو ہاتھ میں دبا کر کہا۔ ”لو۔“

میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ اور میں چلا جاؤں۔“

طاہرہ سر ہٹا کر کانپ گئی۔ دو چار لمحوں کے لیے تو اسے ہلکا سا جھپٹا ہوا تھا۔ اس کے پاس ارشد! انجکشن لگا رہا تھا۔ یہ الفاظ ارشد کے نہیں تھے، انساں کا یہ طریقہ اور ارشد! انجکشن تھا۔ ہاں، اس نے نعیم کو محبت، نگاہ، دعا اور ارشد! سینے سے آدھ لٹی ہو سکتی تھی۔ اس نے اسے ہر نوبت سے آزاد نہ ہونے دیا۔ اس نے سینے میں بہت کچھ رکھا تھا۔ بھی اسی تیرے گم ہو گئی۔

”میں بے خیالی میں لگا تھا طاہرہ!۔“ نعیم نے اسے اندھیرے میں اپنی مچوکی کا احساس دلایا۔ بولا۔ ”میں سلسلے کی بات کر رہا تھا یہی عادت ہے میری دیکھ بھال کو تم اپنا فرض سمجھتی ہو۔ یہ تمہارا کردار ہے۔ میں ویسے ہی چلا طاہرہ کی خاموشی اسے پریشان کر رہی تھی اور طاہرہ خود اپنی خاموشی سے پریشان ہوئی جا رہی تھی۔ وہ نعیم کو اس سے بچنا چاہتی تھی کہ اسے اس کے کمرے میں اتنی رات گئے نہیں اچھا بیٹے تھا اور اسے یہ احساس بھی نہیں اس نے اچھا کیا ہے جو اس کے کمرے میں چلا آیا ہے۔ دن کی بات اور تھی۔

”دن کی بات اور نعیم!۔“ طاہرہ نے اپنی آواز کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”اس بھی کوئی قیامت نہیں آگئی۔ میں ہمدانی نینت پر کوئی شک نہیں کرتی۔ اظہارِ حقیقی جان اور بچاؤ کا خیال آتا ہے جانے کیا سوچیں؟“

”تم نے مجھے معاف کر دیا ہے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”بچوں کی کسی باتیں نہ کیا کر۔“ طاہرہ نے نہ گھٹتے لیٹے میں کہا۔ ”جاؤ۔ سوچنا۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔“

نعیم نے طاہرہ کا ہاتھ اپنے ماتھے میں دبا کر کہا۔ ”میں کسی ایسی ویسی نینت سے نہیں آیا تھا۔ ایک سوچ ہی آئی تھی۔ اکیلا ہوتا ہوں تو فیصلہ کر لیا ہوں۔ تم سامنے ہوئی ہو تو۔“

”یہ خیال میرے دل میں بھی آیا تھا۔“ طاہرہ نے کہا۔ ”سوچیں مجھے بھی پریشان کیا کرتی ہیں۔۔۔ مجھے یلے سوچنے والے ماں باپ زندہ ہیں۔ میرا کوئی نہیں۔۔۔ میرا کوئی نہیں نعیم۔“ طاہرہ کی آواز دھب گئی۔ ”میرا کوئی نہیں اور میرا گناہ ہے۔“

ایک گناہ تھے جسے طاہرہ کو لگا ہے۔

”ظاہر نہیں آتی سخی برہاں؟۔۔۔ بھی نکل کے گئی ہے، دیکھو تو دروازہ رکڑے میں ہوگی۔“  
 ”خواب میں دیکھا ہوگا ظاہر ہوئی ہی کو، چھوٹی بیگم! ملازمہ نے کہا۔ سو جاتی ہے۔“  
 ”نہیں! مائی! اتر غلط کہتی ہو۔ خواب یوں نہیں ہوتا کہ۔۔۔ اور وہ اتنی دیر بستر میں بیٹھی ہر طرف متلاشی نظروں سے رہی کہ کچھ نیک کار دروازے کی آواز نہ آئے اور وہ بس بے حرکت رہ گئی۔“

ظاہر نے اس گھر سے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا فیصلہ کرتے وقت اس پہلو پر توجہ نہیں دی تھی کہ عفت ہاں آتا تھا کہیں کسی نے نہیں سوچا تھا۔ گھروں میں سوچیں مگر ان کی بات نہیں جایا کرتیں۔  
 ”ارشاد!۔۔۔ عفت نے بچے کی پدائش سے سات راتیں پہلے ایک رات ارشد کے ہاتھ تمام کر کہا۔ میں اب بیٹا

رو سکوں گا۔ عفت چلے جانا میں نے تو اپنے ساتھ ہمدردی زندگی بھی اجڑا بنا دی ہے۔“  
 ”سو جانا، عفت!۔۔۔ ارشد نے انکو ضبط کر کے ہوتے تلی آئینہ بیلے میں کہا۔ وہ زندگی گزرتی ہے، اب تمام نمودار جاتا تو ایک اور زندگی کا آغاز کریں گے جس میں ہمارا بیچ بھی شامل ہوگا۔“

”ظاہر بھی ہوگی۔ عفت نے طیل سی سرت سے اضافہ کیا۔ ہوگی ناہ ظاہر وہ مجھے سمات کر دیا ہے، وہ ہونا ہے۔“  
 ”ہے، ہے، عفت! ڈرنے کے بعد بیٹے ہوتے بچے کی طرح کھنے لگی۔ مشکل رات وہ میرے پاس آتی تھی۔“  
 ”اں! وہ تلو سے بچا ہوتے ہی کہا گئے کی اور ہمارے بچے کا نام دی جا کر رکھے گی۔“ ارشد نے کہا اور اس کی بڑی ہی شکل سے انکو دیکھا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ عفت کی دماغی حالت متزلزل ہو چکی ہے، وہ اسے بھی فریب دے رہا تھا اور اپنے آپ کو بھی غصا فریب دے کر فدا سی دیر کے لیے بہلا رہا تھا، اس کا وہ اپنے آپ کو کچھ بھڑکانا تھا، اس کے ساتھ دوسرا بے مسئلہ بچے کا تھا، ارشد اپنے کو ایک عظیم کام کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا لیکن جب سوچتا تو اس کا دل میٹھ جاتا تھا، اباجان اور اس کا بھائی اسے حوصلہ دیتے رہتے لیکن ان کے بھی پاؤں بے ہوتے تھے۔

ان کی رات تو عفت ارشد کو کچھ دیر نہیں رہی تھی، ارشد کو گھر واپس جانے میں دیر ہو رہی تھی، اس نے سوچا آج کا کارڈ کوئی اس کو کیا جائے۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور عفت نے دیکھے ہوئے سکون کی آہ کی اس نے ارشد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پی لیا اور آہستہ آہستہ اس کے منہ کو مسلاتے گئے۔

”ارشاد!۔۔۔ عفت کی مرل سرگوشی سنائی دی۔ ارشد نے اس کی طرف دیکھا، عفت کے ہنر میں پتلی مگر سہل تھی۔  
 ”میں اب بولی۔ چلے تو نہ جاتا ہے؟“

”نہیں!۔۔۔ ارشد نے کہا اور عفت نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے چہرے پر رکھ دیا، پھر اس کی تصویر بوس لیا، ارشد نے اس کے رخسار سے ملاتے تو عفت نے انکھیں بند کر لیں اور ارشد کا ہاتھ اپنے رخسار کے ساتھ ڈال دیا، بہت دیر ای حالت میں رہی، پھر اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ فراسی دیر بعد اس کے ہاتھ سر پہلے پر گر پڑے۔ ارشد نے اپنا ہاتھ چھو لیا جیٹا بڑی کی گویاں اڑا کر چلی گئیں اور عفت کو گئی تھی۔ ارشد نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا۔ اس پر قرت طاری ہو

نہ کی پائی کی جی۔ ایسے میں اس کا ایک انکو نکل ہی آیا اور عفت کی زندگی میں ایک نیا کڑا۔  
 بڑی ڈاکٹر اور پروفیسر کی ہدایت کے مطابق ارشد نے چند روز کی چھٹی سے لی پروفیسر نے ارشد کو کہا کہ وہ زیادہ سے۔  
 ہدایت کے پاس بیٹھا ہے اور اس کے ساتھ محبت بھی باتیں کرتا رہے۔ عفت نے اسے بھی باتیں کیں، ارشد صاحب! پروفیسر کی علوم شکاکہ کی ہدایت کس قدر اچھی ہے، اس نے تو میری پوچھا تھا کہ ظاہر کو کون ہے؟ اور اس کا نام لیکر زندگی میں آیا ہے؟ لیکن اباجان، ارشد اور عفت بھی ٹال گئے تھے۔ پروفیسر نے کہا تھا کہ وہ لڑکی عفت کے پاس آجائے تو مرض میں بہت بہتر ہوتا ہے۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر حیرت ہو گئے تھے۔

ارشاد سب کچھ فراموش کر کے ہوئے والے بچے کی عافیت کا خواباں تھا۔ ظاہر تو اس کے خیالوں پر غالب رہی تھی۔  
 اں نے اسے اس حیرت کو زندگی کا چھوڑ کر قبول کر لیا تھا، اس نے اپنے آپ کو تبدیل کر کے حالات اور وقت کے سانچے میں ڈال دیا، اب اس کا نام انسان نہ تھا اور کبھی کا گھٹنے ٹیک چکا ہو گا وہ کبھی بھی جذبات میں الجھ جاتا تھا لیکن اس کی فطرت میں حقیقت نہیں تھا۔ وہ اس بات کے دو دہیں آگئے۔ اباجان اور پروفیسر نے بھی اس کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی بھی شامل تھی۔

ارشاد نے چند روز کی چھٹی سے کر دیا رات کا بیشتر حصہ عفت کے پاس گزارنا شروع کر دیا، عفت کے پاس اور گھر میں رفت ایک اذیت سے دوچار رہتا تھا۔ عفت اسے اپنے پاس سے اٹھنے نہ دیتی تھی، اس کی باتیں اب باطل لگتی تھیں۔  
 یہ تو لڑکی باتیں کرتی تھی، یا ایک لڑکی اس کی حالت ایسے بہت تھی جیسے اس نے کوئی ذاتی چیز دیکھ لی ہو۔ ایسے میں وہ ارشد کے لیے بہت بات جاتی تھی۔ ایک دوبار ارشد نے پوچھا کیا جاتا ہے؟ تو وہ علاؤں میں کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”ظاہر نہیں کی بڑا تھا۔۔۔ دل میٹھ گیا تھا۔“  
 ایسی کیفیت کے معا بعد وہ ارشد کو ضرور کبھی تھی۔ ”میرے ارشد! چلے جانا!۔۔۔ پھر اس نے یہ کہنا بھی شروع کر دیا۔  
 ارشد عفت تحریری ہوا میں ہنسا رہا تھا۔ اور ارشد نے ویسے ہی کہنا شروع کر دیا تھا، عفت کے مزاج میں بھی کچھ تبدیلی آتی تھی لیکن وہ یہ دیکھ میں بچے کی حرکت کی وجہ سے دب جاتی تھی نفسیاتی اثرات مرض میں اضافہ کر رہے تھے، لیڈ ڈاکٹر اب اسے تازہ خون دینا شروع کر دیا تھا۔

مرحمت، تین دن باقی تھے۔  
 عفت کی ذہنی خرابی اب عروج پر پہنچی جا رہی تھی، وہ اب اس بچے کی طرح حرکت کرتی تھی جو ڈاکٹر اور پروفیسر کے اعصاب دہر جاتے۔ وہ ارشد کو اپنے پلنگ پر بٹھاتی تھی، اگر ارشد بیٹھ بیٹھ کر دھڑکتے کہنے تو عفت پک کر اس کا بازو پکڑ لیتی اور کیفیت آواز میں کہتی۔ ”جنا، ارشد!۔۔۔ ارشد گھر اس وقت آتا جب عفت سو جاتی تھی، اس کی نیند میں کبھی کبھی یہ خواب لگتے ہیں کہ وہ زندہ تو نہ جاتا ہے؟“

”نہیں!۔۔۔ ارشد نے کہا اور عفت نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے چہرے پر رکھ دیا، پھر اس کی تصویر بوس لیا، ارشد نے اس کے رخسار سے ملاتے تو عفت نے انکھیں بند کر لیں اور ارشد کا ہاتھ اپنے رخسار کے ساتھ ڈال دیا، بہت دیر ای حالت میں رہی، پھر اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ فراسی دیر بعد اس کے ہاتھ سر پہلے پر گر پڑے۔ ارشد نے اپنا ہاتھ چھو لیا جیٹا بڑی کی گویاں اڑا کر چلی گئیں اور عفت کو گئی تھی۔ ارشد نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا۔ اس پر قرت طاری ہو



نوروز نے بھی دورو پے کی نیازی تھی لیکن طاہرہ کی واپسی کے لیے۔ اسے تو کسی نے بتایا ہی نہیں تھا کہ گھر کی طاہرہ کیوں اور کہاں پہنچی ہے گھر کی عورتوں اور مردوں کی باتوں اور قرآن سے حمانہ زہ گھایا تھا اس سے نوروز کو کچھ علم نہ رہا۔ ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہے۔ وہ اکثر خدا کے حضور دعا کیا کرتا تھا۔ "یا مٹا میری چھوٹی بی بی کو جلد واپس لایا مجھے اس کے لیے اور وہ جہاں کہیں ہے اسے آرام اور عزت و آبرو سے رکھنا۔"

دودن گزے جو ارشد کے لیے دو سال سے کم نہ تھے عفت کی باتیں اب بے ربط ہو چکی تھیں۔ تازہ خون کا زہر بہتا تھا لیکن دائمی حالت و لرزہ ہوتی جا رہی تھی پر فیصلہ حال نے اب اس کے پاس دودن گھٹنے بیٹھا شروع کر دیا تھا۔ اس میں ارشد زار لکھ جا کر سستا لینا تھا۔ پر فیصلہ کی موجودگی میں عفت ارشد کی فیاضی پر کمری محسوس کرتی تھی۔

فیصلہ سے دن چوڑی ڈاکڑ کی پیش گوئی کے مطابق آخری دن تھا۔ عفت نے پر فیصلہ حال کے آنے پر بھی ارشد کے پاس کو کڑوا کر کہا۔ "نہ ڈاکڑ صاحب اب آج یہ نہیں جائیں گے خدا کے لیے انہیں بھیجتے، ڈاکڑ صاحب؟"

ارشد کہ گیا اور فیصلہ فرمایا اور ڈاکڑ کو چلا گیا۔ دن کا بھلا بہتا تھا۔ ارشد خزان پریشان اس طرح کمرے میں ٹھل رہا تھا جیسے جانائی سزا یافتہ قیدی، ذنگ کی آخری لمحے پر سے کر رہا ہو لیڈی ڈاکڑ نے دھکی کے کمرے میں سارا سامان تیار رکھا ہوا تھا ختم و خرابی ایک نوبت پہنچ جاتے کی تازہ خون بھی رکھ لیا گیا تھا۔ لیکن کا انتظام بھی تھا۔

عفت اب اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔ وہ ایک فنت چپ ہو گئی اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوا ساتھ ہی ایسی دلدرد و رنج ماری کہ ارشد کاپے نہ لے سکا۔ بلازم سے لیڈی ڈاکڑ کو لایا۔ اس نے آتے ہی جن اور دل کی حرکت دیکھی اور کہا۔ کیا تھوڑی سی دیر میں عفت نامول حالت پر آگئی۔ ارشد اس کے پاس پہنچ گیا۔

عفت نے اس کا بازو دھکی سے مضبوطی سے پکڑ لیا اور ستر سے بسترے میں پوچھا۔ "کیا کیا ہوا تھا ارشد صاحب؟ عفت کی آواز اس قدر نچھرتی تھی جیسے وہ گہری کھائی میں سے بول رہی ہو۔ ارشد نے اسے لے لے اور حوصلہ دیا لیکن کئی دن ارشد کو تسلی نہ آئی۔ اس کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے جلال آباد کی گلیوں میں خواتین کی ایک رات اور ایک دن ایسی سیکڑاؤں کا تجربہ نہیں۔ عورتوں کی بچوں کی، بڑھوں کی۔ لیکن وہ دورا بھر نہ گھبراہٹا تھا بلکہ ان چیزوں نے اسے نیا حوصلہ اور نئی ہمت دی تھی اور ایک ہیچ سے وہ جلد دن ایک بل گیا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ اس ضرورت حال میں ثابت قدم نہ رہ سکے گا۔ وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ ابا جان کو طواسلے کہ عفت نے ہم ویسی ہی سچا ماری اور وہ نہ سوتے تڑپتے ارشد کے ساتھ پیٹ گئی عفت کے دانت اس میں چب گئے اور انھیں بند ہو گئے۔ کے چہرے پر ہل چلائی تھی۔ ارشد نے بازو چھڑا کر لیڈی ڈاکڑ کو لایا۔ اس کے ساتھ دوسریں بھی آگئیں۔ ارشد کی جان میں جان لائی۔ یہ جان بری طرح کانپ رہی تھی۔

چار گھنٹے ایسی عالم میں گزرے۔ لیڈی ڈاکڑ نے آخری حکمانہ کی تو زمریوں سے کہا۔ "جسے چلو۔" اسے سپروں والے ستر پر لٹا جا رہا تھا تو ابا جان، زمریوسف اور ارشد کی اہمی بھی پہنچ گئے۔ ارشد نے انہیں دیکھا تو بڑبڑا۔ پر بھی اس کے دوا سنو چھوٹ آئے۔ ابا جان نے تو جود و قدم رہ گئے تھے ایک جست میں طے کیے اور بڑبڑا کر پوچھا۔ "یہ ستر تبتا"

ارشد نے سر ہٹا کر اور صرٹ اسی قدر کہہ کا۔ "ہاں ابھی تو خیریت ہے۔"

عفت کو ڈیوٹری روم میں لے جایا جا چکا تھا کزن نے ارشد کو لایا اور کہا۔ "سب کچھ کپڑا رہی ہیں۔ وہ سخت گھبراہٹ ہوئی ہیں۔ لیڈی اب کوئی رکن نہیں کسی لمحے ہو جائے گی۔ آپ انہیں ذرا تسلی دے آئیے۔ وہ آپ کے ساتھ ہیں کہ پا جاتی ہیں۔"

عفت یزیر لڑی ہوئی تھی اور دودن کزنیں باہر نکل رہی تھیں۔ ایک نے نکلنے نکلنے ارشد کے کان میں کہا۔ "درا جلدی۔" فنت نہیں ہے۔"

ارشد عفت پر فحکا تو اس نے دودن ہاتھ اوپر کر کے چہرہ وقام لیا اور اس کے چہرے کو نیچے کیا۔ ارشد جھجکا گیا اور عفت نے اس کے ہونٹ چوم لیے۔ ہولی شہنا حافظہ میرے ارشد میرے پیچھے کو سلام کنا اور پیار دینا۔"

عفت کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ ان کی باتیں باتیں تھیں۔ "کیا عفت تھی؟"۔ "ساتھ تھے۔"۔ "ساتھ تھے۔"۔ "ان میں ایک گز مسکن بھی جلد رہتا تھا۔ اس کی آواز نہایت اور نہایت دھیمی تھیں لیکن جیسے کئی اور وہ تیزی سے بل رہی تھی۔ الفاظ درونی سے ملے آ رہے تھے۔ ارشد اس پر چھکا ہوا تھا عفت نے ایک بازو اس کی گردن کے گرد ڈال رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے بال مسلا رہی تھی۔ کڑی تھی۔"

"طاہرہ کو میرا سلام کنا۔"۔ "بہت سارا پیار دینا۔ کنا ہم اس پر حق تو پاؤں چر کے معافی مانگتی لیکن تم مجھ کو پہنچی تھیں۔ ارشد میرے پیچھے کو میری قبر پر لایا کنا اور اسے پر نہ جانا کہ تیری ماں کی قبر ہے اور سونا ارشد میری آخری باتیں۔۔۔ طاہرہ آج آئے تو چاہے جسے نہیں تو اسے دھونڈ لینا اور میرا بچا اسے دے کر اسے پیچھے کی ماں بنالیا۔ میری روح مندا رہی شادی پر آئے گی اور تار سے سہرے کو چنے گی۔ طاہرہ کے سامنے کچھ کسی کو نہ دینا۔ اگر تھیں میری محبت کا پاس ہے تو طاہرہ کے سوا کسی دوسری لڑکی سے شادی نہ کرنا۔۔۔ لکھو کہ گے؟"

"نہیں اب میری عفت نہیں، تم زندہ رہو گی۔" ارشد نے دھیمی سہی آواز میں کہا۔

"ایک باجھر کو۔"۔ "میری عفت۔"

"میری اپنی عفت؟"۔ ارشد نے کہا اور عفت کے حلیل ہونٹ چوم لیے۔

"تیرا کمرہ میرے ارشد! میں نے ساری عمر اس سے کہ انتظار میں گزار دی ہے۔ عفت نے بستر اس کے گلے میں بازو لے کر ہوئے کہ۔ "سب کچھ دینا ارشد۔۔۔ اور۔۔۔ عفت کا چہرہ لگا لگا جیسے درد کا ایک اور دورہ اٹھنے والا تھا۔ وہ بے حد مشکل کر کہی۔۔۔ بڑا اچھا طاہرہ کے سوا کسی کو نہ دینا۔ طاہرہ ہی اس کی ماں ہو گی اور پیچھے کو بھیجی تاکہ تیری ماں۔۔۔ اور اس کی آواز ایک لکھی سی چیخ میں دب گئی۔"

"آپ شریف لے جاتے۔"۔ "زس نے ارشد کی کمر ہاتھ دھکے بٹھ کرے کہا۔

اور ارشد کمرے سے نکلا۔ دروازے میں رک کر اس نے عفت کو بچہ دیکھا لیکن عفت کی آنکھیں نہ دھکیں اور وہ پیٹ سے اٹھتے ہوئے دروازے کی کوشش کر رہی تھی۔

ارشد انتظار لگا رہا تھا۔ ابا جان وغیرہ میں باہر نکلا۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ ابا جان تھوڑی تھوڑی در بعد راکہ سے میں نکلنے۔

تھے اور ایسے ہی ایک پگلاٹ کر مات آتے تھے۔ ہر ایک کا دل خدا کے حضور مجبور و رقتا۔ اس عالم میں تین گھنٹے گزر گئے۔  
رات کے دس بج رہے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر انتظار گاہ میں داخل ہوئی۔ سب نے اس کی طرف دیکھا کسی کو محبت نہیں پڑی؟  
کہ اس سے کچھ پوچھتا۔ آخر باجان اُٹھے اور آہستہ آہستہ لیڈی ڈاکٹر کی طرف چلے۔

”مبارک ہو! لوگا بیلا بھلا ہے۔“ لیڈی ڈاکٹر نے ذرا تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بچہ ذرا کمزور ہے لیکن ٹھیک ہے۔“  
”اور بچے کی ماں؟“ ارشد نے اچھل کر پوچھا جس طرح وہ اچھلا تھا اسی طرح اس کا دل بھی پھل رہا تھا۔

”بچے کی ماں!۔۔۔ لیڈی ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ آہستہ آہستہ اور کہا۔ ”نمائیت سکون سے۔۔۔ وہ چپ ہو گئی اور ایک  
ٹائیٹ کے بعد۔۔۔ سب کے لیے دعا طلب رہتی تھی۔ بولی۔“ فوت ہو گئی تھی۔  
سب کے سر جھک گئے اور آنسو رواں ہو گئے۔

”خفے افسوس ہے۔۔۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔“ لیکن یہ حادثہ متوقع تھا۔ خدا کا شکر ہے۔ بچہ صحت سلامت ہے۔ اس کا  
مشاکی تمہی کو کم کرنے کی خاطر کہا۔“ ارشد صاحب اپنے کے خود حال آپ جیسے ہیں۔ ارشد زندگی دے کر جو کچھ اچھا اور بہت خوبصورت  
ارشد نے خالی خالی نگاہوں سے لیڈی ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ ”بچے کو پان سات روز ہسپتال میں ہی رہنے  
پہنچے۔ ہم اسے تندرست کر کے آپ کے حوالے کریں گے۔“ دیکھنے کی گئی ضرورت تو نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ کی والدہ میاں وہ  
موتی ہیں اور بچے کو قتل سے اپنے ہاتھ سے دودھ پلا سکتی ہیں۔“

”میں میں رہوں گی۔“ ارشد کی امی نے کہا۔  
ارشد کھلی ہوئی ٹھٹھکی کے سامنے جا بکھڑا ہوا۔ اس کے سامنے ہسپتال کا چھڑا سا بیچر تھا جس میں گھاس کا مٹھی سبز و تیز  
کچھ بچا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف رنگارنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔  
ارشد کے دل کا کنول مرجھایا۔

نعیم کے دل کا کنول کھل گیا یہی راہ لیڈی کا شجرہ۔ اسے ماں کے بغیر سوزنا لگتا تھا۔ اب اس کے لیے جنت ارضی بن گیا تھا۔  
بچس اور پہلے کی اس رات کے بعد جب وہ ظاہر ہو کر سرے میں چلا گیا تھا اور ظاہر ہونے اس کے ساتھ ٹھوس بائیں کر کے اپنا فیصلہ  
لایا تھا تو یہ کونک روپ ہی بکھڑا تھا۔ اس کا بستر میلان تو جن کا توں تھا اور جھجک بھی ویسی ہی تھی۔ لیکن اب اس شرم اور جھجک میں  
خود اٹھادی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اب شرمنا تو اس انداز سے شرمنا جیسے ہی حرکت موزوں ترین ہو جھجک کر وہ بھٹکتا تھا کہ اسے  
جھگڑا ہی چاہیے تھا۔ ظاہر و سحر اس کی حرکات کا اچھی طرح جائزہ لے رہے تھے اور جان بوجھ کر نادان بنے ہوئے تھے۔ ظاہر  
پہلے سے زیادہ شرم اور جھجک ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ بیٹھے کہ ظاہر و نعیم میں جو جو کڑا آشنا بھون اور ارشد کو ذرا موش کر چکی ہے مگر اس کے  
پہلے میں کوئی جھجک نہیں لگتا تھا جہاں ایک خور و زمر کو لڑا جا رہا تھا۔ نعیم اور ارشد کچھ گھبرا رہے تھے۔ ایک دوسرے  
پر لکھل بھی جو رہے تھے حقیقت جذبات کو کھل رہی تھی۔ ظاہر وہی شروع کر دیا۔ نے کے لیے فیسے لگائی تھی۔

”ظاہر!۔۔۔“ بچہ نے ایک دن ظاہر سے پوچھا۔ ”بچی تانا، نعیم تجھے اچھا لگتا ہے؟“  
”کون؟ نعیم؟۔۔۔“ ظاہر نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”لاحول ولا قوہ؟“

”دیکھو! بھلا اس مذکورہ کون چھپاتی ہو؟۔۔۔ بچہ نے بے تکلفی سے کریدنا شروع کر دیا اور کہا۔ ”مجھے سب معلوم ہے؟“  
”اچھا بتاؤ، آپا آپ کو کیا معلوم ہے؟۔۔۔ ظاہر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔  
”بتاؤ؟۔۔۔ اچھا اس۔۔۔“ بچہ نے کہا۔ ”اچھی رات کے وقت نعیم رتارے کمرے میں گیا تھا اور دو گھنٹے بعد

نکل گیا۔“

”ارے؟۔۔۔ ظاہر نے زور مڑایا سے کہا۔“ آپ جاگ رہی تھیں؟  
”ہاں! تو کیا جو سو رہے تھے؟۔۔۔ بچہ نے کہا۔ ”رات کے بارہ بجے ہم تھرا سوا جاتے ہیں محبت کرنے والے  
سوئے ہیں بھلا؟۔۔۔“ نعیم اور تم نہیں سو تے۔“ دیکھیں اور ظاہر صاحب جاکتے رہتے ہیں۔“  
”اچھا تو یہ محبت ہو گئی؟۔۔۔ ظاہر نے کھٹکے طنز کی۔ ”اور اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں اور نعیم بھی آپ کی طرح میاں  
پر ہی کر۔۔۔“

”اری بہت دفع ہو رہی ہے ریشک تو نہیں کیا۔۔۔“ بچہ نے ظاہر کو ہلکا سا دھکا دے کر کہا۔ ”آخر میرے دشمنوں کو

ذلیل کرے۔ میں تو بات کر رہی تھی کہ تم اور اہل علم اب جو چھپ چھپ کے بیٹھے گلے ہوا میں کچھ راز ہے۔ ہے نا، ظاہری؟  
”محدث نہیں بولوں گی۔ ظاہر نے لب لسان لیا اور کہا۔ لیکن ایک کیل کی حکمت ارشد کو دھوکہ دے رہی ہو۔ تم  
مربانی ہو۔“

”نہیں ظاہر! خدا جانتا ہے میں یوں نہیں کہوں گی۔“ منجھ نے سیدہ ہو کر کہا۔ ”پہلے میری منی ہو... میں اب جانتی ہوں کہ  
ہوں کہ تم کو تم کو بتانا تو یقین کرنا، ظاہر! میں نے اور اہل علم صاحب نے شرع سے ہی سوچا تھا کہ ہر سنے تو تم دونوں کو مانعہ دیں۔  
مجھے، ظاہر! ابتدائی زندگی سے دل چپی ہے۔ اگر کشادہ شادی ارشد کے ساتھ ہو جاتی تو مجھے بے مضرتی ہوتی لیکن وہ بات  
جی ختم ہو گئی ہے۔ لاہور میں جو کچھ ہوا، مجھ پر اور مجھ کو اسے! اب ہم جہاں ہو گئی ہو۔ اب بہترین صورت میں بھی ہے کہ تم مانا بنا رہا ہے  
اور تم اپنے خفا سے نکل کر میں جانتی ہوں۔ تم نہ راز کو شش کرو۔ تم نہ زجلال آباد کو معلوم کرتی ہو۔ رحمت کو، راز ارشد کو اور نہ لاہور والی کو  
کو تم نے کبھی بھی اس کا ذکر نہیں کیا لیکن یہ یادیں اور باتیں درپردہ تمہیں پریشان کرتی ہیں۔ بیشتر اس کے کہ تم ماضی کی گرفت میں آ  
جنگ جاؤ، میں اور اہل علم چاہتے ہیں کہ تم شادی کرو لایم موزوں آدمی ہے۔ اسے تم نے بھی اچھی طرح دیکھ بھال کیا ہے اور اہل  
صاحب تو اسے ایک عرصے سے جانتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تم پہلے ہی نعم کے قریب ہو گئی ہو اور لایم نعم تم میں سما گیا ہے  
اب کو تو لایم کے ساتھ بات کرنا جانتے اور جلد ہی تمہارا سایہ دکھایا جائے۔ منجھ نے منہ پر کھرا کہا۔ ”یہ تمہارا مسک ہوگا اور  
پشاور مسک!۔“

ظاہر مکمل ہو کر شکرگاہ اور شکر کی طرف دیکھ کر اس کے ساتھ پیٹ گئی۔ بولی۔ ”لایم کے ساتھ تو بات نہ کرنا کی ہے لیکو  
اچھی طرح نہیں جانتی۔ بھائی جان کو کیسے وہ اسے کہیں اور لایم مال باب کو خط لکھ کر کوچہ بھی لے۔ ظاہر کی سکرالہٹ غائر  
ہو گئی۔ اس کا سر جھک گیا۔ منجھ نے اس کا سر اوپر کیا تو اس نے ظاہر کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔

”اری؟“ منجھ نے کہا۔ ”ابھی نہیں دیکھی تھی، ابھی رو رہی ہے؟“

”میری ہنسی ایک فریب میں کہہ رہی ہے کیا؟“ ظاہر نے دوپٹے سے آنسو پونچھ کر کہا۔ ”آہوں کر  
میں بکڑے رکھنے کے لیے میں فقہہ لگا کر منساکر کر چوں۔ اب پایا یوں سمجھیں کہ میری سکرالہٹیں روتی ہیں اور آنسو سکراتا ہے  
اب تو میرے لیے یہ فصل کو نامشکل ہو گیا ہے کہ کس کس کو یاد رکھوں اور کس کس کو بھول جاؤں کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ  
یاد آجاتے ہیں جنہیں جلال آباد پھر آئی تھی، وہ بھی جنہیں پاکستان کے راستے میں ہندوستان کی دھرتی میں دفن کیا تھا اور وہ جو  
لاہور میں رہ گئے ہیں۔ ان کی باتیں بھی یاد آتی ہیں۔ وہ باتیں بھی یاد آتی ہیں جو میں نے لاہور میں روستے گزاری تھیں۔ وہ دن  
یاد آجاتے ہیں جو جھپٹے کھلنے لگے ہیں۔ میری ابھی کیا یادوں کا یہ جوہر آتا ہے تو میری حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے میں  
کی پٹی بڑی ہوں اور میرے اوپر سے دِل کا ڈھیر ڈھیر ہے جو میری جان میں جھپٹتی ہے۔“

ظاہر ٹھہری ہوئی، سنبھلی ہوئی، آواز میں دِل رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر لطیف مسکاسم اور آنکھوں میں اشکوں کی نمی  
اس نے پیس کا تھا کہ میرے آنسو سکرانے میں۔ منجھ جانتی تھی کہ اس لڑکی پر ایسی کیفیت کی کبھی عماری ہوا کرتی ہے۔ اسے  
کیفیت سے نکالنا نہیں چاہتی تھی۔

”لیکن میں ہوسکتا ہوں ارشد کو بھول جاؤں۔“ ظاہر نے کہا۔ ”لیکن میں جی نہیں کہنے ارشد کا غلا پر کئے لیکن میں  
اب جانتی ہوں میں رہنا چاہتی ہیں جذبات کی اندھیروں میں اڑتی نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے اس حقیقت کو قبول کرنا ہے کہ میں  
نالائز ہوں۔ آپ اور اہل علم مجھے پیادہ سے سکتے ہیں میرے وارث نہیں بن سکتے۔ اگر میں یہاں زیادہ عرصہ بڑی رہی تو  
بھائی جان کو بڑا کم روگا۔ یہ عرضیں جن کے ارگرد انٹوئل کی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں ایک روز مجھے اہل علم جانی جان کی  
بڑی بنائیں گی، پھر وہ دن بھی آجائے گا جب آپ کو یہ سوچ پریشان کرنے لگے گی کہ میں نے کبھی سوچا، اور پردہ آپ  
پہنچے تو نہیں کر لیا، میں ایک گھر سے دہاں ہو گئی ہوں۔ بیشتر اس کے کہ میں اپنی بی بی اور پردہ سے بھائی کے گھر سے  
اڑ گئوں۔ کیوں نہیں اپنا گھر لے لیا؟ اگر لایم مجھے جانتا ہے تو میں اسی کو ذمہ لگا کر ماضی میں نالوں کی میں اسے محبت کا  
بنت سے دس گی۔ لیکن میں ارشد کو... اسے ملی سی جی جی اپنی پھر وہ کچھ نہ کر سکی۔“

”میں تمہاری کسی ایک بات کا بھی جواب نہیں دوں گی۔“ منجھ نے جذبات سے زور لگا کر کہا۔ ”لیکن ظاہر! اپنے  
وارث نہ سمجھو۔ میں جانتی ہوں تم دو دھکی ملی ہوئی بڑی بچا کھو گئی ہو۔ اگر لایم دکر سے تم میرے گھر سے بدام ہو  
پہنیں بل کر کہاں سے نکالوں گی پھر تمہاری راہ دیکھا کروں گی۔“

منجھ نے اپنے خاندان کو بتایا کہ ظاہر و رفا منہ ہے۔ اہل علم نے نیم سے بات کی تو وہ کچھ دیر عادت کے مطابق شہر دار اہل علم  
نہ بسندہ سے اس کے ساتھ باقی ہیں اور اسے لگا کہ وہ اپنے والد صاحب کو خط لکھ دے اور شادی کی اجازت لے  
اسی روز خط لکھنے بیٹھ گیا۔

اہل علم نے اس کے والد کو علیحدہ خط لکھا جس میں اس نے ظاہر کا غائبانہ تعارف کیا۔ اس کے اخلاق، عادات، اطوار،  
لٹائن سے پہلے کی زندگی، خاندانی پس منظر اور دیگر باتیں تفصیل لکھیں۔

جب لایم کے باپ کو لایم اور اہل علم کے خطوط لے کر اس کی خوشی کا لکھا تھا۔ اس نے لایم کی مال کو بتایا اس نے بھی دو دنوں  
شکیلا کاٹھا کھا اور دن میں ظاہر کی تصویر بنانے میں محو ہو گئی۔

”ابن کھ دوں کہ میں برشتہ منظور ہے؟“ لایم کے باپ نے پوچھا۔

”ابن کھ دوں۔“ اور ذرا سوچ کر کہنے لگی۔ ”لڑکی کے پاس معلوم نہیں زور ہوگا کہ نہیں۔“ انہوں نے لکھا ہے کہ لڑکی لاوارث  
کے پاس کیا ہوگا؟ یہ بات بری ہے کچھ تو ہونا چاہیے۔“

”بائے باقی باتیں لے مٹی ہو لایم کی مال؟“ باپ نے کہا۔ ”میں تو اسی قسم کی لڑکی کی تلاش میں تھا جو منڈانے کو مرہم کرے  
”لڑکی کو لے لے مٹی ہو۔“ ان حالات میں کوئی بیوقوف ذرا بات اور جنرل کی سوچ کتاب ہے جہاں تک لڑکی کے لاوارث ہونے  
یہ راز زیادہ اچھا ہے۔ شادی کے بعد کی سیاست بڑیوں اور شہر داروں کی جھجک جھک سے بچھیں گے۔ دیکھا جائے  
نہیں۔ اہل علم نے اسے منہ بولی بن کر گھر میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ لڑکی کی سکول میں استانی ہے۔ سوسائٹیر  
تی ہے۔ یہاں کو بھی سکول میں لگ جائے گی کہ میں تو کھانا کھاؤں کو شہر دار لایم کی زبانی نہ جانتے لایم کو کھانا دیتا ہوں کہ پٹنڈی میں ہی

ظاہر نہ ہو مغل کا خط بہت دیر لگا کر چڑھا جسے وہ ایک ایک لفظ لانا نہ سمجھ رہی تھی۔ وہ تھوڑی سی بیچ بچی۔ دھلی انڈیا بچہ ایک بار وہ اسے حسین اور دلکش لکھائی دے رہا تھا۔ وہ خیالوں کے زیر و بم میں جیسے جا رہی تھی کہ وہ ماضی میں جا بھی۔ اسے بداداری کی قانون یاد آگئیں اور اس کے آنسو بہنے لگے۔

”اپنے آپ میں اس قدر غم تھی کہ اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ جو اس کے کمرے کے دروازے میں کھڑی ہے۔ ظاہر کیا گیا ہے کہ سر لکھنے والی لکھائی لکھتے چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ سر کے نیچے تھے اور خط لکھ رہی تھی۔ اسے پھر عجیبے کی قسم تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے تو آہستہ آہستہ اس کے قریب گئی۔ ظاہر ہو کر کمر کی کاسی میں اس کی حالت میں پڑی رہی۔ وہ ابھی یادوں کے تالے بانے سے ٹکناڑا جا رہی تھی۔

”میری اہی زندہ تو ہیں تو... ظاہر نے زلیبا کہا اور اس کی آواز بگ گئی۔

”آنسو خوشی کے معلوم ہوتے ہیں، ظاہر!۔۔۔ سمجھنے اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس کا مزاج بدلنے کی خاطر کیا۔

”نہوں نے گئے گھر سے، زندہ اور مرے ہوئے سمجھنے یاد آتے ہیں؟

”اہی بہن تو میں ان سے اجازت لیتی...“ ظاہر نے سر کو کمر کی طرف گھما کر آہستہ سے کہا۔

”چلیا ہے اور میں؟“

”میں لکھنا رہی امی نہیں چوں ظاہر ی؟۔۔۔ سمجھنے اپنے آنسوؤں پر پتا پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میری اجازت ما؟ میں نہیں اپنے ہاتھوں ہندی لگا کر رخصت کروں گی؟

”کمرے میں سال سال کرتا ہوتا سکوت بھر گیا جس میں اداس سی مسرت ہونے ہوئے سانس لے رہی تھی۔ وہ اسیدوں میں وہاں کے کمرے کی فصائیں جیسے جیسے چھین چھین خوشبو بھری تھی جس میں ظاہر اور کمر کی بیابا بھری سرگوشیاں تیر رہی تھیں۔ ظاہر نے کمر کی آغوش میں جھپٹا لیا اور بک کے بستک کر دئے گئے۔ سمجھنے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ آنسو بہ جانے سے

کے ہاتھوں کے پیاد بھرے کس سے ظاہر اس کیفیت سے نکل آئی اور اطمینان کا سانس لے کر اٹھ بیٹھی۔

”مجاے ارشاد و رخصت کس حال میں ہوں گے؟“ ظاہر نے آنسو پونچھ کر کہا۔ ”عفت بے چاری کو خدا صحت دے۔“

”یہ شادی کا پتہ چلے گا تو کیا کہیں گے۔ ارشد کو وہ تو نہ ہوگا؟“

”کچھ ہوگا تو کیا ہوگا؟“ سمجھنے کہا۔ ”اور اسے پتہ چلے گا ہی کیونکر؟ چھوڑو، ظاہر وہ قسم کرو اب اس قسم کو وہ باتیں نہیں سن اور نعم ایک ہوجاؤ تو سب کچھ بھول جاؤ گی۔“

”نہر کی شہقت اور پیار سے لبریز باتوں کے اثر سے ظاہر نے اداسیاں جھٹک دیں اور وہ کمر کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”آپا! لے آؤ کس قدر مسکو گی دیتے ہیں؟“

”سمجھنے اس کا گال تھپکا یا اور کہا۔ ”خدا تجھے خوشیاں مبارک کرے۔“

”خدا خوشیاں مبارک کرے کی آواز سے ارشد کو بوجھ ہو گئی تھی کیونکہ اس کے بعد اسے یہ بھی سننا پڑتا تھا۔ ”عفت مجھ پر ک

نہ مرنی سے شادی کر کے لڑکی کو ساتھ لے آئے۔ رہا ہے یہی کون یہاں جیسے دکھانا ہے جو تھے وہ مشرقی پنجاب اپنا رہ گئے ہیں اور جو آئے تھے وہ جانے پاکستان میں کہاں کہاں بکھر گئے ہیں؟

”میری بوی نہیں۔۔۔ ماں نے بچہ لکھ کر کہا۔ ”بات تو لے جانی جا چیتے؟“

”مگر ابھی تک مشرقی پنجاب سے نکلی نہیں ہو۔ باپ نے کہا ہٹ سے کہا۔ ”مگر ابھی تک حالات ابھی اسی عموں نہیں کیا کہیں ہنق اٹھاؤ اٹھاؤ ہزاروں کا بھی اتنا درد ہو رہا کہ ان کی بوجھ ہیں لڑکی سے غرض ہے اور اس سے دل چاہی ہے۔ سنا نہیں آئے نہ نعیم نے کیا لکھا ہے؟ میں اسے کھدیتا ہوں کہ دیں دن مقرر کرو اور اس میں اس کو بڑا پتہ چیتے جاؤں گا“

”میں بھی ساتھ چلوں گی۔“ ماں نے ذرا دبے سے کہا۔ اور نعیم کی خاطر کس طرح مجبور کئے ہیں؟ میری لگاؤ۔

”یاس ہی تو رہتی ہے پھر وہ بال بچے والی ہے۔ دکھ کچھ میں ساتھ دیتی ہے۔“

”ارے جی!۔۔۔“ نعیم کے باپ نے کہا۔ ”تمہاری بہن جانتے تو اس کا خاندان کیوں نہ جانتے؟ وہ دونوں باپ سے نعیم کے دونوں چچوں کو کہیں نہ ملایا جائے؟“

”نعم نعیم کی ماں امی تھیں بتا رہیں نعیم ماشاء اللہ چچیں برس کی ہو کر اپنی کمائی کما تھے اور سب کو معلوم ہے کہ وہ مکمل طور پر آزاد ہے۔ ہمارے لیے یہ بڑا بڑا کام ہے۔ کوئی لا کرے گا تو کر کے لے لے اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔ اپنے گھر سے بچے کو سمجھتا ہے۔۔۔ بس چپ رہو میں نبھال لوں گا۔“

جب نعیم کو اور اور کالنگ لگے نعیم کے باپ کے خطوط ملے تو گھر میں جیسے خوشیاں کھلنے لگیں۔ ہر جہ پر۔۔۔ مسکراہٹیں اور نعیم بھی نعیم اور ظاہر کی مسکراہٹوں پر شرم و حجاب تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے جھپٹنے لگے۔ بچہ چچہ بچہ کر پڑنا لگ دیا۔

ظاہر نے اظہار و خط لکھ لیا تھا لیکن وہ نعیم کی طرف اب بڑا خط دیکھنا چاہتی تھی۔ سمجھنے سے پوچھا تو اس نے کہا۔

”لے لے۔ اب کیا شرم آ رہی ہے؟ لیکن ظاہر وہ نعیم کے کمرے کی طرف دیکھ کر شرم سے سر نہا رہی تھی۔

”خدا کیا جانیں نا! لڑکیوں کے خط۔۔۔ سمجھنے اسے باز سے پوچھا کہ نعیم کے کمرے کی طرف گھسنا تو وہ میں لیا۔“

”لیٹے لیٹے ہی گھسنا نعیم کے دروازے تک لے گئی نعیم کے سرے میں بیٹھا بک کے خط کو تیسری بار پڑھ رہا تھا۔ اس نے ذرا دور سے میں آکھڑا ہوا۔ ظاہر کو خوش پڑے لیٹے دیکھا تو وہ دروازے کی اوٹ میں ہو گیا اور ظاہر بھاگ کر اپنے کمرے پر

”ہاں! اب جان کا خط دیں، وہ ہنگ رہی ہے۔“

”نعم نعیم نے خط نہ کر دے دیا۔“

ظاہر نے خط پڑھا تو اطمینان و سکون کی لہر اس کے جسم و جان میں سرایت کر گئی تھی۔ بڑک کے ایک ایک

ہی حقیقت تھی اور یہ فرقے کو ظاہر کو جانے کوں سے آسمان پر لے گئے۔۔۔ آئیں میں دلی ملے کر وہیں ایک بار

کا گناہ غور کرنے کی ضرورت نہیں اور میری انہیں زور اور کڑیوں کے لیے پریشانی ہونے دینا۔ کچھ کا معاملہ ہے۔“

”کوئی میری طرف سے کوئی پابندی نہ سمجھو۔ دن مقرر کرنے میں تم آزاد ہو مجھے یہی چاہو وہ پہلے اطلاع دے دینا۔“

بہت افسوس ہے۔ خدا کو یہی منظور تھا۔  
 چنانچہ کوکسات درہر ہسپتال میں رکھا گیا تھا اور آج پانچواں دن تھا کہ وہ اچھا بھلا ہو کر گھر گیا تھا۔ ارشد کی اہلی نے ڈوگھلا  
 کام کا دن زینت کے حوالے کر کے ساری توجہ اور پیار بچنے کے لیے وقف کر دیا۔ یوسف اور ارشد کو دی بٹی بھولی بسوی ابا جان  
 اسے اس طرح یاد آگئیں جیسے وہ اس کے ذہن کے کسی کوئے میں محفوظ رکھی تھیں۔  
 ارشد بعض اوقات قدرت کے معشوم کو دکھاتی رہتا تھا اور اس کا سینہ نرم داندہ سے سبھ رہتا تھا۔ بچے کو کچھ  
 اسے کیا کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ ہر وہ بات اور ہر وہ واقعہ جو بچے کے ساتھ ہوا ہے۔ دل میں تازہ ہو کر سامنے آجاتا اور ارشد کا دل بچے  
 کو دل پڑتا تھا۔ جب ارشد کے اعصاب تنگ جاتے تھے تو وہ تھک کر اپنی انگلی بچے کی پتھلی پر رکھ دیتا تھا۔ بچے کی انگلیاں پھول  
 کی پتھلیوں کی طرح اس کی انگلی کے گرد پٹ جاتی تھیں۔ ارشد بچے کے زخموں پر اپنا دل رکھ دیتا تھا۔ ایسے میں اسے ایسا قدرتی  
 وہابی زندگی اس روٹی کے گائے سے پلٹ کر گزار دینا چاہتا ہو۔ بچے کے جوئے سے جو دکھ اس کے سینے میں بیدار ہوئے تھے وہ ان  
 بچے کے لمس سے دور ہو جاتے تھے۔

لیکن ارشد کے دل وہاں سے غم و غصہ نہیں ہوتی تھی۔ عفت کی موت کے بعد طاہرہ ایک سننے ہوئے میں اس کے ڈھول  
 اور خیالوں پر چھاننے لگی کسی کی اور کسی کو دل وہ اس کی نظروں کے سامنے سے مٹتی نہیں تھی۔ وہ ہر روز ان کا وقت گزر جانے کے  
 بعد دل کو دھندلے فردا کے رشتہ دے لیتا تھا۔ "افتخار بیگ کا خط یاد آیا۔ وہ اس کے پہلے خط کو یاد کرتا تھا اور حساب کرتا رہتا  
 تھا کہ اب طاہرہ اب واپس آباد ہوگی۔ اب کوئی شے نہیں گنتی ہے۔ اور اس کے ماہ کے دوران کراچی ہوگی یا وہ یقیناً لاہور آجائے گی۔ وہ اسے  
 کی ضرورت اس کی تسلی اسی فقرے سے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دکھ بھری لرزتی آواز اس کے گرد مڑلانے لگتی تھی۔ میرا  
 بچہ طاہرہ کے ساتھ کسی کو زور دینا کسی دوسری لڑکی کے ساتھ شادی نہ کرنا۔"

دوبینے گزر گئے۔ بچے نے آٹھ گھنٹے محول دیں اور وہ مسکراتے ہی لگ گیا۔ پہلے سے زیادہ مضبوط اور ہلکا ہوا گیا۔  
 جاتا تھا اور ارشد کے غم و غم کے چہرے پر پھر گئے اور اسے تھے۔ ارشد نے مدد سے دکھ بچے کی ٹمکسٹ میں ڈالنے  
 شرف گارڈین لیکن وہ تنہائی کی گھڑیاں اس سوچ و فکر میں ڈوبا رہتا کہ طاہرہ کو کمال اور کیونکر تلاش کرے۔ اب اس نے ابا جان اور  
 بڑے بھائی کے ساتھ بھی اس موضوع پر باتیں شروع کر دی تھیں۔

اب شہر جو اس کی سہمی میں خیالوں اور یادوں نے پکار کر رکھا تھا جہاں گیا، جھوڑن گیا  
 رہے بن ہو کر ان فضا میں تنگی کا اندھ کے بیٹھا گیا جیسے اسے دھن بچہ نظر آتا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا اور میں بھی دیکھنا چاہتا  
 تھیں۔ کوئی چیز ایک کے رنگ تھی۔ اس پر غامضی طاری تھی لیکن اس فضا میں ایک بے گلی اور اضطراب تھا۔ وہ روٹنا چاہتا تھا  
 ان گھٹیا خشک تھیں۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کا دم گھٹ جاتے گا۔

اس کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ ارشد نے دروازے کی طرف نزدیکھا۔ "سم میٹھا، ابھائی نے بچے کو اس کی گود  
 لے لیا اور آہستہ سے کہا۔ "طاہرہ پر میرا دل بڑا ہے۔"

ارشد نے آہستہ آہستہ بے خیالی میں بچے کو یادوں کے گھیرے میں لے لیا اور نظریں لگا کر کہنے پر تھامیں۔ "وہاں ہی  
 لو کھتا رہا اور ایک لٹ بچے کو گلے لگا کر بے شمار روٹا۔ بھائی پاس کھڑی رہی اور چند منٹ بعد اس کو کچھ بچے لگا کھاتا کر  
 ے سے نکل گئی۔ ارشد کو ایک گونہ قرار آیا۔ رکا بڑا غامض اس کو بڑ گیا۔ اس نے سر پیچھے کر سی پر چھینک کر آہ لی جیسے کہا ہو  
 طاہرہ؟

"طاہرہ! جارجٹ کے لال دوپٹے کے گھنٹہ گھٹ میں سے چھن کر آئی ہوئی انیم کی آواز نے طاہرہ کے سارے جسم میں

ارشد بعض اوقات قدرت کے معشوم کو دکھاتی رہتا تھا اور اس کا سینہ نرم داندہ سے سبھ رہتا تھا۔ بچے کو کچھ  
 اسے کیا کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ ہر وہ بات اور ہر وہ واقعہ جو بچے کے ساتھ ہوا ہے۔ دل میں تازہ ہو کر سامنے آجاتا اور ارشد کا دل بچے  
 کو دل پڑتا تھا۔ جب ارشد کے اعصاب تنگ جاتے تھے تو وہ تھک کر اپنی انگلی بچے کی پتھلی پر رکھ دیتا تھا۔ بچے کی انگلیاں پھول  
 کی پتھلیوں کی طرح اس کی انگلی کے گرد پٹ جاتی تھیں۔ ارشد بچے کے زخموں پر اپنا دل رکھ دیتا تھا۔ ایسے میں اسے ایسا قدرتی  
 وہابی زندگی اس روٹی کے گائے سے پلٹ کر گزار دینا چاہتا ہو۔ بچے کے جوئے سے جو دکھ اس کے سینے میں بیدار ہوئے تھے وہ ان  
 بچے کے لمس سے دور ہو جاتے تھے۔

لیکن ارشد کے دل وہاں سے غم و غصہ نہیں ہوتی تھی۔ عفت کی موت کے بعد طاہرہ ایک سننے ہوئے میں اس کے ڈھول  
 اور خیالوں پر چھاننے لگی کسی کی اور کسی کو دل وہ اس کی نظروں کے سامنے سے مٹتی نہیں تھی۔ وہ ہر روز ان کا وقت گزر جانے کے  
 بعد دل کو دھندلے فردا کے رشتہ دے لیتا تھا۔ "افتخار بیگ کا خط یاد آیا۔ وہ اس کے پہلے خط کو یاد کرتا تھا اور حساب کرتا رہتا  
 تھا کہ اب طاہرہ اب واپس آباد ہوگی۔ اب کوئی شے نہیں گنتی ہے۔ اور اس کے ماہ کے دوران کراچی ہوگی یا وہ یقیناً لاہور آجائے گی۔ وہ اسے  
 کی ضرورت اس کی تسلی اسی فقرے سے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دکھ بھری لرزتی آواز اس کے گرد مڑلانے لگتی تھی۔ میرا  
 بچہ طاہرہ کے ساتھ کسی کو زور دینا کسی دوسری لڑکی کے ساتھ شادی نہ کرنا۔"

دوبینے گزر گئے۔ بچے نے آٹھ گھنٹے محول دیں اور وہ مسکراتے ہی لگ گیا۔ پہلے سے زیادہ مضبوط اور ہلکا ہوا گیا۔  
 جاتا تھا اور ارشد کے غم و غم کے چہرے پر پھر گئے اور اسے تھے۔ ارشد نے مدد سے دکھ بچے کی ٹمکسٹ میں ڈالنے  
 شرف گارڈین لیکن وہ تنہائی کی گھڑیاں اس سوچ و فکر میں ڈوبا رہتا کہ طاہرہ کو کمال اور کیونکر تلاش کرے۔ اب اس نے ابا جان اور  
 بڑے بھائی کے ساتھ بھی اس موضوع پر باتیں شروع کر دی تھیں۔

اب شہر جو اس کی سہمی میں خیالوں اور یادوں نے پکار کر رکھا تھا جہاں گیا، جھوڑن گیا  
 رہے بن ہو کر ان فضا میں تنگی کا اندھ کے بیٹھا گیا جیسے اسے دھن بچہ نظر آتا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا اور میں بھی دیکھنا چاہتا  
 تھیں۔ کوئی چیز ایک کے رنگ تھی۔ اس پر غامضی طاری تھی لیکن اس فضا میں ایک بے گلی اور اضطراب تھا۔ وہ روٹنا چاہتا تھا  
 ان گھٹیا خشک تھیں۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کا دم گھٹ جاتے گا۔

اس کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ ارشد نے دروازے کی طرف نزدیکھا۔ "سم میٹھا، ابھائی نے بچے کو اس کی گود  
 لے لیا اور آہستہ سے کہا۔ "طاہرہ پر میرا دل بڑا ہے۔"

ارشد نے آہستہ آہستہ بے خیالی میں بچے کو یادوں کے گھیرے میں لے لیا اور نظریں لگا کر کہنے پر تھامیں۔ "وہاں ہی  
 لو کھتا رہا اور ایک لٹ بچے کو گلے لگا کر بے شمار روٹا۔ بھائی پاس کھڑی رہی اور چند منٹ بعد اس کو کچھ بچے لگا کھاتا کر  
 ے سے نکل گئی۔ ارشد کو ایک گونہ قرار آیا۔ رکا بڑا غامض اس کو بڑ گیا۔ اس نے سر پیچھے کر سی پر چھینک کر آہ لی جیسے کہا ہو  
 طاہرہ؟

برقی زود وادی۔ اس سے پہلے اس نے یہی آواز کی تھی اور آج کی رات جب یہ کمرہ گدگدوں اور تصویروں سے سما گیا تھا اور  
ظاہر کے لئے چنگ پر چڑھنے اپنے ہاتھوں پھول اٹھا تھے یہ آواز اسے ابھی ہی معلوم ہوئی۔ اس اوجھٹ میں بھی بیاہ تھا اس  
آواز میں بھی بیاہ تھا لیکن وہ جینے لگی۔

وہ بہر ہوتی کی طرح سڑکی جاری تھی کہ نعیم نے اس کا گھونٹ اٹھا دیا اور اس کی ٹھوڑی اس طرح ہاتھ سے تھام کر اڑکی  
جیسے زمین پر پڑا پھول اٹھا یا ہو۔ ظاہر نے چہرہ تو اڑا کر دیکھا لیکن پکوں نے جبکہ کوہا بل بھری آنکھوں کو جو کاسل کے بغیر لٹے  
جنگا کرتی تھیں، روہ سے میں چھپا لیا، پکس اور انھیں تو آنکھوں کے سامنے وہی علم تھا اور نعیم کا وہی کمرہ جس میں ظاہر ہر روز آواز  
رات کو بے دھڑک آکر کرتی تھی۔ آج کی رات اس کمرے کی ہر چیز میں اوجھٹ اور اجینیت تھی لیکن ان کو کچھ نہ اور اجینیت  
میں جردمان، جو آواز تھیں اور کھیت تھا وہ انوکھا نہیں تھا۔ ظاہر ہر چنگ پر سرخ کپڑوں میں بوس اس کی طرح بیٹھی تھی جس طرح برقی زون  
جنگا کرتی تھی نعیم اس کے پاس بیٹھا لیکن چہرے کے قریب نہ اور قریب ہوتا پھیرا گیا۔

ظاہر کی آنکھوں کے سامنے نعیم کا پر شاد چہرہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا ایک ایک نقش اسے اچھا نظر آنے  
رہا تھا۔ پھر نقش اور خدا و خال دھندلے ہو گئے۔ پھر دھندلا گئے۔ پھر چہرے میں آئینے شیشے میں کسی چکر کو دیکھ رہی ہو جس قدر  
بڑی ہو گئی ہو کہ پانی نہ مانتے۔ نقش اس قدر دھندلا گئے جیسے وہاں کچھ تھا بھی اور کچھ بھی نہ رہا تھا۔ جت کا پتہ آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔  
ظاہر کی آنکھوں کے سامنے چھت بھی پٹنے کے ساتھ گھومتی لگی۔ تیز۔ تیز۔ تیز۔ بہت تیز۔ ظاہر نے محسوس کیا  
جیسے وہ چٹخوڑے پر بیٹھی ہے جیسے بہت تیز گھبرا جا رہا ہے اور گرد و پیش کی ہر ایک چیز ایک جگہ میں گھوم رہی ہے۔ وہی سر، وہی  
کیف جو کچھ گھومتے چٹخوڑے پر محسوس کرتا ہے۔

پھر آہستہ آہستہ، نہایت آہستہ آہستہ، اندام آرام سے متعجب متعجب کروا رہا ایک چیز اپنی اپنی جگہ پر آگئی چھت لگ گئی پنکھا  
چلتا رہا جس کی دھیمی دھیمی ہوا اب اور زیادہ خشک ہو گئی تھی۔ سکون، قرار، یمن، سانسوں کے اکھڑے ہوئے تسلسل میں سرور  
جیسے احصاب زدہ کے احصاب ٹھکانے آگئے ہوں اور اب وہ سوجانا چاہتا ہو۔

ظاہر نے بند آنکھوں کو ذرا سا کھولا نعیم کا چہرہ ابھی دھندلے اوٹ میں چھپ گیا تھا، جھجکا اور سکرا ہٹ اس  
کے چہرے کو منور کر دیا۔ ظاہر نے بازو اپنی آنکھوں پر رکھا لیکن جھنجھکی ہوئی سکرا ہٹ کو چھپا نہ سکی۔

کمرے کا داروازہ بند تھا کھانیاں بھی بند تھیں۔ نئے نئے کھانا پر دسے پٹھے کی ہوا سے آہستہ آہستہ بل رہے تھے جیسے  
عروسی کے بستر پر پٹے ہوئے چٹوڑوں کی خوشبو سے وہیں آگئے ہوں کمرے میں رومان پر دسکوت تھا جسے روٹے شیش ٹینٹ  
کرتے ہوئے کسی آنکھ کی دھل، بال گاڑی کے ڈوبوں کے ٹپکے تھے، صدمہ، کھانیاں گھر کے آنکھوں کی زدم، بوم، زدم، بوم کی گونجنا آوازوں  
سڑک پر گزرتے تھے کے گھوڑے کی شب، ٹیلا، ٹاپ اور گھنٹی ذرا سا نقش کرتی تھی۔ ان مختلف آوازوں میں وسقیت تھی۔ تمام  
آوازوں کی سرزنش ایک ایک جی تھی جیسے وہ ایک ہی نغمہ الپ رہے ہوں، جیسے قدرت نے آج کی رات انہیں ایک تال پر منظم  
کر دیا ہو۔

ظاہر کو نعیم کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن وہ آج کی رات کے ایک ایک لمحہ سے اور آج کی رات کی ایک ایک آواز

کی برقی سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی اس سے پہلے وہ ان کی دھل اور کھانیاں گھر کی گونجنا ہٹ سے تنگ آ جا یا کرتی تھی لیکن  
آج اسے ان آوازوں میں فہمی اور تانہو سے کی شکست میں ایک راگ سنائی دے رہا تھا۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نعیم کو دیکھنا نہ چاہتی تھی آج اسے محسوس کرنا چاہتی تھی اس کا ایک دھن نعیم کے ہاتھ میں  
تھا ظاہر نے اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اس کے کس کے قرار کو اور لطف شب کی تاریکی اور سکوت میں تیری ہوئی آوازوں  
کے ترن کو روک کی گھڑیوں میں محفوظ کر لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ نعیم کی ایک سانس کو، جس کے عجب آوازوں خردوں  
سے ٹھارہ تھیں، سینے میں سمیر رہی تھی۔

ظاہر نے عیاں طر پر محسوس کیا کہ ہاضی مر گیا ہے۔ اپنی تمام تر بھوٹی اور بے نیاہ خوشاں اپنے ساتھ لیے ہاضی مر گیا ہے۔  
کس قدر بے بسی تھیں وہاں، ہاضی، ایک فریب، کمر بھی ایک فریب تھا جو ظاہر اپنے آپ کو سے رہی تھی، وہ اپنے  
آپ کو رعیتوں دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہاضی مر گیا ہے نعیم کے پیلوں، آواز وہی زندگی کی پہلی رات جب وہ رازوں کے خدا سے  
غور کر رہی تھی ہاضی نے اسے ڈس لیا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے ایک ثانیے کے لیے یوں لگا تھا جیسے وہ کمرہ عروسی میں نہیں  
واپس کیپ کے قریب سے گزرتی رہی لے لائی کے پاس ارشد کے ساتھ گئی تھم راز ہو۔ اس نے ہاضی سے کہا آگے کی طرف  
کی۔ اپنے آپ کو رعیتوں دلا کر نعیم ہے ارشد نہیں اور اب وہ اپنے آزاد فیصلے سے ارشد کی محبوبین نعیم کی بیوی ہے۔

اس کے ذہن میں ٹرے سے سلامات بیاہ رہو گئے اور اس نے نعیم کا ہاتھ اس طرح مضبوطی سے پکڑا جیسے ڈوبنے  
سے بچنے کی کوشش کی ہو یا جیسے نعیم فٹہ کے جھاگ چلا ہو۔ ظاہر کی حد تک چونک سی گئی اور نعیم کے اور قریب ہو گئی۔  
”نعیم!“ ایک سرگوشی، زلیزلہ۔

”ظاہر!“  
”میرات گزر جائے گی؟“  
”پھر ایک اور رات آجائے گی، ظاہر!“

”اسی طرح؟“  
”اس سے بھی خوبصورت!“  
”خدا کرے!“

خاموشی۔ ایک سکوت، جھلنیز  
نعیم کا ہاتھ ظاہر کے ہاتھ میں تھا۔ سینے پر رکھا ہوا۔ ظاہر اس کے ہاتھ کے شیریں پس کے سہارے ہاضی سے  
نکل آئی۔ اس کے اپنے آپ کا تانہا ہر سرور کرنے کی کوشش کی جیسے خدا نے اس کی روح کے درپے کھول دیئے ہوں اور شے  
ان دیکھوں سے نئی روشنی ڈال رہے ہوں۔ اس نے محسوس کیا جیسے عورت کے وہ جس ایک عورت جنم لے رہی ہو۔ سوانت  
خدا کا پیغام بن کر اس کے ریشے ریشے میں جاری تھی اور ظاہر نے محسوس کیا جیسے وہ شکر کا پیغام بن کر باہر لپک کے دوش پر آسمانوں  
کی طرف اڑی جا رہی ہو۔ خدا کی طرف، ہند، خدا میں سمجھ رہے ہوں کہ اسے خدا اور شکر پر تو رہے جیسے عورت کے روپ میں



پیدا کیا۔ مجھے عورت کے وہ میں ہی پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اس نے ماضی خدا کے سپرد کر دیا۔

رات کے لمحات دمک بنگی چڑلوں کی طرح ایک ایک کر کے اڑتے جا رہے تھے۔ لمحات گزر گئے اور ظاہر کی اندھا زندگی کی پہلی رات کے لمحوں سے صبح طلوع ہوئی جہر صبح سے زیادہ پر نور اور روشن تھی۔

نعیم کا باب دوسرے ہی دن صابن پشاد اور جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے اظہر، نجم، نعیم اور ظاہر کو پاس بلا کر کہا۔  
"میں تم سب کا لیے مدعوں جنوں کو تم نے لی کو میری ایک آرزو اور ایک فرض پورا کر دیا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب تم بھی پورے کرو گے کہ اولاد کی شادی باپ کے لیے کتنی عظیم اور نازک ذمہ داری ہوتی ہے۔ تم بچوں نے لی کہ جس طرح میرے اہصاب سے بوجھ اٹھایا ہے میں اسی طرح باقی عمر ہمارے لیے دست و پاء ہوں گا میں اس بات کا بھی شکریہ ادا کر چکا ہوں کہ تم نے شادی جیسے اہم شے کو گھر پر منتقل نہیں کیا۔ جس طرح تم نے میرے رحم والی، اپنی فوج کی غالباً پہلی مثل ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ دور ہے اور بے جا خواہشات سے بچ رہے گئے۔ میرے بچوں کا دعا کرو خدا امتداری پر مقدس کوشش ہمیشہ کے لیے کامیاب رکھے جس سانگے اور غلوں سے یہ زخم ادا ہو رہی ہے۔ خدا کرے کہ ان دونوں کی زندگی اسی خلوص میں گزرے۔  
"آمین۔۔۔ سب نے کہا۔

اور اظہر صاحب نے۔۔۔ باب نے شگفتہ لہجے میں کہا۔۔۔ "نعیم صاحب کی چھٹیک تو ڈور درو، مال تو اسے ابھی تک گویں اٹھانے کو پھر کر ہے اور میرا صاحب میں کو محفل میں محل کر بات نہیں بھی کر پاتے۔  
"اب کیا کریں گے۔۔۔ نجم نے کہا اور ظاہر نے شہدہ دوسری طرف پھیر لیا۔ نعیم کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہوئی۔  
"خدا کرے صحتی۔۔۔ باب نے شگفتہ لہجے میں کہا اور پوچھا۔۔۔ کوس کا یہ آخری ہفتہ ہے نعیم؟ .... خٹیک ہے تو تم آئندہ آؤ اور اجازت گے؟

"میں نہیں!۔۔۔ اظہر نے کہا۔۔۔ آئندہ سو مور کہتے۔ اس آخری اٹار کو یہاں پک بک منائی جاتے گی۔

"ی ہاں اباجان!۔۔۔ نعیم نے کہا۔۔۔ ہم سو مارا کیس پر اس رات تو شیکے پشاد پر پہنچ جائیں گے۔

نعیم اور ظاہر کے پشاد جانے میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا۔ ظاہر نئی زندگی کے پرہیز آغا خان کے کینٹ دوسروں میں مسرور، پشاد اور نعیم اور سسرال کے خواب دیکھ رہی تھی۔ نعیم سے وہ پشاد کے متعلق، اس کی مال کی طبیعت اور مزاج کے متعلق سوالات پوچھ پوچھ کر اسے پریشان کرتی رہتی تھی۔ بعض اوقات وہ ایک گہری سوت میں گھم جاتی جس میں ایک تختہ کار اور بے مصلحتی بھی۔ ایسے میں نعیم کا ہی سہارا ملتا تھا۔ اور وہ اس کا فکر دور دیتا تھا لیکن یہ فکر تھوڑی دیر بعد پھر عود کرتا تھا۔  
"اگر آپ کی اتنی جان ہے مجھے پسند نہ کرنا تو آپ نہیں کیا کہیں گے؟۔۔۔ یہ سوال ظاہر پہلے قین بار نعیم سے پوچھ چکی تھی اور نعیم اسے تفصیلاً جواب دے چکا تھا کہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اسے پسند نہ کرے۔

لیکن عجیب میں ایک جوانی ہے اسے کس طرح چھپایا جائے گا؟

"کیا خامی ہے تم میں؟۔۔۔ نعیم نے حیرت سے پوچھا۔

"میں بھی تو خامی ہے تاکہ میں لاوارث ہوں۔ ظاہر نے کہا۔۔۔ مہاجر ہونا بھی تو ایک کمزوری بن گیا ہے۔ دیکھ کہ کہیں گے

کبک سے مہاجر لوگ کیا لایا ہے۔ زلزلہ زبردست ہے۔

"نہو، ظاہر!۔۔۔ نعیم نے جھجکا کر جواب دیا۔ "پشاد میں کیا ہر گاہ کیا نہیں ہوگا۔ لوگ کیا کہیں اور ہم ان کے جواب میں کیا کہیں گے یا ہم کیا نہیں کہیں گے، ہر وقت پر ہنصر ہے جو کوئی عیسیٰ بات کرے گا اسے موقع مل اور اس کی بات کے مطابق دینا ہی جواب دے دیں گے۔ ہم کہیں بیکار باتیں سونے سونے کر بھانک رہے ہیں۔

"میں اس لیے فکر مند ہوں کہ مجھے خانہ داری کا کچھ سلیقہ نہیں۔۔۔ ظاہر نے نکلے مند لہجے میں کہا۔۔۔ آپ کی اتنی بڑا زانہ میں مجھے تو بھی معلوم نہیں کہ کس اس کے ساتھ کیسے رہنا ہوگا جاتا ہے۔"

"ظاہر!۔۔۔ نعیم اسے جو جتنی مرتبہ بتا رہا تھا۔۔۔ اس کے متعلق میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے ساتھ ان کا پیار عام ہوں جیسا ہیں۔ وہ مجھے دیکھ کر یقین میں آتے جاتی ہیں ان کا اظہار دینا ہوں۔ انہیں میری ہر چیز سے پیار ہے۔ انہیں میری نظریں اور لڑکھنوں سے بھی پیار ہے۔ وہ ہمارے ساتھ بھی اسی طرح محبت کریں گی جس طرح میرے ساتھ کرتی ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ان کی جو جھوٹا اس لیے کہ میری بیوی رہی۔ جو اس کے متعلق میں میں ایک بات بتاؤں، جو معلوم نہیں پہلے بتائی تھی کہ انہیں کہ وہ ذرا ٹکی ملا رہی ہیں۔ میرے معاملے میں زیادہ شکی اور دہری میں لیکن اوقات تو یوں کر پیشی ہیں کہ مجھے کبھی کوئی خواہ کر کے لیے جدا رہے کیا حال کو میں ضرورت سے زیادہ وقت باہر رہا ہوں۔ جہاں وہ میرے دوستوں کے ساتھ آئیں سے پیش آتی ہیں وہاں بعض اوقات بڑا کر کے میرے بچے کو اتنی اتنی رہا ہر کہتے ہیں۔ انہیں کس کس بھی جاتی ہیں، بہر حال، ظاہر واقف ملحق رہو۔ سب خٹیک رہے گا۔ تم اتنی کے ساتھ مکمل طور پر بے تکلف رہنا اور فرمانہ دارانہ قسم کی محبت کرتی رہنا۔ میں خانہ داری کی فکر میں نہیں ہونی چاہیے۔ میں تو جانتے ہی ہم کول میں اس اتنی خواہ گئے اور گھر کے کام کا فکر نہ کرو۔ اگر کوئی ان کو لے کر تو بھی اسی سادہ کام خود کریں گی۔ یہ ان کی عادت ہے۔

سراسر انصاف اس کے متعلق ظاہر کا فکر نہ ہی دور تھا اور وہ نجم پر سوالوں کی پوچھا دے لگے۔ نجم اسے ہر بات تفصیلاً سمجھا دیتی تھی۔ علم خود بھی عامی عقل مند ہو۔ اٹا ٹک کر یوں کوئی ہر۔۔۔ نجم نے اسے ہر بار کہا۔ "جیسا انسان اور موقع دیکھو گی ویسی ہی بات اور ہر تاکہ یہ کوشش کرنا کہ اس کی طرف سے زیادہ تر برداشت کر لینا اور اپنی طرف سے عطا رہنا۔ جھجکا جھجکا تو اتنی زندگی خواب کرنے والی بات ہے۔ وہ تو بوجھ ہی ہوگی۔ بات بات میں ہمت بھی کرے گی کہ اس کا دل بھی کر لینا اور اپنی مرضی بھی کر لینا۔ نعیم تو تم سے دل برداشتہ ہونے سے رہا۔ تم اس کے دل میں سما چکی ہو، وہ تو سو فیصد امید ہے کہ تمہاری ہی طرف داری کرے گا۔

گھر میں جھجک جھجک ہوتی رہی ہے۔ اپنی طرف سے کوشش کرنا کہ نہ ہونے پائے۔ اگر ہو جاتے تو دو گزر کرنا۔  
سو مار کی شام کو، ظاہر، اظہر اور نجم کو اوداع کر کے نعیم کے ساتھ پشاد پر پہنچ گئی۔ نعیم کی امی نے لنگھیر بکر ظاہر کو مستقل کیا۔ بیٹے اور بھوکے سو سو ملاں میں اس۔ دوسرے دن محلے میں یہ خبر پھیل گئی کہ نعیم بڑی سے وطن لایا ہے۔ عورتوں نے نعیم کے گھر بڑوں دیا۔ اس کی خال کو پتہ چلا تو وہ جلی کٹی کے نعیم اور اس کی ماں پر برسی پڑی۔۔۔ اندری اندر سب کچھ کر لیا اور میں پوچھا کہ نہیں۔ ہمیں کہ منہ سے نکال کر تو لوگوں کا حق اور ضرورتوں اور ایک کم ہو کر۔۔۔

نعیم کے باپ نے محبت ٹوٹ کی باتیں بنا کر اسے ماضی کو لایا اور دو تین روز میں فضا سے رشتہ داروں کے گھون ٹنگوں کا تھوڑا دور ہو گیا۔

آہستہ آہستہ تھی دلہن پرانی ہوئے گی۔

”اس خط کے حساب سے ظاہر ہواں دونوں کراچی ہو گئے۔ ارشد نے اباجان اور رُصفت سے کہا: خط لکھو اور حضرت اگر اپنے مجھے کانامی لکھ دیتے توں کراچی جا کر انہیں تلاش کر لیتا۔“

کراچی میں کسی کو تلاش نہ کی گئی تھی۔ اباجان نے کہا: ”اشتہار کرو جس طرح ظاہر ہونے اس خط میں دو ہزار نو لکھ دیتے تھے وہ کم از کم ایک اور خط ضرور لکھے گی۔ اس کے علاوہ افتخار بیگ کے خط کے مطابق امید رکھنی چاہیے کہ وہ لاہور آجائیں گے۔“

بچے تو سب یقین ہے کہ ظاہر آجائے گی۔ یوسف نے کہا: ”اس گھر کی یاد اس ہم سے دور رہنے نہیں دے گی۔ ارشد اپنے آپ کو سبب تسلیم دے کر خاموش ہو گیا لیکن اس کی اعلیٰ دنیا میں ایک داویلا پیار ہوتا تھا۔ وہاں ایک سبب لایا۔ زلزلے اور آندھیاں ملتی تھیں عفت کے مر جانے کے بعد اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اسے عفت سے اسی قدر پیار تھا جس قدر ظاہر سے۔ یہ احساس کہاں سے آتا تھا؟ ارشد کو معلوم نہ ہو سکا لیکن یہ احساس ایک تلخ حقیقت بن گیا تھا کیا ظاہر اور عفت اسے جو بھی یاد آتی وہ تڑپ اٹھتا تھا۔ اس کی زندگی مسلسل تڑپ اور انتظار تھی جاری تھی۔“

عفت جس طرح ترس ترس کر اور بسک بسک کر مری تھی اسے ارشد اپنا جہم سمجھنے لگا تھا۔ ”کاش! میں عفت کے جیتے ہی اس سے محبت کر سکتا۔ یہ خیال کشاں کشاں اس کے ضمیر میں اتر گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی۔۔۔ کاش! ظاہر اس قدر عظیم تر کرتی۔۔۔ یہ خیال اکثر اوقات بچتا رہا لیکن اسے پریشان کرنے لگا۔ وہ باتو لگتی سوچ میں ڈوبا ہوا ظاہر کو تلاش کرنے کے لگا پھر کرتا رہتا با اندرونی غصہ اس کے زیر اثر برآمدے یا گھرے میں ٹھٹھٹھ لگتا تھا۔ اس کے ہاتھ بے چینی سے عجیب حرکات کرتے تھے جیسے عفت کے ڈھیر میں سے کوئی چیز تلاش کر رہے ہوں بیچن اوقات تو وہ رات کو اٹھ کے بیٹھ جاتا اور رات اندھیرے سکوت میں ہانسی کے ہنگاموں کو دیکھ کر راتوں کی بے چینی کو فریب دے لیتا تھا۔ اس کے اباجان، بھائی، امی اور بھائی گھٹیت گھٹیت کر اس دلدل سے نکالنے میں مصروف تھے لیکن ظاہر کی جدائی کے دکھ اور عفت کے غم میں جو قوت تھی وہاں سے شکست کھانے والی نہیں تھی۔“

ارشد کو کوئی شے سکون دیتی تھی تو وہ اس کا بچہ تھا۔ ظاہر پرچی۔ جو تین ماہ کا ہو گیا تھا فصحت کے ساتھ بچے کا اور انگوٹوں میں دو شہمی انگلی کرکشن کی طرح چلتے رہتے تھے جیسے لینے لینے سا کھیل چلنا۔ وہ بیٹی دیکھا کرتا رہتا ہنستا اور چہرہ رہتا تھا۔ بھئی کا بھی یہ عالم تھا جیسے قدرت نے اپنی تمام تر مہمتیں اس ننھے سے ننھے میں سموی دی ہیں۔ ارشد اسے اس کا لالہ لال کے ساتھ گال گرتا تھا تو بچہ ارشد کے گال کو بغیر ہاتھوں کے منہ سے جیسے کاٹ کھا جاتا تھا۔ جس چوس کر اس کے گال سے بھر دیتا اور ساتھ ہی ارشد کے کان ہانک کو مسرتھی سے پڑا لیتا تھا۔ ایسے میں ارشد کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس ذرا سے اس کے تمام غم سارے دکھ، ہانسی کے فریب اور حال کی نمایاں جس کی ہوں اور اس کے رگ دریشے میں سکون اور ست بھر دیا ہو۔

ارشد نے اب اپنے آپ میں یہ تیرہ ملی پیدا کر لی کہ عجب آئے تھے ابیں بھرنے اور زیادہ دیر سوچ لو کر کیا مجھے اپنے ہی پرکد سے اگلے میں ٹھٹھٹھ کے، بچے کے ساتھ کھیلنے لگ گیا۔ وہ بچے کو سینے پر لٹائے منہ اس کے منہ کے ساتھ رکھتا تھا لیکن بچے سے ظاہر اور اہل اوقات بچے کی موجودگی میں بھی اسے عفت اور اس کی وصیت یا آجائی تھی تو ارشد کی جیسے جن نگاہیں غلاؤں لڑا اور ڈھونڈنے لگتی تھیں۔

”کیوں ظاہر؟“ ارشد نے ایک روز بچے کی پٹنے کی طرح شفات آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ظاہر ہوتی کے ہاں ہو گئے؟ اور بچہ باپ کی آواز پرا پھٹنے لگا جیسے کہ راتوں کیوں نہیں رہوں گا کیوں نہیں رہوں گا۔ ڈھونڈتو لاؤ۔ میں نے پوچھا کیا نہیں آئے؟

ظاہر کو نہیں جانتے تھے؟ وہ آئے گی کہیں قبل سے وہ وہ بلا کر بے گی بہتیں، اپنے پاس سلا کر بے گی بہتاری وہ امی بھیجی ہے۔ دیکھو گے تو اس کے ساتھ لپٹ جاؤ گے۔ پھر تو تم میرے پاس بھی نہیں آؤ گے۔ آؤ گے؟۔۔۔ نہیں جھوٹ۔۔۔ اور اگر آکر آتے تو کون کھینچ لوں گا؟

ارشد نے بچے کا کان جو پھوٹا تو بچے نے دونوں ہاتھوں سے ارشد کے منہ پر چھڑ مارا۔ نے شروع کر دیے۔ اس سلسلہ میں بیٹھ گیا۔

”اچھا بھئی! صاف کر دو۔ اب کان میں پھوٹوں گا۔۔۔ چلو، ظاہر! دونوں ہاں کر دیا کریں کہ نہ تیری ظاہر وہ امی کو ملدی والیں۔“

اس نے بچے کے ”دونوں ہاتھ پھوڑ کر دعا کے لیے اٹھانے چاہے تو بچے نے ”دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ پھوڑ کر منہ لال لیا اور چہرے سے لگا۔“ بہت لالچی ہو ظاہر اس دعا کے لیے کہہ کر ہاتھوں اور منہ پیٹ کی بکر لگ گئی ہے۔ چلو چھوڑو۔“

اور ارشد یوں ہی بچے کے ساتھ کھیل کھیل کر رہا تھا کہ اس کے فرقت کے شب اور کو فریب دیتا رہا۔ ظاہر کے اگلے دن ارشد کو آکر ارشد کی قبر پر بچے کو لے جاتا رہا گا۔ بے دل میں عفت کی قبر پر عفت سے معافی مانگتا اور یوں دل اسے احساس جرم کو دھرتا رہا۔ خیالوں میں ظاہر سے بھی معافی مانگتا رہا اور ظاہر پر دیر کے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر ظاہر کی داہلی ہاتھ میں کر آتا رہا۔

دن راتوں کے تعاقب میں بھاگتے رہے۔ چاند سورج کے تعاقب میں، شام نے ایک دوسرے کے تعاقب میں لٹے رہے۔ ارشد کے تخیلات ظاہر کے تعاقب میں سرگرداں رہے لیکن کوئی کسی کو نہ پاسکا۔ تعاقب کرنے والے بھاگتے رہے۔ منہ کی دوڑ بے سواری۔ دن رات کا پھر وہاں کی رفتار۔ دن گزرتے، بچتے گزرتے، مینے لگ کر رہے۔

اور پورے پندرہ مہینے گزر گئے۔ ظاہر پر دیر دیر برس کا ہو گیا۔ اب وہ ارشد کے ساتھ اچھی بھلی کھیل کر آتا تھا، ایسے ہی جیسے عفت اور ظاہر اس کے خیالوں

میں کھیتی کرتی تھیں۔ طاہر باقی بھی کرنے لگا تھا۔ گو وہ ارشد کی باتیں نہیں سمجھ سکتا تھا، جو وہ اس کے ساتھ تنہائی میں کیا کرتا تھا، ضرور دیکھتا تھا۔ اب ارشد اسے طاہر کی بجائے طاہر ہی کہنے لگا تھا۔

”طاہر ہی بیٹے! — ارشد بھی کبھی سے تباہی سے گستاخا۔“ ارشد اسی قی تو اب آنے ہی والی ہوگی۔

”اُتی دو“ — طاہر کے پاس ہی ایک جواب تھا اور اگر ٹھوس ہو تا تو ایک گروان شروع کر دیتا تھا۔ ارشد اُتی آئی۔ اُگی گئی۔ بابا آئے۔ بابا بھائی۔ ارشد کے ابا جان کو وہ بابا کہا کرتا تھا۔ وہ اس کے لیے مٹائی لیا کرتے تھے۔ رات روز مہلا معمول بن گیا تھا۔ ”بابا آئے، بابا بھائی۔“

اب ارشد پہلے سے زیادہ وقت پیچھے کے ساتھ باتوں میں گزارنے لگا۔ ارشد کا ماضی اس ننھے سے ننھے تھا اور اس میں اسے گزرنے پر جوئے کی ایک ایک جھلک دکھائی دیا کرتی تھی۔ جب طاہر باقی باتوں، باتوں کا کتنا ٹوڑا آتا تھا جیسے بچتے نے اسے ماضی کا ایک قصہ سن دیا ہو۔

اس ٹیڑھے برس کے بعد صرف ایک تبدیلی آئی جو پہلی کی جھلک کی طرح آئی اور گزر گئی۔ وہ یہ کہ غیر اور اپنے رشتہ داروں کی تو اتفاق سے ارشد سے باہر نہیں بل گیا۔ وہ اس طرح بڑے حل طرح کچھڑے ہوئے دو کنبہ بھائی تھے۔ ارشد اسے گیا۔ وہ جانا تو نہ جانتی تھی لیکن وہ لے ہی گیا۔

نمبر کو ٹیڑھے برس بعد علم ہوا کہ عفت مر چکی ہے۔ اور اس کا بچہ ڈیڑھ برس کا ہو گیا ہے۔ اسی اور بھائی کے پاس ڈیڑھ برس ارشد کے اصرار پر اس کے محلے میں گئی اور ارشد اس کے سامنے دل کھول کر دیا۔ نمبر کو عفت کا بہت دیکھ بھال تھا۔ وہ طاہر کو گودیں لیے روٹی پڑی۔ ارشد نے ملے ملا کر ایک نمبر کا نمبر کے آگے رکھ دیا۔ گزرنے پر جوئے ایک ایک لمحے کی بات سنائی دینا بارہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر ارشد کو بتا دیا جائے کہ طاہر شادی کر کے اپنا ٹھکانہ کر گئی ہے تو ارشد کی حرکت قلب کی۔ اس نے سوچا بہتر ہے اسے امیدوار انتظار میں ہی رہنے دیا جائے کہ اگر ایک آدھ بھولی بھری مسکراہٹ تو اس پر آجاتی ہے۔ ورنہ یہ بھی ختم ہو جائے گی۔ نمبر دیکھ رہی تھی کہ ارشد وہ ارشد رہی نہیں جو اصل کی جان خواہ کرنا تھا۔

نمبر کا یہ خیال درست تھا۔ ارشد کی زندگی کو طاہر کے لوٹ آنے کی امید اور انتظار چھوڑ دے رہے تھے۔ ورنہ دیکھا ایک امید پر ٹٹا رہا تھا۔ نمبر نے سوچا یہ دیکھتا تھا ہی رہے، روقت ہر مرض کی دوا ہے۔ لیکن نمبر کو معلوم نہ تھا کہ اس انتظار کو کتنا یہ روز بروز جان ہوتا جا رہا ہے۔ نمبر نے اس کا اندازہ کرتے ہوئے ارشد کو بڑی مہنوں کی بے تکلفی سے کہا۔ ارشد ایکوں نہیں کر لیتے! بعد اسب کچھ بھول جاتے۔ اس جوانی میں رو نے بیٹھ گئے ہو۔ اس طرح کیسے بھر کھتے گی؟

ارشد نے حیرت زدہ نگاہوں سے نمبر کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں۔ سو سوٹ لڑاٹھے اور وہ روزمری ہوا بولا۔ ”آپا یہ کم کر رہی ہو؟ تم جو میری سہارا دہری می غماز ہو؟ یہ جانتے ہوئے کہ میں طاہر ہوں۔۔۔۔۔ اس کے آگے وہ بول ہی نہ سکا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت نمبر پر طاری ہو گئی اور کچھ عین دایوں سے لبریز نکرت چھا گیا جس میں پتھے کے بھگنے ہوئے کی آوازیں سنیں۔ ارشد فریاد ماموسہ کی بعد بولا۔ ”مجھے عفت کی رحمت کا بھی پاس ہے آبا! میں طاہر کے سوا اور کسی کے ساتھ ایک لمحہ بھی سکوں گا۔ ایک لمحہ آبا! تم تو زندگی کی بات کر رہی ہو میں عفت کی روح اور طاہر کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ عفت اور طاہر کی ایک ایک بار

بیاہری لگھوں کے سامنے رہتی ہے۔ اس بچے کی منہسی میں طاہر کی منہسی اور اس کے رونے میں عفت کی سکیاں سنائی دیتی۔ جب کہ اس بچے کو اپنے سے الگ نہیں کرنا تھی کے ہزار منع کرنے کے باوجود اسے اب میں اپنے پاس سلانا ہوں۔ عفت بہاقت اور طاہر کو نہ بھول جاؤں۔۔۔ آبا! سچ بتاؤ۔ طاہر عفتیں نہیں ملی تھی؟

نہیں ارشد! میں نے نمبر کے کماؤ اور اصل اپنے اچھلے دل کو دہری می کی کہ عفت میں آکر کہیں سچ بات نہ لگ دے۔ بولی رہے آتی تو کہا میں اسے تم سے چھپاتے لکھی؟ اور وہ بھی تنہا ہی اس حالت میں؟

بڑی لگی اور ارشد کو بول دیکھا لگا جیسے امید کی ایک کرن نظر آتی تھی اور شب کی تیرگی لے آئے بھی نکل گیا ہو۔ اس نے ارشد کی آواز سنی۔ ”اے خدا! طاہر وہاں بھی ہوا سے خیریت اور کام سے رکھا؟“

لئے لکھی نہیں جانتا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ یہ وجہ ایک نہیں، ہر روز نئی سے نئی شکایتوں کو جنم دیتی تھی نعیم کی  
ہاں وہاں ابیدار ہو گئی تھی جس کا بچھین لیا جائے اور پھر سے میں بند کر کے اس کے سامنے رکھ دیا ہے۔

میں نے کوہِ چودو برس تک اپنے پاس رکھا ہی رہی تھی وہ کیسے برداشت کرتی کہ اسے کوئی اور اپنے پاس لے لے۔ وہ کھاتی تھی  
لگا کر غار کے بعد عمار کی تھی تو عرف نعیم کے لیے بعض اوقات تودہ دعا کیا کرتی تھی۔ "ما خدا امیری زندگی نعم کو بدست  
بایں سلوک، پھر کاغذ اور پھر دفتر جانے لگا تھا تو وہ دن بھر اٹھتے بیٹھتے نعیم کی بغیرت واپسی کی دعا میں لگا کر کرتی تھی  
ایسا ہی ایسی باتیں بھی اس کے منہ سے نکل جاتی تھیں جیسے اس کا بیٹا جنگ پر لیا گیا ہو۔ طاہرہ کے آنے سے پہلے ان  
باتوں کا اس کا منہ دماغ کے سینے کی جھت پر آکر نہ گزرتا تھا۔ وہ ہمیشہ کے باب سے اچھے بھی پڑتی تھی جب وہ اسے  
دلا کے اپنے ساتھ بول چکا کرتا رہی ہے۔ خدا کے لیے اسے اپنے پاؤں پر چلنے دو اور اسے مرد  
بنام عمر بے یقینہ تار ہے گا تو اس پر ظلم کر رہی ہو۔ لیکن بات تڑپ اٹھی تھی۔ پیار بھلا کر مہربان ہے۔"

اب نعیم کے کردار سے ماں کے بے جا لاؤ پیار کا سارہ ہر روز اسے ایک جہازات گزرتیوں تک پہنچے تھے وہ اس  
مزل سے بہت ہی دور تھے۔ ان اثرات کی بدولت نعیم کی شخصیت کی تشکیل میں کچھ کڑیاں محروم ہو گئی تھیں۔ دل محروم  
ان کی قوتیں غامض تھیں۔ دوسری کڑی اور حالات کی مکی سی ناموافقی خود سے وہ بے حد پریشان ہو جاتا اور اس کا دل  
بلا کا صدمہ بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس کا دل صرف پیار، وہ بھی نسوانی پیار کا حاجت مند تھا اور دل پر کچھ ایک  
دش کی گرفت میں کھرا رہتا تھا۔

طاہرہ اور طاہرہ کا پیار جو جڑا تھا اسے جیسے جنت ملی گئی ہو۔ پیار محبت کے خزانے مل گئے۔ اس کا جسم اور روح  
بٹنے لگے۔ وہ بچوں کی طرح ہر وقت غاروں کی آغوش میں گرے رہنے کی ضرورت محسوس کرنے لگا اور یہ ضرورت  
اس طرح اس کے کردار کی لڑیاں اور زیادہ محروم ہو گئیں۔ اسے اس دنیا کا ہوش ہی نہ رہا۔ یہ خیال ہی نہ تھا کہ  
کے خدائی میں داخل ہو چکا ہے اور اسے ان خدائی سے بہرہ دار بھی مہربان ہے لیکن اس میں نرد آنا ہونے کی  
ناجی جرات بھی نہیں تھی۔ یہ صلاحیت ماں کے پیار سے لڑا ہی تھی۔

پھر سے نوٹا۔ اور طاہرہ کو سکول سے آتی تو دلوں اپنے گھر سے میں چلے جاتے۔ کھانا دین کھاتے۔ گہری لمبی  
نے اور زیادہ سے زیادہ دیر گھر سے ہی بند رہتے نعیم کے باب نے یہ حال دیکھا تو وہ کسی حد تک خوش ہوا کہ چلو  
ماں کا سایہ تو مٹا۔ اب وقت کے تقاضوں کو بھی سمجھ لے گا۔

بچنے پر سنا پوٹنے لگے۔ اس نے غار کے دس دلوں ہی میں اپنے دل میں رہ دہم تھا لیا تھا تیرا خوش لڑکی  
لیا ہے۔ اب سمجھ واپس نہیں لے گا۔ اس نے نعیم کی شادی سے پہلے کی طرح نعیم کو بھی کی طرح بھینسا نہ  
ہم کو اب ماں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

تو اس وقت ملی جب دو چار مہینوں پر نعیم اور طاہرہ بہت دیر سے گھر سے میں بیٹھے تھے۔ کچھ محنت کی باتیں ہو  
دینا نے کی سوچ رہے تھے کہ ماں نے نعیم کو بلایا تو معلوم ہوا کہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ماں نے ویسے

طاہرہ کے آئینہ تھے ہی نہ تھے بچہ کا طول خط اس کے سامنے ہل جاتا جیسے کسی نے ہاضی کی ساری مٹا  
ماں سامنے بھیلادی ہو۔ ایک دو لمحہ جب ارشد جلال آباد میں اس کے گھر سے میں انجانے کی طرح داخل ہوا تھا وہاں  
کے دل و دماغ معمولات انہیوں کی آماجگاہ بن گئے تھے۔ حالات سے ہم آہنگی کے اس نے سارے متن کر لیے تھے  
اس کے ساتھ سمجھ کر نہ کرتا رہی نہیں ہو رہا تھا نعیم کے ساتھ تھوڑا دی کر کے اس نے لیا کیا خوب دیکھ  
سہانے پہلے ان سے سوتے جا گئے میں ذہن میں لیا لیے تھے۔ اس نے ہاضی کی تیغ یا دیوں کو نعیم کی ذہنیت  
اس نے ایک لگ نعیم کے سانسوں کی سرسوزی میں بھجائی تھی۔ ایک تڑپ کو اس نے ازودا جیت کی لذت میں لیا  
"وہ بھی تھی شاید جان و گھر میں پہنچ گئی ہے اور اس نے اپنی منزل کو پایا ہے جہاں دیکھ میں زخم۔ بچہ بچہ  
مست رہی مسرت ہے ہر روزی سرور ہے۔ اس کے خدایں جو تڑپ بھی کچھ کر کے کی اور جو جڑ بڑھا محبت السانی کا  
کے لیے اس نے نعیم کے والدین کی منظوری سے سکول میں ملازمت کر لی تھی۔ بچوں کو پڑھانے، اور وہ بھی اپنے زمان  
میں اسے روحانی کیفیت محسوس ہوتا تھا۔ وہ رہا مسٹر طیس کے بنائے ہوئے پلیٹیں۔ مجمع تفریق اور پلیٹیں تختیوں کی پابند  
کے بچوں کو وہ اپنے بچے سمجھ کر ایک سبھی مہربانی کی طرح لکھتی پڑھاتی تھی اور انیس وہ بات کی چھوٹی چھوٹی نگار  
اور جسے وہ بھینچنے کے لیے قیاب ہوتے تھے سمجھا کر پڑتی تھی۔

کلاس میں اسے بعض اوقات امی خاتون یاد آ کر کرتی تھی اور اس کی وہ کہانیاں جن میں پریاں دیوں کی نذر نہیں ہوا  
جاتی تھیں۔ وہ کہانیاں جن کے کرداروں میں خود اعتمادی اور استقلال ہوتا تھا۔ طاہرہ کو وہ کہانیاں یاد بھی تھیں اور وہ کہانیاں وہاں  
بسی ہوتی بھی تھیں۔ ایسی ہی کہانیاں وہ بچوں کو سنا سکران میں خود اعتمادیت اور خود داری پیدا کرتی اور دین و ایمان کے سبق  
کے وقت ان کے ساتھ بھیل کر کرتی اور بچے طاہرہ کو پایا! طاہرہ کو پایا! کی رٹ سے تھکتے نہ تھے اور جو سکون جو قرار اور جوار  
کو انہی نئی روح کی مسکراہٹوں میں ملتا تھا وہی اس کی آسٹھک اور مدد و جد سے بھر پور زندگی کا حاصل تھا۔

جب سکول سے گھر آتی تو نعیم کی ماں کی پیشانی پر پڑے ہوئے ستھنوں کو سیدھا کرنے کی کوشش میں ہر روز  
طاہرہ کے پشاور نے کے دس ہی روز بعد نعیم کی ماں کی ناک کا ڈانڈا سکڑنے لگی تھی اور ماتھے پر لپ پڑنے لگے تھے۔ طاہرہ  
کی وہ جڑا یہی تھیں جنہیں ہر روز ہوش انسان نظر آ کر دکھاتا ہے اور وہ ہر کسی سے سرزد ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن درپردہ نعیم کی

ہی بلا لیا تھا۔ وہ ماں کو ٹال کر پھر طاہرہ کے پاس آ بیٹھا۔

دوسری بارہاں نے بلایا تو نیسے فدا ترش روئی سے کہا۔ اسی احتجاج خواہ نہ ہو لیا کہ رو کوئی بات نہ ہو۔  
 حاتم کے رو گئی۔ اس کے کلیجے میں ایک مس اٹھی خود راسی ویر میں بیٹھا گی بن گئی اور اس کے سینے میں شکستے شکستے آہنا  
 بن گئی۔ ماں اپنے بیٹے کو دلاس لینے پر تل گئی۔ زہر جزا لشعروں میں تھانک رو دکھ میں آگیا۔ ماں کی دنیا اور محمد جہر کی دنیا  
 زندہ لیست ہو گئی۔

ماں کے سینے میں ساس بیدار ہو گئی۔

نعیم نے بشاد پینچے ہی گھر میں ٹوکرائی رکھ لی تھی۔ اس نے ماں کو کماختا دکھا، بچانا اسی سے کہہ کر دیا کہ لکڑی کے ہاتھوں پر نہ بیٹھے۔ وہ زانیہ کی طرح تو کچھ کرنا تھا۔ وہ زیادہ روزِ غم و رنج میں نہ رہ سکتی تھی۔ ایک دن ظاہر صبح میں کسی بُری بھٹی دھوپ میں بال خشک کر رہی تھی اور کتاب چھو رہی تھی نعیم کی ماں دروازے پر آئے بغیر کمری تھی۔

”اچھی جان! — غلاموں کے کیا۔“ ڈال وغیرہ کو لڑائی سے صاف کر دیا کریں۔ وہ کیا حکم کی خواہش کرتی ہے؟ ہم کہاں تھے کو لڑائی نہیں سے خدمت کرانے والے جس کے نیلے غلامہ آئی ہے وہ خدمت کروانے والا ہے۔ ان کے لئے روحی اور فطرت سے بھر پور لمحے میں جواب دیا۔

طاہرہ اس قسم کے لب و لہجے سے نا آشنا تھی۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکتی۔

”کیوں، امی جان؟“ ظاہر نے پیارے سے لہجے میں کہا۔ ”آپ کی خدمت نہیں کرے گی تو کیا لڑا کا پلاسٹنڈ نہیں تو مجھے کہا کریں میں آپ کی بیٹی بھی ہوں، خادمہ بھی ہوں۔“

مسب کھنے کے باقی میں، ریگم صاحبہ! — مال کے بیوی اور عقل کو اس کے اپنے ہی سینے کا زور سے چکا تھا۔ ہر بھر کے بولی ”ہر نے بھی شادی کی تھی، نئی نئی شادی کے چاؤ چلے بھی کر دیکھے تھے۔ میں نول کر شرم دیا ہے۔“ دوسے تھیں چاہے کے تھیں۔ نہ چھوٹے لگا لگا طرز سے کاداد۔“

ظاہرہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ بڑھیا دل میں کوئی بہت بڑی تشکایت ہے۔ ہر  
 ظاہرہ کرنے سے گزر کر رسی ہے لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ اس قسم کی باتوں کا کیا جواب دے۔

مال بولے جا رہی تھی۔ ایک تولا کا پٹیلہ ہی گڑھا تھا۔ اب ساری کسر پوری ہو گئی ہے۔ اتنا بے حیا زحاک  
یہ ایسا مل جائے تو کوئی کیا کرے۔ وہ باتیں اس طرح کرتی جیسے ظاہر سے مخاطب نہیں۔ وہاں صدا کا  
مل رہی تھی۔ ہمیں تو کسی نے وہاں بال کو کہیں دی نہیں۔ شادی کے چوتھے روز اگلوں نے چلی پر بٹھا دیا تھا۔  
میں چم خا کتے تھے، ابھر بھی ماس بھی مجھ کو تھرپری رکھا رہتا تھا۔ کیا بال بڑوں کے سامنے سر بھی اڑا سکا کر  
رہتا تھا۔ پسے ہو، جو پا سے عورت کبھی بچھو لے کے کسی کے سامنے غاڑ دے، کچھ نہیں ملائی تھی اور آج کا  
تھے ویسے اپنے گھر میں دیکھا۔ دن دیکھا زلات دیکھی۔

انہی جان! آپ مجھے کہہ رہی ہیں کچھ؟ — طاہرہ نے حیرت زدہ ہنہر کر پوچھا۔

نہایت کے ہے! سنتا ہی کوئی ہے!...! آتش فشاں پہاڑ کا لاوا! آہستہ آہستہ نکل رہا تھا اور طامہ داس کی حرارت محسوس نہ کی! وہ دے دے سے بینت لگے جب کوئی کہتا تھا اور کوئی سنتا تھا!

۱۰۔ ملکہ کیلے آپ مجھے بھی سچے سمجھائیں۔ طاہرہ نے کتاب بند کر کے کرسی سے اتر کر اس کے پاس فزق پر بیٹھتے

ماہولِ تیر کیا بگاڑ رہی ہوں۔“ ماں نے اسی طرح اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز میں کہا۔ ”اپنا ہی فارغ  
 ل۔ سوچا تھا کہ...“ اور ماں کے آنسو نکل آئے۔

اگر وہ دل تو مجھے ڈوب ہی گیا کچھ پلے نہ پڑا یہ قسم کیا ہے۔ اگر بیسیل ہے تو بوجھ کون؟ ظاہر کے بلے صرف اسی قدر  
 کسی ایسی لغزش پر نہ ماض ہے جسے وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی یا بڑھیا کو شک ہے کہ ظاہر انہی غلطی مانے کی نہیں۔

ہاں! اٹلا کے لیے کچھ کچھ باتیں تو سی اسپیری کی خون سی خطا پر خفا میں؟ — ظاہر ہے اس کے دلوں کندھے اس لہجے میں طرح وہی خاتونوں سے کوئی بات نہایت یار تھی۔ اس کی نظریں اسی خاتون اور اس میں کوئی فرق نہ تھا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک ذوق کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔ ظاہر کا سلیجھا جوا مانع قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر کہ یہی تھی۔ آپ نے بے فکر کاری ہے۔ میں کیا ہوں؟ آپ کے سامنے کل کی کچی تھوہوں۔ آپ سمجھاں گے تو میری غلطیاں اور خرابیاں آپ مجھے غلطی باتیں کی گئیں آپ سے معافی مانگوں گی اور اتنے وہ خطا ہوں گی۔

بچے والے خود ہی سمجھ لیتے ہیں۔ فیعم کہ ماں نے ایک اور بچہ ملا دیا اور انکے کمرے کی طرف چل دی۔ چلتے چلتے بڑا نے ارگتی: ”میں نے کبھی سمجھا کہ کیسوں میں رہنے والے دباؤوں کی لڑکیوں کا کچھ ہوسنیں؟...“ اور وہ جانے کیا کرنے لگا۔

لوگوں لگا جیسے اسے سانس نہ دے لیا ہوا اور ہر سانس جسم میں پھیل رہا ہو۔ اس پر مجھے لکھنیت طاری ہو گئی۔  
 بیان، گمراہی، درد اور اسے کوئی شک نہیں تھا کہ وہ جس میں اس کی ساس دل میں مانے کیا کچھ بچے غائب ہو گئی  
 ہیں۔ چاند کے اجڑے ہوئے گھر کی طرح خالی رہا۔ جبکہ محنت کسی خیال میں میں پہنچا کر ڈرڈن کی طرح گھس آئے۔  
 وہ مجھ پر حسرت کا طار ہوا۔ ذات میں اس پر حسرت کا شک سے مشابہ تھا۔

نے ارادہ کیا کہ اُنھ کو کُراس کے پاؤں پُڑائے اور اسے کہے۔ ”مجھ پر کرم کرو اور بتا دو میں نے کیا کیا ہے۔“ لیکن نا اہل نامی کلم معین میں مڑتا رہا ہے۔ ”سمجھنے والے خود مجھ لیتے ہیں کیسپس میں رہنے والے مہاجرین کی اذکیہ لے لگا مئے دھوا کہ خواب دیکھ رہی ہو۔“

نے کہ کر چٹکا تانہ اور خفا میں مغمی ہوئی عداوتے ہار گشت اسے یقین دلایا کہ یہ دامن نہیں، دوسرا  
 نے بھی یہی کہی عداوتے ہار گشت اس کو راستہ دکھائی، ظاہر ہو کہ اس نظر آگیا جیسے اس کی منزل آگے آگے  
 ۱۵۳ اس کے پیچھے فوجی ہاتھی صفا کی عاری ہو

ظاہر نے دروازے پر ٹپکی ہانڈے ہوئے تھے کچھ سوچا، ارادے ہانڈے تڑپ ہی لیکن ایک سیل مگر کی طرف لگا کر  
گرد جانا پڑی گئی اور ساس کے صبر نالغہ کے لیے دارنوں میں کھینچ گئی۔ الجھتی گئی اور الجھنے کے روگنی راہ قرار نظر نہ لگا  
حل کسی کی کسی پہلو اور کسی خیال سے اس کے استعجاب اور اضطراب کی تسکین نہیں ہوتی تھی۔

ظاہر اپنی سطح سے ذرا نیچے آگئی تھی اس ہونے کی روایت تازہ ہو جاتی وہ اپنی ساس کو سب سے پہلے  
کہتی کہ مابعد ہونا چہ تو تم بھی تو مابعد ہو لیکن ظاہر کی روح کا پرتو تھا جو تمام کا مکس بن کر اس کے دل و دماغ کے پریل ہونے  
لگا تھا غلبہ و روح کا یہی ارتعاش اس کی زندگی تھی۔ یہی تھی اس کی شخصیت جو اس صورت حال میں بے بسی میں ہو گئی تھی اور اب  
بہ جد میں صرف تھی۔ یہی اہل اور ظاہر کی ذات کو اس طرح جھکے دے رہے تھے جیسے مڑ پڑے اور رکے رکے۔

ظاہر سوچ سوچ کر مکان سے اسی طرف چلی گئی۔ اس میں عقل سلیم تو تھی لیکن تجربہ نہ تھا۔ اس نے نفیم کا خیال کیا۔ اس کا دماغ اس پر  
دوسری سوچ کو شک کی تو اس نے اپنے آپ کو دھوکہ دیا۔ ”ابھی تو میری جیسے گرے کی نفیم کے ساتھ گزرنے کے لیے  
سمارے گزرنے لگی۔ لاہور کے حالات سے مجھے نہ کھلا تھا، یہاں کے حالات کا نفیم بدل دے گا۔ رات اسی سے  
گی۔ وہ اپنی امی سے پوچھ لے گا کہ میں نے کون سی غلطی کی ہے اور آئندہ اسی غلطی نہیں کروں گی؟“

پچھلی یادیں تھیں نفیم لیکن باہر لڑتا تھا۔ ظاہر وہ اپنے گھر سے مل گئی تھی۔ اس نے کتاب کھولی تو کتاب کو یوں پرے ہونے  
دیا جیسے ساس کا لگا ہوا ایک ایک لفظ اس پر لکھا ہو۔ وہ جنگل پر چبٹ لیٹ گئی اور چھت پر نظریں گاڑیں لیکن وہاں بھی وہ  
لکھے تھے، ہر طرف سے اسے ساس کی ہی آواز سنائی دے رہی تھیں۔ اس پریشان و مضطرب سے وہ اس قدر بڑبڑاتی  
کے انمول آئے، اس لیے نہیں کہ اسے ساس نے نگار کھلے کے تھے بلکہ اس لیے کہ اس کے خیال کے مطابق اس کی  
کسی حرکت سے انے ان کا گوارا ملے تو کب نہ دیا تھا اور نفیم کی ماں کا دل دھکا دیا تھا۔

”اسنوں کے دھندلکے میں اس نے اپنے ساسے نفیم کو کھڑے دیکھا۔ ظاہر جلدی جلدی اٹھی اور منہ پرے کر کے  
پوچھنے والے لیکن نفیم نے اسنوں کو دیکھ لیا۔ اس سے پہلے تو ظاہر کی روح افزا مسکراہٹ نفیم کا استقبال کیا کرتی تھی  
یہاں تو نفیم کے جسم میں لرزہ ماحاری ہو گیا جیسے اس نے ظاہر کو نرنگی حالت میں دیکھ لیا ہو۔ دروازہ بند کر کے وہ ظاہر کو  
جا بٹھا اور اس کا سرا پنہنے سینے کے ساتھ لگا کر پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟“

ظاہر نے دل کو سنبھال کر نفیم کو ساری بات سنائی اور کہا۔ ”مٹا کے لیے امی جان سے پوچھیں کہ میری کون سی غلطی  
ہو رہی ہے؟ میں تاکہ میں دوبارہ وہی لغزش نہ کر کے انہیں پریشان نہ کروں۔ وہ کچھ بتاتی ہیں۔ امی تو اس قدر خفا معلوم ہوتی ہیں  
بے یہاں تک کہ وہ اپنے کہیں میں رہتے وہ اپنے کہیں کی لڑکیوں کا بھی گھر دے۔“

نفیم گئی پچھلی ساری باتیں بھول گیا اور بلا سوچے جانان کے دماغ پر سوار ہوا۔ اس نے ماں کو صرف اسی فقرے پرانے  
کنا شروع کر دیا۔

ظاہر کا عار نہ تھا۔ وہ شکایت کے جواب میں شکایت نہیں کرنا جاتی تھی۔ وہ تو آئندہ شکایتوں کا جو بھی قسم کرنا چاہتا  
لیکن نفیم نے سننے کو ایسے طریقے سے دھتے میں لیا جیسے نچھاسا پھر کھلا چاقو دھتے میں لے لے۔ صورت یہی بدل گئی اور ماں

ظاہر نے اسے اس حالت میں دیکھا تو ماتا کا دوسرا رخ سامنے آگیا اور اسے بیٹے پر پیار سے بھر پور حس آگیا۔ دروازہ  
لڑا کر کھڑے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور ظاہر اپنے کمرے میں اپنی معمولی جھلپوں میں جھنک رہی تھی۔

”تمہاری نفیم کا باپ بھی باہر سے آگیا۔ اس نے حسب معمول صحن میں کھڑے ہو کر اسلام علیکم کی تعارف معمول کی گونے  
پر سلام کیا۔ ”کیا آواز آتی۔ اس نے حکم کر کے ظاہر کے کھلے دروازے میں سے اندر جاننا تو دیکھا کہ ظاہر صحن  
پر رہی ہے۔ ظاہر نے اٹھ کر اسلام علیکم کی اور حکم کرنے کی تاہم گوشش کی۔ باپ کی بڑی سی آنکھوں نے ایک ہی جہتی ایک ہی  
بظاہر کا ہاتھ پھینکا لیا اور صرف اتنا پوچھا۔ ”نفیم کہاں ہے؟“

”انہی جاتی کے پاس ہیں۔“

”نفیم۔ باپ نے اسے آواز دی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔“

”مٹو نفیم۔“ باپ نے نفیم کو اپنے کمرے میں بلانے پوچھا۔ ”ظاہر دور ہی ہے اکیلات ہے؟ تم نے پوچھا تھا؟“

”انہی جاتی نے کچھ کہہ دیا تھا ابا جان۔“ نفیم نے کمرے پر بیٹھے ہوئے جواب دیا۔

”کیا کہہ دیا تھا اور کیوں کہہ دیا تھا؟“

”میرا تو اب مجھے بھی سمجھ نہیں آ رہی کہ کیوں کہہ دیا تھا۔“ نفیم نے افسرانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں جب آیا تو ظاہر دور  
پاچا تو اس نے بتایا کہ امی کسی وجہ سے خفا تھیں اور انہوں نے ایسی ایسی باتیں کہہ دی ہیں۔“

اور نفیم نے وہ ساری باتیں باپ کو سنائیں جو اسے ظاہر نے بتائی تھیں، پھر کچھ اور جس طرح ان نے نفیم کو کہا تھا وہ بھی  
اور باپ کو بتایا۔ ”پھر امی مجھے اندر لے گئیں اور کہنے لگیں کہ ظاہر بہت آزاداں بے شرم ہو گئی ہے۔ بڑی مٹو نہ تھیں۔“

۲۴۱



نیر کی باتیں بے بنیاد تھیں اگر ان کی بنیاد تھی بھی تو وہ ماں کے ساتھ وہ دایہ کی جتنی جو نعم کی کمزور ترین کو بھی تھی۔ لہذا اس کی باتیں بے بنیاد اور انا میں مردانگی اور خود اعتمادی کا فقدان تھا۔ وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے بات کا نہیں جانتا، جیسے کہ دل درواغ الگ الگ سمجھوں گے۔ ظاہر و خاموش تھی۔ وہ کسی سی ہوں، ہاں بھی نہیں کہہ سکتی۔ اس کی خاموشی کے اہل انکھلا دیتے۔ اس کی باتوں میں غلط فہم پیدا ہو گیا تھا۔

ملا کے لیے مجھے یہ بتائیں کہ میں نے کیا کیا ہے؟ ظاہر ہے مجھے ان کو بچا نیسم کے ساتھ تو وہ بے تکلف تھی ہی۔ بلکہ ان قدر سے ترش روئی سے بولی۔ "اس وکالت کی تو میں بھی قائل ہوں۔ میں نے ای جان پر کوئی لازم تو نہیں دھرا۔ میں ہل پر مل کر خطا کیا ہے اور آپ ای جان کی تعریفیں لے بیٹھے ہیں۔ آپ نے تو بات کو اور زیادہ اُلجھا دیا ہے؟"

ظاہر کا غصہ جو بڑھا تو ان کے کمرے میں تیز تر قدم اٹھاتی چلتے پھرنے لگی۔ اس کے لیے میں جلال اور رعب تھا۔ اس کے لیے وہ فخر کے پلٹنے میں بھی وقار تھا۔ اس کا ظاہری مضمین جیسے کچھ اٹھاتا تھا اور اس کی آنکھوں میں غصے کا آخری نور کی طرح چمک رہا تھا۔ جیسے ان کی ذات کی کمزور گڑبڑاں ٹوٹنے لگیں۔ سب سے اس کے کہ وہ ظاہر کا غلط نقطہ نگاہ سمجھتا اور دیکھتا کہ ظاہر کس زاویے سے حالات کو دیکھتا ہے، وہ سمجھتا ہے اور ناظرین کی باتیں سمجھتا ہے۔

وہ کچھ بولا: "نیسم نے قدر سے گھر رہا ہے۔ کیا؟ تو تو راہ نمواہ ناراض ہوتی ہو۔ ای کی تعریفیں کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کو تم ان کے مقابلے میں اچھی نہیں ہو۔ بڑا میرے لیے تو تم۔ دونوں ایک عیبی ہو ہیں کہ وہ تھا کہ ای آخر بزرگ کی بات لکھنا ہی چاہتا ہے اور دیکھو ظاہر!..."

وہیں نے یہ جاننے کے لیے آپ کو بھیجا تھا کہ میری غلطی معلوم کریں اور میں اس کا علاج کروں۔ ظاہر نے کمر پر ہاتھ رکھ کر ٹپ سے کہا تو نیسم نے دیکھا کہ ظاہر کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ یہ تو بھی سرخی اور چمک نیسم نے ظاہر کے لیے اور آنکھوں میں سلی بار دیکھی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس کے چہرے کا سامنا نہ کر سکے گا۔ ظاہر بولی: "اور آپ گئے تو تو میں انکھلا دیتے۔"

اور اس قدر ظاہر!...

ایک مالک سنوں؟ ظاہر نے نیسم کے قریب ہو کر کہا۔ "تمی میرے آپ جو کچھ سنا رہے ہیں وہ تو میں سمجھ نہیں اب اور کیا سنوں؟"

نیسم نے ہر جہم پر کمر کرتے پر ہاتھ ملا دیا اور سر ہٹا کر دیکھ گیا جس طرح نیسا جوازی نے اس کی بازی مار کر غنیمت سے دب جانا ہے۔ ظاہر نے اسے اور زیادہ ناگوار گزری معمولی سی بات کو بگڑا دیا تھا۔ اسے بھی نیسم نے اس کی طرح ترس اگایا اور اس نے نیسم کو تسلیاں دینے شروع کر دیں۔ دیکھا کہ نیسم کے آنکھوں پر رہے تھے۔ اس نے شکست کا کبھی مسخرہ نہ دیکھا تھا۔ حالات کی اس بے مروتی نے اسے نیا دل تک بلا دیا۔

ظاہر کا خیال تھا کہ یہ آج کی جھجک جھجک محض غلط فہمی تھی جو بے تکلفی سے چھٹے کچھو چھوٹے سے ختم ہو جائے گی لیکن اس نے اسے دیکھا تو ہمت پریشان ہوئی۔ ایک علاج تو یہ تھا کہ وہ داس کی سطح پر اتر آئے۔ اسے عذاب قائم کر دیتی اور ایک کی دہائی

نے کئی بار کئی گھروں میں کچھ بھی کہی تھی کیا کیا، اس قسم کی اس کے چہرے کی تھری تھریوں میں محفوظ تھیں جو ابھر کر اس کی آنکھ سے اٹھنے لگیں اور خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کی اپنی بھی ماں چھو کر تھی نیسم کی ماں اس کی بہرہ ور کرتی تھی۔ آج وہ اپنی رہی تھی وہ اس پر بیت چکی تھی۔

"دیکھو نیسم! باب نے کہا۔" یہ قصہ بہت پرانا ہے جیسے آئے دن گھر گھر دہرایا جاتا ہے جب سے اسے شادی کی سوجھی ہے، اس وقت سے یہ فقرہ ساتھ ساتھ چلا آ رہا ہے۔ ساس بولا یہ سننا سچ قدر پرا ہے۔ اسی قدر بڑھا وقت کے ساتھ ساتھ یہ ٹیڑھا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ آج تک کوئی اسے بلجھا نہیں سکا۔ مگر توں کو کہ ظاہر کو کچھ نہ کر کے اس کی طرف سے کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے ہمتاری ماں کو بات کرنے کا موقع ملے۔ ماں کو تم بھی ناراض نہ ہونے دو اور اسے سمجھا رہوں گا۔ ہمتاری ماں اس قدر فوری جو ہے تو ظاہر کی طرف سے ضرور کوئی اشارہ بلا سکا۔ ظاہر بولا: "مگر عیبی کی آزادی پر عرض نہیں لیکن ہمتاری ماں کو یہ آزادی لینا اچھی نہیں لگتی۔"

"اباجان! نیسم نے کہا۔" ای کو تو ظاہر کے سکول جانے پر بھی اعتراض ہے۔"

"مہوگا۔ ضرور ہوگا۔ باب نے کہا۔" میں ہمتاری ماں کو قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم جاؤ اور ظاہر! وہ رو رہی ہے۔"

نیسم کم عقل تو نہ تھا، لیکن یہ مسئلہ اس نوعیت کا تھا کہ اس نے کم فہم والی عزتیں کیں۔ مسئلے کی پیچیدگی کے سادگی کی شخصیت میں بھی ایک پیچیدگی تھی جیسے وہ شعوری طور پر سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ مال کو بھی ملامت نہیں بنانا جانتا تھا۔ وہ ظاہر کی محبت تھی۔ ظاہر کا حسن اور محبت اس پر سانسے کی طرح سوار تھے۔ یہ دونوں پیار۔ ایک مال کا، دوسرا ظاہر کا۔ جلی کے دو پتھر تھے جس کے درمیان نیسم کا سر اچھکا تھا۔

نیسم اپنے کمرے میں گیا۔ ظاہر نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ نیسم نے نیسم پر ہمتاری کے ظاہر کو ماں کے نصیحتیں کرنی شروع کر دیں۔ ظاہر کے لیے نیسم کا یہ رویہ غیر متوقع تھا۔ ظاہر کو تو قہقہے بھی تو نیسم کی ماں کے دل سے وہ باز لائے گا جس سے وہ اس قدر رنجنا ہوئی ہے لیکن نیسم نے پند و نصیحت کا یہ سلسلہ شروع کیا تو ظاہر اور زیادہ مضطرب ہو گیا اور زیادہ پیچیدہ ہو گیا۔

لیکن اس کی دینی سطح بذمتی۔ اس کی فطرت میں صلح جوئی اور انسانی محبت کے عناصر غالب تھے اور اس کی فطرت اس کے باطنی اہل۔

اسی رات جب نعیم کے باپ نے نعیم کی ماں سے پوچھا کہ آج ظاہرہ کے ساتھ کیا بات ہوگئی ہے؟ تو ان نے بڑے پریلوں کی زبان میں کہا کہ میں نے نعیم کے باپ کو اس فوجی تمہید سے جھٹکایا اور جب وہ تنگ آکر غصے سے بھر گیا تو طلب کیا بات بتائی۔ اس نے وہ غصے کماٹیاں چڑھ کر اپنے خاندان کو سنائیں کہ ایک بار تو اسے بھی گارڈیاں لیں اور چھانچل گئی۔ اس نے غلغلو اور زور دیکھا تھا۔ اس نے نعیم کی ماں کو سمجھانا شروع کر دیا لیکن ماں کا یہ حال جیسے طبی یوتیل بڑا بار بار ہو۔ بڑے کھانچے نہ تھا کہ دیکھا اس دینی اور اخلاقی بستی تک بھی پہنچ سکتی ہے۔

ظاہرہ کو لایاں بچہ اور تھا۔ ماں نے نعیم کو بچہ سمجھنا تھا وہ باطنی اہل تھا اور ماں نے نعیم کے باپ کو بچہ سمجھنا تھا۔ صرف مبالغہ نہیں شرمناک مبالغے شامل تھے۔ باپ نے تین بیٹوں میں اس نمایاں فرق کو محسوس کیا اور گہری سانس لے کر گہرا سوز میں گھول گیا۔

شادی کا بھی ایک ہی سینیہ گزارا تھا۔ راولپنڈی میں منجھ کے گھروالے محروم عرصہ میں پھولوں اور اگر تپوں کی فوج بھی نکلی۔ اس کی طرح زندہ اور تازہ تھی۔ خضامیں ظاہرہ اور نعیم کی شب عروسی کی پرکاشاں ابھی تک کو کچھ محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کا ایک ایک لکھا اور ایک ایک لفظ ابھی تک وہاں موجود تھا لیکن اب اس محرمے کا یہ حال تھا کہ وہ بولتا تھا وہ شباب انگریزوں کی محبت کی وجہی پر گشتاں اندھیرے سکوت میں کبھی کسی ہسر ہارٹ جوداں میں شوق و محبت کے فتنے لیے پھرتی تھی، دل ہو کر تھی۔ اگر قی قیاب بھی مل رہی تھی لیکن خوشبو نہیں تھی۔ اداس سا دھواں فضا کے گندیں تکلیں بھرا تھا۔ ظاہرہ نئے فلگ پر چڑھا تھی جس پر وہ چند راتیں پہلے بیٹھتے شرم کے مارے اپنے آپ میں سرگوشی تھی اور آج وہی فلگ اسے یوں تک رہا تھا جیسے بیٹھتے ہر تے تھوڑے پڑھی ہوئی ہو۔

ظاہرہ نے اس لیے میں سب کو یاد کیا۔ اتنی سادہ اور ای قانون کو بھی۔ ارشد، عفت اور منجھ کو بھی لیکن ان بادل نے بھی بڑا سہارا دیا۔ ان عموں دور تھا اور اس خون سے کسی نئی خواب بھرت۔ جسے تھے نعیم فخر سے میں داخل ہوا تو ظاہرہ کو تھکے لگاوا۔ جنواں رات نعیم کے چہرے کا وہ رنگ ہی نہ تھا جیسے کسی اچھے جھلکے کڑے کا رنگ دھوپ نے اڑا دیا ہو۔ وہ حسب معمول ظاہرہ کے پاس بیٹھا اس کا ہاتھ اپنے کاٹھن میں لیا ہر رات ایسا ہی بدی بھری حرکتیں شروع کیں لیکن ایسے ہی بیخ و تھکاؤ نمازی و حیاں کسی اور طرف لگا کر کوع و جود کا چکر لڑا کر تاجدار ہوا۔ اس کے ہونٹوں کی لرزش سے ظاہرہ ہوتا تھا یہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اخلاقی عزت ساتھ نہیں دے رہی۔ وہ جات کرتا تھا اس میں لرزہ سا بہتا تھا اور بعض باتیں تو اس نے ایسی ہی کہیں سے کہیں جس میں کھیا سنا پڑا اور خفت کا عنصر نمایاں تھا۔

ظاہرہ نے یہ یاد کر کے ایک بار پھر آج کی کاروائی پر بات کرے۔ شاید کوئی سر پرل جاتے لیکن اس کا سر میں سوہا کر پکڑنے لگے گا۔ وہ سمجھتے بھی لگتا تھا۔ ظاہرہ نے نعیم کے انداز میں ایک بیگانگی بھی محسوس کی۔ اسے اور کھنکھاتی تو نعیم نے دے دیا لیکن یہ کہنا۔ وہ انہیں فینڈا کر رہی ہے؟ سوچا، سوچا۔ دن بھر تڑپا رہی ہو۔۔۔ ظاہرہ اور نعیم کو ان جھیلوں کا کٹھن

لیکن اس کی فطرت میں صلح جوئی اور انسانی محبت کے عناصر غالب تھے اور اس کی فطرت اس کے باطنی اہل۔

اسی رات جب نعیم کے باپ نے نعیم کی ماں سے پوچھا کہ آج ظاہرہ کے ساتھ کیا بات ہوگئی ہے؟ تو ان نے بڑے پریلوں کی زبان میں کہا کہ میں نے نعیم کے باپ کو اس فوجی تمہید سے جھٹکایا اور جب وہ تنگ آکر غصے سے بھر گیا تو طلب کیا بات بتائی۔ اس نے وہ غصے کماٹیاں چڑھ کر اپنے خاندان کو سنائیں کہ ایک بار تو اسے بھی گارڈیاں لیں اور چھانچل گئی۔ اس نے غلغلو اور زور دیکھا تھا۔ اس نے نعیم کی ماں کو سمجھانا شروع کر دیا لیکن ماں کا یہ حال جیسے طبی یوتیل بڑا بار بار ہو۔ بڑے کھانچے نہ تھا کہ دیکھا اس دینی اور اخلاقی بستی تک بھی پہنچ سکتی ہے۔

ظاہرہ کو لایاں بچہ اور تھا۔ ماں نے نعیم کو بچہ سمجھنا تھا وہ باطنی اہل تھا اور ماں نے نعیم کے باپ کو بچہ سمجھنا تھا۔ صرف مبالغہ نہیں شرمناک مبالغے شامل تھے۔ باپ نے تین بیٹوں میں اس نمایاں فرق کو محسوس کیا اور گہری سانس لے کر گہرا سوز میں گھول گیا۔

شادی کا بھی ایک ہی سینیہ گزارا تھا۔ راولپنڈی میں منجھ کے گھروالے محروم عرصہ میں پھولوں اور اگر تپوں کی فوج بھی نکلی۔ اس کی طرح زندہ اور تازہ تھی۔ خضامیں ظاہرہ اور نعیم کی شب عروسی کی پرکاشاں ابھی تک کو کچھ محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کا ایک ایک لکھا اور ایک ایک لفظ ابھی تک وہاں موجود تھا لیکن اب اس محرمے کا یہ حال تھا کہ وہ بولتا تھا وہ شباب انگریزوں کی محبت کی وجہی پر گشتاں اندھیرے سکوت میں کبھی کسی ہسر ہارٹ جوداں میں شوق و محبت کے فتنے لیے پھرتی تھی، دل ہو کر تھی۔ اگر قی قیاب بھی مل رہی تھی لیکن خوشبو نہیں تھی۔ اداس سا دھواں فضا کے گندیں تکلیں بھرا تھا۔ ظاہرہ نئے فلگ پر چڑھا تھی جس پر وہ چند راتیں پہلے بیٹھتے شرم کے مارے اپنے آپ میں سرگوشی تھی اور آج وہی فلگ اسے یوں تک رہا تھا جیسے بیٹھتے ہر تے تھوڑے پڑھی ہوئی ہو۔

ظاہرہ نے اس لیے میں سب کو یاد کیا۔ اتنی سادہ اور ای قانون کو بھی۔ ارشد، عفت اور منجھ کو بھی لیکن ان بادل نے بھی بڑا سہارا دیا۔ ان عموں دور تھا اور اس خون سے کسی نئی خواب بھرت۔ جسے تھے نعیم فخر سے میں داخل ہوا تو ظاہرہ کو تھکے لگاوا۔ جنواں رات نعیم کے چہرے کا وہ رنگ ہی نہ تھا جیسے کسی اچھے جھلکے کڑے کا رنگ دھوپ نے اڑا دیا ہو۔ وہ حسب معمول ظاہرہ کے پاس بیٹھا اس کا ہاتھ اپنے کاٹھن میں لیا ہر رات ایسا ہی بدی بھری حرکتیں شروع کیں لیکن ایسے ہی بیخ و تھکاؤ نمازی و حیاں کسی اور طرف لگا کر کوع و جود کا چکر لڑا کر تاجدار ہوا۔ اس کے ہونٹوں کی لرزش سے ظاہرہ ہوتا تھا یہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اخلاقی عزت ساتھ نہیں دے رہی۔ وہ جات کرتا تھا اس میں لرزہ سا بہتا تھا اور بعض باتیں تو اس نے ایسی ہی کہیں سے کہیں جس میں کھیا سنا پڑا اور خفت کا عنصر نمایاں تھا۔



لیا ہاں اور طاہرہ نے بجانب لیا کہ نسیم کی طبیعت ٹھکانے نہیں۔ دونوں کی مسکراہٹیں غائب ہو گئیں نسیم نے دونوں کو دیکھ کر تو کہا چہرہ اور اڑ گیا اور اس میں جو خراسی ہمت اور حوصلہ تھا وہ بھی نر ہا۔ اس کی حالت کچھ اس طرح کی ہو گئی جیسے ڈرے یا لڑے ہوئے بچے کی حالت ماں کو دیکھ کر ہوتی ہے۔

نیکلین نسیم بیٹا آ۔ ماں نے کچھ لڑکھوچا۔ کیا بات ہے؟

”سر بچت رہا ہے۔“ نسیم نے سر ہونک کر کہا اور صحن میں کچھ مٹی ماریا پتی لپیٹ گیا۔

ماں اور طاہرہ کی حالت غریب ہونے لگی۔ سر تو دکھائی کرتے ہیں لیکن نسیم کل ہی خلیفہ کا بھی عادی نہ تھا۔ اس کا سر تو بے واقعی بچت رہا تھا۔ ماں اور طاہرہ بے یقین پڑ گئے۔ انمازیں جان نہ کرنے لگیں۔ دو بچے ایک کھلنے والے پڑے۔ ایک ہاتھ نے سر پر رکھا تو دوسرا طاہرہ نے رکھ دیا۔ طاہرہ بھاگ کر سر نہ ڈالنے لگی تو ماں نے کہا۔ بڑا بکا کرے میں چل کے لیٹر میں سر دبا دیتی ہوں۔ ماں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور طاہرہ سے کہا۔ اچھا دیا پتا ہے کہ بے پانی رکھ دو۔

طاہرہ دل سے چلی ہی تھی کہ نسیم اٹھ بیٹھا اور کہا۔ ”طاہرہ اہم رہنے دو آؤ اور اس سر دباؤ کو بچت پھرت رہا ہے۔“ اور وہ طاہرہ کو سنا تھوڑے کراپنے کمرے میں چلا گیا۔ جاتے جاتے ماں سے کہا۔ ”اتنی اچا کے جلدی بچہ اور دینا اور سپرو لیا کہ گولی بھی۔ الماری میں رکھی ہوگی۔“

طاہرہ کو یہ صورت حال پسند نہ آئی۔ اس نے اسی سے کہا۔ ”ای جان ابھی اچا ہے میں بچائی ہوں آپ ان کا سر دبا دیں۔“

ای کو لگ گیا مٹی تھی۔ وہ غصے میں بڑبڑاتی باورچی خانے میں چلی گئی طاہرہ ماں کا مزاج بجا نہیں گئی۔ وہ اس کے پیچھے بچے باورچی خانے میں گئی تو ماں نے غصے سے کہا۔ ”بیک صاحبہ اچا بیٹے۔ صاحبہ بلار ہے ہیں ہم تو کرکریں اہل کھڑیں۔“ طاہرہ کچھ کہنے ہی گئی تھی کہ نسیم کی آواز آئی۔ ”کہاں چلی گئی ہو، طاہرہ! اور طاہرہ نسیم کے پاس چلی گئی۔ اُس روز کے بعد ماں کا مزاج درست نہ ہو سکا۔ بگڑتا ہی گیا۔

اس دن اور گزر گئے۔

طاہرہ نے ہر روز کوشش کی کہ نسیم کو کم از کم دن کے وقت اپنے کمرے سے باہر رکھے۔ وہ دو تین بار کسی سیلی کے اہل بھی چلی گئی۔ اس نے سر میں کوشش کر کے نسیم کو دریاں کو زراہہ دیا کھار کھنے کے مواقع پیدا کیے لیکن طاہرہ کے بغیر نسیم کی حالت ٹھول سے کچھ بڑے ہوئے پرندے کی سی ہو جاتی تھی۔ ایسے میں اسے ماں کے ساتھ جزوہ ہجرات کرنی ہوتی وہ بھی نہ کرتا۔

طاہرہ نے ایک رات تین گھنٹے صرف کر کے نسیم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ماں کا مطالبہ کیا ہے لیکن نسیم کے دماغ میں ربات نہ پڑی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کے دل کی گزردی، اخلاق کی حرارت کا فقدان، کسی پچیدگی کو آزادانہ طور پر سمجھنا اور بوجہ ہو جانا، سر کو کھنا اور سر دباؤ لانے کی ضرورت محسوس کرنا صرف ایک حقیقت کی آئینہ داریں۔ ماں کا لاڈ سار

سے کیا کمال کرنا اور کسی جمل کی بات سن لے جھوٹے بڑے کا ادب لیا تو اس میں ہے ہی نہیں۔ ایسی ہی کئی کہانیاں نے طاہرہ کو صرف یہ لکھا تھا کہ گرام ڈو کرانی سے نہیں کرنا چاہیے تو اسی بات پر ان کے گلے ڈگتی کھنٹی گئی، میں ڈو کرانی کے لیٹر دیا نہیں سکتی۔ پھر وہاں کہیں، اہلی کہیں جس میں کہیں خاموشی سے اندر چلی گئی معلوم نہیں، ابا جان! نسیم نے بے چین ہر کرک۔ مگر دونوں میں کون سی کجی نہ تھی۔ میں یقین نہیں کر سکتا طاہرہ اس قدر بدتر ہو سکتی ہے۔ اس نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، وہ اہلی سال کے بیان کے باطل الٹ ہے۔ طاہرہ نے مجھے کہا تھا میں اہلی جان سے پوچھوں وہ اس کی کس غلطی پر غصا میں تاکہ ان سے ملے گا۔ لیکن اہلی کا غصہ دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے وہ بڑی طرح مجرب ہیں۔

نسیم کا باپ خاموشی سے مٹ رہا تھا اور اس کے دماغ میں ایک تصویر ہی بنتی جا رہی تھی۔ سرخ رنگ تصویر یا تصویر اس

طاہرہ نے تو دن رات کی اذیت نیک بفراری میں سے مسئلے کا حل اس طرح نکال لیا تھا جس طرح کوئی لکڑی کے سے موتی تلاش کر لیا ہے لیکن نسیم دفتر میں بھی جسم کے رش کو ساکن کرنے میں مجرب رہا۔ وہ زیادہ روز غلامی میں گھومنا رہا۔ اس غلامی سے دو نقطہ نظر آ رہے تھے۔ اور اس کی آنکھیں ٹھنڈی کے پینڈو لوم کی طرح دونوں نقطوں کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں نقطہ دو اہل متفقین کی طرح اس کے سامنے ان صحت و نقوش بن کر رہ گئے تھے۔ اسے کوئی موجد رہا تھا نہ ہی وہ کوئی مل سوچی رہا تھا۔ وہ دباؤ دھونڈ رہا تھا۔

چیز سی لے اسے ”دو دفعہ کہا“ صاحب اچا نے ٹھنڈی سروری ہے۔ لیکن اس نے تو جیسے سنا ہی نہ تھا۔ چکی کے دو چھتری سے چل رہے تھے اور نسیم بھی اتنی سکت نہیں تھی کہ سر ہار نہال سکے۔ سوچتے سوچتے اس کا سر پٹنے لگا۔ اس کی سوچ میں پریشان خیالی اور فزارت تھا۔ کھانک، ڈاکر اس نے طوفان کو وقت کے حوالے کر دیا کہ خودی تم جاتے گا۔ ابا جان بھنجالیں لیں گے۔ چیخو اس کے کو وہ دماغ کاس جنگل سے سے غالی کرنا وہ پھر ماں اور طاہرہ کی باتوں میں الجھ گیا۔ آخر اسے غصہ آنے لگا۔ اس پر اسے بھی معلوم نہ ہو سکا۔ غصہ تیز ہوئے لگا، پھر وہ کڑھنے لگا۔ جس کا زور لگتا دل پر ہوا جو پہلے ہی گزرتا تھا جب غصہ تیز ہوا تو نسیم کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل تیزی سے دھڑکتے دھڑکتے کی گت رک گیا ہوا۔ وہ گہری کھائی میں گر پڑا ہوا۔ اسے مٹی کی محسوس ہوئی اور دل کی حرکت بلا شک و شبہ بے قاعدہ ہو گئی تھی۔ سر میں درد کی نیں ابھی تھی کہ سر میں تھوڑے پڑنے لگے۔

جب نسیم کھڑیں مائل ہوا، طاہرہ گھر گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ساس کو کچھ نہیں کہے گی بلکہ ایسا وہ نہ افیاد کرے گی جس سے ساس کو شکایت کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ وہ دل کو وہ نسیم کو کم از کم دن کے وقت اپنے پاس نہیں بیٹھنے یا کمرے کی اور اسے زیادہ سے زیادہ دیر ماں کے پاس رہنے پر مجبور کرتی رہے گی حالات سے اس طرح کے سمجھوتے کے تحت اس نے سکول سے اگر ساس کو غیر معمولی خندہ پیشانی سے السلام علیکم کہی تھی جس کا جواب اسے شک سے اوروہ ”و علیکم“ سے بلا تھا۔ وہ بھی زیر لب۔

جب نسیم کھڑیں داخل ہوا تو اس کا چہرہ اڑا ہوا تھا۔ طاہرہ کی روزمرہ کی مسکراہٹ نے اس کا استقبال کیا۔ وہ اپنے اعصاب کا بوجھ جتنک لاتی تھی اور اب اس کی مسکراہٹ بروکھ سے آواز دیتی۔ بال بھی صحن میں غلی اور نسیم کا استقبال مسکراؤ

مال کا سامرا اور مال کی گودی پر سکون عمارت — نعیم اپنی ذات میں جو کھانا دوسرا میرے پھر تھا تھا۔ اسے بظاہر اس کا نام نہیں تھا۔ وہ اپنی لفظیات کی کمزوریوں سے آگاہ نہ تھا۔ ظاہر نے اسے ہر پہلو سے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ بھی کیا کرانے دل توڑنا لگا ہے اور مال کے حقوق کیوں فراموش نہیں کرنا چاہتے نعیم بظاہر سب کچھ جان رہا تھا لیکن اس کی عقل ان بات کو قبل میں گری ہوئی تھی۔ اس کی اس لغزش کی سرطابہر ہوگئی تھی۔

دونوں بول اور باتوں پر باتیں کرتی رہی تھیں نعیم کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی نہ اس نے ضرورت حال کے کو سمجھنے کی کوشش کی ظاہر کوئی کوششیں تیز تر نہ ہوئی تھیں اور مال کا رویہ نہ تو اس سے ناگوار نہ تو جھگڑا گیا۔ حد یہ کہ اس نے اس کے باپ کو ظاہر کے خلاف بھڑکانے اور نہتے قہقہے گھڑنے شروع کر دیے۔ ظاہر کے ساتھ اس نے بولنا ہی بند کر دی۔

باپ نے نعیم کو ایک دو بار خبردار کیا کہ گھر میں کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے لیکن نعیم گھبراہٹ نہ۔ غصے میں آجائے اور اس کے پیچھے جانے کے سوا کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ اگر طبیعت میں تلخ بھی آتی تو اس کو ڈانٹنے پیچھے کیا لیکن مال نے لاڈ پار سے غصہ کر دیا اور ظاہر کے خلاف گڑوا جا جب ظاہر نے باپ میں اس کا دل دھو بیٹھا۔ ایک بار ظاہر نے نہت کر کے مال کے اس مسئلے پر گفتگو کرنے کی کوشش کی تو اس نے ہنسے روز کی طرح پھیل دی کہ زبان میں باپیں کر کے ظاہر کو حادہ لہجہ میں ڈال دیا۔

نعیم کی خیالی میدان میں اتر آئی اس کے دل میں اپنا ایک بغض تھا جس کا نذر ظاہر پر ہی لگا۔ خالہ کے خاندان کی ہر لڑکی جو ان تھی خالہ نے لڑکی کے والدین کی خواہش کے مطابق لڑکی نعیم کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اس نے دو تین بار لڑکیوں کو آگاہ کیا تھا کہ لڑکی والدین کے ہاں جا کے بات کرے۔ اس نے لڑکی کی تعریفوں کے پل بھی باندھے تھے لیکن نعیم کی لڑکی منزل سے ہی ہٹ کر بات نہ کر دیتی تھی۔

خالہ کو اس رشتے کی دہائی میں جانا فائدہ ہو رہا تھا۔ لڑکی کی مال خالہ کو خوب کھلائی پلائی تھی اور دو تین موقعوں پر اس کا کچھ محتاجیں پوری کی تھیں سب سے بڑی حاجت یہ تھی کہ خالہ کو فائدہ کو کم ہمیشہ دوسرا زور پلے کی ضرورت تھی جسے وہ کاربانا لگا جانتا تھا۔ اس پناہ گزینی کی حالت میں کون تھا جو اسے اس قدر وسیع دیتا۔ لڑکی کی مال نے ڈیڑھ ہزار روپے کا بندوبست دیا تھا جس کی ادائیگی کی خالہ اور اس کے خاندان میں نہ ہمت تھی نہ مرضی۔ لڑکی کے والدین نعیم کا رشتہ چاہتے تھے خالہ کی اور والدی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ خالہ نے انہیں بتایا تھا کہ نعیم کا رشتہ حاصل کرنا ہم سر کرنے سے کم نہیں۔ وہ لوگ مانتے ہی نہیں جب خالہ نے دیکھا کہ لڑکی کے مال باپ تعریف پڑھتے ہوئے ہیں تو اس نے ایک میلنگ شروع کر دی تھی نہیں کسی کی کہ میں اور کبھی کسی کو نہ نعیم کے لیے کسی اور سکر سے رشتہ کر رہے ہیں۔ یہ جواب نہیں کہ لڑکی کی مال تو زب آپ سختی خالہ اسے کسی دے کہتی ہے۔ دیکھو میں اسے لڑتی ہوں۔ کام ہمت مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی خالہ نے لڑکی کی مال کو کر رکھا تھا۔ تم غور کرنا در نہ زکریاں گے۔ ایک بار ان کے منہ سے یہ نکل گئی تو وہ چہرہ اپنی بات سے ہنسنے لگے۔

چنانچہ انہوں نے نعیم کے مال باپ سے کبھی اشارہ بھی بات نہ کی تھی خالہ کی شہدہ بازی کا سیلاب تھی۔ وہ ایک

انہا میں ایک اور بار جانا مندا ہے۔ ہمناری رقم کا غم تھا جسے جارا دے۔ دن رات سوچتی رہی۔ ہل ان رقم سے لڑکی۔

لڑکی کی مال نے دل کھل کر دیا تھا۔ "اوری گش" ایر تو نے کیا بات کر دی، اہم کبھی رقم کی بات زبان پر بھی لائے ہیں؟ اور چہاں لڑکی ہمناری اپنی دولت سے جب تک ضرورت ہے استعمال کر دے۔ اور یہ بات دل میں ہی کہ گئی ہے مال نے اس کا کیا تھا۔ ہم پر رشتہ کرادو۔ ڈیڑھ ہزار کا حساب بعد میں ہوتا رہے گا۔

نعیم بچے سے راولپنڈی سے ملنے کے لیے آئے تو لڑکی کے مال باپ کو تو جرح پہنا تھا سو ہوا، خالہ پر بھی لگ گئی۔ ایک تو دھنار لڑکی آؤ پڑے والے کرتے تھے۔ اس کی ہرجا جت جوں جوں سے پوری ہوئی تھی وہ گئی بعض اوقات وہ مکر، مزاح اور پیار مال سے لے آتی تھی اور سب سے بڑی جڑت یہ کہ اب ڈیڑھ ہزار روپے کی واپسی کی نکل لاتی ہو گئی۔

اسے ہر وقت خدشہ رہنے لگا کہ خالہ شروع بڑا کر لڑکی خالہ کی تو زبان لگت ہو گئی۔ دن رات کا کھینچن مکر ہو گیا جس دن رات پورے پچھنی خالہ نے اسے قہر ڈونگا کہوں سے دیکھا تھا کہ لڑکی مال میں اعزاز لیا تھا کہ ظاہر کے مقابلے میں اس کی بالائی کچھ بھی نہیں۔

خالہ سخت حیران و پریشان تھی اور اس سوچ میں بھگان ہوئی جا رہی تھی کہ لڑکی والدین کو نعیم کا بدلہ مال سے دے دے۔

دار سے پاکستان میں پھر گئے تھے۔ خالہ نند کے منہ میں دوسری بڑی دینا جا تھی لیکن بات فنی نظر نہ آتی تھی۔ ایک ہی ہم کے گھر میں تھی نعیم دفتر اور ظاہر سکول گئی ہوئی تھی خالہ نے نعیم کی مال سے پوچھ لیا۔ مسناؤ بہن اولیاء و ملین کی گڑبڑ ہے؟

گڑبڑ کیسے رہی ہے؟۔ مال نے دیکھے جو تے لیے میں کہا۔ "جانے کہاں سے اس آوارہ لڑکی کو پھر لایا ہے۔" ابپ سے جہانے کہاں سے آئی ہے یا اور منہ چھٹ لڑکی ہے نہ چھوٹے کا لیا تا نہ بڑے کا ادب۔۔۔ اور مال نے دل کی میٹھاں نکالی جانے اسے احساس تھا کہ نہیں کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے لیکن اسے ایک گورنر آ جا رہا تھا جیسے بیٹھی ہوئی لگت تھی جا رہی تھی۔ اسے یوں لذت آ رہی تھی جیسے نعیم اس کی گود میں آکر اور وہ گول کی طرح اس کے حملے پر ہو۔ ایسے میں اسے ظاہر جو دل کی صورت دکھائی دے رہی تھی جو پے پے پھٹنے کو پڑل رہی تھی۔

خالہ کی تو باجھیں کھل گئیں۔ اسے خیال آنا کہ اس سب میں چند دنوں میں ہی یہ دشمنی پیدا ہو گئی ہے تو معاملہ بہت جلدی ہو سکتا ہے۔ یا پہنچا جا سکتا ہے نعیم کی مال نے تو یہ بھی کہہ دیا تھا۔ "میرا نعیم تو خود کچھ تیار ہے لیکن لڑکی ایسی ہے کہ اسے ڈھیلا چھوڑ دینی نہیں۔ ہر وقت اسے مکر سے میں لیے بیٹھی رہتی ہے۔"

یہی باتوں میں آ۔ خالہ نے کہا۔ "میں نے تو پہلے روز ہی لڑکی کا لالہ لالہ دیکھا کہ جان لیا تھا کہ لڑکی ایسی دوسری ہے۔" لڑکی روز شیک ہو گیا تھا کہ لڑکی نقص دار ہے۔ دراصل ہمارا نعیم بھولا بادشاہ ہے۔ راولپنڈی پر ہمارے دھوکے۔۔۔ وہ ہمیں اپنے والے چمکدے کا لالہ کا ۱۹۰۲ء بھی ایسے ہی اشارے سے بیاد لایا ہے۔ ایک کہ اور ایسی طرح انظر تو لالہ لالہ ہے۔ خالہ نے پراختہ کر رکھا۔ ایک ایک بات اور ایک ایک حرکت دیکھو اس لڑکی کی تو خدا یاد آ جاتا ہے۔ آئی پوچھیں اتنی بدعاش

ہاں! یہ سکول تو، جیسا جی، آپ کے بھائی صاحب تیار ہے تھے، اتنا بدنام ہے کہ وہاں کوئی شریف لڑکی جاتی نہ گا۔ وہاں والے اور پیسے والے عیاش لوگ وہاں کھیلوں کی طرح کھینچتا رہتے ہیں۔

بھاسو کو اسے بیٹھا تھا۔ دونوں عورتیں اسے خاموش مٹھا کچھ کرکوش ہو رہی تھیں کہ تیرے نشانے پر لگ رہے ہیں اور وہ ناؤں اور خود اعتمادی سے ایک سے ایک سے ایک نرالی کبھی جاری تھیں۔

مجھے تو کتنے بھی شرم آتی ہے، میں! — ماں نے باپ کو سنا تے بڑے غلام سے کہا — آج تیرا روز ہے بہترن ساڑھے تین بجے یہ چھوڑ کر سکول سے فوٹی ہے اور شام پانچ بجے بچے بھر جاتی ہے اور رات دس بجے نیسے۔ اس بڑے کو اس روز سے کہہ رہی ہوں کہ کچھ کر کے دیکھو وہ جاتی کہاں ہے لیکن یہ ....

اے بھئی! — بڑے نے غم و غصے سے لڑتی آواز میں کہا — میں نے غصے سے پوچھا تھا، اس نے کہا تھا کہ یوم لکھ کے لیے سکول کی لڑکیاں دوسرا تیار کر رہی ہیں اور سیزمٹر سٹریٹس کے سامنے کام ظاہر ہو کے پڑ کر رکھا ہے غصے سے کہتا تھا دوسرا ہونا ہے اور وہ ہر شام سکول جا کر لڑکیوں کو شرمی کرتی ہے۔

اور اب نے مان لیا۔ — ماں نے طنز پر لکھی میں کہا — جیسا باپ دلیا بیٹا! غلام نے دونوں ہاتھ اس طرح سر کے گرد رکھے جیسے سخت پریشان ہو کر نہ زخاں ہو گئی ہو۔ وہ اسی حالت میں اٹھ گیا اور خاموشی سے چلی گئی۔

ماں نے خندنی سانس بھر کر کہا — تم جانو اور دھماکا مچانے۔ اور وہ بھی کمرے سے نکلنے لگی۔ نکلتے نکلتے چپ سے بات کرنے کے انداز میں کہ گئی — وہ تیس دن اس دن ہوش آئے گئے جس دن لوگ ہمارا منہ کالا کریں گے انہیں اٹھانے لگی۔ اور بڑے کو ادیت نکال انہیں میں ڈال کر چلی گئی۔

ظاہر ہے سیزمٹر سٹریٹس کو کہا تھا کہ ڈرامہ کسی اور کے سپرد کر دیں۔ اس نے ڈرامہ لکھ دیا تھا اور سیزمٹر سٹریٹس ایتھنڈ جی کہ ظاہر ہو کر اسے ظاہر ہوئے غصے سے فوٹی ہوئی کھانک کر ڈرامہ اور کوئی استانی تیار نہ کر سکے گی کیونکہ پلاٹ اور مکالموں میں اپنے ذاتی ادراپے جذبات کو پیش کیا تھا۔

اس نے ایک ایسی بیٹی کی داستان لکھی تھی جس نے دل کھچی تھی مذہب۔ وہ بھوکریں کھا کر لی اور حرام ہوتی جگہ پاکستان کی پسینہ قربان کیا۔ چندہ جمع کر کے ایک چھوٹا سا سکول کھولا۔ اس سکول کے جنوں میں اسے شادی کا خیال ہی نہ آیا جانی کہ اس وقت اس سکول کے لیے وقف کر دیں۔ اس کے عشق و محبت کا مرکز سکول اور سکول میں پڑھتے بچے تھے۔ یہ بچے کے اعصاب میں داخل ہوئے اور وہ بھی بڑے بڑے لیکن بیٹی، ایک ہی ڈگر چلتی رہی — سکول سننے سے سنتے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا جنون — پھر وہ بغیر ماں باپ کی بیٹی سینکڑوں بچوں کی روحانی ماں بن گئی۔ یہ تھادہ تمام جہاں پہنچے وہ دنیا جہاں کی سرتوں کو پالیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر ستر برس تھی لیکن اس کی روح جان ہوتی جاری تھی۔

غیر! — سیزمٹر سٹریٹس نے کہا تھا — اگر آپ چاہیں تو میں سیزمٹر کو خطا لکھ کر آپ کو ہر شام سکول آنے کی اجازت

کہ بات کرنے شرم آتی ہے۔ ... میں! یہ لڑکیاں باب کے لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔  
”ہے تو اب اپنی ہوتی۔“ ماں نے نکل پوچھ کر کہا — ”کس میں تو کسے کس سکول کے بھانے جانے کہاں کہاں ملتی رہتی ہے۔“

ظاہر خاموشی طاری ہو گئی۔ ایسی خاموشی جس کے دامن میں ٹوٹنا سوتے ہوئے تھے خال کو اس خاموشی کی بارش ہو گئے نصیب بننے دکھائی دینے لگے شیطان نے ان کی آن میں اس کے دماغ میں ایک پرانا ارادہ نئے درپہاں دیا۔ اس کی فطرت انگریزی لے کر بیدار ہو گئی۔ غصے سے گھر سے اٹھ کر وہ اپنی منہ کے لگی اور اسے غصے کی ماں کی نما پڑا رہا۔  
”جگ میں سناں! اوکھا۔“ کہا زیادہ سے زیادہ تین مینٹوں میں طلاقی ہو جائے گی غصے سے چادر بڑی طرح پھٹتا رہا ہے کہ کیا کہتا ہے۔  
آس اُنید کے کچھ بڑے دینے ایک بار پھر چل اٹھے۔

اس روز کے بعد غلام نے دوسرے تیسرے روز غصے کی ماں کے پاس جانا شروع کر دیا۔ سیرا درہ ظاہر ہو کر خاموشی بنا کر غصے کی ماں کو چپ سے ہی بھڑکی ہوئی تھی اور حیرت کی ماں نے کسر پر پیسے کی کوئی نہ چھوڑی تھی پھر بھی بعض ایسی ہی جاتی تھی۔ اب اسے تیار ہو جانی شروع ہوتی تو اس کے حوصلے میں نئی جان اوزنی ناز کی آگئی اور اس نے غصے کے ابسا ساتھ ظاہر کے خلاف جہنم کی ناجائز باتیں کرنی شروع کر دیں۔

بڑے نے آغاز میں تو قدم جاتے رکھے لیکن دن رات کی ایک ہی جھک جھک اور ایک ہی سرتل نے اسے سانس میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ ماں کے ساتھ اب غلام بھی شامل ہو گئی۔ دونوں مل کر غصے کے باپ کو شیشے میں آٹا کر ایک دن غلام نے اسے کر دیا۔ ”جیسا جی! میں تو قسری جگہ بگڑنے لگے گا کوئی حق نہیں لیکن غصے میں میری کیا بات۔“  
اس کی ماں میری لگی ہیں ہے۔ اس کی عزت میری عزت اور اس کے بے عزتی میری بے عزتی ہے۔ ہر بات میں تو وہ جس عورتیں علم رکھتی ہیں۔ ایسے ہی سہی لیکن مردوں کو بھی تو کھیں کھوئی باتیں ہیں۔ میں نے اپنی بہن کی خاطر زبان کھول دی۔  
رو کر دیکھا کہ ہوتی رہتی ہے اور آپ کے ساتھ پوری بات نہیں کرتی۔ اس کا کھڑا آپ نہیں نہیں گے کون نہ گئے۔  
تو میں کیا کروں؟ مجھے جو کچھ کہو ویسے کرتا ہوں۔ باب نے شکست خوردگی کے جیسے میں کہا۔ غصے میں کہتا تھا۔  
چکا ہوں کو ظاہر کو زیادہ آزاد نہ ہونے دو۔

میرے تو آپ کے گھر کا معاملہ ہے جیسا جی!؟ — غلام نے بظاہر قلعہ کا نظارہ کرتے ہوئے کہا — آپ مناسب سمجھیں کریں۔ میں اتنا کہتی ہوں کہ لڑکی انصاف دار ہے اور غصے کو اس نے جو بنا رکھا ہے۔ پسند و غم۔  
مردوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ نیک و بد کا خیال رکھتا تھا اور اب ....  
”اور اب کیا حال ہیں غصے کی خواہ کا ایک پیچھے کی بھی گھر میں نظر آیا ہو۔“ — یہی حال اس کی کہ کی خواہ کا ہے۔ جانے کہاں غریب کوئی ہے اور کس کو دے آتی ہے۔  
”جیسا بات ہے، جیسا جی!؟ — غلام نے کہا — اس کی کپڑی لکھی لڑکیاں اور وہ بھی سکول میں پڑھانے والے



ظاہر نے اپنے ماضی کو یادوں کے حوالے کر دیا تھا مگر اب یادوں کو گزرتی مہرئی زندگی کے صبح و شام میں دفن کر دیا۔ اب  
نہیں یاد تھا جہاں اس کی روح ٹھک کر سستی تھی۔ اس کا ٹھکانا ہر جہم نعیم کے ہی جہم کے سوز و غم میں سکون پڑ  
تھا۔ گھر سے جاتے اور گھر آتے سب سحر سحر میں ہوں ظاہر وہاں جا کر انہیں اب سے سلام کہتی تھی۔ یہ  
اس کے سینے کی تھوں سے نکلتا تھا۔ اس نے دھڑکیوں سے بھرتے کر کے بدترکیوں کے دامن میں ہی زندگی کو اپنی راہ پر  
لایا تھا۔ دریا میں بھی وہ اپنے دامن کو بھینکنے سے پہلے کی کوشش میں لگتی تھی۔

خالہ کو جب غلام کو ظاہر و شام کو بھی سکول جاتی ہے تو ابلیس کے کاغذات سے ایک نمبر تیار ہو کے نکلا۔ اس نے  
مذکورہ فوق سے تسلی دی۔ صبر کیے رکھو۔ ڈیڑھ دو ماہ میں رشتہ طے ہو جائے گا لڑکی کے لچن ظاہر ہونے لگے ہیں.....  
بڑی بات کہ وہ ایک بھول تھی جو ان لوگوں پر گئی تھی۔ اب کھر سے اچھے مل رہے ہیں کل میری بہن نے صاف کہہ دیا ہے کہ تو  
بے غم رہے دن اور دیکھ کر سنو تو طلاق دلوادوں گی نعیم کا باب بھی رضامند ہو گیا ہے۔

خالہ اس کے منہ میں ایک ہڈی دے آئی۔  
جس سکول میں ظاہر و چھاتی تھی وہ ان کے گھر سے دور تھا اور خالہ کے گھر کے قریب رات کو عورتیں ٹہلنے کے لیے  
لانے کے پاس سے گزر کر پرہیز کے میدان تک جایا کرتی تھیں۔ خالہ پہلے کبھی کھار عورتوں کے ساتھ سڑک پر کھاتی تھی۔ اب اس نے  
انداز سے آٹھ بیچے کے لہر سکول کے قریب سے گزرتا اور درسی اور دہان دکان شروع کر دیا۔ سکول کے ایک کمرے میں  
بناؤں، موزیم، نیچر اور طبع کی آوازیں آتی تھیں جس میں عورتوں کی کمرہ اور اس میں بھی کونسا کرتی تھیں۔  
ایک دن خالہ چار پانچ عورتوں کے ساتھ نو بیچے کے قریب سکول کے سامنے سے گزرتی تھی تو حسب عادت لڑکیں  
لانے لگیں اور خالہ و خدخت کی انگریزی اوٹ میں گئی۔ اس نے جو منظر دیکھا اسے کھتی ہی رہی اور انھیں سیر کر رہی تھی  
خوشحال کا ایک ایسا لڑکا اس کے سینے سے اٹھا کہ وہ جہاں دیکھیں پہنچ گئی۔ اسے ہر طرف فتح و نصرت کے نغمے  
اڑے رہے تھے۔

اس نے دیکھا کہ ظاہر و ایک آدمی کے ساتھ سکول کے پچھلے کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ رات ہونے کے باوجود اس  
نے نگاہ جھپٹ کر دیکھا تھا۔ سڑک کی تکی کی جگہ اور دروازے میں اس نے ظاہر کو کونسی طرح پہچان لیا لیکن اس آدمی کو پہچان  
اس نے شواہد فریض پہنچی ہوئی تھی اور سر پر جان کیپ تھی ظاہر نے اس آدمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پڑھ لیا تھا اور دونوں  
جنتا بن کر تے جارہے تھے۔ خالہ نے دیکھا کہ ذرا آگے جا کر ظاہر نے اس آدمی کا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ لیا اور  
نزد قریب ہو کر چلنے لگے۔

یہ لڑکا اور ایک ویران سڑک تھی جہاں کو باہل سی سنسان ہو جا کر آتی تھی۔ سڑک کی قیاد دور و دھن میں سے اندھیرا  
ظاہر و اور اس کا ساتھی اندھیرے میں گم ہو گئے کسی اندھیرے کی گلی میں چلے گئے۔ خالہ کو خواب کا دھوکہ ہوا نہ ہی اس  
منظر کو دہرہ دہرا۔ اسے اس قدر مست ہوتی جیسے وہ یہی کچھ دیکھنا چاہتی تھی۔  
خالہ کا سینہ بول چہل گیا جیسے نڈھال سے ڈھکھڑا ہوا روپیش دیا ہو۔ وہ وہیں سے نعیم کے گھر پہنچی اور نعیم کی ماں کو سارا

سے دتی۔ آپ خود سوچتے صبر سرحد کے وزیر اعظم کو ڈرامے پر مدح و تحاریر ہے جو سمیٹنے کے لیے ایک ماہر سے اپنا  
طے ہو چکی ہے۔ تمام انتظام مکمل ہو چکے ہیں اگر آپ کے ملکیت کا یہی نہ کی تو سارا کھیل جو پٹ ہو جائے گا۔  
ظاہر کے پاس انکار کی نظر ہوئی وہ جہنم کی تھی۔ وہ سیدہ سترس کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس کی ساس بلا دہری اس کا گھر  
جینا سماں کیے رکھتی ہے اور اگر وہ شام کو بھی گھر سے غیر حاضر ہوئی تو نہ جانے وہ کیا کیا طوفان کھڑے کر دے۔  
اس نے سیدہ سترس کی پیش کش قبول کر لی تھی اور نعیم سے کہتا تھا۔ اتنی جان کو اچھی طرح سمجھاؤ کہ میں ڈانڈا کر  
رہا ہوں سکول جایا کر دل کی اگر میں نے ان سے پوچھا تو اجازت تو بعد کی بات ہے۔ وہ میرے ساتھ بات نہ کرے گی  
کریں گی

یہ نہ تھا۔ اتنی کی اجازت کی کیا ضرورت ہے تم ظاہر کو جیلا کر دو اور... نعیم نے جذباتی ہو کر ظاہر کو کھڑا  
تے پڑ کر اپنے قریب کہتے ہوئے کہتا تھا۔ اور خدا کے لیے ظاہر و اجلی نوٹ کیا کرنا میں اتنی دیر کی بجائی برداشت  
نہیں کر سکوں گا۔

آپ اتنا وقت فی کے ساتھ گزار کر لیں۔ ظاہر نے اسے نصیحتہ کیا تھا۔ پھر پڑو نہ جاتے کہ بجائی تھی۔ میری نظر  
میں امی کے پاس رہنا۔ یہ تو خدا کا جواب ہے۔ ان کا دل بہلا لیتا۔  
لیکن نعیم کا یہ دل محض سرشام ساڑھے پانچ بجے سکول جانے لگی اور نعیم اس کی واپسی تک کا وقت گھر سے نہیں گنا  
تھا۔ بالوں ہی شام، شام، شام اور پھر ٹھنکے لگ جاتا تھا۔ کتنی باریاں نے ظاہر کے متعلق بات شروع کی وہ انہیں اپنے کمرے  
میں لایا۔ بات ہی دہشت کی عورت تھیں نعیم کی جن سے مال توڑ کی طرح بل رہی تھی اور گھر کی فضا، ماحول کو اندیشہ بنا رہی تھی۔  
میرا کوسوم تھا کہ گھر کی فضا میں کس قدر بدمعاش چل چکا ہے۔ ساس جو پہلے اشارے کی منتظر رہتی تھی۔ اب اشاروں کی  
بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس کی زبان چلتی رہتی تھی۔ وہ ہر بات طعنہ کے لیے کہتی تھی۔ نعیم کے باپ کا مزاج بھی منکر  
اور دھڑ سے ہونے لگا تھا۔ نعیم کو ان حالات کا بھی طرح علم تھا لیکن اس کا رویہ کبھی کبھار تھا۔ اس کی نگاہ ظاہر و سے ہٹتی  
ہی نہیں ہوتی۔

ظاہر کی اچھی بھلی زندگی گھٹن لگتا جا رہا تھا۔ وہ بعض اوقات پرانے کمرے کو دیکھا کرتی تھی جو چٹنے کھنڈے  
دے رہے تھے۔ اسے بعض اوقات اپنے سامنے جمید ہوا کی سیان دکھائی دیتا تھا لیکن اب وہ سرب کے ذریعے  
آواز ہو گئی تھی۔ اس نے ایک غشتان بنالیا اور وہ اس میں غور و خیر کیوں کو تعلیم دینا اس کا طعنہ نظر تھا۔ اس نے اپنے دھول  
کو بھی ایک گم دو میں ایک قوت کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ ساس کا خیال تو نہ سمجھ سکی، اس کی سطح سمجھ گئی۔ نعیم  
شانہ میں کو کچھ سمجھ گیا کہ وہاں بن جاتا تھا۔ سمجھ گئی تھی۔

اس نے انہیں دھتکتے پتھروں کو نظر انداز کرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن اس نے ساس کی قدر و قیمت بارے  
کہ اندھیرے کی جنت کو لڑا ہذا زمین کیا تھا۔ رات کو تھک کر جب وہ نعیم کے پیلو میں بیٹھی تھی تو اسے روحانی قرار نصیب ہوتا تھا  
یہ نعیم کے جسم و جان میں تحلیل ہو کر رہ جاتی تھی۔

حال ہیچ زیب داستان نہایا۔ ماں نے سنا تو وہ تو جیسے میناؤں تک بل گئی۔

”اسے گلشن ازرا پھر سوچ لے۔“ ماں نے اپنے آپ کو فریب دینا چاہا، حالانکہ وہ بھی ظاہر کے خلاف ہی کہہ نہ جاسکتی تھی۔ اسے ظاہر کے خلاف ایسے ہی محسوس ثبوت کی ضرورت تھی لیکن اسے اپنی عزت کا خیال کیا کہنے لگی۔ کتنا بھی لگ سکتی ہے، شاید تم نے کسی اور کو دیکھا ہو؟“

”ظاہر نے فیروزی رنگ کا دوپٹہ لیا تھا آج؟“ خالد نے ثبوت پیش کرتے ہوئے کہا۔ قاضی کی سیدہ زین فیروزی پھل ہیں،... شلوار ساٹن یا ہلکے کی ہے اور سینڈل سفید۔ مجھلا مجھے غلطی کیسے لگ سکتی ہے؟ کو تو اندھیر میں پہچان لوں؟“

نفیم کی ماں نے کڑوں کی تفصیل سننی تو اسے یقین آگیا کہ وہ ظاہر ہی تھی۔ اسنے میں ظاہر کو گھر میں داخل ہونے کو ناراضا ہنس کے کہاں میں کہا۔ آج کچھ دن کا مکمل رات خود چل کے دیکھ لی۔ یہ برسات ہی ٹھوٹ کر تھی جوگی پھر بھائی یا کسی کو دکھائیں گے۔ سکتا ہے وہ ہماری زبان پر یقین نہ کریں؟“

دوسری رات نو سو نوے نفیم کی خالد اور ماں سکول کے سامنے درخت کی اوٹ میں کھڑی تھیں کھارہو اس کی آہی۔ ساتھ ساتھ میں ہاتھ ڈالے سکول سے نکلی سکول کا پچانک اور سخت سے اتنی دور تھا کہ اس آہی کا چہرہ و زہری میں پہچان نہیں تھا۔ وہ تھا بھی انجان چہرہ۔ آنکھوں پر گھر سے رنگ کا چشمہ اور سر پر جناح کیپ۔ ہاتھ میں دان کا ڈبرہ تھا۔

ماں کو لگتی تو وہ زمین پر جتنی ترسماں پر۔ جہاں اسے ظاہر کے خلاف ایک اور جرم کا ثبوت مل گیا تھا وہاں اپنے بیٹے کے گھر کے اجڑنے کا بھی کچھ سمجھ نہ پائی کہ روئے یا مشکل سے۔ رات بھر وہ کروں میں بستی رہی اس نے بڑا نفیم کے باپ کو سنا دیا تھا۔ پھر بھی اسے قرار نہ کیا۔ بوڑھے باپ نے کہا۔ ”میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ نفیم اور ظاہر سے کچھ نہ کہنا۔“

اگلی رات نفیم کی ماں، خالد اور باپ درخت کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ انہوں نے بھی وہی منظور کیا۔ باپ سینک اپنی طرح صاف کر کے دیکھا اور کوئی شک ہی نہ رہا کہ وہ ظاہر تھی۔ اس طرح اس آہی کے ہاتھوں میں ہاتھ دینے اور رز کی طرح نہرا آگے جا کر اس نے اپنا بایاں ہاتھ ظاہر کے ہاتھیں کندھے پر رکھ دیا اور ظاہر اس کے اور قریب ہو گئی۔ باپ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی غم و غصے کے جوش کا عالم کہ اس پر تو جیسے غشی طاری ہونے لگی تھی۔ وہ اس آہی کے ٹوکے چاہتا تھا اور اس ہٹو کے بھی جو اس کے اٹھو تے بیٹے کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی تھی۔

وہاں سے گھڑاتے تمام راہ نفیم کی خالد اور ماں باری باری اور کبھی اکٹھی نفیم کے باپ کی رگ سمیت پھر کھڑکی پر بڑھے پر ایک خاموشی، طوفانِ گریباں، طاری رہی جو گہری ہوئی تھی۔ وہ کسی کی باتیں جیسے ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تمام راہوں کو دیکھتا رہا۔ عزت کا خون، عصمت کا خون، عزت و عصمت کے داکو کا خون اور خون ہی خون۔ اس کے ہاتھ کاٹنے اور جو ایک آہ بات کی تو الفاظ بھی لرز رہے تھے۔ اسے تو یہ بھی خیال نہ آیا کہ وہ کچھ پہنچ کر اپنے گھر سے میں بیٹھ چکا ہے اور مہینے بیٹھا ہوئے نفیم کو اس نے بلایا تھا اور اس کی ماں نے کہا تھا کہ نفیم کو میرے پاس بھیج کر قریب ملنا؟“

بڑا وہ گھٹنے بعد نفیم باپ کے گھر سے نکلا اس کا دل تو جیسے ہلکی سی ذوب لگا تھا سر سبز پڑا تھا اور سستی کی کیفیت ابھی تھی ساتھ ہی اعصاب زدگی۔ اس کی حالت ہر اس خاندان سے بدتر تھی جو اپنی بیوی پر جال شکار کے اور بیوی مات کے بے میں غیر مرد کے ساتھ اندھیری لگی میں گم ہو جاتا۔

”ہاں کے گھر سے نکل کر صحن میں آنا تو اس نے محسوس کیا جیسے وہ گھر پر سے نکلا۔ وہ سر سبز کو دیکھ کر اس کے نظر۔ اس کی شخصیت کی کمزور کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹ گئیں۔ اس نے اپنے آپ کو گھر سے سنبھال کر دیکھا۔ اس میں پرکھا ہوئی تھی۔ سترے ایک چکر کی صورت تیزی سے گھر سے دکھائی دیتے۔ اس نے قے کی حاجت محسوس کی، لی میں شدید درد شروع ہو گیا۔ وہاں سے گھبرا کر اداری کے گھر سے میں چار پائی پر جا کر ادھار سوچنے سے معذور ہو چکا تھا۔

بلاات اور حالات کی کش و پشیمانی داغ میں یوں گھسی چلی کہ اپنی تھیں جس طرح شکستہ کشتی میں دیا کا پانی داخل ہوتا ہے۔ ماں نے جھگ کر اسے سنبھالا۔ اس کے سارے جسم پر رش کی سی کیفیت طاری تھی۔ رنگ روتھا۔ آنکھیں جیسے پھر ہیں اور سانسوں کا تسلسل بے قاعدہ۔ ماں نے نفیم کے باپ کو بلایا ماں نے اسے کو نفیم کی برسات کچھ تو اس پر رخت طاری اس کی اپنی جذباتی کیفیت بیٹے سے بہتر تھی لیکن اس نے زمانے کی گڑھی مڑی کھینچی تھی۔ وہ اس صدمے کو برداشت کرنے شکر کرتا تھا۔ اس نے کچھ چاہی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ اسے زندہ دیکھ کر اسے گھر نہ تھا۔ اس نفیم کی ماں کی باتیں خالد نے اوروں سے اس کے کانوں میں گھسنے ہوئے جیسے کی طرح گری تھیں۔ وہ نفیم کے سر پر ہاتھ کر اسے تسلیاں دلا۔

کچھ اقساں سے اور کچھ مل کے اس ہاتھ سے چپا کر لگا دیا۔ اس کے بال سلا رہا تھا نفیم کی حالت سنبھلنے لگی اسے سارا ہوا تو اس نے معذرت طلب کیا کہوں سے ماں کی طرف دیکھا نفیم کے باپ نے جب دیکھا کہ نفیم اپنے آپ میں آتا تھا تو اس نے جتنی بچ کر اور الفاظ قول قول کہ نفیم کو اس مسئلہ کا عملی حل بتانا شروع کیا اور اتنا اس نے فخر سے پر زور سے انداز وصلہ

دیکھا اور بہت ہیں۔ ایک سے ایک ڈر کر۔ اب ایک ہی مل ہے۔ طلاق میں ابھی زندہ ہوں، بیٹا! نفیم تو جیسے کم بڑا ہو۔ دھما کے کی چکا چند میں اسے اٹھ کر دوتی اور سب کو غلوس دکھائی دینا اور اپنی بیوی میں گناہ سے بھرتے دن کا ایک ایک لمحہ اسے ایک سانس میں نظر آگیا۔ راہ اپنی بیوی کی گناہی ہوئی شیب عروسی اور ایسی ہی پہلی رات جو انہوں نے زمناں تھی۔ ظاہر کا خون اور ظاہر کو کلس۔ اس کی بات شخصیت اور اس کے چپا کر دھاتی قرار۔

نفیم کو ایک تباہی میں بہت کچھ یاد آگیا اور اس نے سہی ہوئی نگاہوں سے باپ کو دیکھا، پھر اس کو دیکھا۔ وہ یقین کرنا چاہتا اور اذرا خواب دیکھ رہا ہے اور ابھی کچھ کھل جائے گی۔ اس نے میں ماں بول پڑی۔ باپ نے تو تسلسل کر بات کی تھی اور طلاق ہی تھی لیکن ماں نے طلاق سے بات شروع کی اور بات ابھی تو سہی نہ ہوئی کہ نفیم پر پھر وہی دل ڈوبنے کا درد پڑ گیا نفیم پر سادیک خوف طاری ہو گیا اور ماں کو بھی اور باپ کو بھی شک سے دیکھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ ماں نے سارا دیا تو وہ غصے میں ڈولا۔ ”چھوڑ دو ابھی! اپنے گھر سے میں جا رہا ہوں۔ اور وہ اپنے گھر سے کی طرف چل پڑا۔

ظاہر کو بھی ہوئی تھی اور لیٹ گئی تھی۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ جنگل میں آگ لگ چکی ہے اور شعلے اس کی کینا کے قریب پہنچ

وہ خالوں اور بالوں کے ٹھٹھٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ڈھتے پاؤں مارنے لگا۔ ایک طرف طاہرہ کی باتیں اور اس کی باتوں کی باری ہوئی مگر وہ شخصیت کو جلاوڑے کی سی تھی۔ دوسری طرف اسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایسی غلش محسوس ہونے لگی کہ وہ اس کمرے سے اس گھر سے اور اس دنیا سے ہی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس کی آنندونی دنیا میں ایک آواز کو گنج لیا۔ یہ سب بستان ہے۔ طاہرہ میری ہے۔ اور تو میں جلی آواز میں اس کی آواز کے تعاقب میں یوں بھاگ رہا ہوں۔ دین بیاں ایک چوہے کا پیچھا کر رہی ہوں۔

رات کا دوسرا پرچہ تھا۔ طاہرہ پوری نیند سوئی ہوئی تھی سوئے سے پہلے اس نے نعیم کی آنکھیں بند کر کے لیٹ کر لیا تھا کہ وہ بے کس نعیم کو الگ الگ جگہ رات بھر آکھیں اس کو بہرہ بھرا کر تھک گئی تھیں اور نورا ستائے کو بند ہو گئی تھیں نعیم نے اس کو سوتے دیکھا تو اٹھ بیٹھا اور طاہرہ کو دیکھنے لگا۔ دو مستفاد خیالات دو پتھروں کی طرح اس کے ذہن میں ٹھارے ہوئے تھے۔ اولیٰ کہ آواز کے ساتھ اسے طاہرہ در روپ میں نظر آتی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہا کچھ سوچتا رہا اور اس کا دل چڑھنے لگا گیا۔ دہلیز گیا اس نے بہت کچھ سوچا تھا۔ طاہرہ کی اس قدر باتوں کے جواب میں اس نے زیادہ باتیں نہیں کی تھیں اور نہ ہی بظاہر ہونے والی کہ اس کے ماں باپ اور خاں کے ایک غیر مرگے ساتھ قابل اعتراض حالت میں جاتے دیکھ آتے اور اس کے خلاف طعانی کا فیصلہ دیا جا چکا ہے۔

دوسرے دن نعیم بارہ بجے دفتر سے واپس آگیا۔ اس کی طبیعت ٹھکانے نہیں تھی گزشتہ رات کی جذباتی اور فزائی اور بیداری کا اثر ذرا کم نہیں تھا تھا۔ وہ صرف دل ڈونے اور گھبراہٹ کی شکایت کر رہا تھا۔ طاہرہ نے صبح سویرے سویرے بیاں طور محسوس کر لیا تھا کہ رات کو تو خاص واردات ہوئی ہے۔ ساس اور سر کی نگاہوں اور حکم میں تھوڑا عتاب جھلکنا۔ اور وہیں سے کسی نے بھی طاہرہ کو سلام کا جواب نہیں دیا تھا جواب میں دونوں نے منہ پھیر لیے تھے صرف نوزائی میں نے طاہرہ کے ساتھ ہنس کر بات کی تھی۔

طاہرہ ساڑھے تین بجے کے قریب گھر آئی تو نعیم در سے بہتر تھا۔ ماں نے اسے مہین نہیں لینے دیا تھا۔ اس کا سرداتی اور داغ چاٹتی رہی تھی۔ اس کے دل سے طاہرہ کی محبت کو دیکھ کر اپنا پیار بگاتی رہی تھی۔ اسے طلاق کا عملی پہلو سمجھا تھا۔ قحی طاہرہ حسب معمول شام کو کمرہ پرل کے لیے سکول چلی گئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے نعیم کو سلام کیا تو نعیم نے ہر روز کی طرح کہا: "خدا کے لیے جلدی ڈنٹ آنا میں تمہیں گھنٹے کیسے گزاراں گا؟ یاد رکھو جی جانتا ہے کہ کڑا ڈرامہ چرٹ کر دل" نا آج اس نے سمجھ ہوئے دل سے زیر لب کہا: "جاؤ"۔

نعیم کا دل بے رخی سے جواب دینا طاہرہ کے لیے غیر معمولی واقعہ تھا۔ اسے سکول جانا تھا وہ لگتی لیکن چلتے ہوئے اس نے پال ڈھال میں بھی ایک ناگوار سی تبدیلی محسوس کی۔ دل دوامع اور عصب پر ایک گرفت اور گھٹن محسوس کی۔ اس نے راستے میں پارکرو ڈرائے کو اوجھڑا دیا چھوڑ دے اور سب مہینس کو صاف کر دے کو میں بہت ہی پروردگار ہوں، دینا ڈرامہ مجھے نے ڈوبے سے احساس تھا کہ جب سے وہ ڈرائے کے لیے سکول جانے لگی تھی، ساس نے گھر کے ڈرائے میں نہتے سے نہتے

چپے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں ڈرائے سے ایک منظر نظر ثانی کر رہی تھی کہ دروازے کا کھلا دھماکے سے کھل کر دروازے کا صفحہ اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا نعیم کو لگا سا مارا لے کر کمرے میں داخل ہو رہا تھا اس کی حالت نے اسے ہرگز کی سی تھی۔

طاہرہ پھر ایک لمحے سے انہی اور دروازہ بند کر کے نعیم کو تھام لیا۔ اس لمحے سے پہلے نعیم نے جانے کی باتیں کیا تھیں کہ قریب پہنچتے ہی ذہن سے نکل گیا۔ اس نے چاہا کہ طاہرہ کی گرفت سے نکل جائے لیکن طاہرہ اسے بہتر میں لے کر اس کے ساتھ لگ کر نعیم دروازہ پر چلی گئی اور اس کا نرم و گلازہ اس کی پیشانی پر تھما۔

"کیا بات ہے؟" طاہرہ نے پیارا اور ہمدردی سے لبریز گھر بہت سے پوچھا۔ "طبیعت خراب ہے؟" "کچھ نہیں!" نعیم کی آواز اس طرح کی جیسے وہ گھر کی کھانی سے بولا ہو۔ اس نے ہاتھ بڑھایا کہ طاہرہ کا ہاتھ اپنی پیشانی پر تھامے۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا تو طاہرہ کا ہاتھ لگ گیا نعیم اس نے اس کا ہاتھ پیشانی سے اٹھایا تو طاہرہ نے اپنا ہاتھ نعیم کے ہاتھ کے حوالے کر دیا۔ دونوں ہاتھ دو تین سے بہا میں محسوس رہے اور نعیم نے بے باکائی سے طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھا پھر اپنی آنکھوں پر رکھا اور اس پر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔

طاہرہ نے فوراً محسوس کر لیا کہ نعیم در رہا ہے۔ اس کی یہ حالت طاہرہ کے لیے حیران کن نہیں تھی۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ نعیم کھال پر دروازے پر محسوس ہے اور گھر کے حالات بے حد پر لگندہ۔ اس نے سوچا کہ کبھی آج اتنی دیر میں اس کے پاس ضرور کوئی یافتہ بگا یا گیا ہوگا۔ اس نے سوچنے پر نعیم سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اسے دیکھ کر تو صرف نعیم کی گھبراہٹ کی خرابی کا۔

وہ کئی دہائیوں سے دیکھ رہی تھی کہ نعیم کی صحت پر پر لگندگی اثر کرنے لگی ہے اور نعیم اکثر دل چھوڑ بیٹھا تھا۔ اس نے نعیم کو لڑکھٹے بھی دیکھا تھا نعیم کی یہ حالت طاہرہ کے لیے تو شیشہ کی تھی نعیم کے بھرے بھرے خول صبر ت پر سے پڑنے سے بادل چھانے لگے تھے اور وہ سمجھنے لگا تھا۔ آج کی رات تو اس کی حالت زیادہ غراب معلوم ہوتی تھی۔ یہ حالت طاہرہ نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ نعیم بھی خاموش تھا اور اس کی آنکھیں طاہرہ اور اپنے ہاتھ کی اوٹ میں خون دور رہی تھیں۔ طاہرہ پر رفتہ رفتہ ہونٹوں اور اس نے سینے میں جن ہی محسوس کی۔

"طاہرہ!" نعیم نے ہاتھ جٹا کر ہنسی سے کہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور آنسوؤں کی ٹاروں سے بے جا رہے تھے۔ اونچی ہوئی آواز میں بولا: "ہر گز کہو، طاہرہ! میں مجھ سے محبت ہے یا مجھے قریب دے رہی ہو۔ خدا کے لیے طاہرہ! میں شاید۔ اور اس کی آواز پھر بگ گئی۔

طاہرہ نے اس کا سر پیٹ کر دیکھا اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ اس کی ایک ایک بات نعیم کے دل میں اترتی جا رہی تھی نعیم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ایک لگن سے خون نکل رہا ہے اور دوسری لگن سے تو تازہ خون نکلا جا رہا ہے۔ اس کی گنج گری پر مچھائی ہوئی زندگی بھر کی بھری ہوئی جاری تھی۔ اسی دوران اسے مال اور باپ کی چند منٹ پیش پیر کی باتیں گئیں اور نعیم کی حالت اس کشش کی سی ہو گئی جس میں سورج ہو گئے ہوں۔

ان نے نعیم کے دل میں ایک خوفناک امادہ پیدا کر دیا۔ اسے اپنے چاروں طرف خونِ طائر کے لگا اور ہم اس ارادے کے خلاف طعن کیا جسے سیلاب میں بہاؤ کی ایک سمت تھی اس کے ہاتھ اٹھایا۔ ایک سہارا۔ موت۔ خون۔

لیکن اس کا خون؟ نعیم کو بھی معلوم نہ تھا۔ جب وہ گھر پہنچا تو اس کا سر جمل رہا تھا۔ ظاہر گھونچتی تھی اور کمرے میں نعیم کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کسی سے نہ کہا کہ یہاں ہے نہ اسے کسی نے بتایا تھا۔ نہ ہی گھر میں کسی کو معلوم تھا۔

نعیم گھر پہنچا تو اس کے کمرے میں گیا۔ اس کا شہسوار اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس نے اس کی حالت دیکھی تو اس کا کلیجہ بے ادب کر کے لگا نعیم چارپائی پر لپٹ گیا۔ اس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو پیشانی تپ رہی تھی۔ باپ کو بلایا۔ اس نے

بڑا لگاؤ بنایا۔ کمرہ سود سے تیار کر رہا تھا۔ باپ نے حال پوچھا تو نعیم نے سر ہٹا دیا۔ بات نہ کر سکا اور اس کے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مال کو چارپائی پر اپنے قریب بیٹھنے کو کہا اور سر ہٹا کر کہا۔ مال نے سر ہٹا کر بڑھ کر

مال باپ پر نشان سوئے جا رہے تھے اور نعیم کے سینے اور داغ میں جو گل شک رہی تھی اس کے شعلے اسے جلاتے رہے تھے۔ اس کا سب کچھ مل رہا تھا اور وہ ان شعلوں سے بھاگ رہا تھا۔ خیالوں میں بھاگتا ہی جا رہا تھا۔ اخصا کٹکٹش نے

مال جیسے گل کی خوشبو کی کر دیا تھا۔ نعیم زور زور سے سر نہ پر سر مارنے لگا اور باپ اس قدر گھبرا کر بھاگ کر ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ظاہر کو دیکھ کر ڈاکٹر گھر میں قیامت آتی ہے جب ڈاکٹر گھر میں داخل ہوا تو اتفاق سے ظاہر وہیں میں گھر رہی تھی۔ ڈاکٹر کے

پچھلے دھاس کے ٹکڑے میں اس کی حالت میں دیکھا تو سب کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے نعیم پر بڑی بڑی، ڈاکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا کہ اسے ایک طرف نکال دے ظاہر اس طرح بولنے لگی جیسے اس کمرے

میں نعیم اور ڈاکٹر بیس سال اور ستر سو سال کی جھول رہی تھی۔ کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟ اس کے گھبراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "انہیں کیا ہو گیا ہے؟ پتلے تو کبھی ان کی

خوابیں ہوتی تھیں۔" ڈاکٹر نے تسلی آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "بمبار تیز ہو گیا ہے۔ سب ٹھیک نہ گا۔"

نعیم کی آنکھیں بند تھیں جب اس کے کانوں میں ظاہر کی آواز پڑی تو اس نے ذرا سی آنکھ کھولی۔ ظاہر کو اپنے اُپر بھاگتا ہوا دیکھ کر اس کی تپتی جھلی میں ڈاکٹر نے ظاہر کو ایک طرف کر کے سیتھو کوپ دل پر بھی تو ڈاکٹر نے بعض اور دل میں

رہی دل بھی جیسے بعض کی حالت زیادہ خوب ہوگی۔ ستر سو سال ایک بار پھر پانچنے لگا۔ ظاہر نے دیکھا کہ ڈاکٹر کے چہرے پر ایک رعبہ رہا تھا۔ نعیم کی ماں اور باپ ظاہر کو خستہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ نعیم کی اس حالت کی

دقت ظاہر ہے۔ وہ ڈاکٹر کے جانے کا انتظار کر رہے تھے اور دل میں غصے کو مین کیے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر نے ظاہر کی طرف دیکھا اور ذرا ہلکا کر سوالیہ انداز میں کہا۔ "آپ؟"

"میں سرسبز نعیم ہوں۔" ظاہر نے اپنا تعارف کر دیا۔

سوا گھنٹے شروع کر دیتے تھے۔ یہ احساس بہت تلخ تھا لیکن ظاہر نے سکول کے ڈرامے کے متن کو سوجا ہوا ہے۔ بھی محسوس ہوا کہ یہ ڈرامہ اور ظاہر کا تو وہ بھی شاید زندہ ہو سکے گی۔

اس ڈرامے کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک منظر میں اس کے جذبات اور غور کا رنگ بگھڑا ہوا تھا۔ یہ ڈرامہ اس کی فائز کا اظہار تھا اور اس اظہار میں وہ روحانی قرار پا رہی تھی۔ اسے وہ ہر قیمت پر شیعہ کرنا چاہتی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ خبر تو اس کی

میں گھڑتی جا رہی ہے اس کی ہر بات کا یہی اس کی قد چمک اور زندگی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ بعض اوقات بیہوشی میں جب ظاہر کو یہ لگتا تھا تو کبھی اور کمرے کی دیواروں کے والی لڑکی کے منہ سے نکلتی سنتی تو وہ مجبوراً ہنسی ہنسی

نات سواناؤں پر رہے تھے۔ نعیم سکول کی کچھ ایک سے تھوڑی دور درخت کی اوٹ میں گھڑا تھا۔ رات کا اندھیرا لگا رہا تھا اور سکول کی تیاں جل رہی تھیں چند منٹ بعد ظاہر وہی آدمی کے ساتھ سکول کے پچھلے کچے باہر نکلی۔ جی کی زور اور مرد و شہ

نعیم کے ظاہر کو تو کچھ طرح بچان لیا لیکن اس آدمی کے نقش و نگار کو بھی طرح طرح دیکھ سکا۔ ظاہر کو تو وہ اندھیرے میں بھی بچان لے سکتا تھا۔ اس آدمی نے ہر روز کی طرح رنگارنگ چتر پیش رکھا تھا اور ہاتھ میں دانت تھی۔ اس کا ہاتھ ظاہر کو دیکھتے ہیں تھا اور اس کے چاروں

آدمی نے اپنا بیاں ہاتھ ظاہر کو بائیں کندھے پر اس طرح رکھ لیا جیسے بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹ لیا ہو۔ ظاہر اس کے اور قریب ہو گئی۔

وہ دل تو اندھیرے میں پہنچ چکے تھے لیکن نعیم کی آنکھوں کے سامنے پہلے ہی اندھیرا اُٹھ چکا تھا۔ اس کا دل بیٹھ گیا جیسے کسی آبی ٹینکے میں بکڑ لیا ہو۔ غصے کا عالم تھا کہ اس کا سر بڑھتا تھا۔ شیاں بند ہو گئیں اور دانت بچنے لگے۔ ان سے نہ کر

پر نگاہ دوڑانی، سنسان سڑک کی آواز کا تیاں جیسے نلکی رہی تھیں۔ نعیم کی داخلی دنیا میں یہ دم کے شروع ہو گئے جن کی گرتا اور ہیبت ناک گونج نے اسے ملا کے رکھ دیا۔ اس نے خیال میں جانے کے گھونسا مارا اور وہ چونک اُٹھا۔ جی کی روشنی میں اپنے

ہاتھ کو دیکھا۔ ہاتھ سے خون بہ رہا تھا۔ اس نے درخت کو گھونسا مار دیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک ارادہ پیدا ہوا۔ وہ چپے سے جا کر اس آدمی کی گردن دلوچ کر اسے ختم کر دینے کو آگے

بڑھا۔ وہ دم چلا اور لگا لگا کہوں رک گیا۔ اسے معلوم نہ تھا۔ وہ جل پڑا۔ اب اس نے سوچا کہ انہیں پوچھ کر ظاہر کو دینا ملان دے دے گا۔ وہ پھر لگتا تھا اور سر ہٹا لیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ ظاہر کا سامنا کر سکے گا۔ وہ اپنی شکست کا سامنا نہ کر سکے

گا۔ وہ اپنی محبت کا خون کرنے سے گھبرا رہا تھا لیکن اس کی محبت کا خون تو اس کی آنکھوں کے سامنے بہ رہا تھا۔ نعیم نے سوچا بہت کچھ سوچا۔ سیدہ تنویر کی طرح تپ رہا تھا۔ دل دوتا جا رہا تھا۔ اعصاب کچھ کچھ نہیں کی طرح کوڑھ لگتا

نوت رہے تھے۔ اس کا دل جرات پہلے ہی دم توڑ چکا تھی۔ سہارا نہیں رہا تھا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا اور شدت سے محسوس ہوا کہ وہ بہت کمزور ہے۔ اس قدر کمزور کہ وہ اس صدمہ سے جان کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ اس کی زبان کبھی نہیں سیکھی کہ میں نہیں ملان دیتا ہوں۔

نعیم کو اپنی بھانجی اور کمزوری کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ گزشتہ رات کی طرح اسے پھر بھرتی محسوس ہوئی اور سر پہ پٹی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اندرونی اور برہنی فضا میں آپس میں ٹکرائے گئیں اور بھیدیں کو نہ دے گئیں۔ ان

”خجے جوتان مارین۔ طاہرہ بعد مشکل بولی۔ لیکن خدا کے لیے ان کی صحت کا خیال کریں، ڈاکٹر لکھا ہے۔“  
”اڑی مل آئی ہے بڑی ان کی صحت کا خیال رکھنے والی، بد معاش!“  
”و جانے کیا کچھ کچھ رہی، طاہرہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔“

طاہرہ کمرے میں جا کر ٹی وی اٹھی، پھر بیٹھی گئی اور دیکھ کر بے میں ٹلنے لگی۔ آخر تک ڈاکٹر لکھ گئی، ساس کی ہر روز کی بلجک کی تودہ عادی بن چکی تھی لیکن آج کی طیارہ کی توقع نہیں تھی، علم اور غصہ سمند کی طرح اڑا پلا، اڑا پلا اور طاہرہ کی تمام میں ادب نہیں، اس کو سختی سے دیکھتے، اس کو دھمکے میں اسے اپنی زندگی کے اہم، جو گزرتے تھے اور جو گزرتے تھے، اسے مجھے سے باہر ہوں کی طرح لوگوں کو اڑا پلا کرتے جو تھے دکھائی دینے لگے۔

اس کے سامنے اس کی زندگی کی کتاب کی طرح کچھ لکھی تھی، پھر تیرا جواس نے کھلی ہوئی کتاب کے تمام ورق تیزی سے الٹ دیے، طاہرہ نے ایک ایک ورق دیکھا، لکھائیاں، چوڑیاں، برقی تھیں، لکھائیاں جو بیت ریح تھیں، اچھی بھی، بری بھی، ایک ایک لڑائی جواس کی راہ میں آیا اور اس کا ہنسنے پر جواس نے دکھائی دیا، خالوں میں وہ دم بھر کے لیے سب کے ساتھ دو دو قدم چلی۔ باہر لے اسے غریب دیتے جس مامی کو وہ آج کے عزام کے پاؤں تھے روز بھر تھی، وہ جوں کا توں، جیتا بگاٹا اس کے سامنے ٹوٹا ہوا جیسے وہ باتیں کل کی باتیں تھیں، جلال آباد کے پرنسنگ مارشبل دروز جیسے یہ لگی کی ٹیڑھی پر تھی تو کھرے ہوئے، ارشد، عفت اور جواسے میں منجھی منجھی رہی ہوئی اور اسے اس شخص سے فوج خورزاں میں بند کر دیا گیا ہو۔

تصویرات کی دنیا میں اس نے سب کی آوازیں نہیں سنی، آوازوں کو وہ اس کی جگہ تھی، انہیں اس نے اپنی ہستی میں جاگڑاں پایا۔

آٹالیں زندہ تھیں، ارشد کے پیدا کردہ جس خلا کو اس نے نعیم سے پڑ لیا تھا وہ اب بھی ایک عجیب غلابی تھا، خالی، مہیب اور بھیاں۔ اطہر خانی اور گڑا پناہوں نے اسے راوی لینڈی کے رہوے میں شیش پر رو کر الوداع کی تھی، اسے دکھائی دیتے، بحرہ عروسی اور نعیم ابھی بھی کسی کس نے جلال آباد اور آٹا شامیوں کو کمرہ عروسی میں جاتی ہوئی آگ بھوس کے خوشنودار وحوش میں اڑا دیا ہے لیکن وہ جو گزرتے تھے اور زمانہ جو بیت گیا تھا، ایک کوچ بن کر آج کی رات کمرے میں جھک رہا تھا۔ کوچ بن کر ایک سرگودھ۔

یہ بایں نعیم کی یہ حالت، ساس کی باتیں اور دن بھر کی تھکان جیتا بگاٹا ٹھکان کی تھی اور طاہرہ ایک تنکا، راہ زادوں کی تھی، اس نے اپنے آپ کو حالات کی روش کے حوالے کر دیا اور دل میں اس راوے کو پختہ کر لیا کہ اپنی ڈاکٹر سے نہیں جتنے کی یہ احتجاج تھا، مگر یہ اتفاق، طاہرہ اس سے بے نیاز تھی، اسے اپنی دیگر اپنی راہ سے اس تھا، اس کی راہ کیا تھی؟ سکول، سکول کے پتے پر کیا، اس نے دو تین بار سوچا تھا کہ ڈرامے سے دست بردار ہو جائے کیونکہ نعیم کی ماں کو اس کا ہر شام باہر جانا پھانسا لگتا اور آج تو ماں نے صاف کہہ دیا تھا۔ ”مہم نے دیکھ لیا ہے تو جاری نظروں کے سامنے کیا دیکھا کر چلی رہی ہے۔“ مگر! لیکن آج رات اس نے فیصلہ کر لیا کہ ڈرامے کو پورا کر کے رہے گی، ایک نہیں ہزار ٹھکان آتیں۔ وہ زندگی کی چنگاری بجھنے کو دے گی۔

طاہرہ نے اپنے آپ کو وقت کے حوالے بھی کر دیا اور ساس کے مقابلے میں اپنی روش سے زبنتے کا ارادہ ملکہ فیصلہ کر لیا، ایسے میں اسے جلال آباد اور لاہور کے درمیان بسنا اور غرا اور چاروہ دیا یا لگا لگا جس کے ٹھکانے مارتے ہوئے

”آپ خدا باہر تشریف لائیں۔“ ڈاکٹر طہرہ کو صحن میں لے گیا اور پوچھا: ”آپ نے کہا تھا کہ اس سے کبھی ان کی یہ حالت نہیں بدلتی تھی۔“

”جی ہاں۔“ طاہرہ نے جواب دیا، ”تاہم غور ہے کہ ان کا دل بہت کمزور ہے اور طبیعت ضرورت سے کم حساس ہے، ذرا سی تکلیف کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور ذرا ہی لمبی ویسی بات برداشت کرتے ہیں۔“

”ہوں! ڈاکٹر نے گہری سوچ سے بیدار ہوتے ہوئے کہا۔ ”گو مجھے ہر نسخہ میں ابھی زیادہ تفصیل میں دینا چاہتا ہوں، انہیں آپ سے دوچار باتیں کروں گا۔ ہر نسخہ کو دل کا عارضہ شروع ہو چکا ہے اور دل واقعی کمزور ہے، دل کو تشویش کا حد تک بے قاعدہ ہے، عارضہ آج کا نہیں پرانا معلوم ہوتا ہے اور آج ہنگامہ کی وجہ سے کسی حد تک ایک

مکملت بیدار ہو گیا ہے۔ مرض حساس بھی ہے اور لفظی جذبات بھی... جی ہاں!... آپ کے ساتھ تھوڑے طور پر دل کی دوا ایسی ہے لیکن جذباتی دوا ایسی بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے، آپ ہر صحن کے کمرے میں آئیں تو مرض کے دل کی کم کثرت تبدیل آئی اس نے مجھے چکنا کر دیا تھا...“ مگر ہر نسخہ میں بڑا نامیہ گا، ڈاکٹر کو ایسی باتیں لکھانی ہیں، آپ ہر نسخہ ساتھ صرف پیار و محبت کیجئے اور انہیں بھلائے رکھیے اور خدا کے لیے جہانی ملاپ سے پرہیز کیجئے جس قدر ہو سکتا۔

”بہت اچھا ڈاکٹر صاحب! طاہرہ نے سر جھکا کر کوئی جوتی آواز میں کہا، اس کے آنسو ٹپک رہے تھے بولی۔ حالت کیسی ہے؟ خطرے سے باہر ہیں وہ یا؟“

”اب تو میں سنبھال لوں گا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”ابھی میں صرف درجہ حرارت کم کرنے کی دوا دے رہا ہوں۔ کل باقاعدہ علاج، غالباً انجکشن، شروع کر دوں گا۔ دل کی تقویت بے حد لازمی ہے، آپ اس بات کا خیال رکھیے کہ ہر نسخہ کو کوئی ایسی ویسی بات نہ لکھی جائے جس سے انہیں صدمہ پہنچے یا غصہ آئے، مرض کے اعصاب بھی نرمی معلوم ہوتے ہیں، ذرا ہی بڑی بہرہ دہیز ہوتی ہے، ہر نسخہ میں“

”آپ یہ بات نعیم کے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کو بھی سمجھا دیجئے۔“ طاہرہ نے موقع غنیمت جان کر کہا۔

”دراستہ کار زیادہ فعل انہی کے ساتھ ہے۔“ ڈاکٹر نے نعیم کے باپ کو چند ایک ہدایات دیں اور ملازم کو دوائی کے لیے ساتھ لے گیا۔ ڈاکٹر کے نکلنے کی خبر کی ماں طاہرہ پر برس پڑی، سچا ہے اس کے کہ اسے صاف بات بتا کر جواب طلبی کرتی، استادوں اشاروں میں اسے ہر بد معاش اور طواف تک کو گئی، نعیم کے باپ نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے چپ کرانے کی بہت کوشش کی، لیکن نعیم کے سر اٹھنے کی بجائے غار لے جاری تھی اور طاہرہ تو اس طرح چپ ہو گئی تھی جیسے اس میں جان ہی نہیں رہی۔ وہ بیٹا کی بڑائی تھی۔

”نعیم کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی، اس نے ایک بار مری جوتی آواز میں اس سے کہا۔“ ”چپ ہو جاؤ، دایا!“ ”چپ ہوں، مال کی زبان کا تو جیسے لکھ کر ٹوٹ گیا تھا۔“

سیلاب کو اس نے سینے اور بازوؤں کے زور سے عبور کر لیا تھا۔ تھک کر وہ اپنے جسم کو لمبوں کے حوالے کر دی تھی اور لمبوں پر پی در پی سانس تاکر کچھ لمبوں سے سینہ سپر ہو جاتی تھی اور اس نے کنارہ پالیا تھا۔ آج کی رات بھی اس نے تیر چلنے والا درک کے اپنے آپ کو لمبوں کے حوالے کر دیا۔

دوسرے دن خالص بیچ ہی ٹھہر لی حالت دھیمی نیم کا حال دیکھا نعیم کی ماں کی باتیں اور رات کی تفصیلات نہیں نعیم کے لہجوں سے لبرز خاموشی دیکھی۔ دکھاوے کے آنسو بہاتے اور ہوا کا رخ موافق دیکھ کر نعیم کی ماں اور باپ کو خوب افسانیا ڈراما ٹھونک مارنے کی دیر تھی۔ پھر نعیم کے سر ہانے جا بیٹھی اور بڑے ہی پیار بھرے لہجے میں طاہرہ کے خلاف زہر نثر کیا:

”بہنہ دو گلشن ہیں“ — نعیم کی ماں نے کہا۔ ”ڈاکٹر نے منع کیا ہے اس کے سامنے ایسی دلی باتیں نہ کرنا۔“  
تیسرے روز نعیم اچھا بھلا ہو کر چلنے پھرنے لگا۔ ہنسا رو دوسرے ہی روز انگلی تھا لیکن دل کی حرکت کی بے قاعدگی بننے کی کیفیت اور اعصابی فرسودگی پرستوری ڈاکٹر نے اسے باقاعدہ انجکشن شروع کر دیئے اور ہدایت کی کہ ممکن ہو ہالے کمرے میں نہ سو یا کرے۔

یہ دوتین روز نعیم دفتر گیا۔ ماں کے کمرے میں ہی رہا۔ طاہرہ حسب معمول سکول جاتی اور ہر شام زہر پزل کے لیے بھی جاتی اسے تہمت ہی نہ ہوتی بحساس کے کمرے میں جا کر نعیم کو ڈرا دیکھ لیتی۔ نوکرائی سے اس کا حال پوچھ کر دل کو سہارا دے

چوتھی رات نعیم طاہرہ کے کمرے میں گیا تو طاہرہ کو جیسے خواب کا دھوکا ہوا ہو۔ اس نے یک کر دروازہ بند کر دیا اور کے ساتھ لپٹ گئی۔

ڈاکٹر نے تیسارے کمرے میں سونے سے منع کیا ہے۔ — نعیم نے بے زخمی سے کہا۔ ”میں ایک کتاب لایا ہوں۔“

”دراپٹھ تو سہی۔“ — طاہرہ نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ ”مجھے بھی ڈاکٹر نے یہی کچھ کہا ہے لیکن پاس بیٹھنے تو منع نہیں کیا۔“

”جانتا ہوں، طاہرہ اسب کچھ جانتا ہوں۔“ — نعیم نے طاہرہ کے بازوؤں سے نکل کر لاری کھولتے ہوئے کہا۔  
”کے اور قریب میں کوئی کتب تک جتنے ڈاکٹر کو کیا معلوم مجھے کیا روک ہے۔“

”آخر بات کیا ہے؟“ — طاہرہ نے سٹ پٹا کر پوچھا۔ ”یوں لگتا ہے جیسے میں نے آپ کو زہر دے دیا ہے۔“



جس کے اپنے آپ ہمارے ہو گئے ہیں؟

ایک شخص، ادا کیا اور ہے۔ نعیم نے تنگی سے مسکراہٹ سے کہا اور کہ لے کر کمرے سے نکل گیا۔  
ظاہر دل پر ہنسنے لگا۔ یہی نہیں کہ دل کچھ گیا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اس کی دھڑکن کو اور تیز کرنا چاہتی تھی۔  
تیز لہریں قیامت خیز شور مچا کر آئیں۔ ظاہر وہاں کو روکنے پر آمادہ ہو گئی۔ بیٹھنے میں آگ لگ گئی تھی اور وہ اسی لگائی ہوئی سے استغاثہ اور حوصلے کو سینک رہی تھی مساوی ٹھنڈے پر چاہیں۔

نعیم کی ماں اور خالہ نے اس کے باپ کو تیار کر لیا کہ نعیم کی صحت اچھی ہو جائے تو طلاق لکھوا کر اور ظاہر کو بھی دے کر بتائی بھیج دیا جائے۔ نعیم کی صحت بظاہر اچھی ہو گئی تھی۔ ماں نے وہ ایک بار بار تھپتھپاتی نعیم نے طبیعت کو اپنے بڑے بڑے آگاہت کا اظہار کیا اور ماں خاموش ہو گئی۔

نعیم کے چہرے سے مہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے کوئی دکھ تکلیف نہیں۔ بھولا بھالا محصور سا چہرہ، شباب سے متور، آنکھوں اور ہونٹوں کے کونوں میں رومان بولے ہوئے تھے۔ وہی بھلا بھلا سہل دل ہم اور وہی گلی کی چال لکھا۔ اندرونی دنیا میں جو بگولے اٹھ رہے تھے وہ کسی فوٹو نہیں اڑ رہے تھے۔ اسے ہر وقت اور ہر لمحہ وہ منظر دکھائی دیتا تھا کہ ایک آدمی کے ساتھ ماں ہاتھ دالے رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی تھی۔ اندھیرے میں اسے اپنی بختی اور سے بھرپور انگلیوں کا جنازہ جاتا دکھائی دیتا تھا۔ انتقام کی آگ اس کے قلب و دماغ کو بھونک رہی تھی۔ اسے خیالوں کی دنیا میں بستا نظر آتا لیکن یہ واضح نہیں تھا کہ یہ خون اس کا اپنا ہے، ظاہر کو کیا اس آدمی کا جو ظاہر ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر میں روپوش ہو گیا تھا۔

پورے سات روز اس نے ظاہر سے بات نہ کی، نہ اس کی موجودگی میں اس کے کمرے میں گیا۔ ظاہر نے آپ کو الگ تنہا رکھا۔ ملازم رکھا، ناکھرے میں لے جاتی تھی اور ظاہر ملازم سے نعیم کی صحت کی تفصیلات پوچھا کر مجھے منگنے ایک دوسرے کا حال سات پردوں میں چھپ کر پوچھا کرتے تھے۔ رات کی تسکینوں میں وہ نعیم کی صحت کے دوا میں مگرتی رہتی تھی۔ حالات کا دھارا چل چلا اس کے خلاف ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اسی قدر نامکمل تھے اور اسے میں جذبہ جاری تھی جو اسے سکول میں پہنچ کر نہاتا۔

اس دوران ظاہر کی طرف بصر کے خطوط آتے رہے اور ظاہر وہ قاعدگی سے جواب دیتی رہی تھوڑے عرصے اس نے بھر پور اپنے گھر کی حالت اور اس کی ذہنیت کی تفصیلات کھنی شرم کر دی تھیں جنہیں پڑھ کر کمرہ بوسہ دیا۔ وہ اسے ہر خط میں حوصلہ اور تسلیاں لکھ کر دیتی تھی جس سے ظاہر کے ارادوں کو اور زیادہ تقویت ملتی تھی ظاہر ہر خط میں غم ارشاد کا حال پوچھ کر تھی لیکن بصر کو ان کا کچھ علم نہ تھا۔ بصر نے کسی بارش اور آئے لکھا تھا اور ظاہر کو بیڑی دیا تھا لیکن لکھ دیا تھا کہ وہ پشاور آئے نہ وہ پندی آئے گی۔ "خدا اچھی شریفوں کے قابل نہیں ہوتی"۔ کچھ ایسی ہی وجہ تھی کہ ان کے درمیان خاموشی طاری رہی۔

نوں جوں ذرا سے کے شیعہ کرنے کی رات قریب آتی جا رہی تھی ظاہر کو تو مجھے کہہ کر پیش بھولا جا رہا تھا۔

یہاں کہ وہ ہر سہل سے واپس آئی، کھانا کھا یا اور نعیم کا حال پوچھے۔ نعیم نے لہجہ سگوتی۔ وہ ڈرامے کو زندہ جاوید شاعر بنا اور اس کا ایک ایک لفظ سکول کی ہر تکی اور ہر پچھے کے ذہن پر نقش کر دینا چاہتی تھی۔ ڈرامے کی دساعت سے وہ "یہ" کا کردار ادا کر رہی تھی۔

اور جوں جوں ڈرامے کی رات قریب آتی جا رہی تھی نعیم کے دماغ میں ایک اور ڈرامے کا ہر سہل مکمل ہونا جا رہا تھا ایک ڈراما ڈراما اس کا دل بدستور کھڑا تھا۔ وہ تو بچپن سے ہی کھڑو چلا آ رہا تھا لیکن اپنی محبت کے کشت و خون نے اس کے ارادوں کو مضبوط بنا دیا تھا بعض اوقات وہ دل میں اپنے ڈرامے کا ہر سہل کرنا تھا تو کھڑو کرنا نہ تھا۔ ایسے میں وہ اپنے مائیں سے منظر کو لے آتا تھا۔ ظاہر کے کندھے پر ایک آدمی کا بازو اور سامنے ٹھیک اندھا۔ یہ منظر نعیم کے حوصلے کو زندہ رکھتا تھا۔ وہ گم گم اور کھو یا کھو یا سارے لگا۔ ماں اور باپ کے ساتھ بھی گم ہی رہتا تھا۔ ہر وقت اپنے آپ میں ابھارتا تھا۔

ظاہر کے ڈرامے میں چار روز باقی تھے اور نعیم نے اپنے ڈرامے کا ہر سہل مکمل کر لیا تھا۔ وہ ایک رات پہلے ظاہر اور اس کی لکھی کر کے دیکھ آتا تھا کہ وہ کمال جاتے ہیں۔ وہ سکول سے نکل کر ڈرامہ ڈراما لگے جاتے تھے۔ وہاں سے آج رات ایک گلی میں جا کر بائیں کوڑھڑاتے اور اس بارہ گھر آگے جا کر ایک مکان میں داخل ہو جاتے تھے۔ ریگلی کا آغری مکان تھا اس سے دایں طرف ایک گلی تھی نعیم نے اس کی لکھی بازو لکھی تھی۔ ڈراما گھر پر کمرے سے جاتی تھی۔

دوسری رات نعیم نوٹس کے قریب درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ سادوں کی خشک ہوا میں چل رہی تھی اور اس کی لکھی پلٹے سے بھگی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پھانچ لیے پلٹے کا کھلا جاو تھا اور یہاں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کاپ آٹھا تھا۔ نعیم اپنے کے لڑنے کو ساکن کرنے کے لیے جاو کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ اس کی ہستی میں جانے کوں چھپا بیٹھا تھا جو اسے روک کر نہاتا تھا۔ "تم خون تو نہ کر سکو گے کہیں اپنے آپ کا جاو نہ مار لینا۔۔۔ لوٹ جاو، نعیم! اپنی جیڑھ جاو گے یہی جاو نہیں کاٹ دے گا۔" اور نعیم ان آوازوں کو دہرا رہا تھا۔ اپنے آپ سے لڑتا تھا کبھی اسے ہل لگتا بیٹھے سر سے پائل اس کے جسم کے دو ٹکڑے ہوئے ہوں وہ ان ٹکڑوں کو جوڑ لیتا اور جاو کو مضبوطی سے پکڑ لیتا۔

ایک بار تو اس نے جاو درخت میں مار دیا بیٹھے اپنے اندر چھپے ہوئے آدمی کو جڑا ہے اس خوفناک ارادے سے بال رہتا تھا قتل کرنے کی کوشش کی جو اس نے جاو کی ٹوک درخت سے نکالی تھی ظاہر وہ اس کا ڈرامہ کا ساتھی ٹوک بائی کی زد و پی سی روشنی میں نمودار ہوئے۔ وہ ہر رات کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خراباں غراماں پلٹے آ رہے تھے بغیر ہر رات لاوت میں چھپ گیا۔

جب وہ سڑک کے اندھیرے حصے میں پہنچے تو نعیم خاصا غماں صدمہ لکھ کر ان کے پیچھے ہوا۔ اس نے غلیٹ نمودار پہنچے تاکہ آہستہ پادوی رہے۔ اسی اندھیرے میں ہی دل کی آگ کھانے کی خاطر اس نے قدم تڑکے لیے۔ جاو ہاتھ میں اچھال مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ اب بزدل اور شرمیلہ نعیم نہیں غنی اور قابل خانہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا لیکن سامنے سے آئی آ رہے تھے۔ نعیم منہ بھل گیا اور ٹھٹھکے کے انداز سے چلنے لگا۔ جوں جوں اس کی چال سست ہوئی اس کے ارادے۔

بھی مسکھاتا ہو گئے نعیم کچھ ساگیا جیسے اب تیری بھی نہیں سنے گا طاہرہ کا چہرہ اس کے سامنے آگیا۔ طاہرہ مسکرا کر بڑی ہنسی سے اس کی طرف سے سر نہ لگا۔

دونوں آدمی طاہرہ اور اس کے ساتھی کو دیکھتے چلے آ رہے تھے اور جب وہ نعیم کے قریب سے گزرے تو ایک ہی جھپکھم کر دیکھا اور کہا۔ "مگر آئیہا میرا کیا بد روز گزرے گا کہ ڈالے لیے جا رہا ہے۔"

"سارے کسی کی بڑی بیوی یا بیوی ادا بیوی ہوگی۔" دوسرا بولا۔ "اپنی ہوتی تو ان اندھیری سڑکوں پر نہ لیے پڑنا کسی مردار خانہ کی بیوی ہوگی۔"

دونوں نے مل کر موقع نہ لگایا۔  
 نعیم کے روتے کھڑے ہو گئے۔ ان جھپتوں نے اس کی ہنسی پر چمک دیا۔ چاقو پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

طاہرہ کا چہرہ غائب ہو گیا نعیم کا دل اچھل کر باہر آئے لگا۔ وہ ایسی رفتار سے چل پڑا جسے بھاگنا سمجھا۔ طاہرہ اور اس کا ساتھی گلی میں داخل ہو چکے تھے جب نعیم گلی میں داخل ہوا تو سامنے سے چار عورتیں آ رہی تھیں جو آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ نعیم نے سوچا کہ ان عورتوں کے گزر جانے کا انتظار کیا تو کھار مکان میں داخل ہو چکا ہوگا۔ ابھی ٹھیک وہ سو گز آگے جانا تھا۔ وہ وہاں سے واپس ہو گیا اور سر پر ہٹ بھاگ کر سڑک کی طرف سے دوسری گلی میں داخل ہو گیا۔

یہ گلی مسلمان تھی۔ نعیم اس آدمی کے مکان کے سامنے اس دوسری گلی میں ایک اور مکان کی اوٹ میں چھپا گیا۔ اسے طاہرہ اور اس کے ساتھی کی بات سنائی دینے لگی تھیں۔ نعیم نے چاقو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس پریشانی کیفیت میں بڑی دیکھ بھال سے کیفیت پر قتل سے پہلے قاتل پڑا رہتی ہوئی ہے۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ جہاں وہ کھڑا ہے اس کے بائیں اوپر پرانی دی ہے جس میں نظر آ رہا ہے۔ اس آدمی کا مکان بھی اس روشنی میں نظر آ رہا تھا۔

اسے سچی کا خیال آ رہا تھا اور یہ بھی کوئی شے نہیں چاقو کا ہار کر کے اور نظر کیا کہ جہاں آسان نہیں لیکن اب یہ حکیم پر نظر پڑا۔ وہ نہیں تھا۔ اسے طاہرہ اور اس کے ساتھی کے قدموں کی آہٹ بھی سنائی دینے لگی تھی۔ اس نے دیوار کی اوٹ سے ایک آنکھ ڈرا کر کے دیکھا۔ اس کا شمار مکان کے دروازے سے پہنچ چھ قدم دور رہ گیا تھا۔ اس نے گلی میں پیچھے آگے دیکھا گلی مسلمان تھی اور جہاں گئے کے لیے موزوں۔

نعیم نے دل ہی دل میں یہ ریل کیا تھا کہ وہ ان پرچہ کا گھر چاقو کا ایک دار اس آدمی کے صحن دل پر کرے گا۔ وہ دل پر چاقو اور دوسری گلی سے بھاگ جائے گا۔ ایک ایک مار کافی تھا۔ یہ چاقو اس نے درے کے ایک پٹھان سے پکڑا تھا۔ پٹھان نے اسے تباہ کیا کہ اس کی نوک زہن میں بھی مٹی ہے۔

جب طاہرہ اور اس کا ساتھی دروازے سے وہ قدم دور ہو گئے تو نعیم نے انکھیں بند کر لیں۔ گھر اس نے دوسرے ٹائپس انکھیں کھول کر نظر کر چھپنے کے لیے قدم اٹھایا جس پر آواز آئی کہ اس آدمی کے مکان کا دروازہ کھلا اور وہ عورتیں باہر نکلیں۔ نعیم نے رک جانا چاہا لیکن وہ سامنے آچکا تھا۔ سر پر چلتے ہوئے لمب کی روشنی میں وہ چھپ نہیں سکتا تھا۔ اس نے سچی مٹی پر کیا تھا کہ طاہرہ نے اسے دیکھ لیا ہے اور کبھی گئی ہے۔ نعیم نے اب بھاگنا بیکار سمجھا۔ اس میں اور اس کے

دل میں چار قدم کا فاصلہ تھا۔ نعیم یوں رک گیا جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے ہوں۔ وہ خون جو اس کی آنکھوں میں تھا جم کے اندر ہی کہیں جذب ہو گیا۔ قاتل اور خونی خاندن مگر مردوں اور شہر لایہ نعیم بن گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے اور انہی طاہرہ اور اس کے ساتھی کے چہرے پر پڑی تھی۔

"اب؟" طاہرہ نے وہیں کھڑے کھڑے نعیم سے کہا۔

"ہاں؟" اس آدمی نے طاہرہ کے ساتھ ہی رک کر پوچھا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک طاہرہ کے کندھے پر تھا۔ دوسرے ہاتھ قاتل کی آنکھوں پر گہرے رنگ کا چشمہ اور سر پر جناح کیپ ڈاڑھی اور کچھ بھلے بھلے صاف تھیں۔

میرے شوہر ہیں۔۔۔ نعیم صاحب!۔۔۔ طاہرہ نے اپنے ساتھی کو بتایا۔

نعیم وہیں کار مارا۔ ہاتھ پیچھے کئے ہوئے وہ دھبے میں ڈوبتے ہوئے جسم کے عشر پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اتفاق سے ملاقات ہو گئی۔ طاہرہ کے ساتھی نے کہا اور ہاتھ طاہرہ کے کندھے سے اٹھا کر اس میں اس ہاتھ کی دھاریاں ڈال دیں۔ اس کے گرد بھاگے نعیم اس سے ایک قدم دور کھڑا ہوا اور وہ اس سے ہاتھ لائے گا۔ بولا۔ لائے لائے۔

نعیم جواب دیتے آگے بڑھا۔ اس آدمی کا ہاتھ ابھی تک آگے بڑھا تھا۔ نعیم کے ہاتھ کا انتظار کر رہا تھا۔ آگے آئی؟۔۔۔ طاہرہ نے نعیم کو تنگفہم لہجے میں کہا۔ "وہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہیں؟" ان سے ملیں۔۔۔ طاہرہ نے کہا۔ "یہ ہمارے بھائیہاں مسیتا رہیں۔ ہمارا امت صحن۔ میں انہیں ہر روز گھر چھوٹنے

نے۔۔۔" نعیم کے داغ میں ایک پکڑا لٹے سے چل پڑا اور وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس نے قریب ہو کر دیکھا کہ جو چہرہ سکول لایا کی زور اور دم روشنی میں جان نظر آ رہا تھا۔ وہ بڑھاپے کی باریک بابک چھریوں سے بھر پور تھا۔ اس نے آگے ہوا تھا اور وہاں ہمارا مسیتا رہا۔

آجاد میرے پوتے۔۔۔ انہوں نے مسیتا رہے کہ۔۔۔ چلو، طاہرہ مٹی! انہیں اندر لاؤ۔ آج اپنی مٹی کے ہاتھ کی چاہتے

ہم کو خوش ہوا جیسے وہ چاقو اپنے دل میں گھونپ لے گا۔ ایک ہی وار کافی ہوگا۔ اس خوفناک احساس کے ساتھ ہی ہوا اور ہاتھ ٹکڑوں کی جیب میں ڈال لیا۔ طاہرہ دروازے کا لاکھول کر مسیتا رہا ہاتھ تھا۔ دروازے میں داخل ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے عہدی سے چاقو بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

اسے میں طاہرہ نے سچی جلدائی تھیں آہستہ آہستہ ہٹ گئے نعیم نے دیکھا کہ مسیتا رہا چہرہ اپنے اوپر کمر و بیش کے گہرے آنکھ لے ہوئے تھا۔ جب اس نے ٹوپی اڑائی تو دیکھا کہ سر کا ایک بھلی بھلی سیاہ نہیں تھا۔

مٹی چاہے نہ تات۔۔۔ مسیتا رہے طاہرہ سے کہا۔ نعیم وہاں میں مشرقی پنجاب میں سن ستائیس میں اندھا ہو گیا۔ اس نے سیاہ چشمہ اتار دیا۔ اس کی دونوں آنکھیں ٹپٹپتی ہوئی تھیں، جیسے جل گئی ہوں۔ اس نے کہا۔ وہاں طاہرہ نے

ڈرامہ خوب لکھا ہے:

”میاں آپ اکیلے رہتے ہیں؟ — نعم نے جیسے خواب میں پوچھا ہو۔

”اکیلے کہاں بیٹھتے؟ — سوستارے سکون آریز ہی نہیں کر سکتا۔ ابھی عمار بیٹی چلی جانے کی تو شکر گوشت ہر ماہ میں اور میاں پہل پہل ہوجاتے گی گھر کا کام کاج، کھانا پکانا، سب کچھ وہ کرتے ہیں عجیب خلوص و زندگی ہے نفیر بیٹا۔“

”آپ میاں کیسے پہنچ گئے؟ — عمارہ جانتے کیڑے لے کر کھرے میں آئی اور نیم سے پوچھا۔

”ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔“ نفیر نے فرار کھانچا کہ جواب دیا۔

نفیر اور عمارہ جب سوستارے گھر سے نکلے گئے تو سوستارے پیار بھری آواز میں کہا — ”نفیر بیٹا! عمارہ بیٹی کو ڈانڈا دے۔

کے بعد بھی میاں ضرور لا لائے۔ میری دکھائی زندگی کا سما رہی سارا دھن سے میں بارہ بچے ہیں جو کھینچے آتے ہیں عمارہ بیٹی نے نو بختی زندگی دے دی ہے۔۔۔ اچھا بچو! جاؤ خوب محبت اور پیار سے جو خدا تعالیٰ دنیا بھر کی خیریاں مبارک کرے آمین میری بیٹی! تم سارا ذکر کرتی ہے کبھی ہے میرے نفیر صاحب بڑے اچھے ہیں۔۔۔ عمارہ بیٹی تو مجھ اندھے کی لاشعلی بیٹی گئی ہے میری بیٹی! بچی تھی۔ اتنی ہی بڑی تھی۔۔۔ ہاں، وہ بھی ایسی ہی تھی۔“ اس کی آواز زندہ ہو گئی تھی۔ اس نے گھومتی سا گل کر کہا۔ ”والہ تیرا بچیاں قوم کی آزادی پر قربان ہو گئی ہیں۔۔۔ جاؤ بچو، جاؤ۔“

نفیر اور عمارہ دروازے میں کھڑے تھے نفیر کا ہاتھ عمارہ کے ہاتھ لگا کر محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دل بیٹہ راتا تھا اور راتا تھا۔ دل کی حرکت بے قاعدہ ہوتی جا رہی تھی۔ اسے خوشی کا مدیر بھی ویسا ہی ہر ناک معلوم ہو رہا تھا جیسے علم ہو چکا کہ ساتھ خفت کا عنصر بھی شامل تھا۔ اسے عمارہ بالکل ہی بدلے اور کھڑے ہوئے ٹوپ میں دکھائی دے رہی تھی اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے عمارہ گھر کے کونوں میں گر گئی تھی اور صبح سلامت نکل کر اس کے پاس پہنچ گئی ہو۔

نفیر کو کچھ نہیں آتی تھی کہ وہ مرستہ کے اس دھچکے سے روئے تے ہائے۔ اس کا دل بے ساختگی سے جیسے اپنے اور کچل رہا تھا اور اس کی آنکھیں آنسو بہانا چاہتی تھیں وہ اپنے آپ سے بے قابو ہوتا جا رہا تھا اور جذبات کے ہاتھوں آ رہا ہے جس طرح اس رات ہوتا تھا جب اس نے عمارہ کو ایک غیر مرد کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اندھیرے میں گم ہو چکا تھا۔

نفیر اور عمارہ کچھ کھانا کھا رہے تھے۔ عمارہ جلنے لگا کچھ کر رہی تھی اس نے شاید طبیعت کا حال بھی پوچھا تھا۔ اس نے بھی پوچھا تھا۔ ”آپ ابھی تک ناش ہیں؟ — وہ ہنسی مچاتی تھی۔ اس نے بہت کچھ پوچھا تھا اور ڈرامے کے متعلق بھی کہ چند ایک باتیں کہیں اور نفیر سے بے خیالی میں جواب دیتا رہتا تھا نفیر ایک جذبہ میں مصروف تھا۔ اپنے غلات برسرِ پل کا وہ ذکر کر رہے تھے درخت کی طرح تیز و تند آسمانی سے لرز رہا تھا اور پاؤں اٹھ رہے تھے۔ یہ آندھی تھی اور دن کچھ بھی نکل گیا تھا نفیر کے چنگے ہارے چلے ہوئے انصاف سکول پیر ہو رہے تھے۔ اس کے جذبات و احساسات میں افراتفری ہوا تھا۔ گمان ہو رہا تھا کہ وہ مرستہ سے مغلوب ہو کر بیچ آئے گا اس کے آنسو نہ ٹپکیں گے یا وہ بے اختیار عمارہ سے

ہائے گا۔ وہ عمارہ کو بازوؤں پر اٹھا کر گھر تک لے جانا چاہتا تھا وہ خیالوں میں عمارہ کی طرف لپکا بھی تھا لیکن اس نے اپنے ذہن ضبط کیا تھا جیسے تیر کوڑے سامنے کسی کے آجائے سے برکتیں لگتی ہاں میں۔

عمارہ کی اس جتنے سے گزر رہے تھے جو کسی حد تک سنان تھا اور جہاں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی عمارہ کو لگتی تھی پوچھا۔ ”تاگدے لیں؟“ آپ اتنی دور تک پیدل چلتے تھک جاتیں گے۔“

نفیر لگا لگا۔ ”اوہر اوروں کا جیسے کسی تنگے کو دیکھ رہا ہو۔“ دور دور تک راتا تھا تو کوئی انسان نفیر نے بے ساختگی سے کے دونوں کندھوں کو پکڑ کر اپنی طفت کھینچا اور اسے سینے کے ساتھ لگا کر اس قدر زور سے بھینچا کہ اس کے اپنے آنسو ٹپک ادا رفت کا یہ عالم کہ وہ کچھ کر نہ سکا۔ آواز ملتی ہیں دیکھ گئی تھی۔

اسے سڑک ہے کچھ تو خیال کریں۔“ عمارہ نے اس کے بازوؤں کی گرفت میں تڑپتے ہوئے کہا۔

پیدل چلیں گے۔“ نفیر نے کہا۔ ”میں تو اب اچھا بھلا ہوں۔“

اور اس نے عمارہ کے بائیں کندھے پر بائیں ہاتھ اسی طرح کھینچ لیا جس طرح اندھا سوستارے لکھا کرتا تھا۔ نفیر نے عمارہ کو نفیر کو کہا تھا۔ ”دونوں یوں چلے جا رہے تھے جیسے کسی حسن و خوش رنگ خیالی دنیا میں چلے جا رہے ہوں اور انہیں ہرگز گھر لگایا تھا۔“

نفیر میں گھر میں داخل ہوا اس کی حالت غیر ہو گئی۔ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ خوشی کی یہ خبر کہاں اور باپ کو کس طرح ساتھ یہ خیال تھی کہ کیا کوئی وہ اتنی جلدی یقین نہیں کریں گے نفیر کا کھڑوہ مقام اس کا دل تھا جو کچھ لڑنے لگے جب دونوں لے ہوئے تو نفیر کی ماں صحن میں نکل آئی۔ ”باب بھی آواز سن کر نکل آیا جب مال اور باپ نے دونوں کو اکٹھے آتے دیکھا کے چہرہ پکھلی ہوئی شکر مہبت دیکھی تو باپ تو ابھی جگہ قائم رہا ماں کے چہرے کا تغیر نہ رہا تھا کہ کھلی گری ہے اور اس بل گیا ہے۔“

عمارہ نے کئی روز کے بعد اپنے مخصوص لیے ساختہ لیجے میں اسلام علیکم کہا جس کا جواب صرف باپ نے دیا اسے ہونٹ ہاں جہاں تھی وہیں پتھر ہو گئی عمارہ اپنے کمرے میں چلی گئی اسے معلوم ہی نہ تھا کہ طوفان اٹھا تھا اور آج کی انقلاب آئین جاتی تھی کہ نفیر کی اس اچانک بیماری میں کیا راز تھا، وہ ماضی کیوں ہو گیا تھا اور آج یہ طوفان کیوں نہ مٹ گیا ہے وہ نفیر کماں چلا گیا تھا۔ اس کے قریب ہوتے ہوئے اس سے اتنی دور کیوں ہو گیا تھا اور آج وہ کیسے لوٹ

ہو کے ذہن میں یہ سوال بیدار نہ ہوئے کیونکہ اسے کچھ بھی تو معلوم نہ تھا۔ وہ اپنے کمرے میں گئی اور نیم باپ کے باہر آیا، ماں بھی پیچھے پیچھے چلی گئی نفیر نے دروازے کی طرف دیکھا کہ کہیں عمارہ بھی نہ آجائے اس نے ماں اور باپ کے پاس اس کے کس طرح عمارہ کا بھیجا کیا تھا اور جس آدمی کو وہ جانے لگا کچھ پوچھ رہے تھے۔ وہ اندھا سوستارے کا ذکر کے مہر کے باپ سے بھی بڑا ہے اور وہ عمارہ کو عمارہ بیٹی کہتا ہے نفیر نے والدین کو ساری باتیں سن کر عمارہ کی تقدیر اس کی ماں کا رنگ بدلا دیا۔



باب کی قربت گمان تک برطاشت کرتی۔ وہ تو جیسے اندھا ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک مجبور بچہ لے لیا جس کی ماں کے  
 ہاتھ لڑھکایا اور اس کے ساتھ جا لگا۔ اس کی کنبھی سے خون نکل گیا، نعیم کے ماں کو اس حال میں دیکھا تو وہ سب کچھ بخول گیا۔ بچہ  
 بڑھ گیا۔ اسے معاً جاندھر سے بھاگنے کے دو منظر یاد آئے کہ بچہ نے اپنی نقل کی ہوتی ناؤں کی لاشوں پر کرتے تھے اور  
 کھانے پینے کی چیزیں خور کر مرنے لگی تھیں۔ چشم زدن میں نعیم کو وہ منظر سامنے نمودار دکھائی دیتے اور ان کی بھری کی طرح اُس  
 کی کنبھی میں اُنہیں بھی دیکھ کر مرنے لگی تھیں۔ چشم زدن میں نعیم کو وہ منظر سامنے نمودار دکھائی دیتے اور ان کی بھری کی طرح اُس  
 کی کنبھی میں اُنہیں بھی دیکھ کر مرنے لگی تھیں۔ چشم زدن میں نعیم کو وہ منظر سامنے نمودار دکھائی دیتے اور ان کی بھری کی طرح اُس  
 کی کنبھی میں اُنہیں بھی دیکھ کر مرنے لگی تھیں۔ چشم زدن میں نعیم کو وہ منظر سامنے نمودار دکھائی دیتے اور ان کی بھری کی طرح اُس

دوسری صبیح طلوع ہوئی۔ کچھ کے سبب افراد حسب معمول جاگے نسیم کی ماں اپنا رنگ صحن میں رکھ کر اعلان کر رہی تھی۔

اتنا ناگھری اپنی گزریاں شکل ہے۔ اور اُس نے وہ سب کچھ کیا جو اس قسم کی عورت، اس قسم کی فضا اور اس قسم کے وقت

دلا سکتی ہے۔

سب سے پہلے ظاہر ہو گا کہ اس سے نفل کی جو گنتی اور نفل کی طرح قیمتی لمحے میں معافی مانگی جس کے جواب میں مال سے ہر کوئی زور سے دھکا دیا کہ وہ دیکھو دیوار کے ساتھ جا لگی اور ظاہر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مال کو بہتہ زور تھا کہ جس کو اس نے نفل مانا ہے یہ وہ لوگ ہیں جس نے سکھوں کی پلے پلے برہمچین کا مسقا بل کر کے برہمچے سے کئی سکھوں کو ختم کیا ہے۔ دیا کا نفل نفل مانا ہی ہوئی مروجوں سے وہ سینہ سپر ہوئی ہے اور اگر اس میں وہ کچھ بھیر بھیر ہو جائے تو اس کی گونج مڑ مڑ کر دے گی۔ یہاں مہررت کچھ اور سختی ظاہر تو دیکھو کہ دیوار کے ساتھ جا لگی اور اگر نفل کی اس کا اخلاق اور اُپر اُٹھ گیا۔ اس کی لٹی لٹی اور زناہ ہو گئی۔

نعمت کی نگاہ میں اب مال کے دور و پربہر گئے تھے۔ ایک مال جس کے بغیر اس کی زندگی اداس و بے حوصلہ تھی۔ وہ مال کھانے سے بلکہ سے سرور و پہنچ و مادی تھی۔ دوسرا روپ ایک اس عورت کا تھا جس سے نعمت کو نفرت تھی کیونکہ یہ عورت اس کو محبوبہ بڑی کے خلاف برسرِ بیکار تھی۔ اس عورت کو وہ قتل کر دینا چاہتا تھا اور مال کی گدوئیں سرکہ دینا چاہتا تھا۔ محبت اور نفرت سے پہلو پہل رہے تھے جس طرح بیک کی کچھ جھلکتے ہیں نعمت کے قلب دماغ میں رہے تھے۔ ان شعور اور شعور میں سببیت کا کس کس تھی۔

جب گھر کے حالات نے یہ شدت اختیار کی تو قنیم کے دل پر گہرا اثر پڑا اور وہ بڑھ کر اسی ہو گیا، نوکریاں اسے تہہ تیہ بکھن دے رہی تھیں۔ اس کے خون کا بھی معائنہ کر چکا تھا لیکن دل کی حالت بہتر ہونے کی بجائے خراب ہوئی جا رہی تھی۔

45

بھی بہت ربا تھا اور کوئی قوت اسے ماں کی طرف گھسیٹ بھی رہی تھی۔ باپ اور طاهر کا روحانی سہارا نہ ہوا تو ماں کا یا پنا کا گھونٹ لیتا۔

لاؤ پیار سے بگڑا ہوا مال کا اکوڑ بیٹا اہل بیت کے طور پر لیتے ہیں سے واقع تھا، اس کی شخصیت نہ خفایت اور احساسِ جرم کے گھومتے پتھر کے درمیان پس رہی تھی اور وہ اس مقام کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا اہل نفسیہ جہانی امراض کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔

منگھمہ نو اس روز بھوجا جب عالیشان چار دروازہ بعد ان کے گھر کو آئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا نے فیض اور طہارہ کو بھوکا ہے اور باپ نے دونوں کے سروں پر شہقت لگا کر دیا ہے۔ وہ اس طرح گھر میں داخل ہوئی اور ایسے بلے بلے مال ساتھ باتیں شروع کیں جیسے اس گھر کی کوئی حد نہ رہی ہو اور یہاں اسی کا حکم چلتا ہو۔ باپ بھر میں میٹھا سن رہا تھا۔ اور کہا کہ:   
 اوطا ہر اپنے گھر میں تھے۔ خالہ باتیں کرتی تھی تو گھر باپ بھر میں سے نکلا۔

مسئوگن؟ — باب نے صحن میں اگر کمرہ خاتمِ عالم بندھ والی کوٹوت میاں بھی شروع کر دی ہے چرائل سات گھر  
کرتی ہے اور ایک کو بخش دیتی ہے لیکن ہم دھرم لے جو بسائق کو نگل جاتی ہو:

”کیا تمہا جیسا بھی؟“ اس نے حسرت زدہ ہنر کر پوچھا۔  
 ”میں غم نہیں آتی کہ اپنی گلی بس کے گھر کو یہاں کر رہی ہو؟“ — باپ نے کرکھڑا کر میں کہا۔ ”تجارت کی یہاں  
 پھر یہاں قوم رکھی تو علی بنکا کر رکھ دوں گا؟“

”بھائیاجی! بوش کی بات کرو۔“ کلکش نے ایسے لمحے میں کہا جو حکمران بھی تھا اور العباسیہ بھی۔ گھر پر لا لیا! میں تو آپ کے بھلے کی بات کر رہی تھی؟

”ہمارا بھلا اسی میں ہے خالہ کہ یہاں نہ آنا کرو“۔ نعیم نے اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا: ”شرم کرو، بے غیرت و اغیرت کرو“۔ نعیم کی ماں اپنی بہن کی طرف سے میلاں میں آ کر آئی۔ ”اپنی اس بد مشاقت و دلوائے کے لیے مری بہن کو کچھ سے نکال رہے ہو؟“

اور مال نے وہ اودھو جمایا مگر نعیم کو باپ سے پہلے نوکر خانا، پھر سر جھکا کر اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن کمرے پر سے پہلے وہ خالہ کو گھر سے نکال چکا تھا۔ خالہ کو گھر سے اس طرح نکلی جیسے ابھی کلباڑی کے کنے آئے گی اور سب کا ردہ لے گی۔ اس کے جانے کے بعد ماں کے منہ میں جو آیا اس نے کہا۔ نہ خاندان کا ادب نہ مہر بیٹے کا لحاظ۔ سب اپنے کمرے میں دس گئے۔

خالد تو اس گھر سے نکل گئی لیکن جو فتنہ پیدا کرگئی تھی وہ نہ نکلا۔ دوسری صبح ماں نے ایک اور حرکت کی اس نے ڈاکریاں دیں اور کہا: "خبردار جو اس بادوچی خانے میں آئی تو جا بس کے لیے رکھا ہوا ہے۔" سچے کسی نے اُسی کے پاس سے گزر کر

نعیم اور اس کے باپ کو پھر جھک جھک کرنی پڑی۔ ماں نے کہا: — "یہ نوکرانی نہیں دلال ہے تیری جوگی دلالی کر

گشت و خون ہوتا تھا وہ جالندھر سے ہجرت کے وقت سے کم نہ تھا۔  
نہ نفعیم کی زندگی میں وہ لحاظ بھی آئے کہ اس نے خودکشی پر کبھی غور کیا۔

وہ سات آبی جوار آزادی کی یلپیں مٹاتی جا رہی تھی۔ پشاور شہر کی منڈیریں ہلکا رہی تھیں جو افغان کا یہ عالم جیسے جیسے ہندوستان آتی ہی نہیں تھی۔ لپٹے پٹے، آجڑے جوتے مہاجرین نے رات کے جلگہ کے ستاروں کو یقین دلایا تھا کہ کم از کم ہندو ہم آباد ہیں۔ ستارے دنگ لگ گئے تھے۔ لوگوں نے جیسے آسمان سے ستارے نونچ کر منڈیروں پر سجالیے تھے۔ سہرا رونق تھی۔ لوگ کوڑوں کھدروں سے نکل کر بازاروں میں جوم بازی کتے بوتے تھے۔ ہندوؤں کے ریڈیو اور گراموفونز نے ہر ہندو کو جی جھوڑ کر جگا دیا تھا۔ ہر دکان پر رونق تھی۔ ہر گلی میں رونق تھی۔ ہر چہرے پر رونق تھی اور پشاور کے ایک سکول میں زندگی اگنی تھی۔ درختوں میں بھی رنگ بڑی تھیں روشن تھے۔

سکول کے سامنے کا صحنہ دہلی کے چہرے سے کیا کم ہوگا۔ سکول کی اینٹیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ سینڈ مرل سرحد کا وزیر تعلیم ڈی پی مشرا اور دیگر افسران بجاگ دوڑ رہے تھے اور سکول کے ڈال میں ظاہر بیٹنے سے شرمناک ہو رہی تھی۔ تھا چہرہ بھی وہ ایک ایک چیز کو چھو کر دیکھ رہی تھی۔ ڈرامے میں حصہ لینے والے بچے اور بچیاں کچھ گھبراتی جی رہی تھیں اور تھیں۔ ڈرامے کی خصوصی کردار دو دو فوجانہ لوگ تھے۔ الگ الگ ٹیمیں تھیں۔ سازجہ بچے تھے اور اندھا موہن تیار۔ آخری بدایات دے رہا تھا۔ وقت شریعت سے گزر رہا تھا۔ رات تیزی سے پھیلتی اور سرگتی جا رہی تھی۔

ڈال بھر چھا تھا۔ صوبہ سرحد کا وزیر اعلیٰ وزیر تعلیم اور ان کے معاشیر بردار اگلی شعلوں پر بیٹھے تھے۔ نفعیم اور اس کا سکول کی طرف سے ڈرامے میں مدعو تھے۔ ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے اعلان ہوا۔ ظاہر نفعیم کی پیشکش کی ڈراما پیش کیا جاتا ہے۔ پردہ اٹھا اور فنون کے ترنم سے ڈال کی فضا پر وہ جھلکی ہو گیا۔ نفعیم نے بچوں کا تارازہ جیسے کیڑا لگنا لگے لکٹاں پر گزرتے جا رہے تھے۔ آسمانوں کے گیت آسمانوں پر ہی اچھے تھے ہیں لیکن جب نفعیم نے فنون کی فوجی گیت زمین پر تار کے سائیا کو ناکات کا قذوہ دینا دیکھا۔

پردہ گر کر پردہ پھر اٹھا اور ڈرامہ شروع ہو گیا۔ پھر پردہ گرنا ڈراما اٹھارہ اور تماشائی ہوش و حواس گم کیے بیٹھے۔ کوہنشا با تو تالی بجا دی ورنہ سینکڑوں تھے کہ ڈال میں جیسے دھڑکتے گئے تھے۔ ان کے سامنے بیٹنی کا کارڈ ایک ایک کی طرح ابھرا۔ بڑھا بڑھا گیا۔ پوسے کی شاخیں نکلی گئیں۔ کونپلن چھوٹی گئیں۔ لہو اور سناہو تاکا، لکایاں، پھول اور غنچے جھلکے۔ فوجانہ آئے آندھیاں ملیں، بجلیاں چلیں، گریں، اگر تری ہیں اور پردہ دخت بٹنا گیا۔ ہر شاخ پر آشیانہ، ہر شاخ پر پھول۔ کی ٹھنڈی چھاؤں میں پکے پھیلے تھے، جھول جھولنے لگے تھے۔ کئی غزائیں آئیں گرد دخت کے پتے ہر سے ہی رہتے تھے۔ ڈرامے کے ایک خوب نکال منظر کے دوران راوی پس منظر میں بول رہا تھا۔ جواہر لال نہرو کی آواز تھی۔ "اور آگ کے شہر گھر کو لپٹ میں لے لیا۔ دو بچے شعلوں کی پیش سے گھبرا کر جگا کے قورواڑے سے جلتے ہوئے کواڑے دو فوجانہ اور گر کر انہیں گدیں لیا اور انہیں خدا کے سپرد کر دیا۔ راوی کی آواز کے ساتھ اندھے موہن تیار کی فائلن سے پس منظر

لے جو بچائی تو نفعیم نے رومال اپنے منہ میں ڈال دیا اس کے سینے سے ایک بڑک بچہ بن کر نکلا جانتی تھی جسے نفعیم بالکل بچہ عزمیں اپنی سسکیاں اور بچکیاں نہ روک سکیں۔ تماشائیوں میں مساجد بن گئی تھیں جنہوں نے پاکستان کے نام پر ہارنے اور گھر حلاوتے تھے۔ اور ان میں بچان بھی تھے جنہوں نے ایک سو سال جنگ آزادی لڑی اور پاکستان حاصل کیا۔ بچے توپوں اور بولوں سے بڑھ گئے تھے۔

لہو باجی گھر حلاقتا، اندھے موہن تیار کا بھی گھر حلاقتا۔ اور نفعیم کو بولیں محسوس ہوا جیسے یہ نفعیم ہی آگ کے شعلوں ہمارے ڈال کا سا آواز اور گرا ہو گیا۔

ڈرامہ ختم ہونے کے بعد وزیر اعلیٰ نے ظاہر کو سونے کا تمغا اور دو سو روپے انعام دیا اور دو سو روپیہ ان بچوں اور بچوں کے لئے ڈرامے میں حصہ لیا تھا۔

نفعیم نے صحنہ نہ تھا کہ یہ لڑکی اس قدر ذہین ہے۔ نفعیم کے باپ نے باہر کر لیا۔

اجان! — نفعیم نے کہا۔ "یہ اس کی اپنی داستان ہے۔"

ظہرانہ! — باپ نے کہا۔ "ظاہر کو ساتھ لیتے چلیں۔"

نہیں! — بچے چلے ہیں۔ — نفعیم نے کہا۔ "وہ ان اینٹیں اس کو گھر بھرنے آئے گی۔"

ال! ال! — اُسے خرد جانا چاہیے۔ باپ نے کہا اور وہ دونوں گھر آگئے۔

اس دن سے ظاہر نے کسر کے دلیں ایک خاص مقام پیدا کر لیا اور سرنے اس کے لیے دل بہت سی جگہ رکھی تھیں۔ حالات اب تیزی سے بدلتے گئے تھے۔ نفعیم کی مال برت سرنے چوتھے روز رنگ مین میں رکھ کر مین کے بکری ہو جاتی اور اس گھر سے سیدھے کے لیے چلے جانے کا اعلان کرتی تھی۔ آگے دن کو کوئی نوکل جانے کا حکم دیتی تھے۔ پانچویں روز ظاہر کو کسی ہمارے گا لیاں دے لیتی تھی لیکن نہ مال گھر سے نکلی نہ کوئی نہ خاست ہوئی۔ اور نہ ظاہر نے مارا اس کے سامنے منہ نکھولا۔ اس کے شب دروز کا چین اور سکون ختم ہو گیا۔ نفعیم کے دل کی حالت ان حالات کے اثر سے بدتر ہو گئی تھی اور نفعیم کا باپ کو کڑھ کر تیزی سے تڑھا ہوئے لگا۔ باپ ظاہر نے چھپ چھپ کر دنا بھی شروع کیا۔ اس نے اپنی زبانی ساس کے خلاف شکایت بھیجی نہ کی۔

ظاہر! — نفعیم نے اسے کئی بار کہا تھا۔ "یوں زندگی گزارنی محال ہے۔ میں نے ایک مکان کا بندہ دہشت کر لیا ہے۔ ہلک ٹھلک زندگی بسر کریں گے اور انعام دہین سے رہیں گے۔"

لیکن ظاہر نے برابر جواب دیا۔ "بیات ہیں نہ یہ نہیں دیتی۔ مال آفرماں ہے۔ ان کا دوجانہ کی باتوں سے کم ہوتا۔ وہ بڑی ہو گئی ہیں۔ وہ آپ کو چاہتی ہیں۔ اگر آپ ان کی نظر سے اوجھل ہو گئے تو انہیں وہ دکھ ہو گا جو انہیں اس میں ہونا چاہیے۔"

باپ نے بھی ایک دن نفعیم اور ظاہر کو ان کے کمرے میں بیٹھے ہوئے کہا۔ "دیکھو بچو! تمہاری ماں تو سودا ہی ہو گئی ہے۔"



واپس آجائے گی۔ یہ تو اسی کے حوالے کو دل کا، روزِ زندگی اسی پہنچے کے ساتھ کئے گی۔ ارشد نے مجھے بتایا تھا کہ عفت نے مرے سے ایک دن پہلے وصیت کی تھی تو طاہرہ کے سوا میرا کچھ کسی کو نہ دینا اگر تمہیں میری محبت کا پاس ہے تو طاہرہ کے سوا کسی دوسری لڑکی کے ساتھ شادی نہ کرنا، ارشد عفت کی وصیت اور تمہاری محبت کو نہیں بھولتا۔ وہ رونا بہتا ہے۔۔۔

طاہرہ کو خط کو سینے کے ساتھ لگا لیا اور اس کی کچی بند گئی کوئی ایک گھنٹہ صرف کر کے اس نے پورا خط پڑھا تو اس کے ہاتھ اور طاہرہ نے اٹھ کر سوٹ کیں میں سے ارشد اور عفت کی تصویریں اور اسی ساجدہ کی تصویر بیکال کر خط کے ساتھ لے لی اپنے سامنے پھیلا کر وہ یاد آیا کہ گشت تہمیں کھو گئی، آنسو بہے جا رہے تھے۔ اسے ٹوکس ہی نہ ہو کہ نعیم مرے میں اس کے سر پر رکھ دے۔ نعیم نے ارشد کی تصویر پہلی بار دیکھی تھی۔ طاہرہ نے اوپر دیکھا اور نعیم کو دیکھ کر چونک اٹھی۔

بابا ہے؟ نعیم نے دیکھی ہوئی مسکراہٹ سے پوچھا۔

برے جرم کی فاشی؟ طاہرہ نے آہ لے کر کہا اور نکلیاں یزیر پینک کمرسہ تختوں پر رکھ لیا اور بولی۔ میرے جذبات اتنا جرم میری گئی تھی۔

ہم دوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور باری باری ساری تصویروں کو دیکھنے لگا۔ ساجدہ کی تصویر کو غور سے دیکھ کر بولا۔ "یہ تمہاری عفت ہے۔ مسکراہٹ بڑی جانفوسہ ہے۔"

پری تصویر نہیں۔ طاہرہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میری امی کی تصویر ہے جسے میں نے دیکھا۔۔۔ دوسری طرف پر چین؟"

ہم نے تصویر لٹا کر اس پر کچھی ہوئی تحریر دیکھی اور طاہرہ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ طاہرہ نے اسے ساری داستان لے کر ارشد کی محبت کا ذکر بلا جھجک کیا۔ جس پر قرآنی کا حال بھی بتایا جو اس نے عفت کی خاطر دی تھی۔

شو کو تم اب بھی جانتی ہو؟ نعیم نے مسکرا کر پوچھا۔

ہی جانی کو چاہتی ہی نہیں اس پر جاننا نہ کرتی ہے۔ طاہرہ نے جواب دیا۔ "اگر میری محبت ایسی ویسی ہو تو تو دوسری لڑکی کے حوالے کریں تو دیتی؟"

اہو نے جب وہ گھٹنے لگا کر داستان سنا تو اس کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا لیکن مسلسل باتیں کرتے کرتے اس کا دماغ داس نے اپنا نعیم کے کندھے پر پھینک دیا۔ نعیم کی انگلیاں اس کے دیشی بالوں میں رینگنے لگیں۔

تم اپنا ٹھکانہ کو نعیم اہم خوش کرو اور علیحدہ مکان لے لو۔ تمہاری اس عمر میں یہ بے درگیاں بہت جی قبل از وقت ہیں۔ ہم بڑے چکے ہیں۔ آپس میں نبھالیں گے۔ ہم دونوں بخارا کرو۔ میری طرف سے اجازت ہے مگر میری نصیحت بھی یہی ہے۔ طاہرہ نے سر کو بھی دی جواب دیا۔ نعیم کو بے چارہ تھی۔ باب کے آنسو نکل آتے۔

ڈیڑھ برس کا مہیب عرصہ ان سہولتیں میں گزر گیا اور ان اٹھارہ مہینوں میں نعیم کے دل کی حالت اس قدر غراب ہو گئی کہ ڈاکٹر نے اسے آب دہرا اور کچھ تبدیلی کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر کو یہ معلوم نہ تھا کہ نعیم کی ماں نے گھر کی حالت بنا رکھی ہے۔ نعیم کے دل کو تیزی سے کھاتے جا رہی ہے۔ وہ بھی کچھ سمجھ نہ سکا کہ مرض کی جذباتیت جسے باپ کی طبیعت میں امتثال تھا اور طبیعت میں گھٹن اور کڑھن بھی ہے۔ مرض کا طرز اظہار صحت مند نسلیں سے تبدیلی آگے دہرا کا سترہ روز قبل نہ کیا۔ آج طاہرہ کے آنسو جھٹے ہی نہیں تھے۔ اس کے سامنے گھر کا طویل خط پھیلا ہوا تھا خط کے پہلے دو تین فقرے پڑھتے ہی طاہرہ کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں نے پردہ ڈال دیا تھا۔ لکھا تھا:

بیاری طاہرہ سلامت رہو!

پورے ایک سال پہلے کا وہ بلا ہو گئی تھی۔ اتفاق سے ارشد کے ساتھ ملاقات ہو گئی۔ دل نہیں چاہتا کہ تمہیں خبر سنلے۔ رہا بھی نہیں جاتا۔ یوں تو یہ خبر ڈیڑھ سال پہلے ہی ہو گئی ہے لیکن ہم دونوں کے لیے نئی ہے عفت کا پتہ پڑا۔ برس کا ہو گیا ہے اور عفت کو فوت ہوئے ڈیڑھ برس گزر گیا ہے۔ عفت بچے کی بدلتی شے کو فوراً بعد بچے کو دیکھ لیں گے تھی۔ ارشد نے بچے کا نام طاہرہ پوز رکھا ہے۔ برا جی پایا پتہ ہے۔۔۔

اس سے آگے الفاظ اس طرح طاہرہ کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے جس طرح جلال آباد کی گلیوں میں لاشیں ترچتی تھیں۔

.... ارشد ہندی تلاش میں تڑپ رہا ہے اور ابھی تک امید لگاتے بیٹھا ہے

کہ تم واپس آ جاؤ گی۔ میں نے اسے مصلحتاً نہیں بتایا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے

میں نے سوچا کہ وہ جس امید پر زندہ ہے وہ امید زہری چاہیے۔ ارشد بیچارہ

بچے کو دن رات سینے سے لگا کر رہتا ہے۔ رات اسے اپنے پاس لٹاتا

ہے اور اسے طاہری، طاہری کہہ کر لٹاتا ہے۔۔۔

طاہرہ آنسو کو پچھتی تو اسے وہ فقرے نظر آ جاتے تھے۔ اب وہ کیا لے لے کر روئے لگی تھی۔ اس نے خط کو اڑے بغیر مڑ پر رکھ دیا اور چہرہ ہاتھوں میں پھپھار کے بے تحاشا روئی۔ اس قدر آنسو بہ جانے کے باوجود آنسوؤں میں کچی کچی زخم نے پھر خط کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اسے سترہ سترہ اور ڈرتے ڈرتے جسے وہ خط نہیں سوا ہٹا سانپ تھا۔

.... ارشد کو سب نے شادی کے لیے مجبور کیا ہے۔ میں نے بھی بہت مجبور کیا۔

قابل کرنے کی بہت خوشحالی لیکن وہ ایک ہی جواب دیتا ہے۔ طاہرہ

”جہاں تہذیبی طاعون پھیلی ہوئی ہے“

”ظالمی کدلی رہتی ہے؟“

”جہاں پاکستان ہے“

”جہاں پاکستان ہے اول ظالمی ہے، جہاں ظالمی ہے اول پاکستان ہے“

”ابو جان! — ایک دن طاہر پرویز نے ارشد سے پوچھا — ”پاکستان ظالمی کی کا ہے؟“

”ہاں جیہا! — ارشد نے سچے سچے اپنے ساتھ لٹاتے ہوئے جوش سے کہا — ”آج کچھ ظاہری بیٹے! پاکستان تیری لہرائی کا ہے۔ یہ پاکستان اسی نے بنایا تھا، میرے بیٹے! یہ پاکستان ہے اسی کا جیری طاعون نے اس کے لیے خون بہایا

ہے اپنا بھی اور پاکستان کے دشمن کا بھی ہے۔“ اس کی آواز قہقہے میں دب گئی۔ اس نے اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز سے کہا — ”اور آج پاکستان نے طاعون کو گل لیا ہے۔“

ارشد کا روبرو چہرے کے گرد لپٹا ہوا مٹا دھیلار لپکا۔ اس کے جوش پر اس پر گئی۔ وہ دیوانہ چپ ہو گیا جیسے کمرے کی خنیاں اس نے ہمارے سر پر لٹائی ہوئی ہو یا اسے کوئی چیز نظر آئی ہو۔ وہ جذبات کی لہروں میں نہ بھلا۔ اس کی آنکھوں میں بیٹھے انجھڑیاں لینے لگے۔

وہ اس کو گولا دو چاروں بعد بچنے سے مخمط ہو کر لولا — ”تیری طاعون نے پاکستان کو بلیا تھا اور میرا دل اجالو گئی ہے۔“

بائیں طاعون پھیلی ہوئی تیرے ابوجاں کو چند غراب دے کر ایک حقیقت بن کر غائب ہو گئی ہے میرے ننھے ننھے بچے!.....

ارشد نے کمرے کے سر کو آہستہ آہستہ سہارا دیا اور بیٹے پر غصہ کی طاری ہو رہی تھی۔ تیری مصیبت کی قسم! طاعون تجھے سے زیادہ مصیبت ہے تیری ان تمام دوسری آنکھوں میں مجھے طاعون کی مسکراہٹیں نظر آتی ہیں۔ تیرے ان کانوں کے گداز میں مجھے طاعون کا سراسر عکس ہوتا ہے۔ تیرے موتیوں جیسے دانتوں میں مجھے طاعون کی ترسہ سی ہنسی سنائی دیتی ہے۔

بچہ خوابوں کی دنیا میں بچ چکا تھا اور ارشد نے خود دل کی دنیا میں جھٹک رہا تھا۔

ارشد میرے چوتھے روز طاعون پر دیکر عفت کی قبر پر لے جاتا تھا خود تختے پر دھتا اور بچے کے ہاتھ بھی دما کے لیے اٹھاتا تھا۔

بچہ نہ سمجھتے ہوئے دھما دھما کے لیے اٹھتا تھا، اگر تم سوالیہ نگاہوں سے ارشد کو دیکھتا رہتا تھا۔ وہ ارشد سے بہت ساری باتیں چنا چنا جاتا تھا لیکن اسے پتہ نہ چلتا تھا کہ کیسے پوچھے اور کس الفاظ میں پوچھے..... وہ پوچھتا جاتا تھا — ”ابو جان! آپ کیسے کہتے

عفت! طاعون ابھی تک نہیں آئی..... عفت! تیرا بچہ میرے جتنے بچے سینے کی ٹنگنک ہے..... عفت! ہندو تیری لہو کو ٹھنڈا کرے

مجھے پر بچہ جو گئے تھی جو میرے دشمن کا دم پر ہے..... نہ تاؤ نہ عفت! طاعون کہاں ہے؟..... ننھے تیرے آخری الفاظ میں شہت میں تیرا بچہ طاعون کے سوسکی کوئیں دوں گا..... رات تو نے اپنے بچے کو جوتا تھا عفت! ہم نے کس کی لطیف سی خنکی

موس کی خنکی میں نے اپنے بچے کے گالوں پر دیکھی تھی۔ ایک تو میرا آٹھوا اور ایک تیرے بوسے کا ٹھنڈا نشان..... اب اگر عفت! یہ

ان نرم گداز دھتوں کی انگلیوں کا اس ایلیٹ اور خفا کہ ارشد پر خمار کی کیفیت طاری تھی اور وہ اس کیسے بند ہے کہ

کون سی دنیا میں مایہ پختا تھا۔ اس نے ڈراما کی آنکھ کوئی طاہر پرویز اس کے سینے پر سیت کے بل لیا دونوں ہاتھوں سے اس

بالوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ارشد نے بے خودی کے عالم میں دونوں بازو نیچے کے گرد لپیٹ دیتے اور اس قدر زور

کے ساتھ لپٹا لپٹا تھا۔ پھر اس کے بچہ خوں جیسے ہونٹوں پر بوسہ دیتا پوچھتے تو نہ پا کر کہہ دیتا۔ بچے کو اتنا قہقہہ لگتا کہ ارشد کو لپٹا

جیسے اس نے جتنے کھیلے ماضی کو دل کے ساتھ چپکا لیا ہوا درگزر سے دونوں کا ایک ایک ٹھوس کے دل کے ساتھ

بچہ دوس کا ہو گیا تھا عفت کو فرسے دوسال ہو گئے تھے۔ طاعون کو غائب ہوئے دوسال چند مہینے ہوئے۔

اور ارشد اور عفت کی آخری ملاقات کا کچھ مہینے گزر گئے تھے لیکن ارشد کی نگاہ میں عفت، طاہر اور بچہ لپٹا رہی تھی۔ وہ جھٹک کر گئی تھی اور بچے پہ لٹا آئیں کی لیکن بچے پہ کوئی بھی نہ لٹتی تھی۔ دن طاعون ہوتے رہے نہ بچہ لپٹا

سوئے رہے۔ ان میں سے کوئی بھی بچے پہ نہ لٹتی لیکن ارشد نے امید کو تاریکی میں نہ ڈوئے دیا۔

جب ارشد اس کے اما جان اور اس کا بھائی یوسف، اکٹھے دفتر سے واپس آتے تو طاہر پرویز پر آمد سے

الٹا نہیں دیکھتے تھے اس کی طرف جھانکنا تھا۔ ”ابا جان! ابا جان! ابا جان! ابا جان! — ارشد میں کھڑا ہوا بچہ لپٹا کر پاؤں پر بیٹھ جاتا

اس کی طرف جھانکنا تھا جیسے اسے رکنے کا خیال ہی نہیں ہوتا تھا۔ اسی رفتار سے ارشد کی چھاتی سے چائے لپٹا اور ارشد

میں دھنک کر اس کے نرم دھنک اور سرخ و سپید گالوں پر بوسوں کی پوچھا کر دیتا تھا۔ سارے دن کی تھکان اسی میں دور ہو جاتی

دنیا ہی بھول جاتی تھی۔ وہ اسی میں عفت کی دلیالت اور طاعون کو بھی۔

طاہر پرویز اب باتیں بھی کرنے لگا تھا۔ ارشد کے بعض سوالوں کا جواب بھی دے لیا کرتا تھا۔ اسے ارشد

سوال زبانی یاد ہو گئے تھے۔

”طاہر! طاعون کی کس پاس جاؤ گے؟“

”کہاں ہے طاعون؟“

”پاکستان میں؟“

”پاکستان کدلی ہے؟“

سہارا میں۔ اپنی باتوں میں بے قراری ہے اور اسی بے قراری میں قرار ہے۔ بچہ پوچھ سکا نہ ارشد اسے بتا سکا۔

ایک دن ارشد نے عفت کی قبر پر طابریوڑ سے کہا۔ ”طابریوڑ! یوں ماتحت اٹھاؤ جیسے روز اٹھاتے ہو۔۔۔ یوں۔۔۔ شباشب بیٹے! — ارشد اس کے پاس پاؤں پر بیٹھ گیا اور بولا ”اب دعا کرو! کہو! اللہ یا اللہ! میری بیانی جو سوری ہے اس نے شغل کے بدل کی جلاوینا کو بیٹا یا اللہ! میری اس سوئی تھی اپنی جنت کا سایہ رکھنا۔“

طابریوڑ ہاتھ اٹھتے قبر کو گھور رہا تھا اور اس کے دماغ میں سوالوں کا انبار لگتا جا رہا تھا۔ ”کہو۔۔۔ بیٹا! — ارشد نے اس نے لہجوں پر ماتحت کہتے ہوئے کہا۔“ یا اللہ! میری اس سوئی ہوئی امی کی روح کو تسکین دینے کی خاطر شکریہ طابریوڑ! تم کو طابریوڑ! بچے کے ہتھکے سے دماغ میں سوال اس طرح بھر گئے تھے جس طرح بند کمرے میں احوال بھر جاتا ہے اور انکھوں کو لگا ہے

بچہ لگتا تھا اور رونہ بھی ہوتی آواز میں کہنے لگا۔ ”ابو جان! اچھل چلائی کے پاس۔“

ارشد بچے کو اٹھانے خزانہ خزانہ سے گزرتا تھا۔ ماحول کی یاں سلو خاموشی نے اس کی چہچہائی شخصیت کو فٹن لگ کر فٹن میں جلا کر رکھا تھا۔ عفت کی قبر اس کے قریب تھی لیکن عفت بہت دور تھی، طابریوڑ کا انتظار تھا لیکن معلوم نہ تھا وہ کہاں ہے۔ بچہ اس کے سینے کے ساتھ لگا رہتا تھا تو عفت اور طابریوڑ اسے اپنے قریب کھڑی نظر آتی تھیں لیکن وہ ان کے سینوں کو چھو نہ سکتا تھا۔ اس فترت میں جو دوری تھی وہ اس کی عمر کی کجی سے بھی زیادہ بڑی تھی اور اس دوری میں جو غمناک تھیں انہوں نے ارشد کو وہ احساسی برس پہلے والا ارشد رہنے ہی نہ دیا تھا۔

”ابو جان! طابریوڑ جانے گی۔ آپ مجھے شادی کے لیے مجبور نہ کریں۔“

”اتی جان! اس برزور کی نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ طابریوڑ! آپ سنا جائے گی۔“

”بھابی! خدا کے لیے مجھے سکون سے جینے دو۔ طابریوڑ! آپ سنا جائے گی۔“

”افسوس ہے، بھابی جان! آپ اتنی سی بات نہیں سمجھیں۔ اس شرط پر جو جانے کی کہاں اسے ناجائز ہے اور اسی گھر میں آنا ہے۔“

”آتش بھون میں ارشد کے یہ الفاظ گونجتے اور بھٹکتے ہی رہتے تھے۔“

قبرستان کے دھکے سے سکوت میں سے گزرتے ہوئے ارشد نے گھوم کر دیکھا اور پریشان کہا۔ ”خدا حافظ، عفت! اٹھاؤ! طابریوڑ! آتے۔“ اس ناخوشی کی کیفیت میں ارشد وہ ارشد رہتا ہی نہ تھا جو جلال آباد کی گلیوں میں جوس کے لیے مردوں اور عورتوں کو جمع کرنے کے لیے ہاتھ کاٹتا اور بھاگتا دوڑتا رہتا تھا۔ وہ ارشد ہے! اپنے پسینے کی ٹور و موافی تروتازگی وہی تھی، جذبات میں الجھن نہ وہ جانے کون سے ارشد کا روپ دھار لیتا تھا وہ خیالوں کی پڑیچ راہوں سے گذر رہا تھا قبرستان پیچھے رہ گیا تھا طابریوڑ کی آواز نے اسے چھوٹا کیا۔

”ابو جان! یہ بھی اتنی ہے؟“

”کون سی بیٹا؟“

”وہ جو سوئی ہوئی ہے؟“

”ہاں بیٹا! وہ تیری امی ہے۔“

”طابریوڑ! یہی اتنی ہے؟“

”ہاں بیٹا!“

”ڈوٹلی اتنی بھی اتنی ہے؟“

”کون سی دوسری؟“

”جو گھل میں ہے؟“

”ہاں، بیٹا! وہ بھی تیری امی ہے۔“

”آغاہ! اسلی اتنی چھالی اتنییاں بگوتیں۔“

اور ارشد نے بچے کے حال کو اپنے حال کے ساتھ لگا لیا۔

”ابو جان! امی اتنی اٹھنے کی نہیں؟“

”نہیں بیٹا! وہ اب نہیں اٹھنے کی۔۔۔ عفت اب نہیں اٹھنے کی۔“

”کیوں ابو جان؟“

”وہ میرا ہے بیٹا! — ارشد نے جواب دیا اور بچے کا دماغ ایک اور سوال کے لیے الفاظ تلاش کرنے میں مصروف ہو ارشد نے بچے کے حال کو اپنے حال سے ہٹاتے لگا دیا۔ ”بیٹا! میری امی اب نہیں اٹھنے کی۔ مٹی کے ڈھیر کے نیچے نے اس کے سارے دھکے دبا دیے ہیں۔ وہ دنوں کا ڈھیر ہے بیٹا! وہ ان غموں کو ساتھ لیے خدا کی پناہ میں پہنچ گئی ہے۔ ہم نے لے لیں اور مل چم کو خدا کے سپرد کر دیا ہے۔ ہم بے رحم ہیں، بیٹا! — اور ارشد کے انوکھل آئے بچہ وہ کچھ نہ سکا۔“

راوی کا دیا چھ چھو کر اتر اتر کر چڑھا۔ کنارے بستہ رہے اور ریت جمع کر کے کنارے کھڑے ہوئے۔ سویرے آئے، سویرے چلے گئے۔ راتیں آتی ہیں، راتیں جاتی ہیں، سرسوں کے پھول کھلتے رہے اور جھرتے رہے۔ ہلنے کے لیے آتش بھون کے لان میں موتی اگا، کھلا، نہ بھیا، ایک کھل اٹھا، کوٹھنی کی منڈ پر بٹھکے ہوئے درخت کے پتے جھڑ لی کے برآمدے میں یوں سبک بسک کی آواز سے ایک ایک کر کے گرتے رہتے جیسے کوئی کھدائی یا ذہن میں چروچھیا جی ہو۔ پتے گرنے پھر گرنے ہوئے۔ آسم کے پڑ میں ٹور پڑا کچھ، کچھ پکا اور آسم کا پڑ بھر دیوان ہو گیا۔ سویرے آئے اور راتیں، راتیں آئیں اور سویرے چلے گئے۔

”ہوتے چڑھتے سوئے تین برس گزار دیے۔ طابریوڑ کی آج پانچویں سالگاہ تھی اور عفت کی وفات کی پانچویں برسی۔“

”میرے بچے! میری قسمت میں تو سالگاہ کی خوشی بھی نہیں گئی۔“ ارشد نے آج پانچویں مرتبہ برزور کو کہا۔ ہر سال لکنا تھا تیری پیدائش کی خوشی مناناں یا تیری امی کا تم کوں۔“ ارشد نے اپنے آپ سے کہا۔ ”گزر جانے دے









اور ظاہر ہو کر رہی تھی۔ کما۔ جادو ظاہر اس کی طبیعت پر نہیں۔ ظاہر نے یہ بے فکری محسوس کی تھی لیکن اسے جہاد  
ہو سکا۔ وہ فکری پرندے کی طرح گھروٹ آتی تھی۔

دوسرے میں دل میں اس کی نظر پر ظاہر کے پاس آئی اور اسے بتا دیا تھا کہ اس کی ساس اسے ظاہر کے سامنے سے  
بہا نچا رہی تھی۔ دل میں ہی روشنی کی لڑکی تھی۔ وہ ظاہر کی سہیلی بن گئی تھی۔ پھر کسی کی زبانی ظاہر کو معلوم ہوا تھا کہ مجھے جس میں اس کے غائب  
بات پھیل چکی ہے وہ ظاہر کو ایک بڑی عصبانیت کو نہ دیکھو۔ ایک سرور کے ساتھ بڑی تھی۔ ظاہر نے مسکرا کر اس جڑ کو بھی اپنے  
میں جذب کر لیا۔

نعم کی مال کو تو خوب جانتا تھا کہ اسے فتنے کا منبع کہاں ہے لیکن ایک رات انجان ہی بن کر وہ نعم سے کہنے لگی۔ "بیٹا! مجھے میں  
نعم کی خدمت سے..."

اری جانو جو میرا ہے۔ ساس نے اپنا مخصوص حربہ استعمال کیا۔ اس کا خون ہمارے تو پیسے ہی کھول رہا تھا جب غصہ  
آؤ تو ان اہل اعتماد و حرارت اور تیز ہو گئی جس کا فرسدا دماغ پر ہوا۔ وہ اسی تباہی بکھنے لگی۔ آئی ہے خدمت کرنے والی۔ تو نے ہی تو  
جادو کیسے میں پھر تیری کالی زبان نے ہی مجھے گرایا ہے۔ میرے پیٹے پر بھی تو نے ہی جادو کر کے میں نے سچے اپنی انکھوں پر ان  
صاحب کے مزار پر جانے دیکھا ہے؟

"کون سے دروازے صاحب اتی جان؟" ظاہر نے چوٹ کو اپنے آپ میں جذب کرتے ہوئے شکستہ لہجہ میں پوچھا۔  
"انجان فہمی ہے اب چرل اور دیوان صاحب جیسے سارا جالندھر جاتا ہے۔  
"لیکن یہ تو پشاور ہے اسی جان؟  
"جل جھوٹی، مسکارا، ایہ جالندھر تو ہے؟

ظاہر سمجھی کہ بڑھیا کا دماغ بیل گیا ہے۔ بخود ہی دیر بعد بڑھیا نے ہوش ہو گئی۔ اُدھر نعم چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ ادھر اس کی ہاں کا  
یہ حال ظاہر دین رات دونوں کی تیار داری میں مشغول رہنے لگی۔ آدھی آدھی رات کو بھی اس نے ساس کے سر پر ہینڈ کر اس کی  
دایاں تباہی اور گالیاں نہیں۔

ایک دن نعم کے باپ نے ظاہر سے کہا۔ "بیٹی تم اس کے قریب نہ جا جا کر دو چنگی عورت ہے اب اباب تو سنا نے اس کا  
دماغ بالکل ہی بیکا کر دیا ہے تم اس سے دور رہو۔ اگر وہ سنا ہے اسی ہے اس کا بھراؤ لگا ہوا ہے۔  
ظاہر مسلسل چار روز ساس کے کمرے میں بیٹھ گئی جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ بڑھیا کا بھراؤ لگا ہو گیا۔  
آٹھوں روز وہ نفقت سے اُدھو موٹی ہو چکی تھی۔ ظاہر نے دیکھا کہ وہ کمرے سے نکلنے کے لیے دروازے کا سہارا لیے  
کھڑی تھی اس کے چہرے سے یوں لگتا تھا جیسے قبر سے مردہ نکلا ہو۔ ہڈیاں باہر نکل آتی تھیں۔ بال بکھکے ہوتے تھے اور انھیں  
منہ ہو چکی تھیں۔ وہ کواڑو پڑے کھڑی کانپ رہی تھی اور قدم اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ قدم اٹھانے کا حق میں دھوپ میں  
بارانی بھی تھی۔ ساس شاید اس چارپائی تک آنا چاہتی تھی۔

ظاہر اپنے کمرے میں بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ اس نے بے اختیار ہانکا کر اُنڈا کر اسے سہارا دے اور چارپائی تک لے آئے لیکن  
اسے ساس کے دھول کا خیال آ گیا۔ وہ خاموش بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ ساس کا اس کمرہ میں قدم اٹھانے کی کوشش میں جس قدر وقت ہو

مستہ ہو گئی ہے کہ... اور اس نے ایک کہانی سنانے کے لیے نعم کو سنا دلی۔ نعم کے باپ کو جاننا تھا۔  
باب تو اب اس کی کسی بات پر یقین کرنا ہی نہ تھا لیکن نعم کے طویل دل پر کڑی ضرب لگی اور دل تیزی سے ٹپل ہونے لگا۔  
اس بات کو ماننے کو دل دو بتا تھا نہ مانے کو تو یہاں سے وہ اپنا تھا کہ ظاہر اب محقق میں بھی بدنام ہو گئی ہے۔ جو وہ پیش کا ذرہ ذرہ  
مشکل بہ مشدد اور دشمن دکھائی دینے لگا۔  
نعم نے زیادہ کاغذ شروع کر دیا۔ دل کا غصہ تیز ہونے لگا اور ایک سال پیشتر سے وہ چارپائی پر پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے انہیں  
ستھنی سے دیکھا تھا کہ بعض کے سامنے کسی کوئی بھی بات نہ کی جائے جس سے اس کا دل کھٹے یا طبیعت میں ڈر سائی نہ جی جان بیاہ  
"ہوئی سے ڈر رہے"۔ کی بات تو اسے تین سال گزرے ہی تھی۔ وہ جتنی ظاہر سے بچنے کو کمر نہیں دیتا تھا۔ بڑا بڑا  
نعم جہانی رنگ آجستہ کر لیا تھا۔ ظاہر بہت کوشش کرتی تھی کہ کواڑو کی بدایت کے مطابق نعم کو نگاہ بارتوں سے دور رکھے لیکن اس  
مال جس قدر قریب تھی۔ اس کے دور رکھتا؟

نعم کے مرض کا یہ حال کہ بعض اوقات اچھا بھلا ہو جاتا اور دوسری جہاں جاتا تھا اور جب بیماری کا دورہ پڑا تو کسی کی جان بچا دیتا  
اُنڈا نہ سکا تھا اگر اُنڈا تھا تو دل کی دھڑکن اس طرح بیٹھ جاتی جیسے دوسرے ہی لمحے حرکت بند ہو جائے گی جب وہ اچھا بھلا ہوتا  
کا دوا و معمول سے زیادہ تیز ہو جاتا تھا۔  
ظاہر اپنے طور پر نوکڑا لڑکی کی مرابت پتل کر رہی تھی اور نعم سے بھی اس طرح کا پرہیز کر رہی تھی لیکن جو نعم کے اندر سے اُنڈا  
چپے چپے اس کے دل کو کھاتا تھا اس کاظم ظاہر کو نہیں تھا۔ اس کے مرض کا ایک ہی علاج تھا کہ اس کے گھٹکی اُنڈا اور اُنڈا اس  
کا بھرتا جسے جس طرح عروسی کی شب کو تھا۔ باپ بھی خوش، ماں بھی خوش، دو دو مسرور اور ظاہر کی خوشی کا تو شکر نہ ہی نہ تھا لیکن وہ  
ظاہر کی دعا میں کہ اسے سوجھو رضائی میں نہ چھپا کر رہا کرتا تھا وقت اور زمانے کو چھپے نہ کچھنے سے نعم کا مرض اسے ساتھ  
دوب رہا تھا اور اس کی مال کی ماسا سے ٹوٹتی جا رہی تھی۔

اور ایک اور ناخوشگوار واقعہ ہو گیا۔  
نعم کی مال کو بٹا تھا۔ بڑھیا کے بھراؤ سے وہ بیل بہن رہی تھی۔ علاج شروع ہو چکا تھا لیکن بھراؤ کم ہوتا ہی نہ تھا۔ ظاہر نے بھراؤ

رہی تھی اس سے کہیں زیادہ اذیت طاہر کی روح کو بردہ تھی لیکن مجبور تھی جیسے اس کے ہاتھ پاگل نہ تجربوں میں مجھڑے ہوئے ہوں۔  
اسے خیال کیا کہ اگر شاہ بخارا بخاریاں آئیں، اکمل الہا نہ ہو کہ غصے میں اس کا درجہ ارتداد چھ جانے، طاہر کو بھی ہی اس کا کیا  
پھر سراسر کو کچا جا بھی تک کاؤلا سمارا لیے کھڑی آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے بڑھیا کچھ سواروں سے لڑا وہ  
حزام سے دوڑنے سے منفرش پر گڑی، کوڑائی کھینچ رہی تھی، نعیم عمر سے میں لیا ہوا تھا، باب باہر گیا ہوا تھا۔

طاہر نے بندہ میں قدم کا فاصلہ دیکھ کر ایک ہی جست میں طے کر لیا، سواروں سے کچھ بھول کر چل کر طرح جھینسی اور اس کا اٹھا  
سارے بے ہوش ہو چکی تھی، نعیم نے اس کے گرے کی آواز سن لی تھی اور طاہر کو بھاگتے خود کھا تو وہ اٹھ کر اپنے دروازے میں گیا  
نہا اس کے جسم میں بھی اب اتنی سکت نہیں رہی کہ کسی کو مار کر سمارا دے۔

دو گھنٹہ، دو گھنٹہ اس کی ماں کو بازوؤں پر سنبھالے ہوئے حسن کی سچی چارپائی کی طرف لاری تھی چارپائی تک بھی نہیں جاؤ  
وہ صلابت کی تھاکر بھیاں لے کر انھیں کھول دیں، اس کا سانس بھولا ہوا تھا، جی اس کے ہوش ٹھکانے آئے اس نے گول گھائی جبر  
دیکھا کہ طاہر اسے سمارا دے کر لاری سے توڑھیا کے جسم کی بھی حفاظت نہ بن سکی تھی اور وہ لڑائی کا فانی آواز میں طاہر پر برس پڑی  
”ہت جا بھڑو دے مجھے جبر وار جو میرے جسم کا ہاتھ لگا تو... بڑھیا کی آواز تھکتا گئی تھی لیکن وہ بولے جا رہی تھی، کھائی  
والی چڑیل ہت دے دو... اس نے طاہر کی کوشش سے آگاہ ہونے کے لیے گڑاؤ کا شروع کر دیا لیکن طاہر اسے بازوؤں میں پکڑ  
چارپائی کی طرف لاری تھی، بڑھیا بولے جا رہی تھی... میری جان لینا جاتی ہو، شاہ! خیر واراب مجھے دھکا دے تو...“

نعیم دروازے میں کھڑا بیٹھ کر نظر دیکھ رہا تھا اور اس کا دل جوں جوں اسرا سنبھلا ہوا تھا تو بے لگا اور دل پر دو کی بھی اچھی بیڑ  
اس مرض کی خطرہ لگے تین ضرورت تھی۔  
طاہر اور اس نے نعیم کو زخم دیکھا، بڑھیا پر ستور زب رہی تھی اور طاہر اسے اٹھا کر چارپائی تک لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ اس سے چارپائی تک لے ہی آئی اور بھاگا۔

طاہر وہ جذبات اور اپنے اطلاق کے انھوں کی قدر کو بھولی ہوئی چارپائی پر بیٹھی ہوئی سانس کے سامنے زمین پر دو زانو بیٹھ  
اور وہ اس کے گھٹنوں پر کھڑکڑاؤ اٹھی، تھکا کے لیے گھٹنے پورے دھتکارا، میں آپ کی بیٹی ہوں میری ماں مر گئی ہے، اب  
ہی میری ماں ہیں، مجھے یوں بدعا میں نہ دیں، مجھے خست کامرغ دیں، خدا آپ کو بی زندگی دے دے خدا آپ کے بیٹے کو بھی دے  
مجھے اپنے قدموں میں بکھریں۔  
طاہر کی دلچسپی کا یہ عالم کہ اس نے سر ساس کی گود میں پیچنیک دیا جسے ساس نے اس طرح ایک طرف دھکیل دیا جس طرف  
لڑھکا دیا جاتا ہے۔

”میں خوب جانتی ہوں تیری مکاری کو، ساس نے کہا اور چارپائی پر لیٹ گئی، طاہر بھاگ کر سر ٹرٹا اٹھا لائی اور بڑھیا  
بڑھانے اور زہمت کو نوازنا دکرے ہوئے اس کا سراسر اور سمارا نہ نیچے دیا، پھر اس پر کھل ڈال دیا۔  
نعیم کے لیے یہ جھٹکا ضرب لاری سے کم نہ تھا، اس کے آنسوؤں آگے غصہ بھی آیا اور اس کے احساسات اس کے دل  
ازماؤں نے جوئے جب طاہر کو عمر سے گئی تو دیکھا کہ نعیم کچھ پریم بے ہوشی کی حالت میں اس طرح چلا ہے کہ انھیں نیچے لگا

لاں کی انھیں نرم و اطمینان میں اس کو چمک رہے تھے، طاہر نے گھبرا کر نعیم کو بلایا تو نعیم نے داسی حرکت کی لیکن بول نہ سکا۔  
اپنے اس کی ناگہمیں چٹک پڑیں، بیٹائی پر ہاتھ کھینچا تو ہاتھ کا شک ہوتا تھا، نبض دیکھی تو بائیں بے قاعدہ تھی، نعیم کو دھکا آدھاریں  
بہار گزشتہ کی کچھ بولایا، بڑھیا کا اشارہ کیا لیکن طاہر کچھ نہ کر سکی۔  
نعیم کی حالت کی تبدیلی وہ کی دنوں سے دیکھ رہی تھی، گزشتہ تین مہینوں سے اس کے چہرے پر زری بھائی ہوئی تھی اور  
ٹھن بھی بے فور موتی جا رہی تھیں، ڈاکٹر نے کئی بار کہا تھا اگر کسی وقت داسا بھی شک کرے کہ مرض پر غشی طاری ہے یا  
نہ ہونے والے ہیے تو فوراً اطلاع کی جائے۔

طاہر وہ دینی بائیں کر گئی۔  
ڈاکٹر آیا، چند مہینے بعد، اکثر طاہر کو ساتھ لے کر چلا گیا جب طاہر واپس آئی تو اس کا سر بول بھٹکا ہوا تھا جیسے مارا ہوا  
ایہ بیان جنگ سے واپس آئے، دو گھر سے آئی تو دیکھا کہ نعیم ہاتھ پر شہتہا، گہری نیند سو رہا تھا، طاہر اس کے سر پر ٹھیکڑی  
آہستہ آہستہ اس کے بالوں پر ہاتھ چھڑنے لگی، آنسو کھینچے ہی نہیں تھے، عمر کے کبرا کچھ چپک چپک لگوں رہی تھی، طاہر کو ان پانچ  
دن پہلی بار نفوس اور کھینچا ہوا تھا اور اس نے نعیم اور اس کے باپ کا نام نہ مانا، اور نعیم کو ملینڈو مکان کا انتقال ذکر کرنے دیا۔  
طاہر کو تو روح تھی کہ نعیم ماں کے قریب رہے گا تو ماں کا دل اس کے پیار میں لگا رہے گا، اس کے علاوہ ساس کی خدمت  
پڑ جائی تھی، نعیم کی اسے آن محسوس ہوا اور اس نے خطرناک غلطی کی، جسے ڈاکٹر نے بھی جگہ اور آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے کہا تھا۔  
بڑی جگہ کے ہاں ہی چلے جاتے، طاہر کو یوں لگا جیسے نعیم کو اس حالت تک اس نے خود پہنچا ہوا ہے، اسی نے اسے اس طرح کش

لیا، بننے پر مجبور کیا تھا۔  
ڈاکٹر کے آج کے رویتے نے تو طاہر کے بال و روٹھ ڈالے تھے، اس کی ساری امیدیں اس طرح چٹا کر چر گئیں جیسے کاج کی

پل پر پھگڑا پڑا ہو۔ آج ڈاکٹر نے کہا تھا کہ مریض کو اب چارپائی سے اٹھنے نہ دینا، جسم کم سے کم حرکت کرے۔  
ایک دو وقت نہ لکھنے، آب و ہوا کی تبدیلی کا منظور دیا تھا اور ایک رویت کہ اس نے چارپائی سے بلند بھی نہ کر دیا، ان دو

ماہوں پر ستر مہینے سال کا عرصہ حال تھا جب طاہر کو ان طویل برسوں کا خیال آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک اندھیرے سیب  
کے مزین کھڑے پایا، اس نے انھیں بند کر لیں جیسے غار کے اندھیرے میں جھانکنے سے گھبرا ہی ہو، آنسوؤں کی دھند میں  
بہت ساری باتیں یاد آئیں لیکن اس نے سر جھٹکا دیا، وہ اب بھی یوں دکرے تھے گھڑائی تھی جیسے اسے سبب زدہ مکان میں جھانکنے  
دل پر بول طاری ہو جاتا ہے، اس مقام پر اگر طاہر نے ایسی بے بسی محسوس کی جس کی قوت سے باہر تھی، اس کے سامنے اب

ہی قوت تھی جس کی تو وہی کشتی کو بار کاسٹا تھی، طاہر اس قوت کے سامنے راتوں کو اٹھ کر دوڑنا سوکر دیا کرتی تھی۔  
طاہر کی عمر چھبیس ستائیس برس ہو چکی تھی لیکن ان پانچ برسوں کے کٹھن حصے نے اسے مگلا کے لکھ دیا، اس کے چہرے پر چوڑی

وہ اس کی روح کا پتھر تو اس کی نقش و نگار ہی دل کش تھے، دروازہ دوسرے زیادہ بڑی دکھائی دیتی تھی، کچھ عرصے سے وہ تین ماہ چار  
لحمی بھی نہیں کرتی تھی، بعض اوقات کپڑے بدلے بغیر سکرول علی جاتی تھی، ساس کے فقر نے اور نعیم کی بیماری نے اس کا حال ملینڈو  
کے رکھ دیا، وہ کئی کئی راتیں سوچی نہ سکتی تھی، نعیم کی تیمارداری کے علاوہ وہ کچھ دیکھنا سے بھلا کم رہتی اور نعیم اور اس کی صحت کے

۲۹۳

”سب سنتا رہتا ہوں بیٹی! سب سنتا رہتا ہوں۔“ باپ نے کہا اور باہر چلا گیا۔

ظاہر ہے پھر سر ہچکالیا اور گھر میں سوچیں گم ہو گئی، دس پتھر مینٹ گورے ہوں گے کوساس کے عمرے سے ساس کی ادنیٰ بچاؤ میں سنا دیئے لیکن۔

تو کیا میں نے اپنے بچے کو بیمار کیا ہے؟ جس بچے کو میں نے غل پر ملایا اور رات رات بھر گودیں ایسے پھرنی ہوں اسے  
 لانے بیمار کیا ہے؟

”فدا کے لیے سہتہ بات کرو اور میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ یہ نعیم کے باپ کی آواز تھی۔ ”اپنے بچے کی خاطر  
 بڑا دلورہ دوسو رہا ہے۔“

میں دیکھ رہی تھی کہ وہ چیز ملے متیں یا سبٹجا کرٹی پڑھا رہی تھی۔ ماں کی آواز اور بلند ہو گئی۔

۱۱۔ اپنے خادمہ کی توسل سے مزاجا پستی تھی جو مضمین میں آیا کچھ جاری تھی۔ ایک تو وہ پہلے ہی جلی ہوئی تھی کچھیں دن کیے غافلہ نے ہاکر لڑی کر دی تھی۔

”کواس بند کرتا۔ باپ نے گرج کر کہا۔ ”تُو نے میرے اکیلے بیٹے کی جان لے کر دم لیا ہے۔“

ہاں کسان تھی وجہ والی۔ اُس نے آسمان سر اٹھالیا اور چینیچنے چلانے لگی۔ وہ صحن میں اکھڑی مڑی اور خوش و غرض سے پازنائی، غلام کو کچلا کر آئے لگے۔ اُس نے بہت کچھ براشت کر لیا تھا لیکن مینظر اُس سے بچھا رہا تھا۔ ایک کوس کا جسم

نائب میلاری اور نعیم کی صحت کے علم نے نہال کو کھڑا کیا۔ دوسرے فکرمند نعیم کی آنکھ ابھی بھی کھلی ہوئی تھی۔ وہ جاکر نہ اُٹھے۔

ہیں؟ طاہرہ! اہاجان! امی جان! ہذا کے لیے مجھے مرنے تو دارم سے دوارے خدا کے لیے۔  
 مٹی! میرے سر میں جو تے ملو لیکن اپنے اس لڑیں بچے کا تو کچھ خیال کرو۔ طاہرہ! آج پہلے بارخود غصے کے لیے میں بولی۔ رات

جہاں مال اور تڑپ تڑپ کر اب اس کی آنکھ کی جلی اور گرم نے اسے جگا دیا ہے۔ اسی گرم مال سے بڑا دان ہو۔ لیون نہیں اس کا کچھ مال

ہم پہنچا جس برس میں علی ہاساس کو ترمیم کے سلسلے میں اس کے حذبات کے استعمال کا اندازہ ہوا تھا۔ اس دوران میں وہ خود بھی بھول گئی تھی کہ وہ فہم کے دماغ پر بیٹھ رہی ہے اور ان

میں نے کہا کہ اس نے دل پر جبر کیا ہے۔ اسے ظاہری طرف اپنی ناپسندیدگی کا باعث سمجھ لی تھی۔

یہ دعائیں کرتی رہتی تھی اس کی دعاؤں میں یہ فقرہ ہمیشہ شامل رہتا تھا: ”یا خدا! انھیں کئی ماں کو تباہ دے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کھار ہی ہے۔“

اس دن کے بعد لغیرمہ جاری پائی سے نہ اٹھا۔ اس کی ماں کا بیٹھا نہ رہا کہ چونکہ اس کا دل بھل صحت یاب ہوئی جاری تھی۔ اسی رفتار سے اس کی زبان میں تیزی آتی جاری تھی اور فحیم کی حالت اس سے زیادہ تیز رفتاری سے گہری تھی۔ جوں جوں فحیم کا رشتہ زندگی سے ٹوٹا جا رہا تھا اس کی ماں کی فتنہ پرانیاں بھتیجی جاری تھیں لغیرمہ کے کانوں میں کیڑے بارماں کے ایلفیٹ پڑے۔ اس کلونی نے سیر سے پیچھے پر جاؤ کیسے جوئے میں..... یہ داناں اب دوسرے درجہ صوفی رہی ہے۔ اس کی ماں نے یہ فقرے کئی بار کہے تھے کبھی حجاب کی موجودگی میں کبھی اس کی غیر حاضر تہ میں۔

نعم کے دل میں یہ الفاظ زہریلے تھوں کی طرح اتر گئے تھے اور اب نعم کا دل سوجنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے باپ نے ان کو سے مشورہ کیا کہ نعم کو ہسپتال میں داخل کر دیا جائے لیکن وائزر کے منہ سے نکلا کہ وہ اس لئے کہا کہ ہسپتال کا ماحول اس قسم کے مریض کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ اس مریض میں مرض کی نفاست کا بہت دخل ہوتا ہے۔

فاکرو معلوم نہ تھا کہ اگر کھڑا فضا ہسپتال سے زیادہ اوتیراں ہے۔ وہاں میں کراہتیں، یہاں چٹیلے جیتے ہیں۔ فاکر نے نعیم کے باپ کو ایک ماریجے کی دیکر کمرض کر کے لیے اور صرف دو حملہ مند اور روح افزا لالوں کی ضرورت ہے۔ دولی کا پانا اترے گا۔ وہاں پانا اترے۔ باپ کے دکھے ہوئے دل کو یہ تیغ احساس کھاتے جارہا تھا کہ نعیم کی ماں نعیم کو اپنے ماتحتوں قریب رکھ لیں۔ لیکن باپ بڑے عیسائی ناموسی طہری ہو گئی تھی۔ بڑھاپا مینے کے روگ کو دیکھ کر مسکنا تھا اور ماں پاس کاٹا کانا ہوتا تھا۔

ایک صبح جب نیرات محزونہ سکا اور طاہرہ رات جہاں کے سرے پہنچی اسے تسلیاں دیتی رہی اور وہی رہتی، باپ ان کے کمرے میں آکر انہیں کی ڈرائیگھ لگ گئی تھی اور طاہرہ کو کسی سر پر چبکا کے کسی سونے میں گم تھی باپ نے اس طرح مری جوئی آواز میں نصیحا کا حال پوچھا جیسے پوچھنے سے گھبرا کر ہر حال وہ دیکھ رہی تھی طاہرہ نے اوپر اٹھایا اور نصیحا کا باپ انہوں میں اسود کچھ کر چمپ چاہ کر پی پی لیا۔ کمرے میں ایسا سکوت طاری تھا کہ طاہرہ باپ کے دل کی دھڑکن بھی نہ رہی تھی۔

”داکر کہتا ہے اس کے سامنے ایسی ہیسی بات نہ کی جائے۔“ باپ نے دیکھے ہوئے لہجے میں دینی دنیاہ آواز میں کہا۔  
اُسے کیا معلوم کہ یہاں ایسی ہیسی باتوں کے سوا کچھ رہا ہی نہیں۔۔۔ صوفیاتی۔۔۔ باپ نے طارہ کو اشارہ کیا تو طارہ کرسی چھوٹ کر اس کے  
قرب ہو گئی۔ باپ نے کہا۔ ”تعلیم کا تو یہ حال ہو گیا ہے۔ تم اس کی ماں کی بک بک کو دل میں نہ رکھنا اور اپنے آپ کو روگ نہ لگانا  
تم دونوں میرا سہارا ہو۔“

”ابھان! ظاہروں کے انکسور پہنچتے ہوئے کہا۔ ”میں تو دور کر رہی تھی ہل لیکن ان کی خاطر کھانے کا بازو کے کامات پاب  
نے سنا تھا حتیٰ جان کی لاکر بھی بخش؟ وہ تو پانسانہ میں غصہ نہ کر کے علی گیس (امید رات بھر تڑپتے رہے۔ ابھی اچھی آنکھ لگی جسے ان کی ہم  
”دوئل پوری رات جاگتے رہے جسے رات انہیں انی جان سنا رہی تھیں کہ محمد کی عورتیں کہیں ہیں کہ ظاہروں نے اپنے خاوند چرب

کیے جوتے ہیں:-

”ہاں! اسوجانے لگا۔ ناگرنے بول جواب دیا جیسے ظاہر ہے اس کا فخر پورا کر کے اس پر اطمینان کیا ہو۔  
 نعیم دن بھر سکون ہے انھیں بند کیے چارہ۔ ذرا سلاٹا تھا۔ پھر ساکت مباد مجھ جاتا تھا۔ ظاہر ہے وہ چار بار کھانے پینے کا  
 اس نے ہاتھ کے بلکے سے اشارے سے انکار کیا۔ آدھی رات کا وقت تھا کہ ظاہر نعیم کے سر پر سے اٹھی۔ اس نے  
 مکان کی نیند سوئے ہوئے دیکھا تو وہ جی لیٹ گئی۔ دو کی راتوں کی جاگ بھڑکی تھی لیکن ہی بے خبری کی نیند سو گئی۔  
 سمجھا کہ ظاہر گھر کا لڑکھ چلی جیسے سوئے میں کوئی اس کے سینے پر بیٹھ گیا ہو یا کسی نے اس کے سینے پر دھڑکیا۔  
 پھر اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ سارا جسم لپینڈ لپینڈ ہو رہا تھا۔ وہ بستر میں بیٹھی اندھیرے میں چاروں طرف سمی  
 گاہوں سے دیکھنے لگی۔ دل کی گھڑ بسٹ زیادہ ہوتی جا رہی تھی اور سینے میں ایک گھٹن کا وہ شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ

ناگروٹ پر لیٹ گئی لیکن اس پر ایسا بول خاری جوتا جا رہا تھا کہ صبر نہ آتی نہیں تھا۔ ٹکڑے میں گپ نہ بھڑکتا تھا۔  
 اس نے آستہ آگزی پر بھی اور کروات بدل لی لیکن دم بدستور گھٹ رہا تھا اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ انکار کرنا نہ چاہتی اور  
 بس جلا دیا۔ نیند تو غائب ہو چکی تھی۔ وہ نعیم پر جا چکی۔ اسے اطمینان نہ ہوا کہ ایک لمحہ کے بعد نعیم گری نیند سو جائے۔ اس نے  
 پریشانی پر ہاتھ رکھا تو اسے یوں لگا جیسے برف کے توڑے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ رضائی نعیم کی ناک تک پہنچی ہوئی تھی۔ انھیں نیند  
 ظاہر نے رضائی کو ذرا سا نکال کر دیکھا نعیم کا منہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ چہرے پر سفیدی مائل زردی چھائی ہوئی تھی۔ یوں تو اس کا پڑ  
 ہوا ہو جاتا تھا لیکن اس طرح کا زرد نہ تھا۔ ظاہر نے آستہ آستہ ہاتھ نکال کر نعیم کے دل پر رکھا۔ دہان خاموش تھی۔ ظاہر نے گھبرا  
 لیا نہیں دیکھیں۔ نہیں بھی خاموش تھیں۔ دونوں بازو اڑے ہوئے تھے۔  
 ”نعیم صاحب!۔۔۔ ظاہر نے آستہ سے کہا۔  
 ”خاموش!“

”نعیم صاحب!۔۔۔ اس نے نواز دے سے کہا اور نعیم کے دل پر ہاتھ رکھا۔  
 گھبراہٹ، ہوس، ساکت۔

”نعیم!۔۔۔ ظاہر نے نعیم کو ہتھوڑوں سے لگا دیا اور پھر ایک جھج جھج کی طرح ظاہر کے سینے سے نکلی اور کمرہ لڑا تھا۔ ”میرے  
 ابا جان!“

ظاہر وہاں کی طرح نعیم کے باپ کے کمرے کی طرف دوڑی۔  
 نعیم کی حرکت قلب اسے سوئے میں بند ہو چکی تھی۔

وہی ٹپک تھا، وہی رضائی، وہی سر ہاتھ تھا۔ وہی کمرہ اور وہی فریج تھا۔ وہی چھت جس کے نیچے ظاہر کی پرشیاں منگول نے نفی  
 پائی تھی اور وہی دہان تھا جس نے اس کی منگول کو چوس لیا تھا۔ نعیم کی وہ عطر نیر اور گہرائی میں جنہوں نے ظاہر کے سینے میں  
 مجھے روٹوں کو شعلہ کر دیا تھا۔ آج خاموش تھیں جس منسلک ستر نے ظاہر کے دہانت کو کچھ کر اس کی کائنات کو سکھ کر دیا تھا آج  
 ماسے نفور دور کی، صبحی صدا بھی نہیں نکلتی تھی۔ تاروں تھکے، نئے اچھے کئے، دل ٹوٹ گئے، نعوذوں کے عمل ویران ہو گئے۔  
 ابرو کی دنیا سے نیل کر گیا جیسے ایک پرندہ شبنم پر بیٹھا، چھپایا اور اڑ گیا۔

نعیم باپ بڑھیا اور کمرہ دوسرے کمرے کے لفٹ گھسیٹ رہا تھا۔ ظاہر صبح میں اگلی تھی۔ ظاہر کی حالت اس طرح تھی  
 تھی جس کے پیچھے چریل نے جھپٹ مارا ہو۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس ماس کو نعیم کے قریب کبھی نہیں آنے دے گی لیکن  
 ہونک غلطی کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ لفٹ ایک سے اٹھ آیا ہے اور کواکس سارا لپکھ رہا ہے۔ اس کی انھیں آنسوؤں سے  
 تھیں اور پرنٹ لڑ رہے تھے۔ اس نے باپ کو دیکھ لیا تھا کہ وہ اس کی ہال گھسیٹ رہا ہے۔ ظاہر کھڑی ماس کو سانس لے لے  
 سنا رہی تھی اور سانس قحش کلاہی پڑا رہی تھی۔ نعیم مجھے بڑے دل پر بیٹھیں لے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد باپ نے ہال کو کمرے میں دھکیل کر باہر سے چھینچنی چڑھا دی۔ پھر ظاہر کو کچھ پر ہاتھ کرنا کہ اپنے کمرے میں جانا  
 کر کر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ نعیم دوازے میں لگا ہوا ہے۔ باپ اور ظاہر ایک ہی جھانک میں نعیم پر ٹوٹ چرے اور اسے اٹھا کر  
 چٹک پر ڈالا۔ ظاہر جی کیسی حالت میں تھی۔ سینے پائل ناگرنے کی طرف بھاگی۔

نعیم کی یہ حالت بھی کمرہ ذرا سا کھل گیا تھا اور وقت سے کھڑکھڑکی اٹھتی موتی سانسیں جاری تھیں۔ انھیں نیند ایک لمحہ  
 غمگین تھیں۔ باپ نے بانی کی چند لہریں حق میں چڑھا کر جنہیں نعیم نے نکل لیا وہ نعیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ باپ نے اسے اپنے  
 مرتبہ بلایا۔ نعیم نے انھیں کھولیں۔ پھر بند کر لیں۔ موت وحیات کی کس کش شروع ہو چکی تھی۔ نوزائے کمرے کھڑکی کا نپ رہی تھی۔  
 یا نوزائے ہی ہے۔ یا نوزائے ہی ہے۔ کا دیکھ کر جاری تھی۔ اور باپ غمزدہ خود اعتمادی سے نعیم کے سر پر مٹھا اگلے کچے کو کوکھ ہاتھ  
 اُدھر ہال کمرے میں بند دوازے کو دووں ہاتھوں سے اس قدر زور سے دھکا دیا کہ جی کئی کسار امکان ہلٹا محسوس ہوتا  
 باپ نعیم کے جسم کے بلکے بلکے ارتعاش سے محسوس کر رہا تھا کہ ریشو شرابا نعیم پر بری طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ باپ نے جاکر دروازہ  
 دیا اور نعیم کی ہال کو دوازے سے پھر کر کھینچا۔ نعیم کے پاس لایا۔ ”یہ دیکھ اپنے سینے کچھ کا حال۔ اس کی قدر دار تو جسے بے ہوش کر  
 مال نعیم پر گہری اور دھار میں مارا کر دے لگی۔ ”اے اس جہل کو خدا غرق کر دے گا۔ اے اس جاگڑا گری نے ج  
 بچے پھر چاد کر دیئے ہیں۔ کہاں گئی وہ کمری!“

وہ نعیم پر پڑی اس کے کالوں میں جھج جھج کی تھی تو باپ نے اسے کدھوں سے پھر کر زور سے اٹھایا اور دھکیل کے کمرے سے  
 باہر نکال دیا۔

”ناگرنے آکر نعیم کی حالت دیکھی نعیم کے دل پر شیتھو کو پکھڑی ناگرنے کی انھیں کچھ زیادہ ہی کھل گئیں۔ وہ کمری پر پڑ گیا  
 شیتھو کو پکھڑی کر لیتی بیٹھائی پر ہاتھ پھیرا اور جنہوں کو دانتوں میں دایا کمرے میں ہوت کا ساکت تھا۔ نوزائے ظاہر اور باپ  
 کی بھڑکی تھی۔ ناگرنے ناگرنے دکان پر لپکی ہوئی تھیں۔ ناگرنے بیک کھلا گھراں انداز سے جیسے وہ کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے نعیم کو ایک  
 انگشت لگا دیا۔ سامان بیک میں بند کر کے خاموشی سے بل چڑھا۔ ظاہر اور باپ حیران مضطرب اسے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔  
 وہ ناگرنے کی غیر معمولی خاموشی سے اس قدر سنبھلے ہوئے تھے کہ وہ کمرے کے بارے کچھ پوچھ ہی نہیں رہے تھے۔

”ناگرنے لڑا اور باپ اور ظاہر اس کے پیچھے چل پڑے۔ ناگرنے حویلی کے دوازے سے میں سے نکلتے گھوم کر کھیا اور کہا۔  
 ”میں نے کچھ گشج دے دیا ہے۔ اس سے مرضیں سکون سے۔۔۔ اور وہ چپ ہو گیا۔  
 مسکوں سے سو جائے گا۔ ناگرنے صاحب، ظاہر کے کمرے سے بے اختیار سیلا ہوا۔

پانچ برس کا وہ سیاح عصر۔ وہ سولہ گدھت کے ظاہر اور نعیم نے سواٹے آغا کی چند ایک راتوں کے سکون اور صبح کی سانس نہ لے تھا۔ بول تھا جیسے ہلکے گڑا گیا سر نعیم کے سر اور رات سے بڑا جسم کے پاس گھر مچنے ظاہر کو کچھ بھی یاد نہ آیا۔ لیکن نہ لو کہیں نہ جوانی، اشد زحمت نہ مجر جلال آباد نہ لفظ کی کیسپ، آتشا جوں نہ بندگی میں سناٹی غور کی شب عروسی۔ اسے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آج کے دوپہن پہلا ہوئی تھی۔ بڑہ۔ اور تمام عمر بڑہ رہی۔

نعیم کی میت اس کے سامنے پڑی ہوئی تھی اور ظاہر اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے تو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ اسے دونا چاہیے۔ چھٹا چاہیے یا ہاں نوپنے چاہیے۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ سینے میں وہی گھٹن تھی جو اس نے سوتے میں محسوس کی تھی اور وہ گہرا کراہنے لگی تھی۔ وہ گھٹن اب اس کا گھر بھی گھٹن رہی تھی۔

دنیا میں کبھی کی طرح عرصہ پہنچی تھی لیکن ظاہر کے گھر میں بھی شب تاریخی۔ طویل شب بہت طویل کبھی نہ ختم ہونے والی رات۔ یوں تو ظاہر وہ جی جی تھی لیکن اسے گرد و پیش کا ہوش نہ تھا۔ نعیم کا بے جان جسم اس کے سامنے پڑا تھا اور وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے ہوش نہیں تھا۔ عین اور گھر سے میں عورتوں کا ہم غریب غریب ہے۔ ظاہر نے سنا ہی نہ تھا کہ اس کی سانس میں کرب رہی تھی اور کہ رہی تھی۔ "میرے لال کے بھاگ پندی میں جا چھوٹے۔"

ظاہر کو ظلم نہ تھا کہ عورتیں سرگرمیوں میں کرب رہی تھیں۔ "پیر کی بدو عالی ہوئی ہے۔ یہ کوئی جھوٹ تو نہیں۔ اس نے غلام پر جاؤ کر کیا بھرا تھا؟"

ظاہر کو خیال ہی نہ تھا کہ اس کی سانس اور غلام کا پرو پگینڈہ نعیم کی میت کے گرد سیاہ عورتیں کی طرح اٹھتا اور جھیلنا جاتا تھا۔ وہ اسے یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ نعیم کی میت کو نسل کا جنازہ باہر نکالا جا چکا ہے۔ اسے ہوش آیا تو دیکھا کہ وہ کھٹے چنچر عورتوں کے زرنے میں گھڑی تھی اور ایک جنازہ دور و شہر کے درختوں کی اوٹ میں جل رہا تھا۔

ظاہر کی آنکھیں اور آنکھیں شیشم کے درختوں کی اوٹ میں چھپ گئیں اور لوگوں نے ان پر ٹی ڈال دی۔

ستان بل مات کے سکوت کو چرتی، سرحد کی داویوں میں سے پچ گھر نکلتی، چاند نیلی میں سیاہ دھڑال گنتی بہت تیزی لئی کی طرف آ رہی تھی۔ پش اور بچے بیٹا بہت دور پہنچے رو گیا تھا اور اس کی روشنیال کبھی کی نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ وہ اسے ایک تک رہا گا پانی چاند نی کی چوڑی لکیر کی طرح گاڑی کے ساتھ ساتھ رنگا آ رہا تھا اور ظاہر کی نگاہیں اس بائیں زمانہ انرا کلاس کے ڈبے میں جا رہا اور عورتیں لڑائی اٹھ رہی تھیں۔ ظاہر گھٹنوں کو بازوؤں کے گھر سے میں لے لے لے کے ساتھ لگی بیٹھی تھی کہ ہوتی چاند نی کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سر گھڑی کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ اس کے بیٹھنے کے ساتھ، ایک شکست، ایسی شکست جس نے پھر اٹھنے کی جیسے ہمت ہی چوس لی ہو۔

بڑا بڑا جوان چہرہ جس کے رویں روئیں سے سکا رہیں پھوٹی تھیں غم داندہ کی بکھری ہوئی تصویر بنا ہوا تھا۔ پکھلی ہوئی ٹھیں جن میں حرا نکھڑا ایدل لیتے تھے، گچھی گچھی سی تھیں اور یہ آنکھیں سپید چاند نی میں یوں جھنک رہی تھیں جیسے کوئی ہوتی باہر ہی نہیں۔ اس کا دل آرزو محبت کا سمرا لیے سحر کی رفتار سے دھڑک رہا تھا اور گاڑی کے پیٹوں کی جھک ٹھکا ٹھک اسے زندگی کے لمحات پلٹے اور چرچا تے سناٹی دے رہے تھے۔ وہ بوسے کے سپتوں لاپرواہی کی پڑ بنگامہ رگڑ میں بیٹے ہوئے رتوں کے قصے اور گڑی ہوئی زندگی کی جاہلی سن رہی تھی۔

بیہ شدت سے چرچا تے۔ ایسی چہنیں جو ظاہر کے دل کی خاموشی چنوں کی طرح درد آلو تھیں۔ گاڑی گولہ کے ٹکائی تھی اور نرم داترے میں موڑا کٹ رہی تھی۔ ظاہر ان کے ساتھ داٹے ڈبے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے مزہ کی ذرا نظر آ رہا تھا اس کے پیچھے چاند نی میں چمکتی ہوئی ریل کی بیڑی جو داترے کی محورت گھوٹی جا رہی تھی، وہ سواتری بار گڑی پل نظر میں اور زیادہ شغف نظر آ رہی تھی۔

ہر کے دو کہیں میں ایسی ہی دو لکیریں ابھرائیں۔ ایسی ہی چاند نی اور ایسی ہی رات۔ اسے پیار بھری سرگوشیاں سناٹی اس کی نظروں کے سامنے سے راولپنڈی اور گولہ کے درمیان پھیلے ہوئے پہاڑ غائب ہو گئے۔ اور ان کی بنیاد ان کے لیے لی جس میں دور تک ریل کی جگہ تھی پٹری دوسری لکیروں کی طرح آتے جگہ مل گئی تھی۔ پڑاوی کے رشت۔ سامنے والی ریلوے کی کیسپ کی خاموشی بائیں۔ بائیں میں سوتے ہوئے بنگلے، بے بس اور لاپا اہم اور سب پر چاند نی کے لطیف پردہ ڈال رکھا تھا۔

میری اچھی عمارتوں کے ساتھ لگائے گئے گولڈ سے راولپنڈی تک پھیلے ہوئے ہریاے سلسلہ کے واسطے میں چاندی سرسوں روشنی میں اس کے تصورات کی تفصیلات جن رہی تھی، ایک ایک کر کے اور انیس اس جزائی جاری تھی جیسے پھر سے ہونے لگی تھی اور بدیہ ہو۔

اس تعبیر میں سے ایک سرسوں اور بڑی پر سوزنا کا ڈانڈا بھر لگی۔

الغرض آج دی رات سہاگ والی بھیک کی جانٹاں کھڑا رنگ ہوئی

ریل گاڑی کی آواز گونگی رات کے سکوت پر چاندنی پر دو جگہاری ہو گیا۔ یہ آواز جتنی تو سرسوں پرانے تصور کی گزرا کی محسوس لہروں کی طرح عمارت کے گرد منڈلانے لگی۔ اس کے آئینوں پر لگے اس کی سہاگ رات کو رات کی تیرگی نے ڈس لیا

پر سوزنا آواز اس رات کی تھی جب عمارت لٹی پٹی فائنٹ لٹو جی کیسب میں آئی تھی اس وقت اسے لٹنے اور بے گھر ہونا غم نہیں تھا۔ دو خوش تھی کہ اس نے پاکستان حاصل کر لیا ہے۔ اس سے بڑھ کر سہاگ رات جن میں ہو سکتی تھی گراں گرا

جب اس کی سہاگ رات لٹ گئی تو دربارے ہوئے نہجی سپاہی کی طرح با دوں میں بنا دھوڑی تھی۔

اس کے ذہن میں وہی پر سوزنا لٹا رہے تھے جو اس نے لٹو جی کیسب کے کچھ دور رات کو پورے لان کے قریب ارشد کے پاس نیم دراز ہو کے سنے تھے۔ کوئی دکھیاور مہاجر کار تھا۔

میلے فریخا قسمت دے، کیجئے شمع تے بجتے چراگ ہو سی

ایک چنچ شانی دی۔ دو شمع ہمیشہ کے لیے بجھ گئی تھی جس پر طاہرہ پرانے کی مانند خدا ہوئی تھی۔ جین پھر شانی دی ہے

طاہرہ اپنے دل کی طرح بھیجی لیکن یہ ان کی دل تھی۔

ان کی کو خوت دل سے اسے سمجھو کے رکھ دیا اور ساتھ ایک دھکا جس سے اس کا سر گڑی سے ٹکرایا پڑنے لگا

موتی کھر گئے۔ یاد اور تصور ان گراں کے ڈبے میں غائب ہو گئے۔ طاہرہ نے کھر کر کر بھر جھانکا گاڑی راولپنڈی کے بسٹن کے بار والے سکیل کے پاس کی ہوئی تھی سگن گرا نہیں تھا۔

طاہرہ نے دیکھا کہ راولپنڈی شہر اور مضافات کی قیاد دور دور تک زرد پیسے ستاروں کی طرح چاندنی میں جھلک رہی تھیں۔

قیاد میں ایک اس طرح بکھری ہوئی تھیں جس طرح طاہرہ کے تصورات اور خیالات کھر گئے تھے۔ گاڑی کی آواز کی ایک جھلک جیسے دنیا کا نظام میں رک گیا ہو۔ جیسے وقت دن رات گنگل کی سرخ تپ کے نیچے اگر ٹھہر گیا ہو۔ طاہرہ نے آدھی اور اٹھ کر راولپنڈی شہر کی ہلکی ملکی خوشبو اسے محسوس ہونے لگی۔ چوہر سے دور ہونے کے باوجود پتہ کی نو سے پل محسوس رہی تھی جیسے وہ کل شام یہاں سے پٹا اور گئی تھی۔ لیکن یہ کل بہت طویل تھی، بہت لمبی، پانچ پھر برسوں پہلے ہوئی۔ اس بار نے سرسوں میں ٹوئیں، نوکھڑی ہوئی تھیں۔ کس قدر اپنیت تھی اس کو نہیں۔ طاہرہ کو غور غور دی میں ملتی ہوئی ان کو قبول اور رات کی رات چوہوں کی بوند لگتی۔ وہ ایک بار پھر دیکھیں تصورات میں کھل گئی تھی کہ ان کے جین گرا نہیں گئے۔ طاہرہ نے کھر کیس سے جھانکا دیکھا۔ سگن ابھی گرا نہیں تھا۔ وہ سرگڑی کے ساتھ لگا کر مضافات ہی ہو گئی۔



”یہ فیہم قرین ہو گیا ہے۔ آراء اور سکون کی فتنہ۔ وہ دنیا کی فتنوں سے ذوق چلا گیا ہے۔ مرنے سے غم میں ملان نہ ہوا۔  
 حضرت ہوتا دھڑا جاتا رہا۔ فیہم کا لہجہ جاباب ان راہوں کو دیکھتا رہے گا جن پر ہم اپنی قیاس اور آج جاری ہو۔  
 آواز میں بند ہو گئے تھیں اور ظاہر ہوئے قرار۔ انکھوں سے آنسو جاری تھے۔  
 ”بیکے راولپنڈی ہوں گے اور سب سال پشاور میں تھری سیلیجی جیڑوں میں بھی اور مال بھی“  
 ”کاش! تم فیہم کی بہن تہیں۔ ظاہر ہوئی! ہمارے جانے کے بعد فیہم بہت یاد آئے گا۔“  
 ”مقام تو ظاہر میرا گھر ویران کر چلی جو۔ ساری روٹی منارے ساتھ تھری ڈولی میں جاری ہے۔“  
 ”اب تو بچلی! اس دن کو یاد کرو گے دل بھلا یاد کروں گا جس دن تم مارا مارا لایا تھا۔“  
 یہی ہی ظاہر ہوا۔ نامہ دو ایک کسی نوٹ میں دوں کی اس میں تہا۔ وہی سناتی ہے۔ اب یہی آج اس میں چندا

درا کر دی۔  
 ”اب منارے کو ملے گا میں باہر سے تالا لگا دوں گا۔ منارے کھووں گا نہ دیکھوں گا۔ اسی جھوٹے میں زندگی کے انی  
 گواروں کا گھر اور فیہم اور بیٹے تہیں کر رہے ہو۔“  
 ایک چٹکا اور ظاہر ہو کر چپک اٹھی۔ اس نے باہر دیکھا۔ گھبراہٹ کے قریب گھر کا چھاپہ ایک چٹکا ادا ہا۔  
 ساتھ ہی قیامت خیز شور۔ ٹرکوں کا گھڑیوں کا طوفان۔ بچوں اور عورتوں کا غل غپاڑہ۔ دیکھتے ہی دیکھتے انکھوں چھوٹا  
 عورتوں اور بچوں سے بھر گیا۔ گاڑی راولپنڈی کے شہر کی پڑی ہوئی تھی۔

ظاہر واقعی ہے۔ اپنے انکھوں کا سوسٹ لیں۔ انکھوں کا سوسٹ فارم پر آتی ہے۔ اس کا دل ٹوب رہا تھا۔ راولپنڈی کے ٹیٹ ڈراما  
 کرنا سے یوں محسوس ہوا جیسے وہ چپکالے لے کر روڑ پر گئے گی۔ اسے وہ وقت یاد آیا جب وہ لاہور سے راولپنڈی آئی تھی۔  
 وہ وقت جب وہ فیہم کے ساتھ ملکر بن کر پشاور کے لیے روانہ ہوئی تھی یہی ٹیٹ فارم تھا۔ لوگوں کا ہنگامہ اور روٹی کی کمی  
 جنگ سے میں کسی قدر لطف اور زندگی تھی اور آج کی رات جیسے سیکڑوں لاشیں گاڑی سے نکالی اور گاڑی میں بیکرین جا رہی  
 ظاہر ٹیٹ فارم پر کھنکھاتی تھی۔ کیوں؟ اسے معلوم نہ تھا۔ وہ بھگا کر باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ کیوں؟ اسے پتا  
 نہ تھا۔ اچھا مبادا قتل ہو جیتے بھگ رہا تھا اور ظاہر کو اس کے تعاقب میں بہت تیر چلا پڑا۔ دور نہ دیکھ کر اسے کچھ  
 خیالوں میں مبتلا جاتی۔

ظاہر بچہ کو بھاڑے آنے کی طرف اسی قدر اطلاع تھی کہ وہ کسی روز آ جائے گی فیہم کی وفات کے دوسرے  
 ظاہر نے بچہ کو ایک طریق غلط فیہم کی موت کی اطلاع دی تھی۔ خط لکھا تھا ایک رو بھری داستان تھی۔ یہ خط بھگنے کی طرف  
 پڑھا تھا جس طرح ظاہر نے بچہ کا وہ خط پڑھا تھا جس میں اس نے لاہور سے آکر عفت کی موت کی خبر اور ارشد کی جواب دہی  
 کی تفصیلات لکھی تھیں۔ فیہم کا والد ارشد کا چھانا خاص دوست تھا لیکن فیہم کی موت نے تو اس پر سنگت طاری کر دیا تھا اور اسے  
 ہاتھوں کسی کو فیہم کے مرنے کی اطلاع دینے کا جوش ہی نہیں تھا۔ دوسرے رشتہ داروں نے اصرار دیا تھا کہ خط لکھتے  
 ظاہر اور بچہ خط لکھنے کے دوسرے دن پشاور گئے تھے۔ فیہم کو قریب دو چوتھا دن تھا۔ ان چار دنوں میں فیہم کی مال

”اس کی ساس پر ہار ہوئی تھی اور اسی کے اثر سے اس کا خانا بند رہا ہے۔  
 ”یہی بہن داخلہ دیکھو۔ ٹاکڑوں کو آخر وہ ملک پر ہی نہیں چلا۔ پتہ چل بھی کیسے؟ کالے علم کا کسی کو پتہ چلا ہے کبھی؟  
 انان کو نے دوسرے حکم کو اپنا توصات بتا دی تھی۔ ہم نے بھلا دے دیتے۔“  
 اور یہ موضوع صرف ساس کی زبان پر نہیں غلنے کی بھڑت کی زبان پر تھا۔ سوا سے غلنے کی ان فوجوں اور لکھوں کے جو  
 اہر کے پاس کرکھیا کر تھیں۔ اس ہی پوئے اپنے طور پر پوشش کی تھی کہ ظاہر کے خلاف اس پر واپس پڑے کے خلاف  
 دیکھنا کہ یہاں کی جیلوں کے سامنے پڑا ہوں کی کیا جمل تھی جس نے بات کی اس کا ظاہر کے ساتھ ملنا ملنا نہ کر دیا گیا۔ ظاہر کے  
 پانچ نہر نا بھی تو شہر شہر کے اثر کی دہلی تھی۔ ظاہر کو کاسا یہ بھی محسوس سمجھا جاتا تھا۔ غلنے والیوں نے بہنوئیں کو اس کے قریب جانے  
 سے سخت منع کر رکھا تھا۔

اس ماحول میں ظاہر رہتی تو کیسے رہتی؟ فیہم کا باب سب کچھ دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ فیہم کا جنازہ غلنے کے فوراً لگنا  
 سے جوش سے اٹھ اٹھا تھا۔ جادو میں ہی ظاہر خشک تنوں کی طرح ان لوگوں کی کندھ کی تھی جب ظاہر کو بکشا رہے تھے  
 ظاہر نے انیس چھ برسوں کے قے سے سنا ہے تھے لیکن جو قے عورتوں نے بچہ کو سنا ہے تھے بچہ کا دل پرانہ رہتی تھی۔ ظاہر  
 باتیں تو وہ انسوں کی روانی میں تھی یہی لیکن جب اس نے عورتوں کی باتیں جو تمام کی تمام ظاہر کے خلاف تھیں تو وہ ظاہر  
 کے لیے میں آئی اور غلنے میں ہوئی تھی۔

”بے ظاہر کیا چھ برس تم نے ان چٹوں میں گزارے ہیں؟ اسے تم زندہ کس طرح رہی ہو؟۔ بھڑا سے کسے جاری تھی  
 کو نے میں مہادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ بڑی تھی۔“ اسی تیری غیرت کہاں کر رہی تھی۔ فیہم فرشتہ تو نہیں تھا کہ اس کی خاطر  
 اب بے عزت لوگوں میں بڑی رہی ہو۔ راولپنڈی کیوں نہیں آئی؟ ہم کیا کر گئے تھے؟  
 ”پاپا میں جنوں میں سب کچھ کھتے رہی ہوں۔“  
 ”جنوں میں تو تم کھتی رہی ہو لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ ان کا لی لالہ کی زبانیں اس قدر کالی ہیں میں تو یہاں چند گھنٹوں میں مل کر  
 لاکھ گئی ہوں اور تم نے یہاں چھ برس گزار دیے ہیں۔ میں مر تو نہیں گئی تھی۔ میں تو بھی تھی تو بھر گھر میں ہوتا ہے یہاں بھی دی  
 پڑھنا کہ یہاں یہاں تو معلوم ہوتا ہے مجھے کا عہدہ پانچے گا نے والیوں کا ہے۔“  
 ”اس لیے تو میں نے آپ کو چھ برس یہاں آ کے نہیں دیا تھا۔“  
 ”اب تم جو یہاں قید۔“ بھڑا سے کہا تھا۔ اپنا سالانہ باندھ اور ہارے ساتھ چل۔ آج ہی خیر ہوا جانی ایک بھی چڑچوٹی  
 لوں میں تارے بجائی جان کا کشتی ہوں اور میں آج ہی لیے چلتے ہیں۔ اسے اس قدر بے حیاتی؟ مرود عورتوں نے کیا کیا کیا کیا  
 چڑھائی میں۔ فیہم تیری اس کی ساس کو دنیا میں اور زخم کھاتے۔“



ووجہ مقدر لگا کر منہ ہی تو رہا کہ کوشش ہوتی تھی نہ غم رہا کہ جس کے سینے سے اٹھتا تھا۔ وہ دل کی سرکوبی کو دبانے کی خاطر مقدر لگا کر منہ ہی تھی۔ یہ سب سبکیاں اب وہ خود بھی نہ سمجھتا تھا۔ اس کی ذات کے پردوں میں ایک عورت روئی تھی اور کتنی رنج تھی۔ طاہرہ و اعظم تب بیوہ ہو گئی ہو۔۔۔۔۔ طاہرہ و اعظم نہ کہاں ہے۔۔۔۔۔ وہ پہلی رات کہاں کھڑی تھی طاہرہ؟ وہ دیکھو وہ محض کمرہ تو تھا۔ اسے سامنے ہے اس کے رہنے والے کہاں چلے گئے؟ دل کے شیشے میں دیکھو طاہرہ! اب اس میں کیا نظر آتا ہے؟ شیشہ ٹوٹ گیا ہے۔۔۔۔۔ یہ سمجھ کہاں ہے۔۔۔۔۔ گایاں تو اب بھی بننا رہ جاتی ہیں اور سنتی ہو کیلئے؟ ان کی دل دے رہے ہیں اس روز اس دل میں خوشیاں تھیں۔ آج دل دل جنمیں ہیں۔

اور ایسی ہی آوازیں طاہرہ کی داخلی دنیا میں سرگوشیاں کرتی رہتی تھیں۔ آوازیں ایک عورت کی تھیں جسے طاہرہ نے ایک رات تنہا ہی پہچان لیا تھا۔ اچھا تو کہ اس نے پہچان لیا۔ اس عورت کی شکل و صورت تو طاہرہ نے ملی تھی مگر یہ روح سے بڑھتی تھی طاہرہ نے اب اس عورت کو جھکنا شروع کر دیا تھا۔ سینے میں جب یہ کتنی تھی تو طاہرہ کو بری لڑکی کو چھو کر بھاگ بھڑکی تھی مگر کتنا ہوتی تھی، پھر طرح طرح کی شرارتیں کرتی تھی۔ جینے جینے کو منہ ہی اور یوں اس کی سستی کے پردوں میں سے اٹھتی آوازیں پردوں کے عقب اب رہی اب جاتی تھیں۔

شب بزدلی کو کوشش سے اور اپنے آپ کو کامیابی سے خراب دینے سے طاہرہ نے اپنے اوپر قابو پایا اور زندگی کے دیگر حقائق و مسائل کے متعلق میں اترنے نہی راہیں تلاش کر لے اور سرگرم عمل طبیعت کو نئے میدان میں اتارنے کے لیے بارگاہ۔ وہ بظاہر ازدواجی زندگی کی دلچسپیوں اور کچھ دل کو نیوٹی جاتی تھی جس کی وجہ سے ایک نئی چیز کے ساتھ تہیں کرتے وقت وہ میں نہیں سمجھتی کہ یہ کس طرح یہ فخر و فخر ہے کہ کتنی تھی۔ آہا! یہاں ایک باغ میں نے بول لیا کہ۔۔۔۔۔ ایک باغ میں ادیں اگلے پلک بیٹھے تھے کہ۔۔۔۔۔ اور وہ فیم کی ایک آدھ بات کو بر مضموع میں چپاں کر لی لیا کرتی تھی۔ ہنس کر مسکرا کر اور دل کے در و دل میں دیا۔ اور یوں طاہرہ نے ایک عظیم غم کو اور اپنے سامنے پھیل جونی ہو گی کی سپاٹ زندگی کو مسکراہٹوں کی حین اور دلکش متوں میں پایا یا سلا لیا۔

طاہرہ کو تجربے طاہرہ کے مستقبل کا فیصلہ لیا تھا۔ انہوں نے اس کے لیے ایک پروگرام تیار کیا تھا۔ وہ اسی انتظار میں تھے لہذا اپنے آپ میں ٹوٹ گئے تو اس ساز کو چھوڑیں۔ میاں بوی کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ڈھ مہ ماہ بعد تجربہ اور طاہرہ کو کمرے میں منجی عروہ کی باتوں میں صرف تھیں طاہرہ کی مزاجی کیفیت تحول پر تھی۔ طاہرہ اپنے منہ میں تھا۔ اس نے تجربہ کے ساتھ ملے لکھا کہ وہ رات رات ان کی باتوں میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔

نہج نے بات سکول کے موضوع سے شروع کی۔ بولی۔ سید مسٹر میں آج پھر نام نہان ہو رہی تھی کہ طاہرہ صوف ایک اس کے بعد آئی تھیں۔۔۔۔۔ وہاں تھیں جو کتنی جماعت میں لگا تھا جتنی سے۔ بہتر ہے کہ جی چل کے کلاس کا چارج لے لو۔ ہاں تو وہ پانچوں جماعت دے رہی ہے۔

”بہت اچھا“۔ طاہرہ نے خوش ہوئے جو کہ۔ ”کل ساتھ لے چلا۔ یہ ڈیڑھ سید غلام خواہ ضائع ہوا۔“

انہو چھپانے کی کوشش کرتی تھی لیکن پندی آتے ہی اسے ٹھوس ہوا کہ اس کے غم اور موبوں غم اور بھی ایسے کہ اس بھی ضائع نہ ہوں۔ طاہرہ کو بکرا کی رویت اس کا جانا پہچانا تھا۔ پھر بھی اسے عجیب و غریب لگ رہا تھا۔ اسے یوں جیسے وہ دھوپ میں گری پڑی تھی کہ کسی نے اسے اٹھا کر چھائل میں ڈال دیا ہو۔

رات گزر گئی۔

پھر کئی راتیں گزر گئیں۔ راتیں آتی تھیں اور طاہرہ اور دیگر کی باتیں سن کر کمرے کے اچالے میں سو جاتی تھیں۔ ان چھ برسوں میں جو کمرے کو دیکھے تھے۔ اب ایک کمرے میں کھانا اور دو کمرہ کمرے کا بڑا بڑا پیارے کھلونے سے بچتے تھے وہ طاہرہ کے ساتھ اس کو دیکھ کر نہ خیر نہ کراتے اس کے ساتھ چپے رہتے تھے۔ ایک دن طاہرہ نے کمرہ کو بخش دیا۔ آہا! انہیں کوہ! لگا کر اس لفظ سے مجھے فحش ہے۔ یہ مجھے غلام کتے میں تو مجھے پشاور والی خالہ یاد جاتی ہے۔ لیکن بچتے۔

طاہرہ اور تجربے طاہرہ کی نظر لیتے سے صرف رکھا کہ اس کے کمرے پر رونے کے آنا نظر آنے لگے کبھی ٹوپی سیر کو لے جاتے کبھی ٹوپی اور سید پور کے برے بھرے خوشنما خلیفے میں جا کر دن بھر وہیں گزارتے۔ ایک دن مری کی کمرہ لگاتے کمرے میں زیادہ دوسری خلاق کی باتیں کرتی تھیں۔ اسنے دن بھر اور طاہرہ نے پشاور اور فیم کا ذکر ہی نہ آئے دیا پھول کا کہ بہت خوشگوار تھا۔ مگر پھر غلطی کی لڑکیاں بھی ایک ایک کر کے جمع ہو گئیں اور کمرے میں فوجانہ لڑکیوں کی غفلیں جمنے لگیں۔ طاہرہ کے دل و دماغ سے پشاور والا غم اترنے لگا لیکن آہستہ آہستہ بعض اوقات وہ یوں سمی جاتی جیسے اسے نظر آتی ہو یا اس نے فیم کا جنازہ دیکھ لیا ہو۔ ایک خندہ سا اس کے دل میں بٹھا رہتا کبھی کبھی ابھرتا تھا مجھے معلوم کہ سول اور کمرہ۔ یہ خندہ بنا شروع کر دیا فیم کی یاد بھی جاتی تھی اسے تہا میں میں سو سوتا سوتا لڑتی تھی تجربہ اسے تنہا کر ہی بسنے دیتی تھی۔

چند دن اور گزرے تو طاہرہ کے اترے ہوئے کمرے سے یاس کی پھانیاں دخل گئیں اور اس کا فہرٹن شروع ہو گیا۔ مسکراہٹ میں بھی جان لگتی۔ آنکھوں میں وہی شوخی اور بالوں میں وہی جھجک ہو کر کئی گندھے جو رنگ و آکام کے ہو چھ سے لڑا۔ جھک آتے تھے۔ پھر سید سے ہو گئے اور مری کی گردن ایک باہر تھی کئی جسم میں وہی زندگی اور شادی سے پہلے کا چہرہ لگا ہوا۔ شگفتہ مزاجی یوں بالکل اٹھی جیسے فیم کی دیکھو کون کون تھی اور تازہ دم ہو کر اٹھ بیٹھی ہو۔

وہ بات پر ہنسنے لگی۔ طاہرہ کے ساتھ مذاق، لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاں، بچوں کے ساتھ کھیل کود اور تجربہ کا وہ فخر تنگ نہ رکھتی تھی۔ تجربہ کو طاہرہ کی یہ حرکتیں بہت پسند تھیں۔ اس کے علاوہ تجربہ کو ایک سکون بھی ہوا کہ اس کا لڑا لڑا لڑا کے پاس سوئے لگا تھا اور دن رات اس سے الگ ہوتا ہی نہیں تھا۔

طاہرہ کے پاس کوئی روتا آتے تو نہ سنا جاتا تھا۔ کبھی کبھی معلوم نہیں تھا کہ کھارہ ہو گی کے دکھ کو فیم کی یاد کو۔ چھ سالہ راجی زندگی کو اور فیم کے تڑپ تڑپ اور ترس ترس کر مرنے کی فیمیں اور سکون میں اس کی طرح دفن کرنے کی کوششوں میں ٹی تھی جس طرح تو کول نے اس کی انگلیوں اور روحانی سیریل کو فیم کے ساتھ قبر میں بدایا تھا۔

کامکول اور اسے اپنے غون سے پہنچ کر خود بانداؤں.... مجھے بچوں سے پیار ہے۔ اے۔

"میں نے مسرت کی طرف اور مسرت نے میری طرف دیکھا جیسے ہم نے ایک دوسری کو کما کر کوئی نئی غلامی بن کر باہر مل  
علوم ہوتا ہے ہم نے اسے دور سے بیڑہ سڑکی کا گرد دکھا تو اس نے جھک کر تکلف سلام کیا اور دفتر کی طرف چلا گیا....  
چند روزوں بعد تیرہ چلاک اسکول کے بورڈ نے اسے لڑکوں کی پانچویں جماعت دے دی ہے میں نے سوچا کہ اسکول  
یہ اس قسم کے ماسٹر بھی آئے گے وہ حال علیے تو اچھا خاصا مغز آؤی معلوم ہوتا ہے لیکن ٹیڈ ٹول عام اسکول کے مولیوں  
جیسی ہے میں نے سوچا وہ اس سکول میں کیا پڑھائے گا۔ تو یہاں کے پروگرام اور پلیس کا بھی پتہ میرے گنگا گنگا پتہ نہیں  
میں ہی اسکول کے برہنہ کی زبان پڑھ رہی ہوں، جزی بابا تھا، بالکل اس طرح جس طرح تھامری کلاس کے بچے تھے باور پاپا، طاہر پاپا  
کرتے رہتے تھے....

کرتے کرتے وہ سکول میں عجیب و غریب شخصیت کے نام سے مشہور ہو گیا، برہنہ کی اس کی طنزی اور خوش مزاجی کی تعلیم  
کرتے لگے جزی بابا بہا بہا حال کو تفریح کے وقت بچوں کے ساتھ کھیل سب سے ہیں، ایک دن دیکھا کہ باہر جزی میدان میں ہاتھوں  
اور گھٹنوں کے بل گھڑا اپنے گھوم رہے ہیں، دوپٹے کے ان پر ساریں اور دس بارہ پچھتے تالیاں بجا رہے ہیں، باری باری سب نے  
سوار کی اور بابا کے چامچے کو دیکھا تو گھٹنوں سے چبڑا ہوا تھا، پہلے کتا ستیا سن کر لیا تھا....

"جماعت میں جب پڑھاتا ہے تو کیا حال کوئی بچہ بلا ضرورت منہ سے آواز نکال جاتے، ایسا پہلے کی اپنی سانس بھی  
سنائی نہیں دیتی پڑھانے کا انداز بھی ایسا کہ بچے سحر ہو کر سن میں جذب ہو جاتے ہیں جیٹے کے وقت بچوں کا مٹوس بابا کے  
ساتھ ہوتا ہے، اور تیش ذرہ ہر جان بچوں سے آگیا نہیں، لڑکوں سے تو وہ بہت محبت کرتا ہے، تفریح کے وقت اس  
طرف بھی اٹھتا ہے اور پہلی دوسری جماعت کی بچیوں کو جمع کر کے انہیں طرح طرح کی کمانیاں سناتے بیٹھ جاتا ہے، میدان میں  
ی وہ بچوں کو گویں لے کر بیٹھ جائے گا اور باقی کو اپنے قریب جٹھا کر خوش اور لڑائی کے قصے شروع کر دے گا۔  
"واقعہ عجیب آدمی ہے" — طاہر پاپا اور استاد سکول کا دیر الیسا ہونا چاہیے۔ استاد اور شاگرد  
کوئی فرق ہی نہیں رکھنا چاہیے۔

"لیکن شخص تو حکمران ہے طاہر پاپا۔" — بچہ نے مزے لے لے کر کیا۔ "میری کلاس کے بچوں سے بیکار کی کرتی  
نیں لیکن اس شخص کی نوعیت نہیں، ایک روز میں نے دیکھا تفریح کے وقت ایک بچی، غالباً پہلی جماعت کی کئی کھڑی رو رہی تھی۔  
لہجہ سے ہونے اور برہنہ کا ہوا۔ اُدھر سے جزی بابا چلے آئے تھے جب بچی کو دیکھا تو اس طرح بھاگا اور بچی کو گویں  
غالباً جیسے وہ اس کی اپنی بچی ہو۔ اسے بھلا یا نہ بل پر جا کر اس کا منہ دھوا اور اس کا رن کھل کر جیسے سے چھٹی کی گھٹی نکالی۔  
ما کے بال سنوارے اور اس کا رن باندھ دیا، بارہ بار کچھ کر چوم کر رہا تھا اور تفریح کا تمام وقت اسے گودی میں اٹھاتے  
ماتے پھرتا رہا....

اسے کلاس میں چھوڑ کر آتا تھا کہ راستے میں مٹھ چھوڑ ہو گئی میں نے پوچھا — بابا یہ بچی آپ کی ہے؟ حیران ہو کر  
نہیں تو بال باپ کی ہوگی کیوں؟....

بچہ سکول اور استانیوں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں جو پہلے بھی ہو چکی تھیں لیکن تفصیلاً سنیں ہوتی تھیں۔ طاہر نے بچہ سے  
پوچھا کہ شافت میں کوئی رد و بدل ہوا ہے کہ نہیں؟ بچہ نے ایک قانون بتا دیا کہ اس قانون کا ذکر کیا ہے؟ بچہ نے کہا کہ اس طرح دیکھا گیا تھا۔  
وہ جماعت کو پڑھاتے وقت نسوا منہ میں ڈال کر فرش پر تھوکتی رہتی تھی اور تو کسی نے اس حرکت کو نہ دیکھا، کلاس کے بچوں  
نے شکایت کر ڈالی تھی اس قانون کی گندی ہے، کالا کالا تھوکتی رہتی ہے۔

اس سکول کے بچے اچھے گھرانوں کے تھے تعلیم کے ساتھ تربیت پر خاص توجہ دی جاتی تھی چوتھی جماعت تک لڑکے  
اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے، پانچویں جماعت سے لڑکوں کی کلاس الگ اور لڑکیوں کی الگ ہو جاتی تھیں، ایک کلاسٹر اور  
ایک کواستانی پڑھاتی تھیں، سکول کے ہر سہولیت سلیٹہ اور تعلیم تھی کیا پڑھنے اور کیا کھیل گویں، سکول کی حدود میں کسی قسم کی تفریحی  
کو برداشت نہیں کیا جاتا تھا، ایسے سکول میں نسوا اور تھوکتا کیسے گوارا کیا جاتا، چنانچہ اس قانون کو کھال دیا گیا تھا۔

"ماسٹر لیں ایک خوشگوار اور دل چسپ اضافہ ہوا ہے۔" — بچہ نے طاہر کو بتایا۔ "وہ ہے جزی بابا، پانچویں جماعت  
کو فاضل اور تیس گزاف پڑھاتا ہے، کوئی ایک برس ہوا، وہ بابا، لیکن اور جناح کیپ پنے سکول کے چھانک میں داخل ہوا  
تھامیں اور وہ استانی ہے، اس مسرت جہاں، چھانک کے قریب کھڑی جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ ہم دونوں کے پیر تیز  
غالی تھے....

"ایسی آپا میں اس دور سکول گئی تھی تو مسرت نظر نہیں آتی تھی، وہ کسی ہے؟ شادی کر لی ہوگی کس نے؟  
"نہیں۔" — بچہ نے جواب دیا۔ "کتنی ہے شادی نہیں کر دی، بڑے بڑے اوپے گھٹنوں سے رشتے آتے  
ہیں لیکن وہ کسی کو قبول نہیں کرتی۔  
میری خاص جگہ رہتی ہوگی۔"

"کتنی ہے یہ بات بھی نہیں غیر تو ہم دونوں کو ملتی باتیں کر رہی تھیں کہ یہ بڑا ہوا، اور انہی انہی سفید لڑکی سے پتہ  
چلتا تھا کہ چپاس ساتھ برس کی عمر کا ہوگا۔ سیدھا کھڑا ہوا ہر جسم ہاتھوں، بازوؤں اور کندھوں کو دیکھ کر جو احوال کا مستحکم کرنا ہے، وہ  
سکول کی طرف جھٹکا، چھانک میں داخل ہوا تو مسکرا کر کہا۔ "اسلام علیکم، ہم نے علیکم السلام کہا تو کہنے لگا۔ آپ اس سکول میں  
پڑھتی ہیں؟ پڑھاتی ہیں یا کسی سے ملنے کی ہیں؟....

"میں نے کہا کہ ہم استانی ہیں، اس کے ہاتھ میں کوئی بھی چیز تھی، گول دستانے والی، وہ بڑے ہاتھ طریقے سے  
چھڑی کو ہاتھ میں پکڑے کو لے کے ساتھ لگا کر داسا ڈھانچا ہو گیا اور چھڑی کا سہارا لے کر کھینچنے لگا، میں نے اس سکول کی بہت  
تعلیم تھی ہے اور سکول کے نظام اور طریقہ تعلیم کے متعلق فوری معلومات بھی فراہم کی ہیں، کیا مجھے بیان ماسٹر گائیں گے؟  
"ہاں جواب سننے سے پہلے ہی کھینچنے لگا تو کئی توبہ مجھے بھی سکول میں لے سکتی ہے۔ راولپنڈی میں بیسوں سکول ہیں لیکن  
مجھے ان کے پرانہ ماحول اور غلط طریقہ تعلیم سے بڑی نفرت ہے، مجھے حالت تھوڑے بیٹھے چاہیوں، میں تو یوں بریلی میں پڑھا  
اور یوں جماعت کو فاضل، اُردو اور جنرل نامی پڑھا کر تاشا کھیں اب میں چھوٹے بچوں کو پڑھانا چاہتا ہوں....

"میں نے پوچھا کیوں؟ تو بولا۔ "مجھے پودے نہیں چاہیوں، مجھے پتہ نہیں چاہیے۔ جسے میں جہاں چاہوں اٹھاؤں گے

”سکول کی باتیں تو جو چلیں، ڈیڑھ مہینے سے سو رہی ہیں۔ منجھنے لگا۔ حجازی بابا نے خواہ مخواہ بات لہجی کر دی ہے۔ طاہرہ والا کام کی بات سنو، لیکن کیا سناؤں؟ میں تو اب بات بھی کرتے ہوئی ہوں۔ پہلے جو کچھ جھگٹا کرتی ہو، دیکھا جائے تو اس زوردار میں ہی ہوں۔ اندھا دھند تہیں تنزیں دھکیل دیا تھا۔۔۔۔۔ ڈال تو، طاہرہ! میں نے یہ بات اس لیے ابھی کہیں نہ بتائی کہ تھکادول ٹھکا کر نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ بات قبل از وقت تھی۔ ابھی تو لغیم کو اللہ شہنشاہت کرے، بے چارے کی گڑبگ نہیں رہتی۔“

طاہرہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور مزاجی کیفیت میں بھی نمایاں تبدیلی آنے لگی۔

مگر کبر کی تھی۔۔۔ ہم نے ارشد کے سارے خطوط پڑھ لیے ہیں جو وہ تباری غیر جانبداری میں ہر طرف بکھاتا رہے۔  
ہم اس کے آخری خط سے آغاز ہو گئے۔ اس کی جذباتی کیفیت دہی ہے جو برسوں پہلے تھی۔ وہ تبار سے انتقام میں  
ہے اور جانی کو دیکھ گئے جو نے ہے۔ اس کا بچہ طاہر پرویز بھی اب طاہرہ کو اپنی کولٹاں کھڑا ہے۔ باپ بیٹا تباری  
رہے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر حضرت گشتی ادھر ہم گیارہ معلوم ہوتا ہے قدرت نے تبار کے دل و روز ازل سے  
تھے تھے ادھوت کے ہاتھوں تبار کے ملاپ کا سامان پیدا کر دیا ہے۔ میں تو مجنونا چند دن جو نے ارشد کو خط لکھنے لگی تھی  
طاہرہ کو لے جاؤ لیکن تبار سے بھائی جان سے بات کی تو وہ کہنے لگے کہ تم سے پوچھ لیا ہے کیوں نہ تم اپنے ہاتھ سے  
دھو۔۔۔ آج آج تارے تو روز نگیاں بھر سے مسکرا اٹھیں۔

ظاہر و کاسر جھک گیا تھا اور دو گہری سوج میں پڑی ہوئی تھی۔ پندرہ روز ہو گئے تھے کہ خبر نے اسے ارشد کے خطوط دیتے تھے جنہیں پڑھتے اس نے ارشد کو اپنے قریب مسموں کا تھا لیکن اسے ممانع اور اس کی ماں کا خیال لایا گیا تھا۔ اُس نے بھل دل سے خطوط پڑھ کر کجبر کو نواسیے تھے۔ ارشد اس کے خیالوں میں سمایا رہا تھا لیکن شادی کے خیال سے اُس نے دل میں دعا کی تھی کہ خدا کرے۔ ارشد سامنے نہ آئے۔ دو روز تجسس بٹا تو رُخا بھی باہنہیں قدرت نے توڑا۔ اداں میں دوبارہ گرفتار نہیں ہونا چاہی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی سکول کے بچوں کے لیے وقف کر دینے کا عزم فرمے تھی۔

”کیوں؟ خاموش کیوں ہو گئی ہو؟“ نجم نے پوچھا۔ ”کہو تو میں خط لکھ دیتی ہوں۔“

”نیل بابا! — ظاہر ہونے دکھ بھری عینک کے گھماؤ نہ لکھو۔ ان باتوں پر اب مٹی ٹال دو۔ جیسے نعیم مر گیا ہے میں اس سب سہم گئے ہیں۔ مجھے ارشد عفت اور ظاہر پرور کی یاد نہ ملاؤ میں نے بڑی ہی جدوجہد اور بڑے ہی استقلال سے کراچی میں کھینچا تھا۔ مجھے اب آزار اور سب سے دوں میں اچھی طرح جانتی ہوں ارشد کس حال میں ہے۔ مجھے یقین ہے وہ تمام عمر میں کرے گا لیکن وہ زفرہ تو ہے مجھے اس بات کی خوشی اس لیے اٹھ اٹھتا ہے کہ وہ زفرہ ہے۔ اگر نعمت شادی نہ کرنا تو وہ رہتا ہے۔ مجھے امید ہے ارشد مجھے بھول جائے گا اور اپنے پیشے کے لیے زفرہ رہے گا میں جانتی ہوں وہ شادی نہ کرے میرے ساتھ نہ کسی اور کے ساتھ، ورنہ ارشد وہ ارشد نہیں رہے گا۔ اس نے بھی شادی کر کے دیکھ لیا ہے، شادی نہ کر کے دکھ لے لے“

میں نے کہا۔ آپ نے پیار تو اپنے بچوں کی طرح کیا تھا۔ بابا میں بڑا اور بولا۔ یہ سب بچیاں میری ہیں۔

دو کچھ تجزیہ ہو گیا میں نے دکھا اُس کے چہرے کا ناخوشدِل لگتا تھا جلی سیاہ لے کر کھینے لگا۔ مِس صاحبہ انہوں  
تو مجھے ہر پختے سے بیدار سے لیکن بچوں کا تو میں دوا نہ ہوں۔ اُن بچوں کو بڑے بڑے کماں کماں کی ٹھوکریں کھانی میں  
جانے ان کے چہاگ کیسے ہیں۔ اکثر اچھے نہیں ہوتے۔ اُن ماں باپ کے سر پر ہیں تو کل خانہ دوسرے سال کے چم کر مِ میں چلی  
جائیں گی۔ لڑکیوں کی قسمت میں ہنسنا کم اور دنا زیادہ لکھا ہوتا ہے۔ خداوند کی کا لچا ہوتا ہے۔ یہ یاد دعوہ نہ مٹی اور دو یادگار کرتے  
ہیں۔ رعنا رکھنا، مِس صاحبہ! میں نے لہجی کا میں شرف کر دی ہے۔ بچوں کی عمر ہوتی ہے کہ انہیں زندگی بھر کا پیار دے یا  
جانے رہا پس چلے تو ان تمام بچوں کو بڑا ہونے ہی نہ دوں اور سب کو اپنی شفقت کے ساتھ میں رکھ لوں۔ بڑھے! اُن کے  
پاس ہے ہی کیا؟ اُن کو پتہ نہ تھا کہ انصیب ہوئی رہیں، نہ ہی میری بی بی میں تو میں صاحبہ! دل کی بیانیں بکھانے سکول آج ہوں۔ میرے  
دل دودھ نے مل کر ساری دنیا دل سے تعلیم دینے کا طالعہ اُس کا کر لیا ہے۔

”ظاہر! اس روز میں اسے کچھ بھی لانی تھی۔ بے چارہ دل میں کوئی دکھ لیے بھرتا ہے لیکن اپنے متعلق بتانا کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میں ربی سے محبت کر کے آیا ہوں۔ دنیا میں تنہا آتا تھا۔ تنہا ہی راتوں تنہا ہی رہوں گا۔“

”رہتا کہاں ہے؟“

”سکول والوں نے اسے کوارٹر دے رکھا ہے“

”ارے؟ سکول والوں نے کوارٹر بھی بنائیے ہیں؟“

”ہاں!۔۔۔ بخیر جواب دیا۔“ اب تو سکول کا جوشیل بھی بن گیا جسے ہمیں پچاس ساڑھ روپے اور دو کلو ایک اگک رہتے ہیں جوشیل کے ساتھ چھ کوارٹر دیتے گئے ہیں تین استانیوں کے لیے اور دین ماسٹروں کے لیے ایک میں چوٹی بلا رہتا ہے۔ اس کا کھانا وغیرہ جوشیل میں ہی پکاتا ہے۔ مجھے تو اتنا اچھا لگتا ہے کہ میں نے اسے کہا تھا کہ ہمارے گھر میں رہے لیکن وہ کہتا ہے کہ تنہائی زیادہ اچھی لگتی ہے۔“

”معلوم ہوتا ہے اس کے خوش واقارب فداوات میں شہید ہو گئے ہوں گے جن میں پہنچے بھی ہوں گے۔“ علامہ نے قیاس آرائی کی۔ ”غافل کی تسکین کے لیے اس نے منکول کے پتھروں سے پیاد پیکار کیا ہے۔ زجانے کتنے بچوں کا مات دادا ہوگا۔ بٹاؤں میں ایک اندھ سے مسیحا کو کھسے اسی کیفیت میں دیکھا تھا۔“

”بات کچھ ایسی ہی ہے۔“ مجھ نے تائید کی۔ ”اپنی آنکھوں کے سامنے یہ بچوں کا قتل وہ دن.... اللہ بچائے یا اللہ تو بے نیاز ہے۔“ مجھ نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”بے چارہ بڑا بھلا آدمی، اس عمر میں جا کے کئی جانیں اپنی آنکھوں کے سامنے گلین میں بڑھتا ہوا آگ کا لکڑیوں کو دہتا تھا مجھے بری ہے۔“ اس نے صرف ایک منہ نہرا ہے۔

”غلط کہتا ہے۔“ حارثہ نے کہا۔ ”وہ ان کہاں بول کر دھڑکا نہیں جانتا، یاد نہیں کہنا چاہتا، خیر جانے دو عزیز کیا ہوا کہ اسے کل ملے گئے۔ مجھے ابھی ہسپتال بڑی تھکی لگتی ہیں، سکول کی کوئی اور بات سناؤ۔“

”لیکن ہمتاری اور ارشد کی شادی تو ان دونوں شادیوں سے مختلف ہوگی ظاہر ہے۔“ نجمہ نے دلیل دیتے ہوئے۔  
 ”وہاں عفت تھی، یہاں نعیم کی ماں کی ویسی لگی۔ ہمتارے اور ارشد کے درمیان تو ایسی کوئی بات پیدا ہوئے کا  
 ہی نہیں ہے۔“

”ابا! آپ ارشد کی ماں اور بھائی کو بھول گئی ہیں؟“ طاہر نے طنز پر لہجہ میں کہا۔ ”یوں تو چھ سال سے بڑا  
 گزر چکا ہے لیکن خدا کی قسم ان کی باتیں ابھی تک میرے کانوں میں اس طرح گونج رہی ہیں جیسے آج صبح ہی انہوں نے یہ بات  
 کہی تھی۔ ان کی نیت اور اخلاق ہندی تو قوم دونوں پر لکھے ہیں میری ساس سے وہ کسی پہلو کو نہیں۔ یہ تو اللہ کا شکر۔  
 آپ یہاں موجود ہیں ورنہ میں تو لاہور میں ہی کراہ کر مر جاتی۔“

”ظاہر وہ روز مارا اور وہ حالات ہی اور تھے۔“ نجمہ نے کہا۔ ”اس وقت عفت کا وجود سارے قتلے کا  
 تھا۔ اب تو وہ بات ہی ختم ہو گئی ہے۔ اللہ جانتا ہے میں لاہور ارشد کے گھر گئی تو اس کی اتنی اور بھائی نے دور دور کر تہیں کیا  
 تھا۔ بھائی نے تو یہاں تک کہا تھا کہ ظاہر کیا یاد کرے گی کیے لوگوں کے گھر جا چنسی تھی۔ وہ کتنی تھی ارشد کو تو چھوڑ دینا  
 کابست فکر ہے کہیں غراب ہی نہ ہوتی پھرے۔ وہ تو ظاہر اسٹینجیں بھا کر ہمتاری راہ دیکھ رہی ہیں۔“

”صرف اس لیے کہ یہ ان کے بیٹے کی زندگی اور خوشی کا مسئلہ ہے۔“ طاہر نے تیز ہو کر کہا۔ ”اگر ارشد ان کا  
 مرضی کے مطابق شادی کر لے تو ظاہر ان کے گھر کے سامنے بیسی مر جاتے تو وہ پانی نہ پوچھیں۔ ابا! میرے ساتھ ہو  
 انہیں کیا دل چاہی ہو سکتی ہے؟ ہاں میں آپ کو عفت مرحومہ کی ذرا سی زبان ملی تھی تو انہوں نے مجھ سے اتنا بھی نہ پوچھا تھا کہ  
 لڑکی کیوں اس طرح کہتی ہے؟ لیکن عفت ان کی بہو تھی تو اس لیے مجھے بیگانہ سمجھ کر ایک سانس میں مجھے طوافت تک کہنا  
 دیکھ تو یہ ہے کہ انہوں نے میری ارشد کی روحانی محبت کو راکھ کر دے کر مجھے بھی گریز نہیں کیا تھا۔“

”تو اس کا ایک ہی علاج ہے۔“ نجمہ نے ذرا سوچ کر کہا۔ ”کہ ارشد کو پہلے اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ  
 باپ سے الگ ہو جائے۔ وہ یقیناً ایسا ہی کرے گا بلکہ اس کے ابا جان اور بھائی قسمت اسے خود ہی الگ کر دیں گے۔  
 ”لیکن وہ اس کی ماں اور بھائی کا گلا تو گھونٹ سکیں گے۔“ طاہر نے جواب دیا۔ ”ہم ان کی دسترس سے لڑا  
 نہیں جا سکیں گے۔ وہاں بھی وہی الزام تراشیاں شروع ہو جائیں گی تو میں نے ان کے بیٹے کو ان سے الگ کر دینا چاہا تو میں ہی ملے

طوفان کی وجہ میری ساس کا بھی وہم تھا کہ میں نے اس کے بیٹے پر قبضہ کر لیا ہے۔ پھر اس وہم سے وہ روز نہیں ملے  
 کہ نعیم ال کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ ابا! میں نے ایسی باتیں کہی نہیں سوچی تھیں میں تو ہر طرح کے انسان  
 ساتھ بنا کر رکھتی ہوں لیکن اس ایک شادی نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ انسانی فطرت بڑی وسیع اور پھری ہے۔ انا  
 کوئی حد نہیں۔ نہ جانا ہے اس کی کیا کیا آگستا اور اس میں کیا کیا سما جاتا ہے۔ ابا! اس کتاب کو اب بند کر دو۔ یہ ڈراما

ختم سمجھو۔ آج ارشد ظاہر پر گورگوں کے کرہٹس تو لینا ہے۔ شادی کے بعد اس کی بہو بھی ختم ہو جائے گی اور ظاہر بڑا  
 کی کلجی ہو سکا۔ اب اس کو بھی ترس جائے گا اور اگر سچے کو محو کی سازش ہو گیا تو یہ عزتیں کم کر دیں گی کہ سوئیٹ مال اپنے کاغذ  
 رکھتی۔ خدا کے لیے ابا! ارشد کو زندہ رہنے دو۔ اس کے بچے کو ہنسنے بھیلنے دو۔ ارشد مجھے یاد کرنا ہے اور میں اسے

رج یاد کر رہی ہوں جس طرح نعیم کو اس کیفیت میں جو لذت ہے وہ قربت میں نہیں، وہ روز بھی مر جاتا ہے، میں بھی مر جاؤں گی  
 اور ظاہر کچلا جائے گا۔ ارشد کی ماں اور بھائی اگر ارشد کے لیے پریشان ہیں تو ہمیں پریشان ہی رہتے۔ وہ وہ کچھ یاد ہیں تو  
 میں سمجھتا ہوں۔ وہ وہاں زبان کے گناہوں کی سزا اٹھاتے ہیں۔ ارشد میرے انتظار میں زندہ ہے اور اپنے بچے پر جان  
 اگر دے۔ اس میں میں وہ بچے کو بھی تعلیم و تربیت دے رہا ہے۔ میں ارشد اور نعیم کی ماں زندہ رہوں گی اور سکول  
 کے بچوں میں لگ رہوں گی ابا! ہم دونوں کو زندہ رہنے دو۔ اب سکول کے بچوں کی تعلیم و تربیت میری زندگی کا مشن بلکہ بنون بن  
 با ہے۔ خدا کے لیے ابا!۔ طاہر نے ہاتھ جوڑ کر تعجبی انداز میں کہا۔ ”کیوں ارشد کو میرے یہاں آنے کی اطلاع نہ  
 دے دنا۔“

”اگر ارشد بغیر اطلاع آگیا تو؟“ نجمہ نے پوچھا۔  
 ”اگر ارشد بغیر اطلاع آگیا تو...“ طاہر نے زیر لب کہا اور گہری سوچ میں کھو گئی۔ سوچ گہری ہوتی گئی۔ نجمہ بھی  
 اوش ہو گئی۔

نجمہ کو تو قحیح تھی کہ ارشد کا نام لینے کی دیر ہوگی اور طاہر ارشد کو فوراً لکھ دے گی یا ہند کر کے جلدی کھوا دے گی لیکن  
 ان رنگ میں بدلا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ طاہر کو کچھ لکھ کر دے، اس کے پیچھے ایک عزم ہوتا ہے۔ طاہر کے کارائوشیت  
 سے تو وہ خود بھی متاثر تھی۔ اس کے علاوہ مجھ کو کہہ رہا تھا کہ طاہر کا جو حال اس کی ساس نے بنا دیا ہے کچھ اتنی قسم کا حال  
 شد کی ماں اور بھائی بھی نہ سکتی ہیں۔ اسے ان دونوں عورتوں کا وہ رویہ عجولانہ نہیں تھا جوا انہوں نے عفت کی باتوں میں اگر  
 نیا کر تھا۔

ظاہر وہاں سوچ میں سر جھکا ہے جو تے تھی اور غرا چنے خیالوں میں لکھ گئی۔ اسے طاہر کی پہلی شادی کا انجام پریشان  
 رہا تھا۔ اسے اپنے آپ میں شرمساری بھی محسوس ہوتی تھی کہ یہ شادی اس نے اپنے ہاتھوں ملے کر دانی تھی۔ کچھ بگاڑ تو نعیم  
 مال میں لگی تھی۔ غرا چنے اپنے آپ کو بھی جرم سمجھتی تھی کیونکہ اس نے نعیم کے لواحقین کو دیکھ بھالے بغیر طاہر کو کنوئیں میں چھینک دیا  
 غا اور اب وہ پھر اس قسم کے جرم کے ارتکاب کو تیار ہو رہی تھی۔

اس نے طاہر کی دلیلوں کے علاوہ اس حقیقت پر بھی غور کیا کہ ارشد کی ماں نعیم کی ماں جیسا سلوک کرنے کی اہلیت رکھتی  
 ہے۔ اسے یہی احساس تھا کہ طاہر وہ ایک موتی ہے جس کی چمک کو کوڑے کرکٹ میں نہیں چھپا جاسکتا ہے۔ اس نے خدشہ  
 ہوں کیا کہ یہ قدیل بھی نہ رہ جائے کہیں ایسا نہ ہو۔ سو سکتا ہے ایسے ہی ہو جو کہ۔ اپنے ارادوں کی تکمیل کے بعد ایک خلوہ  
 لکائی دے رہا تھا جس پر اس نے پہلے زیادہ غور نہیں کیا تھا لیکن طاہر نے اس طے کے کی تفصیلات سن کر سمجھ کر گہری سوچ  
 لڑاں دیا۔

ظاہر نے لوں کو فوجد کر لیا تھا کہ اب شادی نہیں کرے گی حالانکہ اس کے سامنے ارشد اور عفت ارشد چاہیں  
 س پہنچیں مگر کوئی کاوت حال نہیں تھی۔ ”لیکن ارشد بغیر اطلاع آگیا تو؟“ نجمہ کا لہجہ تو اس کے ذہن میں عید گیاں اور  
 نوازی پیدا کرنے لگا۔ اس نے جھوٹ کہا تھا کہ وہ ارشد اور عفت کو بھول چکی ہے۔ اس نے مجھ کو لے کر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہل کے تھیں میں مجھ کوں کی.... دیکھو بھرا! ظاہر کے اس جنون کو شادی کے بچہ بچوں میں نہ چلو جہاں تک اس کی جوانی  
 ہے وہ تیار نہیں ہوگی، بلکہ اس میں سے کئی جوانیاں چھوڑیں گی۔ اس جنون اور جرنالی کو وہ اب سکول کے بچوں کے لیے  
 کرے گی۔ یہ ایک عجیب و غریب نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے۔ بھرا! ظاہر میں مقام پر پہنچ چکی ہے۔ دو عام انسان  
 ہوں سے بہت دور ہے، بہت اونچا، یہ مجھ کوں کا احساس بڑے کم احساس ہوتا ہے۔ اسے تعمیری کاموں میں  
 دل کرنے کے لیے ظاہر جیسے کردار کی ضرورت ہوتی ہے اور جیسا کہ تم نے مجھے ارشد کی شخصیت کے متعلق بتایا  
 میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس کی ذات میں بھی واقعی خدا عبادی اور ظاہر والی صلاحیتیں ہیں تو وہ بھی تیار نہیں ہوگا بلکہ تیار  
 نہ والوں کو تیار ہی ہے بجائے گا۔ وہ بھٹکے گا نہیں۔ ذرا غور کرو بھرا! چھ سال اس عرصے میں ارشد دنیا کو ہی بھول چکا ہے۔

کی جتنی کج غرضانہوں نے اکٹھے طے کیا تھا اس غور کو اور مہفوز کو مسافر ساری عمر نہیں بھول سکتے تھے مسرت کے ہوں  
 یا ملال کے، ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔ ظاہر کو ارشد اور عفت یاد آتے تھے تو اس کے ملق میں گولا سا ایک جاتا تھا پھر اگلے  
 ضرور ہوتا تھا کہ ارشد کا پھر وہیم کا چہرہ بن جاتا تھا۔ ظاہر کے ملق میں اسکا ہوا گولا دل پر جا پڑتا اور اس کے انسو بہنے لگتے تھے۔  
 سکسکل نکل جاتی تھیں۔  
 کلیں میں ارشد کے ساتھ بھی شادی سے انکار کر سکوں گی؟ — ظاہر نے اس سوال پر غور کیا تو اس نے اپنے دل سے  
 ایک دم محسوس کی — "شاید ایسا ممکن نہ ہو۔"  
 وہ کچھ دیر اس شش شش بیچ میں پڑی رہی بھرا! وہ اہلی تو ظاہر جو تک اٹھی اور بولی ہے پانڈا کر رہی ہے جس سکول میں جاتا  
 ہے سو جا میں۔ بھرا! ذرا سوچئے۔  
 "ارشد کے ساتھ شادی کے متعلق؟"

"نہیں! یہ تو سچے سچے کوہن شادی نہیں کروں گی۔ ظاہر نے اٹھتے ہوئے کہا — "میں ارشد کے بغیر اظہار  
 چلے آئے کے متعلق سوچ رہی ہوں کہ یہ صورت کس طرح روکی جاسکتی ہے یا اس صورت کا سامنا کس طرح کیا جاسکتا ہے۔...  
 جا میں اپنے گھر سے ہیں۔ ظاہر نے سنجیدگی سے گفتگو سے کہا — "جلدی جا میں۔ اظہر جانی جان کو بستر ویران ویران سا لگا  
 رہا ہوگا۔"

بھرا! یہ ایک کراسے دوہر لیا اور اس کی پیشانی پر طولی بوند دے کر کہا — "بڑی پیاری بہن ہو ظاہر، لیکن ارشد  
 بھی تو میرا بھائی ہے، اس کا میں کیا کروں؟"  
 "جا میں غم میں مارے دیکھا جائے گا۔" ظاہر نے ٹھکراتے ہوئے کہا — "آپ کا ایک بھائی تو دیکھ لیا اب  
 دوسرا دیکھا ہے۔"  
 بھرا! اپنے گھر میں بیٹھ گئی۔

"عجیب لڑکی ہے۔" اظہر نے بھرا کی زبانی ظاہر کو کہیں، باتیں، جذبات اور احساسات سن کر بے ساختگی سے کہا  
 اور جھوم اٹھا۔ "نزدہ باز۔" اور بولا — "بھرا! یہ باتیں غوطہ میں، ظاہر کو فیصلہ کرنا ہے اور قابل قدر۔"  
 "لیکن سوچیں تو۔" بھرا نے کہا — "ذرا اس پہلو پر بھی غور کروں کہ ارشد کی عمر تیس ہے، وہ بھر جو جوانی کی عمر میں ہے  
 اور ظاہر کو دیکھئے، اٹھائیس برس کی ہے اور ابھی کنواری لگتی ہے، کیا ظاہر کے فیصلے سے وہ جوانیاں تیار نہ رہ جائیں گی؟  
 یہ جی نہی کے کہ ان دل بات ہوتی کیا ایک دوسرے سے کتنے قریب اور بڑے سے کس قدر مجبور میں تو خدا کی قسم سوچی بولا  
 تو دم ٹھٹھنے لگا ہے۔" وہ جا میں تھک رہی ہیں۔

"یہ غلط ہے۔" اظہر نے کہا — "محبت ایک عجیب جنون ہے، میرا مطلب فلی قسم کی محبت سے نہیں میرا مطلب  
 اس دلانہ اور بے لوث محبت سے ہے جو ارشد اور ظاہر کے درمیان ہے۔ ظاہر نے بالکل درست کہا ہے کہ ارشد  
 میرے انتظار کی دھن میں اپنے بچنے کی پورش اور تعلیم و تربیت میں لگ رہے گا اور میں ارشد کی محبت اور نسیم کی یاد کے جنون

لے کے سکوت میں گرگوشیاں تیرنے لگیں۔

ظاہرہ امیرا ظاہر پرور تھیں بلارٹا ہے۔

پروریز سے مجھ دو ارشد! ظاہرہ امی بھی گم گئی ہے۔ وہ نہیں آسکے گی۔

اں ظاہرہ! تم زندہ ہو میں جاننا ہوں تم زندہ ہو۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں زندہ ہوں۔

ما میر سے ارشد! لوگوں نے ظاہرہ پریشی ڈال دی ہے۔ وہ ظاہرہ مر گئی ہے جو تہناری تھی۔

ناجی ظاہرہ! وہ چاندنی راتیں نہ بچھو یاد ہے تم سے، تم نے مجھے کیا کیا تھا؟

ناادلاؤ مجھے وہ باتیں ارشد! وہ خواب کی باتیں تھیں میں نے ان چاندنی راتوں کو یادوں کے حوالے کر دیا تھا اور میری قبر میں دفن کرانی ہوئی۔

اں ظاہرہ! تم نے جھوٹ تو کبھی نہ بولا تھا؟

میں ارشد! میرے قریب نہ آؤ۔ میں اب ایک جھوٹ کے سہارے زندہ رہنا چاہتی ہوں۔

رگوشیاں بلند ہونے لگیں۔

شاؤ میرے قریب ارشد! مجھے آزاد رہنے دو۔

ہوئے تصور میں دیکھا کہ ارشد نے ہمیں پھیلا دی میں اور ظاہرہ کھچی ہوئی کھیر کے گھیرے میں ملی جا رہی ہے۔

ارشد! مجھے بخش دو۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے اب آزاد بننے دو۔

ہوئے اپنے پاؤں اکھرنے سے زویتے تصویر اداں ہو گئی کمرے کا سکوت گہرا ہو گیا۔ ظاہرہ تصویر کی آنکھوں میں

نئے پتھر کی ریت کی عذبات کی لہریں اونچی ہو جو کمرے کی تھیں اور ظاہرہ گڑگڑا کر اٹھ رہی تھی رات گزرتی جا رہی تھی۔

نہایتی آنکھوں میں بھی آنسوئیں میری آنکھوں میں بھی آنسوئیں۔ تجھے میرے آنسوؤں کی قسم، اب ہم ایک دوسرے

میں گئے کہو منظور ہے کہ دو ارشد! منظور ہے۔ دیکھو تہناری ظاہرہ تم سے الگ کر رہی ہے کہ وہ میں تہناری

ناول گاؤ۔

ہاں ناؤں؟

اں کوئی نے بتایا یہ نہیں کہ میں بوجھ میں ہوں میرا سایہ بجا رہی ہے میں چڑیل ہوں ہنوس ہوں۔ ظاہرہ پروریز

مانے سے بچا رہے تھو، ارشد!

ما ظاہرہ تم باگلی ہو تم میری نہیں ہو۔

ہوئے سر کر دو۔ سے جھکا دیا۔ ریو۔ سے پیش پا پنجن نے زور سے دل دی تو ظاہرہ نے بول کرے میں دیکھا

ارشد! رو سے جھٹک اٹھا۔ اس نے گرد پیش کا جتنز لیا۔ خارجی دینا کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑنے لگیں۔

شیش پریل کا گلائی کے شنت کرتے جوئے ڈبے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ سبکی گھر کے انجن

اوپر بوم کی آوازیں رات کے سکوت میں تیر رہی تھیں۔ اسکے ڈکے تانگے کے گھوڑے کی ٹپ پٹا پٹا بھی

اٹھارہ نمبر نے آپس میں باتیں کر کے سینے ہلکے کر لیے اور وہ گہری فہم سو گئے لیکن ظاہرہ نہ سو سکی بچہ کا بچہ اٹھ

میں بچوں کی محسوس فہم سو رہا تھا اور ظاہرہ کی فہم ہی کہیں جا کے سو گئی تھی۔ یہ تو اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ شادی نہیں کرے

لیکن بچہ کا یہ سوال۔ "ارشد بغیر اطلاع آگیا تو؟" اس کے سامنے ایک چٹان بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ظاہرہ نے نالہ

اپنی قوت ارادی کو پرکھا۔ اپنی خودی کو بچا لیکن تصور میں ارشد آیا تو اسے یوں لگا جیسے اس کا عزم جذبات کے بگولوں میں

میں آگیا ہو۔ اس کی قوت ارادی جواب دے گئی۔ اس نے ارشد کے تصور کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اسے

فات کی سبکی نشانی دی۔ "نہیں نہیں۔ ارشد بغیر اطلاع آگیا تو میں اس کی خواہش اور خواہوں کا خون نہیں کر سکوں گا۔

اس نے لیٹے لیٹے اپنے آپ کو حوصلہ دیا لیکن ارشد کا خیال اس کے ذہن اور اعصاب پر قابض ہو گیا۔ وہ ہاں

جھٹک رہی تھی لیکن بے سود۔ وہاں ٹیڈی اور جیسے بے خیالی میں سوٹ کیس میں سے ارشد کی تصویر نکالی، پھر کمرے میں

تصور کو مزید پرکھا۔ یہ تصور اس نے مسکندہ کھچی تھی پہلی نظر میں ہی اس کے جسم نے جھجھری لی۔ اس نے بچی جانے

کو آنکھوں سے اوچل کر دیکھ لیا کہ نہ تھا۔ دیکھ لو۔ ڈراسی دیکھ لو۔ دیکھ لینے میں تو کوئی عجز نہیں۔

ظاہرہ تصویر کے غم دعا میں ٹھوکتی اور اپنے آپ کو کھلا بیٹھی۔ وہ ذہنی انجمن سے اٹا گئی تھی۔ ذہن جھٹک کر ارشد

گدا تصور میں سست نہ لگا۔ ظاہرہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ اس کی ذات جیسے ارشد کی ذات میں تحلیل ہوئی جا رہی تھی نص

نے سوئے ہوئے احساسات جگا دیئے تھے۔ جسے وہ بھتھی تھی بھٹھا بیٹھی ہے وہ آگ چھل اٹھی۔ چھوڑی ہوئی منزل میں

توں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ارشد کی مراثی کی بات کی طرح تادہ ہو گئی۔ وہ اس کی مراثی بات اگل جاتی تھی لیکن ارشد کا

اویا داس کے لاشعور کے منبع پریش میں محفوظ تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ذہن لاشعور وہ سپت ہے جس میں ہر چیز اور غلط

وہم تک محفوظ رہتا ہے، جسم نہیں ہوتا۔

غذبات و صرف جذبات کی لہریں اٹھاتیں اور ظاہرہ ہلکے لے کھانے لگی۔ اس کے سامنے ٹیبل لمپ کی روشنی تھی

جوتی تصویر میں حرکت ہوتی اور تصویر بڑی ہوئے لگی، پھیلنے لگی اور تصویر پورے قد میں آکر سرکاری۔

"ظاہرہ اب آجاؤ۔ میں نے جوانی کے طویل سال تہنارے انتظار میں گزار دیئے ہیں۔

"جھول جاؤ ارشد! اب ظاہرہ کو جھول جاؤ۔

رجوگی۔

اس نے بغیر سرٹھا تے انھیں کھلیں، لپکس ہوئے ہوئے اور اعلیٰ طاہرہ نے دیکھا کہ جس تصویر کو اس نے ان رکھ  
تھا وہ سیدھی پڑی تھی اور طاہرہ کے ہونٹ تصویر سے چپال تھے۔ اسے یاد آیا کہ اس وقت اس نے تصویر کو سیدھا کر لیا تھا  
میرا کہ نہ کسی بھی ہوگی تھی اور وہ تھی دوسرے اس پر ہونٹ رکھنے ہوئے تھی۔

اس نے ایک جھٹکے سے سر اوڑھ لیا، تاہم اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سر پر ہاتھ لگا کر دیا تھا، جو اور  
بہتر تھا۔ اس کے ہونٹ جیسے تصویر کے ساتھ چپک گئے تھے، طاہرہ نے اپنے آپ میں ایک کوئی سی  
لہجے کی کیفیت محسوس کی۔ وہ اسی حالت پڑی رہی، اپنا کاس کا شوق مکمل طور پر بیدار ہو گیا۔ سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ وہ رات بھر

آپ سے تصویر کے ساتھ تیس گھنٹے رہی ہے۔ اسے سخت محسوس ہونے لگی اور اسے پسینہ آ گیا۔ اس نے جھٹکے سے  
آپ کا رخ اٹھایا۔ اسے کسی حد تک مضحکہ آنے لگا تھا جیسے وہ اس وقت کے مقابلے میں کھڑی ہو گئی ہو جس نے اسے  
ایک سال کا دوسرے لمحے اس نے اپنے آپ کو فرش پر دوڑا پایا، قید لڑو، ہاتھ دھاوا کھانے ہوئے اور اسے اپنی آواز سنائی  
دی۔

”یا خدا! یا میرے اٹھائے مجھے نجات دے۔ یا خدا!... اس کی آواز اس طرح بلند ہو گئی جیسے ٹھاس کے سامنے محسوس  
کے روپ میں کھڑا اس کی آواز سنائی دے۔ سن رہا ہو۔“ یا خدا! طاہرہ نے دانت میں کڑکایا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ کیا اس کے  
کے ہونٹ لڑ رہے تھے اس کے سینے سے نکلا۔ ”یا خدا! اور اس کی آواز بھر گئی۔

اس کے اعصاب مڑھل حال ہو چکے تھے، سر میں گرانی اور دل دھڑلے سے دھڑک رہا تھا، چنگے قریب ہی تھا، وہ فرش پر  
بٹھے بیٹھ چلا، اس کی طرف بھکی اور سر ہلکے پر رکھ کر ٹھونچ بھونچ کر دو گئے۔

مسجد سے ٹھونک کی آواز آ رہی تھی اور اوپر لڑی کے سکوت میں حدس ارتعاش پیدا ہو گیا۔ سرخ کبھی کے اذانیں دے رہے  
تھے، طاہرہ نے اپنے کنبے کے دھول پر دو ہاتھیں کاٹیں، اس نے اس کو کھینچ کر اٹھا کر دیا، اس نے سوچا یہ  
رات کی بات کی طرح دیکھ رہے لیکن یہ دونوں ہاتھ اسے سمجھ رہے تھے، طاہرہ کے کنبے پر رہے تھے۔

”طاہرہ! طاہرہ!“ اس کے کانوں میں بگڑی آواز پڑی اس نے سر اٹھایا اور آہستہ آہستہ اٹھی۔ اس نے دیکھا کہ ٹھاس کے  
اٹھ گئی تھی۔ طاہرہ تیزی سے گھومی اور سب سے پہلے دیکھ کر ہوا اس کے سینے میں چھپا لیا۔

”اچھا! خدا کے لیے ارشد کو میری اطلاع نہ دینا۔ اللہ ترے بچوں کو زندگی دے دے، اچھا! مجھے ارشد سے بچانے رکھنا، وہ  
اسنے آیات میں انکار نہ کر سکوں گی۔“

مجھے اسے تسلی دی کہ اس کی مرضی کے مطابق ہی ہوگا لیکن طاہرہ روئے جا رہی تھی اور بار بار التجا کر رہی تھی۔ ”سنبھل گیا!  
میرا کہ نہ کسی بھی ہوگی تھی اور وہ تھی دوسرے اس پر ہونٹ رکھنے ہوئے تھی۔“

اور اس نے مجھ سے نہ جانے کتنی ہی قیاس لے لیں، طاہرہ کو قدرے سکون ہوا۔ وہ لیٹ گئی اور گھنٹہ بھر سو لیا۔  
مجھ نے جب طاہرہ کی اس حالت کا ذکر کیا تو اس نے مجھے خبر سے کہا۔ ”اب بس اس کو چھوڑنا، یہ کیا ہے۔“

سنائے دے رہی تھی۔ ان مختلف آوازوں میں یہ سیدھیت تھی، تمام آوازوں کی سر اور نال ایک ہی تھی جیسے قدرت نے اسے  
نفسے اور ایک نال پر منظم کر دیا ہو لیکن سچ یہ نفسے اور اس تھے۔ شرتال میں یا سیدھیت تھی، طاہرہ تڑپ اٹھی۔ ”نہیں! اب  
نہیں کروں گی۔“

اس نے تصویر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، ساتھ ہی اس نے تصویر کو ایک طرف کر دینے کا ارادہ کیا، لیکن  
تقریب اور اس کے ارادے تصویر کی منکرائی نگاہوں میں مرقعہ ہو گئے۔ پھر وہی جذبات اور طاہرہ نے  
”ارشاد! عہد کر لیں کہ ہم دُور دور رہیں گے، ورنہ تم بھی مر جاؤ گے میں بھی مر جاؤں گی تم طاہرہ پر دینے کے لیے غم  
کیوں پھنپھن رہے ہو؟ سنو، ارشد! خدا کے لیے میرے سامنے نہ آنا۔“

جانے دے دیا کہ کتنی ہی تھی کہ ان کے بچہ وصل دی تھیں، طاہرہ اب محسوس دنیا سے بہت دور پہنچ چکی تھی، رات گزرنا  
پشاور سے آئی ہوئی پاکستان کبھی کی چپکلی تھی، طاہرہ پریم کو خانی کی حالت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

”دور خوں کے پتے ہرے ہو گئے ہیں، دور خوں کو ڈر لگ گیا ہے، شاخوں میں گھونسلے آباد ہونا شروع ہو گئے ہیں،  
آؤ ہم دُور دور کو ڈر لگتے ہیں، کھانا پتے بھر جائیں گے، گھونسلے اجڑ جائیں گے، رُت آئے گی، رت جائے گی، گھونسلے  
کے لیے گھونسلوں کو بھر دیا کر کے لیے۔ ارشد! آؤ عہد کر لیں کہ ہم دُور دور سے فطرت کا قیام نہ دیکھتے ہیں، گھونسلے  
دوسرے کے قریب نہیں آتے ہیں گئے۔ زندگی گزری جائے گی، آؤ اور دُور کے لیے جسے، الگ، الگ دُور کر لیں، الگ دُور  
ہو جائیں، تم نعمت کی طرح گھونسلے جاکر گہری فیزد سو جاؤ، طاہرہ پر دینے ہی زندگی اجڑ جائے گی، ارشد! اس کی محسوسیت دُور  
ہم دونوں کو کوئی مل بیٹھنے نہ دے گا۔ دونوں کو کسی نے ملنے نہیں دیا کبھی، ارشد! یہ درخت کے پتے تو بیج بھر جاتے  
اور پھر برے ہو جاتے ہیں۔“

نندہ کے غم سے، ارشد کی یاد نے، ارشد سے ستا دی، ذکر کرنے کے فیصلے نے اور ارشد کے ایک سال سے  
کے خوف نے طاہرہ کو اپنے فطری رنگ سے بہت دُور پہنچا دیا تھا۔ وہ ارشد سے دور رہنے کی کوشش کر رہی تھی،  
کی تصویر کو فطرتوں سے اوجھل کرنا چاہتی تھی، لیکن وہ اسی تصویر میں کچھ کی طرح وحشتی جلی جا رہی تھی، وہ اس قدر جذباتی تو تھی کہ  
لیکن ایک اور اس نے اس کے ذہن کے ایک اور گوشے کا نقاب اٹھا دیا تھا اور وہ جذبات مجھے جہاں میں پہنچا گیا تھا  
اور جذبات گھٹ گھٹ جا رہے تھے۔

اس نے تصویر کو اٹھا کر دیا اور تھک دھار کر سر پر چھبیک دیا، اس نے ٹھکی ہوئی خجائیک آواز میں کہا۔ ”اب نہ دیکھو  
یہ پیدا نہیں رہتا۔“

رات رنگی جا رہی تھی، ستارے ٹھنک ٹھنک گئے اور اوگھ رہے تھے، مجھ کا ننھا قیسری بار کوڑے بل چکا تھا تھے  
چھوٹے بھائی کے رونے کی آواز مجھ کے کمرے سے آتی تھی اور وہ دودھ پی کر کبھی کبھی چلا تھا اور طاہرہ سر کر رہی پرکے  
کے نظام سے قیاس تو نہ ہوئے تھی۔ لاولین شہر پر سکوت طاری تھا، تھوڑی دیر بعد اس سکوت میں کوچنچا رہا گئے۔

اتفاق یہ تھا کہ ان کے دھکیلے ہوئے مال گاڑی کے ڈوبے سائیدنگ میں کھڑے ڈبل سے ٹکرائے، طاہرہ کا  
۳۳

طابروان ازواجی ضروریات اور خواہشات سے بہت آگے نکل گئی ہے۔

”چلیے یہ طرہ برا کوسم ارشد کو طار ہو کا کلام نہیں ہونے دیں گئے۔ منجھرنے کہا۔ لیکن میں یہ بتانے سے دینی سہولت کھانا سے کبھی ارشد اور طار ہو کا آسانا سامنا ہو گیا تو طار ہو کی موجودگی کیفیت ایک نیک نڈ میں غائب ہو جائے گی اور وہ ارشد کے سامنے جھک جائے گی اگرچہ جھکی تو ارشد اسے منانے لگا۔“

”وہ دیکھا جاتے گا“۔ اظہر نے کہا۔ ”لیکن ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ طائرہ کو اس سے چھپائے رکھیں۔“

ظاہر مشکل ایک گھنٹہ سو فی گھنٹہ کے لیے جگہ لیا، ناشتے کے بعد وہ تیار ہو کر کیمبر کے ساتھ سکول چلی گئی۔ اس سے پہلے وہ ایک بار سکول کی کتبھی اور بنیہ مدرسہ اس اور انسانیوں نے اس کا استقبال بڑے جوش اور مسرت سے کیا تھا۔ آج پھر یہی حال تھا، ایک استانی بچوں کی تو دوسری درجہ لیسٹی تھی۔

ابھی کول کھینکے کا وقت نہیں مڑا تھا۔ بڑی جماعتوں کے لڑکے اور لڑکیاں ابھی سکول میں آتے تھے۔ ان میں بہت سے ظاہرہ کے پرانے شاگرد تھے جنہوں نے اس سے قسری جماعت میں پڑھا تھا۔ اب وہ دسویں میں پہنچ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے ظاہرہ کو کچھ لیا تو ان کی اس میں ظاہرہ کو اپنا حصہ کی چیز تمام لڑکیوں اور لڑکوں میں بٹھانے لگی۔ چوتھا برس گزر جانے کے باوجود قسری جماعت کا وہ زمانہ نہ بھولے تھے۔ ان کے دلوں میں ظاہرہ کا پیدل پہلے روز کی طرح زندہ تھا۔ انہیں یاد تھا کہ پشاور چلی گئی تھی تو وہ کتنے دن اُور اس رہے تھے۔ دوسری استانی کے ساتھ ان کا دل لگتا ہی نہ تھا۔ ان سب کو ابھی تک دکھایا نہ بھی یاد نہیں جو ظاہرہ انہیں سنا کر لگتی تھی۔

سکول کی کھٹائی بج رہی تھی، بچے کلاسوں میں جا رہے تھے اور کچھ لڑکے اور لڑکیاں عمارت کے گرد جمع ہو رہی تھیں۔ آپا، السلام علیکم! آپا! ادب عرض کی کہ آدین عمارت کے گرد بلڈ بوتلی جاری تھیں، رطابو نے سب کو دیکھا پھر باری باری دیکھا۔

"اور یہ تم بوا جمل..... اسے تم کو اتارنے سے تجھے اس وقت..... روحی بہمیت رہو، بیٹی، تم تو گریسا سی تھیں بات بات پر بدلتی تھیں۔ اس طرح عمارتوں نے ہر ایک کا نام پوچھا ہر ایک سے پیار کیا۔ اور ذرا سے بچے آج جوانی میں قدم رکھ چکے تھے۔"

لوگیاں بڑی شمع تھیں۔ ایک بول اٹھی۔ ”ہو! شادی مبارک ہو۔ آپ تو ایسی ہی گئیں کہ سکول کا راستہ ہی یاد نہ رہا۔ ایسی شادی بھی کیا۔“

ظاہر کے دل میں جیسے کسی نے خنجر ادا دیا ہو۔ وہ ادا اس پر گئی، مگر اسے یاد آ گیا کہ وہ بچوں میں کھڑی ہے۔ ایک ٹائٹینیں منہج لگتی اور شکستہ لہجے میں بولی۔ "اری! یہ تین کس نے بنایا تھا کہ میں نے شادی کی ہے اور نہ ہی کوئی ایسا ارادہ ہے بچو، اب پھر سکول میں آگئی ہوں۔"

”مستحانی کی خاطر آپا جھوٹ بول رہی ہیں۔ ایک لڑکی نے شوخی سے کہا۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے دلوں میں ایک بار بھر طائرِ دُکا سو یا ہوا پیارا اور جلالِ جاگ اُٹھا۔ ان کی خوشی کا اندازہ اس بات سے

३५०

برتا تھا انہوں نے کھڑے سے کھڑے طاہرہ کے اعزاز میں ایک پک بک پارا وکام بنایا۔  
 اور جب سکول کھلا تو طاہرہ بیڈ میٹرٹریس کمرے میں پہنچی تھی۔  
 ”طاہرہ! وچ برس کے بچہ رہے سے آپ بہت ہوشیار ہو چکی ہوں گی۔“ بیڈ میٹرٹریس طاہرہ سے گڑبڑی تھی۔ ”اب تو  
 اُس باپا بچوں جیسی محبت سے لے سکتی ہیں۔“

”لے تو سکتی ہوں۔“ طاہر نے ذرا سوچ کر کہا۔ ”لیکن مجھے

زیادہ لذت آتی ہے، اس کے علاوہ مجھے تجربہ چھپی جماعت کے بچوں کا ہے۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" زیدہ مسٹرٹیس نے کہا۔ "میں آپ کو چوتھی جماعت دے دیتی ہوں آپ چاہیں تو آج ہی

بارج کے میں چاہیں تو مل سے شروع کر دیں جیسے آپ کی مرضی

ظاہر نے اُسی روز چوتھی جماعت کا چارج لے لیا۔

جب تعارف کے لیے کلاس کے کمرے میں داخل ہوئی تو پہلی اُستانی جو چالیس پتالیس کے چمپے میں تھتی ہوئی۔ ”سنو کونو؟“

یہیں مس ظاہرہ امتہاری نئی آستانی:

کلاس لے بچوں کو طاہرہ کی اسکل و صورت دیکھ کر مسرت مہوئی۔ طاہرہ کی شخصیت اور خدو خال میں انہیں جاذبیت محسوس

ہوئی۔ ان سسکری ہوئی اٹھوں اور زیر لب بزم میں انیس ماں کا پیار جھلکا دھخالی دے رہا تھا۔

میں نے اس کے ساتھ ساتھ ایک اور ایک کھانا سب بچوں کو دینے لیا۔ اس کے رکھنے میں ایک جانی بچہ ماری ہوئی۔ اسے اپنا

منزل کو یاں سہو رانی آسانی اسے حاضری کا حوصلہ دلایا۔ دکھاری تھی جسے طائرہ نے رسم بطور دیکھا۔

طاہر کو کاہر دل ملنے ملائے میں گزر رہا تھا۔ اس نے میں تفریح کی گھنٹی بجی تو وہ شاف روم میں چلی گئی۔ بخمیر نے اسے کہا۔

اؤ طاسرہ! تمہیں جوڑی بابا دکھائیں۔ وہ اسے ٹھیلے میں ڈال دے گی۔

تمام استانیوں اور استاد چاتے اور گپوں میں مشغول تھے لیکن جزی بابا کی تفریح کھیل کے میدان میں بہوتی تھی یہ ممکن ہی نہ

نکاح کے خیل رہے ہوں اور جوزنی بابا ان میں موجود نہ ہو۔ طاہرہ نے دور سے ہی پہچان کر وہ چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی والا ترنمند

نہج نے جزی بابا کے ساتھ کبھی کبھار بات نہیں کی تھی جب بھی موقع ملا کسی سی دو چار باتیں کہیں، حالانکہ وہ اسے ایک اگلی بھی لگتی تھی پھر بھی دونوں کے درمیان ایک گونہ اجنبیت برقرار رہی تھی۔ نہج نے بہت خوشش کی تھی کہ بابا کے دل کا فضا کمال ہے۔ اسے اتنا احساس ضرورت تھا کہ بابا کو کھانا پکانا انسان ہے اور وہ بریلی میں سارے خاندان کو کھانے کے بھی ہوں گے۔ ضائع کی آواز ہے۔ اسے خیال تھا کہ بابا اب تنہا ہے اور ایک تنہی تنگی اور محرومی سے دوچار ہے۔ نہج نے جانتا تھا کہ اسے گھر میں لاکھ کراں کی خدمت کرے اور اس کی باقی زندگی کو اس تنہی سے بچالے نہج کے جذبات اور پیش کش کے باوجود وہ نہج کے ساتھ مکمل طور پر مکمل نہ سکا تھا۔ جیسے اس میں گہری دل چاہی تھی۔

آج جب طاہرہ کو بابا نے کچھ بھیج دیا تھا۔ وہ کچھ تو نہج نے ان گلابوں میں ایک داستان چھل دی۔ اسے خیال آیا کہ طاہرہ کو دیکھ کر بابا کے دل میں کیسی ہوشیاری کا تازہ ہوگئی ہے۔ اسے پشاور والے اندر سے موسیقار کا وہ قصہ بھی یاد آگیا جو اسے ظاہرہ نے سنایا تھا کس طرح وہ اس کے ساتھ پیدا کی گئی تھی حقیقت تو یہی تھی کہ طاہرہ کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ جس نے کچھ انہیں کھول کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ بابا بھی غالباً اسی سونے اڑکی تھا لیکن نہج کو یہ شک بھی تھا کہ بابا نے طاہرہ کے دل میں اپنے خاندان کی کسی لڑکی کو دیکھ لیا ہے اور اس کا دل چاہ رہا ہے کہ اسے چھو کر اس کو سونگھ کر دیکھے کہ یہ وہی تو نہیں جو بریلی میں شہید ہوگئی تھی!

طاہرہ نے بھی بابا کی کیفیت دیکھی تو اسے پشاور والا اندھا موسیقار یاد آگیا اور اس کے یہ الفاظ۔ ”میری بھی ایک بچی تھی جو طاہرہ کی طرح تھیں لیکن میری تھی۔“ طاہرہ کو یاد آگئے۔

اس کے دل میں بابا کی ہمدردی کی لہریں اٹھ اٹھیں نہج نے اسے بابا کے متعلق بہت کچھ بتایا تھا لیکن وہ اس کا تصور مکمل طور پر باندھ نہیں کی تھی۔ اب اس نے بابا کو دیکھا۔ اس کی باتیں تو اس کے دل میں ہمدردی کے ساتھ جاری پیدا ہوگیا۔

اگر بآسانی اس طرح کی باتیں نہج کو شاید طاہرہ بھی اسے عجیب غریب شخصیت کے طور پر ڈال دیتی لیکن اس کی باتوں میں جانتا تھا کہ وہ محرومی اور احساس تنہائی تھا جسے وہی محسوس کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں درد محرومی کا احساس ہو۔ اس نے فوراً یقین کر لیا کہ بابا بریلی میں اس خاندان کو کھانا پکانا ہے اور وہ خاندان کے ایک ایک بچے کو ان بچوں میں تلاش کر رہا ہے۔

طاہرہ کو ایک گونہ اطمینان ہوا کہ بابا نے تنگی بھانے کا کس قدر انداز محنت مند اور جدید کر لیا ہے۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ بچوں کی جہتی جماعت اس نے بڑھانے کی تھی یہی ہے وہ اس کے سونی صد لڑکے پاس ہونے کے علاوہ اس بڑے بچوں نے حاصل کیے تھے۔ وہ فیصد تھے۔ بچوں کے متعلق بابا اور طاہرہ کی جڑیں مشترک تھیں۔

طاہرہ کو افسوس ہوا کہ جب اس کے کانوں میں تفریح کے خاتمے کی گھنٹی کی آواز پڑی۔ وہ بابا کے دل میں داخل ہو کر اس کی داستان حیات چڑھنا چاہتی تھی۔

بابا نے اسے کہا۔ ”آداب عرض، میں طاہرہ کو ابچہ ضرور لینے گا۔“

طاہرہ نے چونک کر اور بے اختیار ہو کر کہا۔ ”بابا! میں بھی اس دنیا میں تنہا ہوں۔“

بابا کو اس کا جملہ دیکھ کر اور طاہرہ اسے جانتا تھا وہ کبھی نہیں رہیں۔

دونوں ہاتھ کانوں سے ادا پر سر پر رکھ کر خوش گوش کے کان بنائے اور ناک اور ہونٹوں کو لرزہ دے کر لسنے لگا۔ ”لوں بہانے خوش گوش۔“ اور پکے ہنس ناس کپکاپ ہوئے جاب سے تھے۔ ”اچھا تو خوش گوش تھا بڑا ہوشیار... بابا نے پک کر ایک بچی! گود میں چٹائی اور کمانی جاری رکھی۔

”ابا! اسلام علیکم۔“ جو تھی جماعت کے ایک بچے نے طاہرہ کو پہچان کر سلام کیا اور بابا سے کہا۔ ”بابا! دعا ہی نئی آستانی گھڑی ہیں۔“

جزی بابا نے اُدھر دیکھا تو ہنس کر کہا۔ ”آئیے میں بچہ صاحبہ اکیا کروں، بچے ضد کر تے ہیں۔ اپنا تو ہنسی متعل ہے اپنا یہاں بیٹھ جاتی ہے۔ اور...“

بابا بولتے بولتے کہ گیا اور اس کی ٹاپیں طاہرہ پر چڑھ گئیں۔ کمانی کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ بابا کی بات اُدھوری رگتی۔ بچے کمانی تھے کو بے چین ہو رہے تھے کتنے کتنے بابا آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا۔ گود میں اٹھانی سوتی بچی کو اس نے کندھے کے ساتھ لٹکالیا۔ اور اڑکھ کر اس کی ہونٹوں پر بولے بولے بچہ اور طاہرہ کی طرف چل پڑا جیسے طاہرہ نے اس پر جا کر دیا ہو اور وہ اس کی قوت کے دور سے بے بس ہو کر چل رہا ہو۔ وہ گہری اور حیرت زدہ نظروں سے دیکھتا تھا کہ قریب جا کر اور بچہ کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”جزی بابا! بچہ نے تعارف کر لیا۔“ یہ میں مس طاہرہ پر دین! ہمارے سکول کی نئی آستانی آج ہی انہوں نے چنی جماعت کا چارج لیا ہے۔ ان سے میں نے آپ کا فائدہ تعارف کر لیا تھا ہے۔“

”آداب عرض میں طاہرہ! میں دیکھ رہا تھا کہ چہرہ بالکل نیا ہے۔ آپ کو دیکھ کر چند سرت ہوئی۔ اب ٹوٹ پر درد بردار ہو گئی... بڑی خوشی کی بات ہے... بابا نے پچوں سے کہا۔ ”تجاوڈ کو اب تم کھیلو۔ میں ذرا ان سے باتیں کروں کل پھر گھر آ گھبرا اٹھیں گے۔“ اور وہ طاہرہ سے غما طلب ہوا۔

”بچے میں بیٹھے چڑھتے ہیں عجیب باری مخلوق ہے جس طاہرہ یہ بچے میری زندگی میں وہ طاہرہ کی طرف دیکھتا تھا اور کہا۔ ”انہوں میں ایک چمک پیدا ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔“ چٹنی کے وقت یہ بچے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں تو بابا دل بچہ سا جاتا ہے۔ وہ دیکھی ہی مسکرا کر ادا خاموش ہو گیا۔

”بچہ اپنے آپ کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔“ طاہرہ نے مسکرا کر کہا۔ ”مجھے خود بچوں کے ساتھ اسی فہر کاٹنا ہے۔“

”مجھے یہ لڑکیاں زیادہ پیاری لگتی ہیں۔“ بابا نے کہا۔ ”یہ ننھے ننھے مسکراتے ہوئے ننھے ننھے، یہ ذرا ذرا سی کوٹلیاں۔“

بابا جیسے وہ ہیں اگیا ہو۔

”سننا ہے آپ بریلی کے مہاجر ہیں؟“ طاہرہ نے کہا۔

”میں مس طاہرہ! بابا نے ایسے جیسے کہا جس پر درد کا عنصر غالب تھا۔“ میں نے بھی سنا ہے کہ بریلی کا مہاجر ہونا ویسے اپنا ہوش رہنا تم ہے۔ اکثر اپنے آپ سے باہر رہتا ہوں میرے متعلق بیشتر باتیں مجھے دو مہر سے معلوم ہوتی ہیں۔ بعض استاد مجھے کہتے ہیں میں بچوں کے نیچے گھوڑا این کر پڑے رہا دو لکین ہوں لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوتا۔“

بھائی بی بی چاہا میں سنا رہا ہوں۔

”معلوم ہوتا ہے اس کی عمر پچیس سال نہیں۔“ طاہرہ نے اس کے قد میں جاتی کی چال دیکھتے ہوئے کہا۔ دیکھ تو ذرا کس طرح اکر اور باوقار طریقے سے چلتا ہے۔ گردن بھی سیدھی اور کندہ بھی تھمتے ہوئے۔  
”یہ چارے کو دیکھیں نے پوچھا کر دیا ہے۔“ بھگت نے کہا۔ ”اور بال قبل از وقت سفید ہو گئے ہیں ویسے جہانی لحاظ سے بڑھا نہیں۔ اسے بااثر صرف اس لیے کہتے ہیں کہ اس نے سکول میں اپنا نام جوزی بابا لکھا ہے۔ دوسری وجہ اس کے سفید بال ہیں۔“  
”معلوم ہوتا ہے اس کی عمر اگلے نکل گئی ہے اور یہ پیچھے رو گیا ہے۔“ طاہرہ نے کہا۔ اگر بابا اس عمر میں تیرہ بیس کی عمر کی عورت سے شادی کر لے تو اس کی زندگی ایک بار پھر مکمل اٹھنے۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ بھگت نے تائید کی۔ ”آنا بڑھا تو نہیں، ہاتھوں میں کیا اور چہرے پر کیا۔ ابھی بڑھا پلے کی ایک کپڑی طاہرہ نہیں جوتی۔ بے چارے کا علم نے خلیہ جکاڑ دیا ہے۔“  
”بہر حال آپا۔“ طاہرہ نے اُٹھ کر کہا۔ ”پوشش کریں گے جو اسے گھر لے ملیں۔ اپنے دونوں نگوں میں پیڑاؤ لکھ بھول جائے گا۔ سچا اس قسم کے انسانوں پر تو میں بھی متاثر ہوں۔ جانے کتنے دھماکے پھرتا ہے!..... بھائی بابا کو تو اعراض نہ ہو گا۔“

”اری نہیں۔“ بھگت نے کہا۔ ”بلکہ انہوں نے خود کہا تھا کہ اسے گھر لکھ کر دیکھی بات تو یہ ہے۔ طاہرہ کہ اپنا جہانی سفید ہر گیا تھا اور والد صاحب کی تو مجھے ضرورت ہی یاد نہیں میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے میں اسے باپ اور بھائی کی جگہ لکھ کر خدمت کرنا چاہتی ہوں۔“

بابا جب سکول کے کونے سے گھر کر بڑے سکول کے احاطے میں داخل ہوئے گا تو وہ کہ گیا اور گھر میں بیٹھے کھانا بھجوا دیا۔ طاہرہ اپنے سکول کی طرف پل پڑی تھیں۔ بابا طاہرہ کو جانتے دیکھتا رہا۔ سر سے پاؤں تک پھر پاؤں سے سر تک اور اس کے ایک ایک قدم کو دیکھا۔ جب طاہرہ کو دیکھا۔ میں داخل ہو کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو بابا کے منہ سے آدھا۔ ”بس طاہرہ!۔ اور ساتھ ہی ایک مسکراہٹ جس میں جانے کتنے ارمان اور رعبے تھے۔ اس کی مسکراہٹ میں انہوں کو چمک چکی۔

”دوسرے روز طاہرہ باقاعدگی سے کلاس لینے لگی۔ پہلے دن ہی اس نے بچوں کو ایک کامانی سنائی تو کامانی قسم ہونے لگا۔ بدبکچی نشوونما سے نفی سی آواز آئی۔ ”آپا آپ بہت اچھی ہیں۔“ طاہرہ نے موسیٰ کیا جیسے ارشدہ خیال تو نہیں لیکن موزوں اور دل کی موت اور موت سے پہلے کی اذیت تک زندگی اور بیوی کا تصور ان بچوں کی فنی فنی باتیں سننے اور ان کے مضمون چوں ا دیکھنے سے ختم ہو گیا ہوں۔

اس نے اعصاب سے ایک بوجھ کو اتر اٹھا یا اور اس نے سکون سے لبریز آہ لہا۔ اس کے دل بے گناہ عزت و احترام اور اس اجبار میں دیکھ بھری یادیں دیکھا سو احوال کچھ کلاس کے کمرے کی فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ اس کے سامنے ایک کنبہ کنبہ کسی طاہرہ کی طرف سے دیکھ رہے تھے۔ طاہرہ پر اس تحفے کے سوا کسی سی کیفیت طاری ہو گئی ہو منزل

تفریق کی گنتی تھی تو بھر شرافت و رسم میں اس کا انتظار کرتی رہی اور طاہرہ کھیل کے میدان میں جوزی بابا کے ساتھ بچوں سے مل رہی تھی۔ آج اس نے جوزی بابا کو گھڑا نہ بننے دیا۔ وہ بچوں کو لکڑی کے کھنڈوں والے جھوٹے پر لے گئی۔ بچوں کو کھیلنے بٹھا کر وہ اور جوزی بابا گھماتے رہے۔ جب دونوں تھک گئے تو ایک طرف کھڑے ہو گئے اور بچے ایک دوسرے کو کھیلنے دینے میں مشغول ہو گئے۔

”اس طاہرہ آپ نے کتنا کر کم کیا ہے کہ میرے پاس لگتی ہیں۔“ جوزی بابا نے ہانپتے سانس کو نبھالتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب کچھ بہت لپٹ آیا ہے۔ لیکن اساتذہوں کی اکثر تہمت بھگت لپٹا نہیں۔ ان کے بڑھانے کا طریقہ اچھا

ہے لیکن ان کے دلوں میں بچوں کی وجہ تہمت نہیں جو میں چاہتا ہوں۔ وہ بچوں کو پیار سے بڑھاتے ہیں لیکن اس بیار میں پیشہ ورانہ عنصر غالب ہوتا ہے۔ بیاضی نہیں ہوتی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر مجھے پسند نہیں کرتے۔ بعض مجھے سنکے کھتے ہیں، بعض نے نیم پانچ لک کر دیا ہے۔ یہ تو نیکر کی مدد کرت ہے کہ میں بچوں کے معاملے میں نہ ہاگل ہوں بچوں کو مختصر صاف پانچ لکھ کر دے دوں جو جاتا ہوں میں انہیں گھوٹا کھا چاٹ لینا چاہتا ہوں۔“

طاہرہ بھی کسی منہ نہیں پڑی۔ بابا نے پوچھا۔ ”بس طاہرہ آپ واقعی میں یہی شادی شدہ؟“  
”نہیں بابا جان۔“ طاہرہ نے جواب دیا۔ ”میں غیر شادی شدہ ہوں اور شادی کا کوئی ارادہ بھی نہیں۔“

بابا سے گہری پزشتیق نظروں سے بول دیکھ رہا تھا جیسے اس کے خدو خدال میں کوئی کھوٹی جوتی پیر تلاش کر رہا ہو۔  
”میں زندگی کا ایک ایک لمحہ اور جاتی کی تپش کا ایک ایک ذرہ ان بچوں پر صرف کرنا چاہتی ہوں۔ میں تنہا ہوں، بابا بابا اس دنیا میں کیسی ہوں۔“

”اور بھگت صاحبہ؟“

”میری منہ بولی بنی ہیں۔“ طاہرہ نے جواب دیا۔ ”دنیا میں ملو اور احساندار، اگر گھر کا بڑا ہو تو میں آج اس سکول میں نہ ہوتی۔ جیسے بھولنے کی گڑبگڑوں کے اندر سے میں گم ہو چکی ہوتی۔..... اور مصافحت کیجئے گا بابا جان! میں نے اپنی تمام کامی شروعات کر دی ہے۔ میں اتنی تھی آپ کی باتیں سننے اور اپنی شانے لگ گئی۔“

”سنائیے، بس طاہرہ!۔“ بابا نے متشغلاً لہجے میں کہا۔ ”یہ باتیں مجھے سناہتے ہیں۔ میں سناہتے ہوں۔ آپ کے سینے میں گھٹن ہے اور دل علم کے بوجھ تلے دبنا ہے۔ میں خود اس حال میں ہوں۔ طاہرہ! مجھے اپنی باتیں کھل کر سناہتے ہیں۔ یہی ایک ذلیل سے دل کے قرار کا درآپ ہے۔ جانیں کی تو ایسے انسان کی تلاش میں رہتا ہوں جو میرے دل کے بوجھ کو دھکا کرے۔ میری شے، دل والے ہی دل والوں کی سنتے ہیں میں بڑھا ہوں۔ دو تین برس اور جی ہوں گا۔ آپ جوان ہیں، اسی عمر میں آپ نے فیملی کو دل میں رکھنا شروع کر دیا تو آپ قبل از وقت بڑھ جاتی ہیں۔ دل اور دماغ ہر جہاں ہیں۔ میں جانتا ہوں سچ کی کسی کو معاشی اور معاشرتی حالات فرصت نہیں دے رہے کہ وہ دوسرے کی سننے اور جوں کے پاس فرصت ہے اس کے پاس دل نہیں۔ میں کبھی کسی کو نہ جانتا ہوں لیکن کوئی سننے والا نہیں۔ کسی اور پر ہاگل کی کون سننے کا س طاہرہ۔“



”اس لیے کہ آپ کا دل جوان ہے۔ اس میں جوان ہو گئیں ہیں۔ اس کی ایک ایک دھڑکن میں شباب بھرے ران ہیں اور میری کمبانی میں سوائے دکھ اور درد کے کچھ بھی نہیں۔ میں آپ کے اس دل پر ایک لمحے کے لیے بھی اپنا بوجھ نہیں ڈالوں گا۔“

ظاہر نے دیکھا۔ جزوی بابا مسکرایا تھا۔

”نہیں یہ بات نہیں۔“ ظاہر نے ہنسیوں کے لیے کہا۔ ”آپ مجھے بیگانہ سمجھ رہے ہیں۔“

”جنگ نہ؟“ بابا نے قدرے حیرت سے کہا۔ ”میں ظاہر کو ایک بات کہوں بلانا مانے گا؟“

”کیسے بابا جان میں تو کہنے اور سننے کے لیے آپ کے پاس آتی ہوں۔“ ظاہر نے ایسے لمحے میں کہا جس میں بے تکلفی اور اپنائیت تھی جسے بابا نے نمایاں طور پر محسوس کیا اور اس کا حوصلہ کھل گیا۔

”میں ظاہر میں آپ کو بیگانہ نہیں سمجھ رہا۔۔۔ وہ ذرا سا خاموش ہو گیا پھر بولا۔ ”میں نے کل غیر صاحبہ کے ساتھ آپ کو دیکھا تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں نے اس سے پہلے آپ کو کئی بار دیکھا ہے۔ جیسے آپ ہمیشہ میرے دل میں اور میں آپ کے دل میں رہا ہوں معلوم نہیں آپ کا عقیدہ کیا ہے لیکن میں اس حقیقت کا قائل ہوں کہ بعض انسانوں کے دل روزِ بازار سے جڑ دینے جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو جان نہیں سکتے لیکن جوں جی وہ زندگی کے کسی موڑ پر یا کسی دورا ہے پرا اتفاق سے۔ بظاہر اتفاق سے۔ اگلے ہوجاتے ہیں تو وہ پہلی نظر میں ہی ایک دوسرے کو کھ دیتے ہیں۔“ ”تم تو برسوں اکٹھے رہے ہیں ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں لیکن کہاں؟“ آپ ذرا اس لفظ قدرت کو سمجھنے کی کوشش کریں تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ انسان کس طرح انسان کو پہچانتا ہے۔ میں نے آپ کو دیکھ کر قلب و دماغ میں کچھ ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ خدا جانے آپ کے احساسات کیا تھے؟ شاید آپ میرا نشانہ کرنے آئی تھیں؟“

”نہیں بابا جان! غلطی نہ تھی۔“ ظاہر نے مسکرا کر کہا۔ ”میں آتی تو آپ کو دیکھنے ہی تھی لیکن میں نے آپ کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کا نمایاں احساس ضرور پایا تھا۔ اور میں نے محسوس کیا تھا کہ میں شاید آپ کی خدمت کے لیے ہی پیدا کی گئی ہوں۔ اس احساس کا کھ کھال آپ کا بچوں کے ساتھ دانا نہ پیا رہے کیونکہ مجھے بھی بچوں سے آپ ہی کی طرح پیار ہے۔ اس ہم خیالی نے میرے اور آپ کے درمیان غیرتیت اور بیگانگی کا فرق پیدا ہی نہیں ہونے دیا۔“

”بہر حال کچھ تو تھا۔“ بابا نے ہنس کر کہا۔ ”دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اور اہ! ظاہر! مجھنی بچ رہی ہے۔“

آج معلوم ہوتا ہے کتنی جلدی بچ گئی ہے۔

رات جب ظاہر سوئے کے لیے لیٹی تو اس کے خیالوں میں جزوی بابا داخل ہو گیا۔ ظاہر نے سوچا کہ بابا ہفت نام کا بابا ہے۔ ویسے تو وہ اچھی خاصی تندرست عمر میں ہے۔ وہ بابا کے دکھوں کا دوا دینا چاہتی تھی۔ ظاہر کو خیال آیا کہ ایک دن

”نہ شفقت کو کبھی سہارا دیا تھا۔ کو شفقت کا معاملہ جزوی بابا سے منسلک تھا لیکن بات ایک ایک ہی تھی۔ وہاں غریب سے غریبی اور نی پیدار کبھی تھی یہاں کسی دکھ نے محرومی اور تنگی کو جنم دے دیا تھا۔ ظاہر نے خود پندرہ برس کی عمر میں شفقت کو مائی اور ذہنی لحاظ سے نبھال لیا تھا تو اس پختہ عمر میں بابا کو وہ زیادہ اچھی طرح اور آسانی سے نبھال سکتی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ بابا بیل و محبت کا پلدا ہے۔ اسے بابا کے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے بچہ سے کہے تھے۔ ”بابا کے پاس ہے جی کیا؟“ اپنے کو زمانا ملی نہ ہو۔ ”میں نہ مینی۔“

ظاہر نے سوچا کہ کس قدر تلخ اور اذیت ناک محرومی ہے۔ ظاہر یہ خیالوں کے ریشے میں جی جاتی تھی اور ذہن دُور دُور کی گزراں ملا رہا تھا۔ اسے پھر شفقت یاد آتی۔ ارشد بھی یاد آتا اور اس کا دل بوجھل ہونے لگا۔ لاہور کے وہ چھ پناہ گزین خاندان جنہیں ظاہر نے بھرا دیا تھا، اسے یاد آئے۔ اس لیے نہیں کہ دنیا کو خیالوں میں احسان جتا رہی تھی بلکہ گھر کی گھر کی کڑے جوتے فلوں کا یاد رکھتی تھی۔ اسے نیم کی یاد تازہ پڑا۔ یاد جب بھی آتی تھی اپنے ساتھ ہزار اذیتیں لے کر آتی تھی اور ظاہر کا ایک ایک ہلکا کر دیتی تھی۔

ظاہر کو دل دُور ہونے لگا اور پھر بھاگ کر جزوی کے خیال میں محسوس ہوئی۔ جو درمیان میں کیم کی یاد دینے پیدار کیا تھا۔ ظاہر نے اکل خرچ جزوی بابا کی طرف موڑ دیا۔ خیالات خود بخود گزریاں ملائے جا رہے تھے کہ وہ چوک اٹھی اور بڑا آواز سے کہا۔ ”مرے ابا وہ ایک کٹر سے نکل کر مزید پرکھی اور کاغذ کے پرے پر لکھا۔ ”بچوں! پلے کاٹھی آؤ۔“ اسے پشاور والی بچی کو بچیں پلے مٹی آؤ کر کے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔

”اگر جزوی بابا یہاں آجائے تو کتنا چھابو۔“ ظاہر نے اپنے آپ سے کہا اور کڑی بدل لی بابا بچوں سے یہ پیار اس کے دل و دماغ پر مول ہو گیا تھا وہ بابا کے ہاتھ تو ہاتھ اس کے پاؤں بھی چوم لینا چاہتی تھی۔

دوسرے دن جمعہ تھا۔ سکول جمعہ کے روز گیارہ بجے بند ہو جاتا تھا۔ ظاہر نے صبح سویرے سویرے بچہ سے کہا۔ ”آپ! میں آج چٹنی کے بعد دیں سے جزوی بابا کے ہاں چلی جاؤں گی اور ذرا دیر سے واپس آؤں گی۔“

”تو میں بھی ساتھ چلوں گی۔“ بچہ نے کہا، مگر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔ ”لیکن نہیں۔ ہمارے بھائی جان بھی جلدی آ جائیں گے اور بچے انہیں پریشان کرتے ہیں گے۔ ان کی موجودگی میں وہ مائی کے پاس نہیں رہتے۔“ مائی ان کی کوڑائی تھی اور بچے اس کے ساتھ خوب انوس تھے بچہ کی غیر حاضری میں وہ اس کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔

”میں آج اس کی کمبانی سن کے ہوں آؤں گی لیکن اپنی نہیں سناؤں گی۔“ ظاہر نے کہا۔ ”کل تفریح کے وقت میں نے اپنی داستان شروع کر دی تھی لیکن فوراً بچ ہو گئی۔ سوچا ہے چارہ خود دکھایا آدمی ہے۔ میں اپنی پناہ سنا کر اسے اور کیرن پریشان کر دوں۔۔۔۔۔ پیش آیا! اگر وہ مان جائے تو اسے ساتھ لیتی آؤں؟“

”مان لیتی آؤں۔“ بچہ نے شوق سے کہا۔ ”میں تو چاہتی ہی ہوں۔“

گیارہ بجے چٹنی کی گھنٹی بجی تو ظاہر جلدی جلدی بڑے سکول کے احاطے میں جا پہنچی جزوی بابا بچوں کے مجلس میں آ رہا تھا۔ ظاہر کو دیکھتے ہی اس نے قدم تیز کر لیے اور بچوں کو ادا دے کر کوکھ ظاہر سے آ ملا۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کے گھر ملک چلوں؟“ — طاہرہ نے پوچھا۔

”اوه اکیس دہلیس؟“ — وہ جیسے اسی خواہش کو دل میں دبائے ہوئے تھے تاکہ ذرا سا اشارہ ملتے ہی خواہش اُبھر آتی۔  
”میں طاہرہ! آئیے آج غریبوں کا کھانا کھا کر بھی دیکھتے؟“

”ہاں بابا جان! کھانا تو ضرور کھاؤں گی۔ میں نے سچ کہا ہے کہ دیا تھا کہ میں بابا کے ہاں جا رہی ہوں۔ دیر سے ٹوٹو کی“  
”آپ کو یہ خیال کیسے آگیا کہ طاہرہ؟“

”دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔“

”اوه! خوب! بابا نے نہیں سوچا۔“ — آپ نے خوب یاد دلایا میں کل تفریح کے وقت آپ سے کبڑا تھا کہ

”دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔“ آپ اپنی بات سناتے سناتے چپ ہو گئی تھیں۔ آپ صرف اسی قدر کہ چپ ہو گئی تھیں کہ میں بھی دنیا میں تنہا ہوں۔

”آپ کو کہیں سے بہت پیار ہے۔“ — طاہرہ نے کہا۔

”بچوں کو میں پیار کا صمیم حقدار سمجھتا ہوں۔ لڑکیاں، بے زبان اور بڑا لی مخلوق۔“ — جوزی بابا بولا۔ ”والدین جہاں بھی چاہتے

اور جس کے ساتھ چاہیں باندھ دیں۔ ساری عمر کے لیے جس کے رحم و کرم پر انہیں ساری عمر کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے وہ جیسا چاہتا

سلوک کرے۔ اولاد کو موتی توڑی ہو کر جانے دیا کہ سلوک کرے، عورت تو بڑا لی مخلوق ہے۔ عورت کے بغیر ہم جی جی نہیں کھتے

عورت کو ہم زندگی بھی بنالیتے ہیں۔ عورت کے بغیر ہمیں درد و دیوار و دران بھی دکھائی دیتے ہیں اور جب گھر میں لڑکی پیدا ہو جاتی ہے

تو ہم افسوس کرتے ہیں کہ خدا نے بنا نہ دیا۔ بچے بعد و بچے سے تم جلد لڑکیوں کا باب تو گھرا ہی جاتا ہے میں نے ایسے ایسے

باب بھی دیکھے ہیں جو پہلی لڑکی کی پیدائش پر بوی سے کچھے کچھے رہتے تھے میں کو اس نے بیٹا کیوں نہ بنا۔ میں طاہرہ! میں نے

تقریباً تمام والدین کو بیٹیوں سے پیدا کرتے دیکھا ہے لیکن کتنے ماں باپ، بلکہ باپ! ایسے ہیں جو بیٹی کے مرنے پر دل ہی دل کا

اٹھنا کرتے ہیں ہوا چار دو سو سو سب سے ہیں اور چوری چھپے خدا کا انکار کرتے ہیں کہ ایک ذمہ داری ختم ہوئی۔۔۔۔۔ میں طاہرہ! خدا

شاہد ہے میں ان بچوں کو دیکھتا ہوں تو جی میں آتی ہے کہ خدا مجھے اتنی دولت اور بہمت دے کہ میں ان بے زبانوں کو اپنی پانچویں

لے لوں۔ انہیں پیدا سے پاؤں اور پال کر ایسی راہ پر ڈال دوں کہ وہ مڑکی محتاج نہ رہیں۔۔۔۔۔ لیکن میں طاہرہ! اپنے پاس سوائے

ان جذبات کے کچھ ہے ہی نہیں۔۔۔۔۔ اور لیجئے۔ وہ غریب خاندان آگیا۔ بابا نے جیب سے چابی نکالی، بابے نے ٹنگ جتو طاہرہ سے

آگے نکل گیا اور کوارٹر کا دروازہ کھولا۔

”کوارٹر کے دو کمرے تھے۔ ایک کو بابا نے بیٹھک بنا رکھا تھا۔ فرنیچر اسی قدر تھا۔ ایک چار پائی، دو کرسیاں، ایک چھوٹی

میز، ایک بڑی میز، ٹیکسٹی کے ایک کونے پر قاعدہ، غلام کی تصویر فریم میں لگی ہوئی تھی اور دوسرے کونے میں علامہ اقبال کی تصویر

میں چینی کا بھنگدان رکھا تھا جس میں تازہ جگرت سیا بنوا تھا۔ اس گھڑان کے سمار سے ایک دستی تصویر تھی۔ یہ تصویر ایک

بچہ کی تھی جو چاند کا سہو کہیں مشغول کائنات تھا اور بہت ہی پیارا۔ بچہ کی مسکراہٹ بھی ایسی کہ مسترت کے فتنے کو بند کر کے

رکھ دینے کو جی چاہتا تھا۔ بچہ کی مسکراہٹ میں طاہرہ صبح کی رات بیدار ہو جی جی چمک چمک بھی بچو پیٹ کے بل لیا اور اٹھنے ہوئے۔

”کتنی پیاری تصویر ہے۔“ — طاہرہ نے تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

”یہ بریلی کے ایک مصور کا شاہکار ہے۔“ — جوزی بابا نے کہا۔ ”صبح اٹھتا ہوں تو سب سے پہلے بچے کی اس کمر بٹ

نابوں پر اقبال اور پھر قاعدہ غلام کو۔ اس طرح دقت خوردہ جسم میں جان آ جاتی ہے۔ پھر دن خوب گذرتا ہے۔۔۔۔۔ اچھا! تو میں

لے کا بلاہٹ کرتا ہوں۔“ — اور وہ کمرے سے دوڑ کر نکل گیا۔ اس کے دوڑنے کے انداز میں جوانی کی جھلک تھی۔

طاہرہ نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ سوائے اس مختصر سے فرنیچر اور ان تین تصویروں کے کسی سے کوئی خاص

نہیں تھی، دروازوں اور کچھ رکوں کے پر دے بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود اس کمرے میں اس نے انوکھی سی جاہلیت

ماکی، ہر ایک چیز اس طرح سلکتے اور قرینے سے رکھی تھی جیسے اسے اسی جگہ پر ہونا چاہیے تھا۔ بڑی میز پر کتابیں کچی

اُڑھ دی ایک بھی ترتیب سے۔

طاہرہ نے اٹھ کر دوسرے کمرے میں جھانکا۔ وہاں ایک چار پائی بغیر لیٹر کے پڑی تھی۔ ایک کرسیاں ایک ٹوا اور چند برتن

تھے اور اللہ کا نام تھا۔ طاہرہ کو بابا کے قدموں کی آواز سنائی دی تو وہ کمری پر بیٹھ گئی، بابا کمرے میں داخل ہوا تو پیچھے پیچھے

کا ملازم ٹرے میں کھانا اٹھائے آیا۔ منہ دھاڑ دھو کر دونوں کھانے پر بیٹھ گئے۔ بابا تین کراتا اور طاہرہ دل چاہی سے سستی

لٹانے سے فارغ ہو کر بابا نے ملازم کو کھانے کے برتن لے جانے کو کہا۔

جب ملازم چاچا کو بابا نے طاہرہ سے کہا۔ ”آپ چاہیں تو تھوڑی دیر لیٹ جائیں اور میں یہاں بیٹھا باتیں کرتا اور سنا

گا۔“

”میں آپ لیٹ جاتیہ اور میں ٹی ٹی رہوں گی؟“

”کوئی نہ دو دن لیٹے رہیں۔“ بابا نے اس طرح کہا جیسے کسی بچے سے ہم کلام ہو۔ ”اچھا! تو پہلے اپنی بات سنائیے

طاہرہ! آپ کی ادھوری سی بات ہے مجھے رات بھر پریشان رکھا ہے۔“

”بابا جان! میری بات کوئی کمی کمانی تو نہیں۔“ — طاہرہ تو پہلے ہی جانتی تھی کہ جوزی بابا کے دھکے ہوئے دل پر بوجھ

لے رہا ہے چلا کہ وہ اس قدر پریشان رہے تو وہ اور زیادہ محتاط ہو گئی، وہ بات کو دل کو کر کے کہنے لگی۔ ”بات اتنی سی ہے

۱۹۴۷ء کے فسادات کی کچھ مٹیوں جوں گھر کے تمام افراد شدید ہو گئے تھے اور میں بچ بچا کر نکل آئی تھی۔ اب اور رفیق میری کمپ

آگیا سے ملاقات ہو گئی تو یہ پینڈی لے آئیں یہاں آ کر انہوں نے ایک چھوٹے سکول میں ملازم کر دیا تھا۔ اب کافی تجربہ

لر کچی ہوں، کچھ اپنے طور پر پڑھتی بھی رہی ہوں۔ آؤ اس سکول میں خوشش کو کر کے لگ کر میں جوں بس اتنی سی بات تھی۔ اگر آپ

ناہاں میں سکھوں نے ہمارے گھر پر کس طرح حملہ کیا، میں کس طرح بچ گئی، میں کس طرح نکل آئی اور لاہور کس طرح پیدل سفر

ایا، سناتی ہوں لیکن وقت ضائع ہو گا اور ہم دونوں کا دل دکھے گا۔ اگر بے فروغے کیوں اٹھا لے جائیں۔ آپ اپنی

بے میں دراصل آپ کی رو دلاؤ شے آتی ہوں۔ طاہرہ لہر لہی سنجیدگی سے بولی۔ ”بابا جان! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ

بظاہر صبر و پاکتی صدیوں کی چٹیں کھاتے ہوئے ہیں جنہیں آپ بچوں کے پیار سے سلواتے رہتے ہیں۔ میں بھی آپ

بات کو آپ کی خاطر پریشان رہی ہوں۔“

”دیکھئے باباجان! — طاہرہ نے قدرے ہنسا کر کہا: ”آپ کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہہ دیجئے، نہ کہہ کر میں اگر آپ کے  
نہ سنائیں تو کم از کم خدا کے لیے اس تکلف اور غیرت کو ختم کیجئے میں جس بے تکلفی سے آپ کے پاس آئی ہوں، اس  
میں عیب نہ دیکھئے۔“

”جی ہاں، میں نے آپ کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہہ دیجئے، نہ کہہ کر میں اگر آپ کے  
نہ سنائیں تو کم از کم خدا کے لیے اس تکلف اور غیرت کو ختم کیجئے میں جس بے تکلفی سے آپ کے پاس آئی ہوں، اس  
میں عیب نہ دیکھئے۔“

”جی ہاں، میں نے آپ کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہہ دیجئے، نہ کہہ کر میں اگر آپ کے  
نہ سنائیں تو کم از کم خدا کے لیے اس تکلف اور غیرت کو ختم کیجئے میں جس بے تکلفی سے آپ کے پاس آئی ہوں، اس  
میں عیب نہ دیکھئے۔“

”جی ہاں، میں نے آپ کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہہ دیجئے، نہ کہہ کر میں اگر آپ کے  
نہ سنائیں تو کم از کم خدا کے لیے اس تکلف اور غیرت کو ختم کیجئے میں جس بے تکلفی سے آپ کے پاس آئی ہوں، اس  
میں عیب نہ دیکھئے۔“

”جی ہاں، میں نے آپ کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہہ دیجئے، نہ کہہ کر میں اگر آپ کے  
نہ سنائیں تو کم از کم خدا کے لیے اس تکلف اور غیرت کو ختم کیجئے میں جس بے تکلفی سے آپ کے پاس آئی ہوں، اس  
میں عیب نہ دیکھئے۔“

”جی ہاں، میں نے آپ کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہہ دیجئے، نہ کہہ کر میں اگر آپ کے  
نہ سنائیں تو کم از کم خدا کے لیے اس تکلف اور غیرت کو ختم کیجئے میں جس بے تکلفی سے آپ کے پاس آئی ہوں، اس  
میں عیب نہ دیکھئے۔“

”جی ہاں، میں نے آپ کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہہ دیجئے، نہ کہہ کر میں اگر آپ کے  
نہ سنائیں تو کم از کم خدا کے لیے اس تکلف اور غیرت کو ختم کیجئے میں جس بے تکلفی سے آپ کے پاس آئی ہوں، اس  
میں عیب نہ دیکھئے۔“

نہ بابا کو... اس نے سکون کی آہ لی اور کہا۔ ایک عمر کے بعد ایک عورت نے میرے حکم کو چھوڑا ہے۔ بابا نے رات دیکھتے ہوئے احتجاج کیا۔ آپ اسی طرح کبھی کبھار کیا کریں گی؟  
 ”کیوں نہ کیا کروں گی باباجان؟“ طاہرہ نے بیٹوں کے پیار سے کہا۔

گھر کا طاہرہ نے بھر کھا یا سے ملاقات کی تفصیلات سنائیں۔ سب کچھ کہا گیا کہ اس مذہبی حالت کا پہلے علم نہیں تھا۔ وہ اور انہی بھائیوں کے ساتھ ملاقات کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی شخصیت کی کمال دیتا تھا کہ وہ اہلکار بدرستی سے بڑھ کر کسی کے خلاف کچھ کر کے لیکن طاہرہ نے تو جیسے بابا کے لیے زندگی وقف کر دی تھی۔ اس نے بھر کھا کو تیار کیا، بابا میاں نہیں لگے۔

ناتانے کا۔ جب طاہرہ نے اسے والہا جواب بابا کے انجان میں دیا تو سب کچھ ہو گیا۔  
 ٹھوڑی دیر بعد اور طاہرہ بابا کی بڑی بھائی کی زندگی کے متعلق قیاس آرائیاں کرتی رہیں۔ انہوں نے بہت کچھ سوچ ڈالا لیکن کسی ایک پر نہیں آ سکیں۔ انہوں نے سوچا کہ کسی لڑکی سے محبت میں نکالی ہوئی ہوگی اور بابا نے تمام عمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔  
 یہ فیصلہ کیا ہوگا اور کسی ایسے ویلے تمہیں خانے میں پرورش پائی ہوگی۔ اگر خدات میں اس کے گھر کے افراد شہید ہوئے اور چھاپا آئوں؟ ہو سکتا ہے وہ اس عظیم حادثے کو یاد کرنے سے گھبرا ہو۔  
 دنوں سوچ سوچ کر پریشان ہونے لگیں اور جیسی بابا ایک مرتبہ گئے۔

رات کو بابا نے وہ گھنٹوں کے لیے پانچویں جماعت کے دو لڑکیوں اور ساتویں جماعت کے تین لڑکیوں کو پڑھا کرنا تھا۔ یہ پڑھانی شروع ہوئی اور انہیں بغیر فیس کے پڑھایا کرتا تھا جس میں احسان اور نیکی کا عنصر نہیں تھا بلکہ وہ اسی سہانے گھر میں تھوڑی دیر رہنے کی پیکر لیا کرتا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے پڑھاتا اور گھنٹہ پون گھنٹہ ان کے ساتھ مسنی مذاق اور کھیل کو کرتا تھا۔ اگر بوشل کی پہنچی تو یہ سب بیکے بیکے گھر کے کبھی بھی نہ چلتے۔ بچوں کی موجودگی میں بابا کبھی ناخوش نہیں ہوا تھا۔ بچوں نے اسے جب بھی ملے ہوئے دیکھا، لیکن آج رات جب پہنچے اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو باغیر معمولی طور پر خوش تھا۔ بچوں کے باہمی کچھ کہنے کو بابا آج بہت خوش ہے۔ اس کی خوشی کا اندازہ تو انہوں نے اس سے لیا کہ بابا نے انہیں کہا۔ ”بھو آج نہیں ہوگی۔“

آج بابا بہت خوش ہے۔ ایک بچی نے خوشی سے کہا۔

بابا کھل کر ہنسا۔

بابا ان اس قدر خوش کیوں ہیں؟ ایک لڑکے نے پوچھا۔

”میرے بڑھو میاں؟“ بابا نے اس کے گال تھپکا کر کہا۔ ”بڑھنے شہزادے کو اس کے دل کی کافی مل گئی ہے۔“

اسے بھی بتایا ہے۔

جب بچوں کے سلاموں اور شب بخیر کا شور و شر باہر سے پہنچ گیا تو بابا کے کمرے میں خوشگوار سکوت طاری ہو گیا۔ یہ کمرہ لے چلے جانے کے بعد رات بوی خاموش ہو جایا کرتا تھا لیکن اس میں غم ہوتا تھا نہ مسرت۔ آج رات کمرے کی کھانک کھانک کے لمحات تاروں کی طرح جھل جھل کرتے بچتے جا رہے تھے۔ بابا نے چار پانی پر لیٹے لیٹے پرسکون سی

”بابا جان!۔۔۔ طاہرہ نے کہا۔ ایک بات مانیتے ہمارے گھر چلتے اور وہاں رہتے۔۔۔ دیکھئے انکار نہ کیجئے۔ آپ ایک بار کچھ آپ کی خاموشی کا کچھ میں۔ وہاں کا ماحول اور رضا آپ کو روحانی سکون دے گی میرے علاوہ وہاں کچھ نہیں ہے، اطہر بھائی جان میں، بڑے شگفتہ مزاج اور دلنسا لڑکی ہیں۔ ان کے دو ننھے ننھے بچے ہیں۔ سب سے بڑا اس قدر پیارے پٹے ہیں کہ آپ دن رات انہی کے ساتھ کھیتے ہیں گے۔ چلیے میری درخواست منظور کر لیجئے۔“

”نہیں مس طاہرہ؟“ بابا نے کہا۔ ”مجھے اس تنہائی میں بڑا رہنے دیکھتے ہی تنہائی مجھے کھانے کو دوڑتی ہے اور اور یہی تنہائی میرے کچھ تھے اعصاب کو سہلایا دیتی ہے۔ اب میری عاوش نہ بگاڑ میں بھر صاحبہ کو کبھی طرح جانا ہوں وہ بڑی اچھی ہیں۔ میں ان کا گھر دیکھ آیا ہوں۔ کچھ بھی دیکھ آیا ہوں۔ مجھے وہاں کا ماحول بہت ہی پسند آیا ہے لیکن میں کسی نے نہ گھر میں داخل ہونا پسند جاتا۔ وہ تو بھر صاحبہ کی زندگی میں وہاں چلا گیا تھا۔ اور کسی آباد گھر میں جا کر کچھ پرہیزوں طاری ہو جاتا۔ اور جانے کون میرے ضمیر کو لعنت ملاست کرتے لگتا ہے۔ میں خود ہی اپنے آپ کو دھکیل کر وہاں سے باہر نکال دیتا ہوں اور آپ سے کہتا ہوں کہ کسی آباد گھر میں داخل ہونے کا تم سے چھین لیا گیا ہے۔ ہم محبت ہو تم آسہی سایہ ہو نیکل جاؤ نہ یہ گرام جانے کا۔۔۔ بس طاہرہ! اسے بھروسہ نہ کرنا کہتے ہیں۔“

”بابا جان! تو مجھے ساری بات سنائیے۔ ایسی ہی سبیلان نہ بچا تھے۔“ طاہرہ نے بچوں کی کسی شوشی سے کہا اور ہاتھ باندھ بیٹھنے پر رکھ دیا۔ بابا نے انہیں بند کر دیں اور آہستہ آہستہ پانا پنا طاہرہ کے ہاتھ پر بے آیا۔ ہاتھوں کے لمس نے بابا کو جذبات گھرائیں میں چپک گیا۔

”بس طاہرہ؟“ بابا نے گہرائیوں میں سے کہا۔ ”میں اس قدر جذباتی کبھی نہیں ہوا تھا۔ اپنے آپ کو اس طرح بے کبھی نہ ہونے دیتا تھا لیکن آج آپ کے سامنے جانے کیوں جی جاتا ہے کہ کچھ نہ کچھ کہتا ہی رہوں اور روتا ہی رہوں۔ یہ آپ کا جاؤ ہے جس کا طاہرہ؟“

وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا اور انہیں غم داہمنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ دو چار لمحوں بعد اس نے طاہرہ کے ہاتھ کو ڈال دیا اور بے خودی کی کیفیت میں طاہرہ کی طرف دیکھ کر لٹی بجے میں کہا۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو۔۔۔ اس نے طاہرہ کو ہاتھ ڈال دیا اور اٹھایا اور اپنے ہونٹوں کی طرف لے چلا۔

طاہرہ نے پناہ تھ اس کے حوالے کر دیتا تھا بلکہ وہ بھی ہی خود سہرگی کے عالم میں۔ بابا کے احساسات اور اس کی کیفیت نے اسے بابا کا گردہ بنا لیا تھا۔ دوسرے لمحے طاہرہ کا ہاتھ بابا کے ہونٹوں پر تھا۔ طاہرہ نے دوسرے ہاتھ سے اس کے سینے بالوں کو سسلا کر شوروں کو دیا اور بابا کے آئینہ جاری ہو گئے۔ طاہرہ جانتی تھی کہ کون کونسا سکون اور طمانین کے ہیں۔ بابا کو ان ٹھوکوں کی بڑا تھا۔ طاہرہ نے دیکھے دلوں کو سسلا کر خواب جاتی تھی۔ اس نے بابا کو روئے ہی دیا۔ اس کا ایک ہاتھ بابا کے ہونٹوں پر تھا۔ بابا نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا بالکل ایسے جیسے بچوں سے دودھ پنی رہا ہو۔ دوسرا ہاتھ اس کے بالوں میں رینگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بابا نے طاہرہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنا ہاتھوں پر رکھ لیا۔

”معدت رکھنا مس طاہرہ! جیسی بابا کبھی پاگل ہو جاتا ہے۔“ بابا نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”معاف کر

ہاستان زبان سے دہرائیا نہیں جانتا؟ ہر مجرم اقبال مجرم سے گھبرا ہے۔ ثواب محبت کوڑا خونڈتا ہے۔ محبت سچھے جلی درجھیں کی کٹی جھی۔ وہ بکلی کی ایک چمک جتنی چمکی اور جلی، تو وہ بکلی اور دوسیا گھٹنا جسے جس کے ماسن میں بکلیاں پرورش پاتی ہیں اور دل کو کھلا دی ہیں لیکن تیرے سینے کی پروردہ بکلی سے تیرا اپنا نشین جلاؤ لا۔۔۔ یہ تو ایک فریب ہے۔۔۔ ایک سرب۔۔۔ ظاہر آ  
عکس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ تاخوات پر غم کے گہر سے چھا گئے اور عکس کے موتیوں نے لڑ لڑ کر کہا۔۔۔ ظاہر آ  
اں ظاہر آ۔۔۔ بکلی کی ایک اور بکلی، یا چمک کا جو کدو۔۔۔ ظاہر آ۔۔۔ بس ظاہر آ کی تم ہر روز اس کی گفٹیاں اس کی سبوتا  
باناے سر کو جھنجھوڑا آنکھیں کھولیں تو دھڑکے کے دھڑکن میں کھڑا تھا۔ یا چمک کے پیچھے رکھئے ہوتے۔ اس نے گہری  
ایں درجھی تھا، سکون بھی تھا۔ اسے ظاہر و کاداعہ کہیں آیا کروں گی، یاد آ رہا تھا۔ کیا کروں گی کی یہاں ہے۔ اُس نے  
پانچ پانچ زبانوں سے جالے میں ناچو گیا۔ ایک بار جتنا تو دوسرے میں الجھ جاتا۔

”لوگوں سے؟“۔ ہا مانے دل ہی دل میں پوچھا۔ ”نوکیا ہے؟۔۔۔ کہاں سے آئی ہے؟۔۔۔ کہاں کا ارادہ ہے؟۔۔۔“  
 ”جس لڑکیوں سے پہلے دیکھا وہ پہلے احسا ہے۔ طاہرہ! اس طاہرہ!۔۔۔ وہ بھی تیری ہی طرح حسینہ تھی۔ تیری ہی طرح جوان  
 ۔۔۔ میں نے اسے پاکر کھودیا اور کھوکھو گچھے نہ پایا۔ کچھ سو میری راہیں آئی ہے۔ طاہرہ! وہی جوانی ہے کہ راتیرے ہاتھوں کے پس  
 دی کی کیفیت ہے جو اس کے ہاتھوں میں تھا۔ تیری سانسوں میں بھی وہی عطریہ رُو ہے جو اس میں تھی۔ یعقوب کو سہا کے  
 نکمے میں بوسہ کی لڑائی تھی۔ آج تیری آنکھوں کی چمک میں میں نے اس کا جلوہ دیکھا ہے۔ تیری گردن کے خم میں میں نے  
 لہجہ کی بھیجی ہے جب ثوبات کرتی ہے تو تیرے ہونٹوں کے کوئے اسی طرح مسکراتے ہیں جس طرح اس کے مسکرایا  
 تھے۔ وہ محبت کا بیغاں ابن آکے آئی تھی اور دکھ درد دے کے چلی گئی۔ ایک دھوکا۔ آج تو آئی ہے۔ ایک اور دھوکا  
 و فریب۔۔۔ قدرت انسان کا تاشہ کرتی ہے۔“

چند لمحوں بعد باہر آگئے تھے کہ سامنے کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کس کی آنکھوں میں آنسو تڑپ رہے تھے۔ بابا نے کاڑوا سا اداسی کی طرف دیکھا تو اسے پہچنے کی تصویر نظر آئی۔ تصویر کی روح افزا مسکراہٹ دیکھ کر بابا کے آنسو ٹسکڑا اٹھے۔ اس نے فیضیہ دیکھا۔ اب کس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا دھوکہ بٹھا۔ صبح کا ذب کی طرح — اس نے پہچنے کی تصویر کو دیکھا اور دہشت کا دھوکہ دیا۔ مسکراہٹ مسکراہٹ بن گئی۔ بابا کی روح بھی ٹسکڑا اٹھی اور اس کا رُواں بیدار ہو گیا۔ اس نے موس کی کیا غیہ و پلہ کی کیفیت ایک خواب تھا۔

اس کی انھیں کھل گئیں اور وہ ذرا آگے چھڑکے اور تصویر کے ہر منٹوں پر بوسہ دے کر خدا بلند آواز سے کہا۔ "تیرا ماں ابھی ہے۔" اس نے آستین میں دیکھا، عکس کے چہرے پر مسکراہٹ کا تاثر نہ بکھرا تھا۔ یہ ہے تیری جڑ، سزا بھی، جراثیمی رکے، ٹپکے، کواب نہ بھولنا، در نہ جل، حاسے نہ کاٹو۔

ہائے سکون آئیز آئی اور دل ہی دل میں کہا۔ عطا ہو چکی ہے، کاش وہ میری بچی ہو، تو میں تنہا ہونا اسے نہ سہائی بنا، اسے مٹاؤ! اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر دل میں دعا کی۔ ایک بچی دے دے جسے میں اپنی بچی کہہ سکوں، بول پڑا، اے لایا نہ ہو، مگر جسے لیکن ان کے ماں باپ انہیں سچے سچیں کر لے جاتے ہیں، بہت سزا جھٹکتی لی شیخو کے

انگلیشی پرائمریز رکھا تھا۔ اس کی نگاہ پڑی تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”میں برس! — اُس نے زرب لب سرگوشی کی۔“ میں برس کی سحرانوردی! اور کیا بلا تجھے کہ تو اس قدر خوش ہے؟“

سرب لب... اب جگتا کہ اس کے چیخے... بڑھا شہزادہ... شہزادی ملی تو کچھ برس کی عین جی جب دل بھی مر جاتا ہے اور دم جاتی ہے... لیکن... اس نے عکس کو قریب کر دیکھا... تیری روح تو جوان ہے... انسان پہلے جوان ہوتا ہے پھر بڑھا جاتا ہے اور وہ پہلے بڑھی ہوئی ہے پھر جوان ہوتی ہے... تیرا دل بڑھا نہیں بڑھا... یا سو گیا ہے؟ تو اس قدر خوش کیوں ہے

پا سے گھسنے لگی ہے؟ پاگل! وہ تو جوان لڑکی ہے... آج نہیں تو کل اپنے گھر چلی جائے گی... اچھا گھر بسا لے گی اور وہ شہزادی کی ماں کی بیٹی کی جگہ چھرے کا؟

وہ بچہ کمرے میں ٹھلنے لگا۔ اس کی رگ رگ میں طہرہ سمائی ہوئی تھی۔ اس نے خیالوں میں طہرہ کے چاروں رُپ: — ماں، بیٹی، بیوی بہن — طہرہ میں اسے سارے رُپ نظر آتے۔

”جانے اس لڑکی میں کیا بات ہے کہ وہ چلی گئی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے قدرت کا لاف تم ہی درجہ برعم ہو گیا ہے۔“  
طاہرہ!... کس طاہرہ!... طاہرہ!... کس قدر خوبصورت ناہ ہے۔

دو گھر مرنے کے وسط میں لڑکھایا اور محبت کو دیکھنے لگ گیا۔ اس کے دل دو عالم پر دو متضاد خیال ایک وقت پہ  
جُڑے تھے۔ خوش بھی تھا ناخوش بھی۔ اس نے علم و ایمان ایسی جھلک دیکھی تھی جیسے طاہرہ اس کے لیے پیدا کی گئی ہو اور  
ہی خیال کو وہ یکساں سالہ بڑھاپے اور ظاہر و حیران لڑکی۔

”اس کی عمر تیس سے ذرا ہی کم ہوگی۔ احتیاس زنجوئی تو انیس برس ہوگی۔۔۔ ہا کے ذہن میں مجھ کا بڑا ایک خیال آیا۔ میں؟ اُف!۔۔۔ میں برس کا فرق۔۔۔ لیکن دل کو کون دیکھتا ہے۔۔۔ خیر۔۔۔ گزار دے۔۔۔ زندگی کے باقی برس جی یوں ہی گزار دو۔ عورت کے لمس کی محدودی میں ہی گزار دے۔۔۔ مگر کوئی بنائے مگر کوئی تباہ نہ وہ اپنے گھر کیل جائے گی۔“

جزیہ ہا کے دل و باغ میں افراط فی سی یا ہو گئی اور وہ غصے میں لگا۔ غصہ کس پر تھا؟ شاید اپنے آپ پر رہوئے، سامنے ملایا دیکھ سکتے کہ یہ تیری سزا ہے محنت ڈالو اپنے کیے کی سزا! حکمت را ہے آدم کا بیٹا ہے انور! اس جنت راس نہیں آتی تھی۔ تو نے بھی جنت کو ٹھکرا کر صحرانوں کی رست پیا مخنا قبول کیا تو اُس وقت بھی بگل گیا۔ اب بھی بگل نہ ہوئیں تو جنت کو اجابا نا تھا۔ اپنی جنت کو۔ اس دورانِ جنت کی اعڑی سموی آسموں سے تری تمام زندگی کا بارود دیکھ لینا انسیب؟ اپنی تعمیر؟ بنے ہوئے نصیب کو تو نے خود بگڑا رکھا۔ مگر کہ ٹھکر کر کر تو نے تیرے تھر کی خاک میں ادھر تھر بن گیا..... جو عمر کے اس فرق کو کبوں سرچتا تھا تو نے؟ شادی کا ارادہ تھا؟

بابائے مکیں کو سعادت آئینہ نگاہوں سے دیکھا اور زیر لب کہا — ”سچجہ سے یقین تیس برس گزرے چھین لیا گیا  
یاد کر اس وقت کو... کچھ تازہ تمام عمر... خدا کرے تیری عمر طویل ہو۔“

عکس کے چہرے پر غم و غصہ کی گہری پرجھپٹیاں نظر آنے لگیں۔ ہرنٹ لرز رہے تھے۔ "کیا کتنا پتھرا ہے لوگوں!"

خدا! اب میں اپنے گناہ کی تلافی چاہتا ہوں۔ دے دے میرے ساتھ! کوئی تیر کی دے دے!... طاہرہ بی بی دے دے! طاہرہ کے نام پر وہ اپنے آپ میں حکم لگایا۔ وہ دو چار تائینے چھت کی طرف دیکھتا رہا اور اس کے منہ سے بے لہجہ نکلا۔ طاہرہ... کس طاہرہ... طاہرہ جوڑی! — اور وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

طاہرہ نے جوڑی پہلی باتیں کر کوئی نہ دیا، تیس پھر بھی وہ بابا کی بی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ بجز اور اہل پرانے کمرے میں سوچے تھے اور طاہرہ جب دوسرے دن کے سونے کی تیار کی کر کے بستر میں لیٹی تو بابا کا خیال پھر اس کے ذہن میں لایا۔ طاہرہ جو شاید دوسروں کے لیے ہی جینے کے لیے پیدا کی گئی تھی، جوڑی بابا کے آنسو ہمیشہ کے لیے خشک کر دینا چاہتی تھی۔ یہ پہلی رات تھی کہ اسے نسیم یاد آئی۔ اس کے کوہ کیہ کر رہیں اس زندگی کی ایک اور صفت ایک جس میں رات گزاری تھی، اب بھی بول ملدی رہتا تھا۔ پتہ ہی میں آئے۔ اسے دوسرا سینہ ہر پہلو تھا لیکن وہ محمول کو بھی اس کمرے میں نہیں گئی تھی۔ وہ تین بار کمرے میں کمرے کا حصہ نہ تھا۔ چوڑا دیا تھا تو اس نے نوکرائی سے کہا تھا۔ تانی اس کمرے کا دروازہ کھلا نہ رہنے دیا کہ وہ بچے کے ساتھ اس کے کمرے کی بار بالائی آباد کی باتیں، اتنی خاتون اور اتنی ساجدہ کی باتیں کی تھیں اس کے آنسو بھی ٹپکے تھے لیکن یہ کیفیت محض بڑھاپا کی تھی، اسے عام حاصل نہ تھا۔ طاہرہ دن یا دن کو ملدی ہی ابھی دیا کرتی تھی۔

اب اس نے جوڑی بابا کو قریب سے جو دیکھا تھا سے اس بڑھاپے کے نوپ میں چوڑی ترقی ساری ستر میں نظر آنے لگیں۔ بابا کے پیکر میں اسے اتنی خاتون سے نہ کہ نسیم کے ایک انسان جس کے دم سے طاہرہ بچے پھرے پر رہتی رہتی تھی۔ دکھائی دیا بابا کے کردار اور طبیعتی رجحان میں اسے اپنی شخصیت کا پرتو بھی نظر آ رہا تھا اور اس کی سرگرم عمل طبیعت ایک بار پھر بچہ گزارنے کے لیے تیار ہو گئی۔

اس نے اپنی گری ترقی زندگی پر شک و شبہ نہ کیا تو اسے انجڑی ترقی معطلوں کے نشان نظر آئے۔ لے جرتے قانون کے توش باد کھاتی دیتے۔ اسے اپنے دل کے تھوڑے جگہ جگہ پھرے جرتے نظر آتے۔ اس نے پاک کر خاں میں ایک ایک ٹکڑا چھنے کی کوشش کی اور دن کو جوڑی بابا کے قدموں میں پھل کر لے کر ایک بابا کر لیا۔

وہ جان تھی اور جوانی کی انگلیں بھی تھیں، محسوس کی تھیں، ہر جوان لڑکی کی طرح اس نے بھی تھوڑی کے رزقے جرتے جرتے دل پر غم لے جرتے تھے۔ ان تھوڑی کو حقیقت کا رُوب بھی دے لیا تھا۔ اس نے محبت بھی کی تھی، راتوں کو چھپ چھپ کر رات کے سکوت میں، اداؤں کے ہنگاموں میں۔ اس نے شادی بھی کی تھی، جوانی کی ہی تو وہ تھیں جوتی ہیں، اس نے دونوں کو ہار کے دیکھ لیا تھا۔ کمال گئی وہ محبت، کیا حشر نہ تھا اس شادی کا؟ اس نے زخمی دونوں پر ہر دم لکھا اور لوگوں سے اس کا لاشی نمی کرنا، لیکن طاہرہ کو ان کا سیریل اور نامزدوں کا نفس نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا اسے لے لیں تھا، اس سے یہی کچھ کرنا چاہیے



تھا اور اب تمہارک الدنیا ہونا چاہتی تھی۔

یوں تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ارشد کے ساتھ اس لیے شادی نہیں کرے گی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا انجام بھی نصیر والا ہو لیکن درپردہ خیال یہ تھا کہ اب اس کی چھانی انگلیں ہر جگہ ہیں اور اب وہ ان لذتوں میں اذ سر ہر بڑا نہیں چاہتی۔ اس نے آج بآگ و فضا دیکھا اور اس کی باتیں سنیں تو اسے ایک گناہ لہان ہو گیا کہ وہ سینے کی پیش گوئی کی بجائے کسی عورت میں بھگتے کی یہی بات اس کی عبادت تھی، یہی رکوع، یہی سجود۔ بابا اور بچے۔

”میں! سات برس گزر گئے ہیں۔ کیا اب بھی ظاہر کا انتظار کرو گے؟“ امی نے ارشد سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”میرے بڑھاپے کو دیکھو، جانے بس وقت ختم نہیں جا رہا، اپنی آنکھوں کے بتاؤ تو دیکھ لوں۔“

ارشاد خاموش اور گرم سمجھا سن رہا تھا۔ امی نے کوئی نئی بات نہیں کی تھی۔ آج امی بچہ کر رہی تھی۔ ظاہر پرورد کو بچتی بچوں تو دل ڈوب جاتا ہے۔ بیٹا ٹوٹے اس کے دل میں بھی ظاہر کو بٹھایا ہے۔ وہ بھی ظاہر دانی، ظاہر امی کی تاربتا ہے۔ وہ تو یہ سمجھ گیا ہے کہ اس کی انی کہیں گئی ہوئی ہے اور آجائے گی۔ جانتے ہوئے کیا کر رہا تھا؟ ارشد نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے کہا۔ ”کچھ رہا تھا میری ظاہر امی میرے لیے نیا سوٹ لانے گی۔ رات باجان کر رہے تھے ستمی امی آنے سی والی ہے۔ ارشد بنا اپنے حال پر اور اپنے بیٹے کے حال پر گرم کر دیا۔ ابھی ان کا پیغام آیا تھا۔ شادی کر لو اور ظاہر کو بتادیں گے کہ یہی تمہاری ظاہر دانی ہے۔“

ارشاد کے لیے یہ باتیں نئی نہیں تھیں۔ وہ سات سال سے یوں رہ رہا اور یہ باتیں اسے زبانی یاد ہو گئی تھیں اور اسے سب کو ملنے کی عادت ہو گئی تھی۔ یہ فقرہ اس کے منہ سے لاشعری طور پر نکل جاتا تھا۔ ظاہر واپس آجائے گی۔ اس کے آبا جاجان نے اب اسے شادی کے متعلق کتنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بھائی کی توقع کو کاروبار بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ صرف بھائی اور انیس کے پیچھے بڑی بیٹی تھیں۔

آج ظاہر پرورد کی ساتویں سالگرہ اور عفت کی ساتویں برسی منائی جا رہی تھی۔ یہ ایک خاموشی سی تقریب تھی۔ خوشی کے ساتھ فلم بھی شریک عمل تھا۔ ارشد نے یہ تقریب ہر سال کی طرح منائی۔ ظاہر پرورد کو سننے پڑنے پر ہنار عفت کی قربانے گیا۔ ”آبا جاجان! یہ میری انی کی قبر ہے اور آپ کہتے ہیں کہ میری امی ظاہر ہے جو واپس آجائے گی۔ یہ تو جیسے ہیتمے ناکہ بات کیا ہے؟“ بچے نے پوچھا۔

”یہ تمہاری خالہ کی قبر ہے۔“ ارشد نے کہا۔ ”تمہاری امی، ظاہر وہی ہے اور یہ اس کی لگی بہن کی قبر ہے۔ بڑی امی جاننا نہیں دانی ہیں تمہاری صرف ایک امی ہے۔ ظاہر، وہ آجائے گی۔“ اس طرح ظاہر پرورد کے دماغ سے ایک میٹر ہا سلائی لگی۔ ارشد یوں ظاہر کو کے خیال میں الجھا رہا تھا۔ تین سالہ صبا کے تصور کے ساتھ باتیں بھی کیا کرتا تھا۔ ظاہر پرورد ذرا جتنا تھا تو اس کے ساتھ بھی ظاہر کی باتیں کیا کرتا تھا لیکن ظاہر کا شعور بیلار ہوتے ہی وہ محظوظ ہو گیا تھا۔ وہ اب ایک لکے میں ظاہر سے مل گیا تھا۔ اسے ظاہر پرورد کی تربیت اور شخصیت کی تشکیل کا پورا پورا خیال تھا۔ وہ بچے کے ساتھ کبھی بھی اسی طرح کھیلتا تھا۔

لا، ان میں، برآمدے میں اور انوار کو اسے لادی میں کشتی رانی کے لیے لے جاتا تھا لیکن اب اسے اپنے ساتھ سلا آنا نہیں تھا۔ سنا وہ اسی کے کمرے میں تھا۔ اس عمر میں وہ کشتی کھیلے تو نہ سکتا تھا لیکن کشتی کا رخ اچھی طرح موڑ سکتا تھا۔ ارشد چپوتا اور ظاہر کشتی کے سرے پر بیٹھ کشتی کا رخ موڑنے والا چپو نہال لیتا تھا۔ ارشد پسینے میں شرابور ہوتی کشتی آواز میں بچے کے ساتھ بے لطف باتوں کی طرح باتیں کرتا رہتا تھا۔

اس نے ظاہر پرورد کو اس عمر میں فٹ بال کا کھلاڑی بنا دیا تھا۔ جاکر اور قبل کی کسی نظمیں اسے زبانی یاد کرادی تھیں جو وہ ترنم سے نایا کرتا تھا۔ اس یوں آزادی پر ارشد نے اسے چند نفروں کی تقریر لکھ دی تھی جو اس نے سکول کے یوم آزادی کے جلسے میں زبانی لکھی تھی۔ بچہ پسینے سے ارشد نے سکاؤٹ بنوا دیا تھا جب پہلے دن ظاہر پرورد سکاؤٹوں کی وردی پہن کر گھر سے نکلا تھا۔ ارشد پرقت طاری ہو گئی تھی۔ ارشد نے اسے اپنے ہاتھوں و دی ہنپائی تھی اور کہا تھا۔ ”اب میری ظاہر دانی کی روح بھی خوش ہو گئی ہوگی۔ اُسے تو قدرت نے سکاؤٹ کے دل میں ہی پیدا کیا تھا۔ وہ اگر کبھی میرے بیٹے کو سکاؤٹ بنانا۔“

”آبا جاجان!۔“ ظاہر پرورد نے جوش مرست سے کہا تھا۔ ”جس دن امی کو آنا ہو گا مجھے پہلے بتا دینا۔ میں ہی وردی پہنوں گا اور امی کو خود ہی کا ستر نہال والی نظم پڑاؤں گا۔“

”بہت اچھا، بیٹے!۔“ ارشد نے لپک کر اسے اٹھالیا تھا اور نیا خست کس کا ٹنڈو چما تھا۔ اس کے آنسو چھوٹ آئے تھے اور جب ظاہر پرورد تانگے میں بیٹھ کر سکول چلا گیا تھا تو وہ کشتی ہی پر ظاہر پرورد اور ظاہر کے تصور میں گم رہا تھا۔

بچے بچے سات سال گزر گئے تھے۔ آج اب جھون میں کئی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ ارشد کے آبا جاجان پیش پر آگئے تھے۔ ارشد نے زیادہ وقت برآمدے میں آرام کر سی پر بیٹھے ظاہر پرورد اور یوسف کے بچوں کے ساتھ باتوں میں سی ٹھیل اور مٹالے میں کرارتے تھے۔ ارشد کی امی کے بال سفید ہو گئے تھے اور ہر جگہ آتی تھی۔ بھائی کے ہاں ایک دو بچہ پیدا ہوا۔ نووری کی شادی ایک صاحب زادے کے ساتھ کر دی گئی اور اس نے اپنی نوینا بھالی بھی شادی بچپان کی بل آج اب جھون کی ساری پشانی کو ڈھانپ چکی تھی۔ کبھی پودے کھل کر پھج چکے تھے اور ان کی جگہ نئے پودے کھل رہے تھے۔ اس کوٹھی کی رونق اب بچوں کے دم سے تھی۔ بھائی کے لالہ اور ظاہر پرورد نے سر سبز لان کو فٹ بال کا میدان بنا لیا تھا۔ پرانے درخت چھوٹے جا رہے تھے اور نئی پودا ابھرتی جا رہی تھی۔

یہاں کی دنیا بھی بدل گئی تھی لیکن ارشد کی دماغی دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اس کے جذبات اور احساسات وہی تھے جو تین برس پہلے تھے۔ ظاہر کا انتظار وہی تھا۔ ظاہر کی وادی اس طرح جو ان تھی۔ جڑوں میں ظاہر پرورد بڑا ہوتا جاتا تھا ارشد کے دل میں ہو گیا اور ارشد کا انتظار جو ان جوتا جاتا تھا۔ ارشد کی سرگرمیاں تین یا فظوں پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ عفت کی قبر، ظاہر کا انتظار اور ظاہر کی اس زندگی اسی شمشد میں گزر رہی تھی۔

”ظاہر کوٹ آئے گی۔... عفت نے کہا تھا کہ ملا کر بچہ ظاہر کے سواری کو نہ دینا۔... بچہ ظاہر کا ہے۔... میں ظاہر کا ارکا رہا ہوں۔“ اور ایسے ہی خیال اب اس کے لاشعریں داخل ہو چکے تھے اور اس کی ہر حرکت اور ہر بات میں اس کی نظر آتے تھے۔

تین مہینے اور گزر گئے۔

وقت اور زمانہ تین ماہ اور اگلے ٹھل گئے لیکن ارشدی شہت میں قید رہا اس کے دل و دماغ نے جیسے زمانے کو اڑکھتا تھا اس کے پاس باپ اور بھائی اس کے غم میں تیزی سے بڑھے جوتے جارہے تھے لیکن ارشد اس غم میں جہاں تھا وہاں ہی غم اس کی جڑوں کی انگوٹھ کو زندگی دے رہا تھا۔ طاہر واپس آجائے گی۔ یہ اس کا یقین ہی رہتا تھا بلکہ عقیدہ بن گیا تھا جیسے خدا کی ہستی کا یقین ہو، خواہ وہ نظریہ ہی آئے لیکن انسان مادی کے بھروسے پر زندہ رہتا ہے یہی عالم ارشد کے عقیدے کا تھا۔ اب تو وہ اس جنونی کیفیت میں پہنچ چکا تھا کہ گرامر سے یقین دلایا تھا کہ طاہر کو مرنے سے قوی ہو تمام عمر اس کے انتظار میں رہا۔ یہ تین ماہ سے سات سالوں پر تو سمد خشک ہو کر موزاں کیسے ہیں لیکن ارشد کے سینے میں وہی لہریں اٹھ رہی تھیں اور اس کی صحت روزی بھی دیتی تھی۔ ہندو بھی وہی بھروسہ ہی دیتا تھا اس کے انہوں بھی جوتے جارہے تھے۔ وہ وہیں بھی جوتے جارہے تھے۔ تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں بھی کرتا تھا اور کچھ چوٹی کرتا تھا لیکن اس کے قدم ڈنگا گئے تھے۔ وہ وہی طور پر نڈل اور مستعد تھا۔ کام روزگار ہوا گھر کا پوری مل جی اور کھیتی سہ کرتا تھا۔ وہ اس جنون کو طاہر پر روزی کر تبت میں استعمال کر رہا تھا اور طاہر پر روزی ایک مثالی کردار بننا جاری تھا۔

”دیکھو، طاہر اب اتنا ہی اس حرکت سے طاہر وہی سخت غما ہو گیا۔“

”طاہر اب اچھا کرنا چکا کہ تو نے اسے گالی دی ہے؟ طاہر اتنی کیسے لگے؟“

”دیکھو، طاہر اب طاہر وہی سے یوں لپٹ کے بٹا ہوا ہے؟“

”طاہر اب کو کشتی کی سر بھی کر رہا ہے؟“

”نہ طاہر اب انہیں پرانی ہو گئی ہیں۔ اب طاہر اتنی کے لیے یہ نظر بد کر رہا۔“

کچھ عرصے سے ارشد نے بھر کو خط لکھتے بند کر دیئے تھے پہلے وہ اپنے بہنرات بھروسہ کو کھ دیکر اور اسے سکون نصیب ہوتا تھا لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب طاہر پر روزی چھوڑنا سنا تھا جب سے اس نے اچھی باتیں کہی اور کبھی شہزادہ دی تھیں، ارشد کو نہ فرصت تھی کہی اور نہ ضرورت ہی تھا تھا کہ بھروسہ کو طویل خط لکھے۔ اسے یہ یقین تھا کہ بھروسہ اپنے خط پر طاہر کی تلاش میں مصروف ہوگی اور اسے جب بھی سراسر ملادہ فریادہ اطلاع دے گی۔ اسے یقین تھا کہ بھروسہ کے بہنرات سے خوب واقف ہے۔

ان تین مہینوں میں جزی بپا اور طاہر ایک دوسرے میں جذب ہو چکے تھے۔ دوتنسا اور ملکی مادی سنیوں نے ایک دوسرے میں سکون پایا تھا۔ طاہر وہ تار کا پیشہ وقت بپا کے گھر میں گزارتی تھی جسے گھر چھوڑ کر بھی وہیں گزرتا تھا۔ بعض اوقات وہ رات کو بچہ ہونے سے پہلے غریبوں کے لیے بپا کے ہاں چلی جاتی تھی کبھی کبھی اور کبھی بچہ کے ساتھ بھروسہ کو بچہ تو ضرور ساتھ ہوتا تھا۔ بپا کے گھر میں اب پڑے لگ گئے تھے چلا بانی کی جگہ نواری پٹنگ آگیا تھا۔ وہاں گزریاں لگتی تھیں کہ ان کا ایک ریکٹ۔ مزید پوش بھی اور دو دروں پر تصویریں بھی آویزاں ہو گئی تھیں۔ یہ سامان طاہر اور بپا کی خواہش میں سے فروزا گیا تھا۔

مل سیدی گوتی تھی اور جس محسوس کی تنہائی میں دکھ اور درد تھا وہاں اب سرسٹا الطینان قس کرتے تھے۔ اجڑی ہوئی مٹھل جیسے آباد ہو گئی تھی۔ بپا کا پھر وہ چوکھل اٹھا تھا بھروسہ میں بچوں کے قہقہے بلند ہو گئے تھے۔ تقریب کے وقت پہلے بپا کی بچوں کے زرخے میں ہوتا تھا تین ماہ سے طاہر وہی اس زرخے میں نظر آنے لگی تھی۔ جہاں سکول کے عملے کے بعض افراد نہیں داؤتیں دیا کرتے، وہاں چند ایک استاد اور ساتیاں ابھی بھی جہاں سکول گھوم رہی تھیں۔

بھروسہ کے بچے جو جیسے اب بھروسہ کو بھول گئے تھے سکول کے بچے جیسے سڑیوں آکر بڑا لاشکر ادا کرتے تھے اور گھروں سے نکلے بچوں کے لیے اب نئی سے نئی کمانیاں جنم لینے لگیں کئی نئے ٹھیل ایجاد ہوئے اور ایک ٹھیل ہی کیا گیا۔ جزی بپا اور طاہر نے مل کر سکول میں طرح نو ڈال دی۔ جن اتفاق سے بیڑہ سڑیوں اور بیڑہ سڑیوں دونوں کے تھان۔ رویے اور نیت کو سمجھ گئے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے لگے تھے۔ یسینے میں ایک بار فونی زونی لاس جزی بپا۔ طاہر بھروسہ کے ساتھ ایک بیک پر جاتی تھی سکول میں بزم اب قائم کی گئی اور سکول میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔

بپا اور طاہر اس حد تک ایک دوسرے میں مٹھل گئے جیسے انہوں نے ایک دوسرے کی لگ رگ اور دل کی ایک ٹھکان چھوٹ لیں لی ہو۔ جیسے وہ ایک دوسرے کے حال و احوال سے سالہا سال سے واقف تھے۔ حالانکہ دونوں نے اپنی چوٹ سے بھی ایک دوسرے کو اپنی جزی جزی زندگی کی تحریروں اور نا کاسیوں کی نوداوا نہیں سنا تھی۔ انہیں اب ایسی حرکت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ طاہر نے اب بپا کے کبھی نہ پوچھا تھا کہ بپا میں اچھی طرح جانتی ہوں آپ کا دل کو طویل قسم کی چٹنیں کھاتے ہوئے ہیں جسے آپ بچوں کے پیار سے سلاتے بہتے ہیں۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے بپا نے اسے ساری دھانسان سنا ڈالی ہو۔

بپا نے بھی اب طاہر سے کبھی نہیں کہا تھا مجھے سنا ہے کہ اس طاہر بادل کا غبار یوں ہی ہلکا ہوگا، اور آپ مل جھن جاتی ہیں۔ بپا جیسے طاہر کی زلیست کی کتاب کا ایک ایک لفظ چڑھ چکا تھا۔ صرف ایک اضطراب تھا۔ دونوں کے دلوں میں جس کی بات ہو کر لیتے تھے۔ ان کی سرگرمی طبعیت میں چوٹوں کو سلا لیتے تھیں۔

صرف ایک کشتی تھی، ایک لطیف کشتی، جسے دونوں نے محسوس کیا تھا کہ بپا اور طاہر نے بپا کا سرگرمی رکھ کر دیا تھا۔ بپا اور طاہر کی عمر میں انھوں نے بھلا تھا۔ وہ دونوں چنگ پر ایک دوسرے کے قریب بھی بیٹھے تھے۔ اس کے دوران میں کبھی کبھی ایک کشتی لے کر کر دیتی تھی۔ وہ اب میں بہر بات جو کس لیتے تھے لیکن اس بے قراری کا انہوں نے کبھی لاشکر نہیں کیا تھا۔ بعض اوقات بپا اور طاہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تھا یا اس کے بہنراتوں سے سکراہٹ کے لئے سرخیزوں میں جوتا تو اس کی نظریں یوں بے لگ جواتی تھیں جیسے عورت کو تلاش کر رہی ہوں۔ بعض اوقات بپا اپنی نیت محسوس کر کے چھپنے بھی جاتا تھا۔ دوتنسا بار اس نے اپنے آپ کو دل ہی دل میں کوسا بھی لیکن یہ کیفیت کبھی نہ کبھی آنکھوں کی مادی تھی۔

طاہر کی خود ہرگز اور اور دل کی کاہر عالم کتہیں چادر و قہوں پر شدت سے چال۔ تلاش میری عمر ایک ہی جہت میں دس برس پہلا گیا جائے۔ بلکہ اس نے ایک بار اپنی اور بپا کی عمر کا جائزہ لیا تھا۔ بھروسہ کیا تھا لیکن فرق صیب تھا۔ اس

سے میرے پاؤں پھر لنگھاڑوٹیا:

"دیکھ لینا طاہرہ! میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ جسے مجھ نے یقین کے لمحے میں کہا۔ اگر ارشد تارے سامنے آیا اور اس نے شادی کا لگاؤ مانگو تو خاتمہ آکار زکو سکون کی نعم اس مجھے سامنے بات ہی کر سکوں گی۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔" طاہرہ نے ہنس کر کہا اور باتوں کا رخ بابا کی طرف موڑ دیا۔

وقت اسرار حیات کو چھپاتا اور آشکارا کرتا گذرتا جا رہا تھا۔ ایک اور مہینہ گزر گیا۔

جنگم کے بیٹ ہیں ایک اور زندگی کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس دفعہ اسے زیادہ حلیف ہونے لگی تھی۔ شے اور سر کی لڑائی نے

اُسے بے حال کر دیا تھا۔ لینی دیا کافر نے اسے دس پندرہ روز کا کم کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اُس نے ہدایت کے مطابق پندرہ

روز کی چھٹی لے کر لی تھی۔ اس کی چھٹی کا دو سال روز تھا اور حرجات کی شام تھی۔ طاہرہ جزی بابا کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ ہر روز کی طرح کمرے

میں اندس سا باراد مسرت و موزن تھی۔ دنیا کے ٹھکانے ٹھوٹے اور مارے ہوئے دودل ستارے تھے۔ بار بھی ایسی تھیں

میں کئی فتوحات شکار ہی تھیں۔ اس شکست میں فح و نصرت کے نغمے تھے اور ان ہارے جہزوں نے جانے کتنے شکستہ

دل کو تازہ دم کر کے کارزار حیات میں اتار دیا تھا۔ قدرت اس بار پھر بھول نہ کر رہی تھی۔ جڑھا پاد اور جانی پہلو پہ بیٹھے تھے جوانی

ہوا پے کے لڑے کو کھام رہی تھی اور بڑھاپا جوانی کی بے تابیوں کو سلا رہا تھا۔

"بابا جان! اب یہ کچھ خوبصورت ہو گیا ہے۔" طاہرہ نے کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور کچھ

اضافہ کرنا ہوتا ہے۔۔۔ اگر صوفیہ بیٹ ہو تا تو لطیف ہی آجاتا۔"

"اضافہ؟ جزی بابا نے چاروں دیواروں پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "ایک اضافہ فی ضرورت بڑی ہی شدید

ہے۔۔۔ ان تصویروں میں؟"

"کھانا؟"

"ان تصویروں میں آپ کی تصویر نہیں ہے۔ کس طاہرہ؟"

"اُدھ! میری تصویر!۔" طاہرہ نے مسکرا کر کہا۔ "میری تصویر تو میرے پاس بھی نہیں ہے کبھی اتروا لے گا خیال ہی

نہیں آیا۔۔۔ میں موجود ہوں پھر آپ تصویر کو کیا کریں گے؟"

"آپ ہر روز اور ہر وقت میرے پاس ٹھوڑے سی ہوتی ہیں۔ بابا نے شگفتہ لمحے میں کہا۔ "کسی کی تصویر اپنے پاس

رکھنا حقیقت کا احترام کا اور مصلحت کا اعلا م ہوتا ہے؟"

طاہرہ سوچ میں پڑ گئی کہ لڑکے اور لڑکیاں کتنے شوق سے اپنی تصویریں اتروا تے اور ہر کسی کو دکھاتے پھرتے ہیں مگر

اس کے پاس اپنی کوئی تصویر نہیں کبھی اتروائی ہی نہیں۔ اب جزی بابا نے اس سے تصویر مانگی تو بھی اس کے دل میں یہ خواہش پیدا

نہ ہوتی کہ وہ اپنی تصویر اتروا لے۔

"بس طاہرہ! جزی بابا نے کہا۔ میں آپ کو کچھ صاحبہ اور اطہر صاحبہ سے جواب دینا چاہتا ہوں۔ ہر روز خیال

آتا ہے کہ آپ کو اپنے پاس رکھوں۔ آپ چلی جاتی ہیں تو مجھے میرا سکون ہی چلا جاتا ہے۔ بچوں میں دل لگتا ہے۔ وہ بھی بڑھکھ

ار نہیں آتا۔" طاہرہ نے مسکرا کر کہا اور غیدہ بھی ہو گئی۔ "دیکھئے۔ اب میں نے اپنے آپ کو کس طرح سنبھال لیا

۳۱۲۲

کے باوجود طاہرہ اس خیال کو دل سے نہ نکال سکی اور دونوں کے سینوں میں ایک لطیف تشنگی پرورش پاتی رہی۔ شاید اسی کا ارتقا

کہ بابا اُسے کس طاہرہ کا تھا۔ کس طاہرہ کے کبھی نہ کہا تھا کہ وہ اسے جانی پہلو کو نہیں کہتا۔

طاہرہ کا ہاضی اور ہاضی کی جہول کیاں بابا کی محبت میں گھومتی تھیں اور طاہرہ کی بھگی بھگی ہمتی لیکن اس کا دل ایک لگ

سے آزاد ہو رہا تھا۔ اسے بعض اوقات رات کی تنہائی میں محسوس ہوتا جیسے اس کی ہستی کے دروازے پر کوئی دھک دے

رہا ہو۔ جیسے کوئی زور زور سے اس کے دل کے کھوکھلا کھٹارہا ہو۔ جیسے کوئی باہر بارش اور طوفان میں کھڑا بندرہا ہو۔

پیٹ پیٹ کر رہا ہو۔ ہانگ رہا ہو۔ اس دھک دھک طاہرہ نے کبھی محسوس کیا اور یہ احساس بعض اوقات ایک خوف سا بن جاتا

اس کا دل اس کی گرفت میں آجاتا تھا۔ اس خوف سے ذرا پہلے پاؤں ابھرا سے لاشعوری یا غیر ارادی طور پر ارشد کا خیال آیا

کرتا تھا اور ساتھ ہی کچھ یہ سوال۔ اگر ارشد نہ اطلاع لیا تو؟

اطہر اور جنگم نے اسے یقین دلایا تھا کہ اسی صورت میں وہ اسے ارشد سے چھپانے کے رکھیں گے لیکن ارشد کے ہاں

آجائے کے خوف سے وہ اتنا مذہب ہو سکی۔ حالانکہ ارشد کے ساتھ شادی نہ کرنے کا وہ پختہ عزم اور فیصلہ کر چکی تھی۔

ایک رات وہ ارشد کے آپہنچ آجائے کے خوف سے نہ رونا رہی تھی اور وہ اسی صورت حال کا تجربہ کر کے اس وقت

کو ختم کرنے میں مصروف تھی۔ یہ خیال اور خوف اس کے ذہن کی گہرائیوں میں اتر رہا تھا۔ اُس نے کچھ گہرا سانس لیا

لیا کتاب کھولی لیکن اس کے سامنے ارشد کا تصویر کھڑا ہی گیا۔ اسے وہ رات بھی یاد آتی جب اس نے ارشد کی تصویر سے

باتیں کی تھیں اور بے خودی میں تصویر کو ختم لیا تھا۔ آج پھر اس پر ویسی ہی کیفیت طاری ہوئی جارہی تھی اور یہ خوف حقیقت بنا جا

رہا تھا۔ ارشد آپہنچ سامنے آیا تو زخم زخم کر سکون لگا۔

ایسے میں اس نے یہ بھی محسوس کیا جیسے وہ ارشد کے پاس پہنچ جانا چاہتی ہو۔ دبا ہوا سا ایک جذبات اس کی ذات میں

آج پوری طرح بھڑک رہا تھا۔ طاہرہ ارشد کی محبت کو دل میں سمجھ رہی تھی جیسے زخم کا صدف نشان باقی رہ گیا ہو، مگر باتوں کی تنہائی میں

اسے ارشد یاد آتا تو وہ اس احساس سے پریشان ہوجاتی تھی کہ یہ بیٹو نے تو زخم کا نشان نہیں بلکہ یہ زخم ہے جو شاید کبھی ل

سکے کبھی مند مل نہ ہو سکے گا یہ زخم اور ذوق کی طرح تازہ تھا۔ طاہرہ کی ہستی کا دروازہ زور زور سے کھٹک رہا تھا اور وہ اسے

کھولنے سے گھبر رہی تھی۔

"خیر! دیکھا جاتے گا۔" طاہرہ نے اپنے آپ سے کہا۔ کوئی راہ فراموش نہیں تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو خیر دیکھا جاتے

گا۔ کہ کلاس پریشان خیالی سے گولہ صلی کوانی چاہی تو اسے لطیف سا قرا محسوس ہوا۔ ایسا قرا رجا سے ارشد کی قربت میں ہی

ہلا کرتا تھا۔

"دوسرے دن اس نے جنگم کے ساتھ ارشد کا ذکر چھیڑ دیا۔ کچھ دیر طاہرہ بیوی کی باتیں ہوتیں اور جنگم نے محسوس کیا جیسے طاہرہ

کے دل میں ارشد کی باتیں چلی ہیں۔

"طاہرہ! ارشد کو بلا لیں؟"

"ار نہیں آتا۔" طاہرہ نے مسکرا کر کہا اور غیدہ بھی ہو گئی۔ "دیکھئے۔ اب میں نے اپنے آپ کو کس طرح سنبھال لیا

میں نہیں کہیں کہ چلے جاتے ہیں مگر آپ کی تصویر ہوتی تو سونے سے پہلے اسی سے دو چایا میں کر لیا کہ آپ کا وجود میرے  
مرازم کوئی زندگی دیتا ہے، وہ نرمی لعل اوقات کچھ سماتا ہوں۔ آپ شاید سوچ رہی ہوں کہ کھاس ٹاٹے سے کوسری تصویر کیا کہ  
شوق پر آیا ہے۔ اسے میرا لاکھ پنی کر لیجئے۔ لوگ تو مجھ باگل ہی کہتے ہیں :-

۱۰۔ اللہ کرے میں آپ کو کچھ کچھوں بہر حال یہی پوری کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہونے میں کہ کیا میرے پاس  
یہی اپنی تصویر ہے۔ ان کی جوانی کی تصویر وہ بالکل میرے مشابہ ہے۔ اس متذکرہ مشابہہ میں خدا سے دلچسپی ہوں  
مجھے اپنی تصویر یاد رکھو رہتا ہے۔ دوسری ایک ایسی اوقات میں سا جو ہوتا ہے۔ یہ ان کی میں برس کی عمر کی تصویر ہے۔ بڑی اچھی آتی  
!! جان! بہنوں پر ایسی ہی سکو اسٹ ہے جیسی اس بچے کی تصویر میں ہے جسے ساتھ لیتی آؤں گی۔ !! جان! — ظاہر ہونے  
چمک کر کہ شکل تو جمع ہے۔ آدھے سے زیادہ وہ ان کے ساتھ کر رہے ہوں۔ اچھا! وہ تصویر بھی آؤں گی۔ — ظاہر ہو کہ نیت  
منجید ہو گئی اور خدا سامنے کر لیں۔ لیکن !! جان! وہ تصویر کسی کو دینے والی نہیں۔ اس تصویر کو ایک بہن کی اہمیت حاصل  
ہے۔ اس کی دوسری طرف میری ان باتوں سے دوچار افراد میں ایک کو بھی لکھی ہوئی ہے۔ بہر حال میں آپ کو دکھاؤں گی :  
اگر اس تصویر میں آپ کی وہاں بھی جھلک ہے تو لکھی : انا میں ظاہر ہوں۔ !! انے کہا۔ مجھے برس چیز سے پیار ہے  
جس میں آپ کی جھلک ہے۔

”ایا جان! اب اجازت دیجئے! — طاہر نے بیا کے ہاتھ تھام کر کہا — ”نہجرا کی طبیعت اچھی نہیں۔“

خدا ایں صحت یاب کرے۔ بابا طاہر کے ساتھ یہ اچھو کھڑا اجڑا اور طاہر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ طاہر کے ساتھ چلا نہادواز سے مکے آیا۔ صحن میں اور گرد و پیش پر برات کا اندازہ لگ کر ہر جگہ پکڑ لیا۔ بابا کو طاہر کو کمرے کے پردوں میں سے چھپ چھپ کر آتی ہوئی دھنسی سی روشنی میں ایک لطیف ساتنے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ بابا نے طاہر کو دیکھا اور اس کا جو ہاتھ ہلا کر کھولنے کو بڑھاتا واپس لگایا۔ اس نے طاہر کو لے کر ہاتھ کو چھوڑ دیا اور اس کے سامنے اس کے کئے کندھوں کو حتم کر دیا۔ بابا سے کہا: ”حسن طاہر!“

ظاہر ہو چڑیا کے اس لمبے کوب اچھی طرح سمجھنے لگی تھی۔ وہ جان گئی کہ بابا کے جذبات امدائے تھے ہیں۔ ایسے میں بابا کو تنہا نہیں چھوڑ کر کی تھی مگر اس نے اسے خبر کی شکایت کا خیال تھا اور وہ جلدی گھر پہنچا جاتی تھی۔ ظاہر ہے بابا کی طرف دیکھا اور اس پر پنے بہت محبت غالب آگئی۔ وہ آگے بڑھی اور بے ساختگی سے سرسری کے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ ظاہر ہے پہلی بار بابا کے جسم کی خوش اور سختی کو محسوس کیا۔ بابا نے جھک کر اپنا دل ظاہر کرنے کی سعی نہ کی بلکہ وہ دوسرا تھا اس کے کندھے پر بچہ نہ لگا۔

تو وہ مس ظاہر نہ۔ وہ چونکہ ایک طرف بہت گیا اور ظاہر کی خوشی و حکمت کا روزہ می نہ ہوئی آواز میں کہا۔ اپنے  
 ایاک حضرت کر دینا کہ کبھی ایسی کیفیت میں آجی جاتا ہوں۔ اپنے ایاک کو بھول کر زمانا۔ کل غصہ کر لے گی۔ اس نے ظاہر کی  
 بیخود ہاتھ رکھا اور کہا۔ مشہد بخیر۔

وہ رات طاہرہ اور بابا کی بڑی لمبی رات تھی۔ متضاد خیالات و دونوں کے سینے ہلار رہے تھے۔ بابا نے زکریا سے ملنے

لہئے بہت کچھ سوچا وہ کچھ بھی سوچا جو اسے شاید نہیں سوچنا پڑتا تھا اور کوئی ایک غنڈہ وہ اپنے آپ سے اس سوال پر بحث کر رہا نہ پوچھوں گا وہ برا مانے گا۔ وہ راض نہ ہو جائے ... مگر کیا اتنا زیادہ فرق؟ !! کہنے کی بار اپنے آپ کا غصے سے دیکھا اس کے دل میں حرج و مرج تھا جسے دیکھ کر وہ غصے سے بڑھتا تھا اور حقیقت محض اس قدر بھی نہیں رہتا جسے انہیں بزرگ کے ذریعہ سمجھا گیا تھا۔

مجھے ایسی ہی ذہنی حالت ظاہر ہو کر رہی، بلکہ وہ اس حد تک پہنچ گئی۔ ”یہاں محض نام کا بابا ہے۔ بالوں کی سفیدی تو انسان کو  
 زمانہ میں کر سکتی..... بڑھاپا بھی سب مجھے اس کے جسم سے تو محبت نہیں اس کی روح جو ان ہے لیکن بے سہارا میں اسے  
 سہارا دے سکتی ہوں۔“

طاہر نگر کے تین چادہا سے بابا کے چہرے پر لڑکتی ہوئی جوانی کے آثار دیکھ رہی تھی۔ "بابا کا دل جوان ہے۔ اسے ایک زبان سنبھالی کی ضرورت ہے۔ بابا پند نہیں کرے گا۔" بات کو دیکھیں؟ ناراض نہ ہو جاتے۔۔۔ اور لوگ، لوگ کیا کہیں گے۔ یہاں عرصہ ایک ہزار سے شادی ہوئی۔ شاید اس کے پاس "دولت جھونکنے" نہیں، شادی بابا کو ملد ہی رہا کرے۔ لہذا ختم ہو جائے گا۔ جانے کیا ہو جائے؟ اچھی میں جلد ملت ہے شاید یا لینے میں نہ ہو۔ لیکن تنگی کسی؟ کوئی تنگی؟ میں ہائی نیچ کی مڑوں؟۔۔۔ شادی!۔۔۔

اسے نفیم یاد کیا اور فاکٹر کے الفاظ بھی یاد آئے۔ دیکھتے تھے نفیم نفیم صاحب سے دور رہے وہ نہ ان کا دل جواب دے جائے گا۔ انہیں صحت باب جانے دیکھتے۔

مات گزرنے کے ساتھ ساتھ ظاہر کے خیالات اُلجھتے اور گمراہ مٹے جا رہے تھے۔ دماغ تھک گیا تھا اس پر غزوگی ایسی ہر پہنچتی اور انھیں بندھوٹی جا رہی تھیں۔ انھیں بیانا اور نسیم کے خیال کو اپنے حاسن میں لے کر بند کجیوں اور اس نے ابیں اور شکر کو دکھا۔

خواب میں ارشاد اس کے بہت قریب آگیا تھا۔ اس قدر قریب کہ اس نے اپنے خمار پر اس کے سانسوں کو محسوس  
 طارو نے خمار پٹاؤٹھ کر کہ ارشاد سے کہا۔ ”نہیں! ارشاد! نہیں۔ اب مجھ کو باؤ مجھے اور چلے جاؤ میں اب تیرے ہاتھ  
 انکوں کی۔“ اور ایک سوال بٹاٹھا جب دھواں فضا میں تحلیل ہو گیا تو اس نے دیکھا، ارشاد ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہے  
 طارو کا سانسوں کی خوشی میں رکھا ہے۔ وہ اس کے درمیان تھا۔ قسم نے کہا تھا کہ تم میرے ہاتھ نہیں لے سکو گے!

ظاہر ہوئے لیکن یہ دونوں ہاتھ اوپر کر کے اشرہ کے چہرے سے کواٹھوں سے تھام کر پینچے کرنا اور کہنا "نہیں چلیے!"  
ان کے ساتھ تمام آجادیہ کے قریبیات سے بھاگنے والوں کی۔ میں انکار نہ کر سکیں گی۔

جب جس کی آنکھ کھلی تو اس نے خواب کو دہن سے اُگل دیا مگر اس نے محسوس کیا کہ وہ خواب اس کے اوپر اور اس طرح بھنا رہا ہے جس طرح بھنورا گل پر چھینٹتا ہے۔

ظاہر نے جب اُمّی ساجدہ کی تصویر نکال کر پرپس میں ڈالی تو وہ ہنس پڑی اور سوچا۔ ”یابا کبھی یقین نہیں کرے گا کہ یہ تصویر

میری نہیں۔

اس لئے کہی بار دیکھی مجھ کو یہ تصور کو بھر دیکھا لیکن اسے اس کے سوا کچھ یاد نہ آیا کہ وہ یہ تصویر حوزی مالک کے لیے لے جا رہی ہے اور وہ اسے کہے گا۔ ”بس ظاہر وہ آپ کے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ یہ تصویر آپ کی والدہ کے ہے؟“ اس لیے کہ آپ یہ تصویر مجھے دینا نہیں چاہتی تھیں۔

وہ تصور میں بابا کے اس بیچ و تاب سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اسے اپنی طرح شینکا تصور کی دوسری طرف دکھائے گی، اتنی سادہ اور احمق خانوں کی تحریر دیکھ کر بابا اپنی غلط فہمی پر شرمندہ ہو گا۔ ظاہر ہے سوچا کہ بابا کے ساتھ کتنا دلچسپ مذاق ہو گا۔

سکول شروع ہوئے سے پہلے اس نے بابو بتایا کہ وہ تصویر لے آئی ہے لیکن گھر چل کر دکھا گئے گی اس کا خیال تھا کہ  
سکول شروع ہوئے میں چند منٹ نہ گئیں، مذاق اور حوارہ جاتے گا گیارہ بجے چھٹی ہوئی تو ظاہرہ حاضری کے جب تک بند کرنے  
میں مصروف تھی کیونکہ یہ پہلے کی آخری تاریخ تھی۔ وہی نہیں، آج تمام اچانک استائیاں اور ناسی کام میں مصروف تھے۔  
ظاہرہ فارغ ہو کر باہر نکلی تو بابا کو کوارڈر رک گیا۔ دیکھا کہ بابا ایک لڑکے کو ساتھ لے کر کوارڈر کی طرف جا رہا تھا۔ بابا نے  
جب تک کام ختم کر لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ظاہرہ آج آئے گی۔ اس لیے اس نے ظاہرہ کا انتظار نہ کیا ظاہرہ نے دم تک بیکر لے  
اور اس قدم دوسری سے آواز دی۔ سب جری بابا!

ہم نے گھوم کر دیکھا اور وہیں تک گیا۔ اس نے حسیب سے چابی نکالی اور لڑکے کو دے کر کہا: ”دیکھو بیٹا! وہ دو دروازے کھول دیکھتے ہو نا؟“ جہاں کھولے دو دروازے کھلوے۔ یہ چابی باہر کی ہے اور یہ اندر کی۔ لڑکا چایاں لے کر جھانک گیا۔ اس نے اس طرح فریادیں ماریں کہ وہاں سے ایک شخص باہر نکلا۔ وہاں سے دوسرا بھی نکلا۔ پھر ایک کے پاس حیران و پریشان کھڑا تھا، جس نے فرمایا: ”یہ کونسا لڑکا ہے؟ اس نے کتنا کڑا کر نہیں آئے؟“ لڑکا خود کڑے کے آگے آگیا۔ ”میں شاید معلوم نہیں تھا کہ قلعے کے دروازے کھول دیا جائے گا۔“ لڑکا نے کہا۔ ”کڑا کر لگی ہے اور اب جان بھی آئے نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میرے ساتھ چلو پہلے کھانا کھاؤ، اور پھر اسی سے کہو کیا ہوں۔“

”کچھ کھاؤ۔“ ایک صاحب نے کہا۔ ”میں میرے کارخانے سے آتا ہوں۔“ حسیب نے کہا۔

”بعض ایچ بے چارے پریشان ہو رہا ہے۔ شاید نئے آئے ہیں۔“ حسیب نے کہا۔

”جی ہاں! اور طاہرہ کو کارخانہ پہنچے تو لڑکا کارخانہ پر سے لڑاؤ کھول چکا تھا۔“ اوپر سے ملازمی نے کہا۔

”ابا کو بچے کا زادہ خیال تھا۔ طاہرہ نے سوچا کہ کھانے میں دیر نہ کی جائے۔“ بچے کو کھانے کے قدر بھوک لگی ہوگی۔ وہ قریب کھانے پر پہنچے۔

”بچہ ناہمی تھا۔ جبکہ کھانا لکھن اس دوسری جماعت کے بچے تھے۔“ حسیب نے فرمایا۔

”بہت لکھنا۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔“

ظاہرہ کے دماغ میں تصور والہ مذاق سلایا نہ جوا تھا۔ اس نے بابا سے کہا۔ ”بابا! آج ہماری اور آپ کی لڑائی ہو جائے گی۔ آپ نہیں

لگے یہ تیسویں مہرے سے اور میں کہوں گی اُمّی کی جیسے؟

”پھر فیصلہ کن کرے گا؟“ بابا نے منہ سرکھا۔ ”لاؤ! دکھاؤ تو سہی۔“  
 ”کھانا کھا کے دکھاؤں گی اور فیصلہ بھی ہو جائے گا۔“

”کھانا کھا کے دکھاؤں گی اور فیصلہ بھی ہو جائے گا۔“

”فیصل میں کروں گا۔“ پتھنے نے شوخی سے کہا اور طاہر اس کی شوخی سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے ایک کپے کی گڑن کے گرد بازہ لپیٹ لیے لیکن وہ بابا کے ساتھ مذاق میں اس قدر چٹختی کر چکے تھے کہ ساتھ ساتھ یہ بازہ زور زور سے اس قسم کا صاف ستھرا جھولاجھولا، خوبصورت اور شریخ بچرمل جانتے تو وہ اسے چاٹ نہ لے۔ ایسے بچوں کا تو وہ مارے پیادے کے برحال کر دیا کرتی تھی۔ بابا کو بھی طاہر کو یہ مذاق دالافٹو اس قدر بھلا لگا کہ وہ اسی میں محو ہو گیا ورنہ بچوں کے معاملے میں وہ دنیا کو ہی بھول جاتا تھا۔ ابھی کھیلے بیٹنے کی بات ہے کہ طاہر نے اسے سر پر سے تیا کو وہ ایک نار نار بچی کی تعلیم کے لیے کہیں روپے ماہوار پناہ بھیجا کرتی ہے تو بابا نے معاف کیا تھا۔ آٹھ ماہ سے دس روپے مجھ سے بھی لے کر بیچ دیا کرتی تھی۔ اور اب بچی کے لیے پینتیس روپے جانے لگے تھے۔ اس کے بعد بابا نے طاہر کو سونپی کا حلیہ اور ان کا نقشہ پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح کہ جیسے وہ اس بچی کا تصور باندھ کر اس سے پیار کرنا چاہتا ہو۔

”بیٹا! بابائے پنجے سے کہا: معلوم ہوتا ہے تمہارے ہا جان کو دو تھی آج کی چھٹی کے وقت کی غلط فہمی ہے درندہ اب تک آجلائے۔ وہ اب دو پنجے آج آئے گئے۔ بابائے پنجے کے سر پر ہاتھ پھر کر کہا: ”ساتھ دو! لے کر ہے میں جا کر جاؤ۔ تمہارے آبا جان آج آئیں گے تو ہم تینیں جگائیں گے۔ میں چپڑاسی کو ان کے اشتہار میں بٹھا آیا ہوں۔ جاؤ میرے پنجے! شاہ باں!“

بچہ دوسرے کمرے میں خیار پائی پر لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا۔

”کتنا پیارا بچہ ہے کسی کا“ — طاہرہ نے کہا۔

”اچھا تو جناب اب تصویر نکال لیتے۔ ملازم برتن لے جا چکا تھا تو یاما نے کہا۔

ظاہر نہ ہوں کہ میں سے تصویر نکالی اور مسکرا کر دُور سے بابا کو دکھائی، بابا کھل کر ہنسنا اور لڑلا۔ ”گو کیا آپ اتنی دیر سے مجھے بنا دی تھیں۔ بہت خوب، ہنس، ظاہرہ اب لڑائی نہیں ہوگی۔ تصویر اب اس گھر کے کی زینت بنے گی۔“

”میں سچ لہتی ہوں۔ یہ تصویر میری امی کی ہے۔“ طاہرہ نے تصویر بچہ پیچھے کر کے پنوں کی سی شوخی سے کہا۔

’یہاں قریب تو لایا تیتے نا!۔۔۔ بابا نے ہمارے سیلیوں کے انداز سے کہا۔“ یہاں میز پر رکھتے۔ ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے میں مانتا ہوں کہ مال بھی میں مشابہت ہوتی ہے لیکن کیس کیس نہ کہیں تو فرق ہو گا۔“

ظاہر نہ آئے کہ تصویر بابا کے سامنے میر پر کہ دی بابا نے اسے ہر سلسلے سے دیکھا اور ظاہر بابا کے چہرے کے آثارِ خلعت کو کچھ نہ ہی۔ اس کے چہرے پر عیاں طور پر تہذیبیں آرہی تھیں اور جاری تھیں۔ بابا تصویر میں اس طرح مجھو گیا جیسے سیرور دیکھتے دیکھتے اس کا دل مٹ گیا ہوا درود و بیٹھے بیٹھے کھڑا کیا جو۔ ظاہر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔

”آپ کی اب عمر کیا ہے؟ تیس سال پوری نہیں ہوئی نا؟... ہونہ؟۔ بابا نے تصویرِ نفوس حمائے موتے کہا۔

ہوں! آپ کی یہ تصویر اٹھارہ یا بیس برس کی ہے۔

”میری امی کی“

”میں ظاہر ہوئی“

”غلط!“

”صحیح۔“

ظاہرہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔

”کس قدر شبست! — بابا نے زربک کہا جیسے ظاہرہ کی بات مان لیا ہو۔ ظاہرہ ابھی تک نہیں رہی تھی اور بابا اپنے آپ سے بات کرنے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”دبی ملک، دبی نقشہ، مسکراہٹ بھی دبی۔“ بابا کے چہرے پر اس کی پرتیاں چٹکیں گونگناں کا خم دی، ہونٹوں پر مسکراہٹ دی۔

بابا نے آہی اور ظاہرہ کی طرف دیکھا، پھر تصویر کو دیکھا، بولا۔ ”ماننے کو جی نہیں جاتا میں ظاہرہ ماننے سے جی گھبراتا ہے۔“ اچھا تو تصویر کی دوسری طرف دیکھتے۔ ظاہرہ نے خوشی سے کہا۔

بابا نے تصویر کو مان لیا اور اس پر کبھی مڑی مڑی نظر ڈھی، ظاہرہ کی آنکھیں ابھی مسکراہٹ تھیں اور اس کی ہنسی کانوں تک پہنچ گئی تھی، لیکن بابا نے ایک جھٹکے سے تصویر کو اپنی آنکھوں سے ڈھک کر دیا اور خود اس طرح گھبرا کر کھلی کی تیزی سے سر تھپکے کیا جیسے اس نے ہاتھ میں سانپ پکڑ لیا تھا اور اس نے اس پر ہلکا کر دیا اور ساتھ ہی بابا نے دوسرا ہاتھ اس قدر زور سے میر پر مارا جیسے بندہ بلی ہو، ایسا دھماکا ظاہرہ گھبرا گئی۔ اس نے دیکھا کہ بابا کے ہونٹ نمایاں طور پر ہترنے لگے تھے اور پس ہاتھ میں اس نے تصویر پر زور دیا تھی وہ اس طرح کانپ رہا تھا کہ تصویر کو قاتلنا مشکل ہو رہا تھا۔

بابا نے تصویر کو پھر سیدھا پھرا لیا، پھر سیدھا پھرا لیا اور بابا پھر وہ اس قدر لالہ سرخ ہو گیا کہ ظاہرہ نے اس کے چہرے پر یہ رنگ کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ جان گئی کہ بابا آج پھر جذبات میں ڈوب گیا ہے۔

بابا ڈوب رہا تھا۔ ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ اس پر وہی کیفیت ظاہر تھی جو ڈوبنے والے کی ہوتی ہے۔ وہ تصویر پر پرکھنے لگا دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں ایک جگہ ٹھہر گئیں۔ اس کے ذہن میں طوفانی لہروں آٹھ آٹھیں اور جٹاؤں سے ٹکرائے گئیں۔ اس کے سینے سے بچے لے اٹھنے لگے اور آسمان کی طرف بڑھنے لگے۔ اس کے داغ میں تیز رفتار میں گامی کا شور بلند ہونے لگا۔ اس کا دل اٹپانے والے میں کی طرح ٹپٹپٹ ٹپٹ ٹپٹ کا دوا دوا بلند کرنے لگا۔ اس کا جسم ہلکی سے چلنے کی پٹ میں لگا اور اس کے سامنے زمین آسمان ایک چکر کی صورت میں گھومنے لگے۔ بہت تیز باد و باران کا شورش اس کے کانوں کے پردے پر بھڑکنے لگا۔ لگیاں کر کے گئیں۔ وہ شور، وہ ٹپل، وہ قہقہے کہ بابا کی اس اندرونی حالت کا عکس اس کے چہرے پر ظاہر ہونے لگا۔ اس کا منہ ٹھنڈا ہوا۔ ظاہرہ کیوں موسیٰ بڑا جیسے بابا بے ہوش ہو کر گرے والا ہو۔ اس نے بابا کے ماتھے پر پسینے کے قطرے بھی دیکھے۔ بابا کا سا جسم پھر پھر کانپ رہا تھا۔ جیتنے سے کہ ظاہرہ جڑی بابا کا اس ذہنی حالت سے نکلتا تھا بابا نے تصویر پر یہ پرکھ دی اور کچھ کھڑا ہوا۔ اس نے آٹھ کھڑا ہوا کی طرف پھیلا دی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ لرزے سے ہوتے ہونٹ جانے کی کہتے والے تھے کہ اس کی کڑا

کسی چیز نے ملتی میں ہی دیر ہو لی۔ اس کے ہونٹ تڑپ اٹھے۔ ظاہرہ حیران پریشان آہستہ آہستہ بابا کی طرف بڑھی۔ بابا کے سینے سے ایک دلدرد آواز نکلی۔ یوں کہ جیسے کسی نے اس کا گلا گھونٹ رکھا تھا اور ایک لخت پھوڑ دیا ہو۔

”میری بیٹی! — بابا آنکھیں بند کیے اور باہیں پھیلائے ایک قدم آگے بڑھا اور کانپنے آواز میں کہا۔ ”میری بیٹی! ظاہرہ! ظاہرہ! اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھی تو بابا نے اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر اپنے سینے کے ساتھ چپکا لیا اور اس کا منہ اوپر کر کے ان پر بوسوں کی بارش کر دی۔ گالوں پر آنکھوں پر، پیشانی پر کندھوں پر گردن اور بالوں پر۔ بابا کے آنسو پٹ پٹپٹ گر رہے تھے۔ وہ ہر بوسے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ ”میری بیٹی! ظاہرہ! میری بیٹی! —

ظاہرہ سمجھ چکی کہ بابا اس قدر جذباتی کیوں ہو گیا ہے۔ اس پر تو جیسے کسی دور سے کاڑھ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بابا کو پکڑ لیا اور خود فرش پر بیٹھ گئی۔ بابا کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اس طرح بے فانی سے رو رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے پتھر دم توڑ رہا ہو۔

”بابا جان! — ظاہرہ نے اسے گھنچھوڑا۔

”جڑی بابا! — جیسے وہ اسے نڈے سے جگایا ہو۔

”کیا تھو بابا میرے ساتھ بات کیجئے۔“

”بابا! کہو، ظاہرہ بیٹی! اب بابا نہ کہو۔“ جڑی بابا نے اپنے سامنے دو زانو بیٹھی ظاہرہ کا سر پر کلامی کرکھ کر کہا۔ ایک لڑ بابا جان کو پھر سر لگا گھونٹ دینا۔ میں تیرا باب ہوں۔۔۔ ظاہرہ نے سر پر دیا۔۔۔ میں جڑی بابا نہیں ہوں۔ یہ میرا بہرہ ہے۔ میں جمال بیگ ہوں۔ تیری امی ساجدہ کا قافلہ خاندان۔ ظاہرہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ”میرے منہ پر ہتھکڑی دے۔ میری بیٹی! اپنے بزم باب کے منہ پر ہتھکڑی دے۔۔۔ بابا ظاہرہ کو کندھوں سے پکڑے بلکان ہو رہا تھا۔ تیری امی خانواری میری ساری ساری تھی۔۔۔ تو بال بابا میں اپنی بیوی تھی۔“

میرا کیا کہہ رہے ہیں۔ بابا جان! — ظاہرہ کے لیے بابا اور بابا کی باتیں سنا بہت پریشان تھیں۔ اس کا سر کھانے لگا تھا۔ وہ بولی۔

خانوں نے بتایا تھا۔ میرے بابا جان جنگ میں مارے گئے تھے۔

”نہیں نہیں۔ نہیں۔“ بابا نے زور زور سے سر ہلایا۔ ”وہ کجمنٹ باب ابھی زندہ ہے۔ میں میری بیٹی! وہ جنگ میں مل مارا گیا تھا۔ آج سے تیس برس پیشتر اس جو بڑے سینے میں ایک جنگ چھڑی ہوئی تھی میں اس نے اپنی نو آئینہ بچی کو کھیل تھا اس نے سوچا ہے اس کی اس میں میں جانے کی لیکن وہ زندہ رہی، بابا کو شرمسار کرنے کے لیے۔ بابا! اپنے گناہوں پر سزا بھگتے گئے۔ لیے زندہ رہا۔۔۔ میں جہاں بیگ ہوں، ظاہرہ بیٹی! میں جڑی بابا نہیں ہوں۔“

”بچے کچھ سمجھاتے تھے۔“ ظاہرہ نے اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے کہا۔ ”خدا کچھ سمجھاتے تھے۔“

”تو میری بیٹی! —“ بابا نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھا تے جڑے کہا۔ ”میرے قریب آؤ۔۔۔“

اور بابا! — اسے بتایا کہ اس نے کس طرح ساجدہ کے ساتھ شادی کی تھی اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ اسے لڑکپن میں قدر نفرت تھی۔ وہ پاگل تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر لڑکی پیدا ہو۔ اس پر اس کے گھر لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر اس نے کس



یہ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

نوار کے تیز زموں کی آہستہ کمرے کے دروازے پہنچی تو طاہرہ نے اس طرف دیکھا۔ اس نے دیکھا اور آنکھوں کو فراسا سیکڑا پھر غور سے دیکھا کچھ ایسی ہی حالت نور کوئی ہوئی۔ طاہرہ کی داخلی کیفیت وہی ہوئے گی جو کچھ دیر پہلے تعمیر کوئی کر کے بابا کی ہوتی تھی۔

”ارشاد؟“ طاہرہ جیسے جھنجھائی ہو۔

”میں تم ہو، طاہرہ؟“ — ارشد نے آہستگی سے کہا اور حیرت زدگی کے عالم میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

طاہرہ نے دیوانگی کے عالم میں بازو پھیلا دیئے اور باپ کی موجودگی کو نظر انداز کر کے بہت تیزی سے آگے بڑھی اور

ارشاد کے ساتھ لیٹ گئی۔ طاہرہ کا باپ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اس منظر کو پیادہ بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”میری تم؟“ ارشد نے طاہرہ کو انگلی کرتے ہوئے اس کے کندھوں کو تھام کر کہا۔ وہ بوکھلا چلا تھا۔ بولا — ”میری سہیلی! آٹھ نور دوڑتے پندہ کی گئی ہے۔ آتی ہے اس قدر صرف تھوڑا کچھ کہ تھک کر رہ جائے گا۔“ وہ فراسا کر بولا — ”لاؤ مجھے! میرا کچھ تو بتاؤ کہاں ہے؟“ طاہرہ پرویز:

”ارے ارے رے رے! طاہرہ نے بڑا ہلکا کر کہا — یہ طاہرہ پرویز ہے؟“

اور وہ دوسرے کمرے کی طرف اس طرح بھاگی کہ کوسری کو گھڑا، نیز سے ٹٹوئی اور سوتے ہوئے طاہرہ پرویز پر جا گری اس نے اس پر بوسوں کی پوچھا کہ وہی اور سات ساڑھے سات سال کا بچہ کچھ کر جاگ اٹھا اور وہی سی صورت بنائی۔ طاہرہ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگایا اور واپس اس کمرے میں آئی۔ وہ رو کر کہنے کو چم رہی تھی — ”اوہو میری عفت کی نشانی! اوہو میری قربانی کی یادگار!“

”اوہ ارشد معذرت کھنا! طاہرہ نے کہا اور اپنے باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی — ”ہاں سے ملو۔ یہیں میرے آبا جاناں جمال بیگ۔“

”کیا کہا؟“ ارشد نے حیرت سے پوچھا — ”تمہارے آبا جاناں؟“

”ہاں! میرے آبا جاناں!“ طاہرہ نے کہا — ”تیس برس کے بعد آج اچانک ملاقات ہو گئی ہے۔ یہ کہاں کی بعد میں باتیں کیے؟“

ارشاد اس طرح آگے بڑھا جیسے خواب کی دنیا میں چل رہا ہو۔ اس نے بابا کے گھٹنے چھو کر مصافحہ کیا۔

”آبا جاناں! یہ ارشد ہے۔“ طاہرہ نے کہا — ”یہ بھی جلال آباد کے رہنے والے ہیں۔“

”وہ بینا طاہری؟“ ارشد نے سترت سے بھر پور لہجے میں بیٹھ کر کہا — ”میری تساری طاہرہ اتنی تم نے تو پہچانی ہی نہیں؟“

اور طاہرہ پرویز نے جسے ابھی تک طاہرہ نے اٹھایا تھا تھا، طاہرہ کی گردن کے گرد بازو لپیٹ کر اس دور سے بھیچا کر

مردم گھٹنے لگا۔ اور طاہرہ نے اس کا رخسار اپنے رخسار کے ساتھ لگایا۔

طاہرہ! اب تو کھل کر باتیں ہوں گی۔ ارشد نے کہا — ”ہیں اور میرے بیٹے نے پورے سات سال پہلے

طرح اتنی خاتون پر حملہ کیا اور ساجد بھنگی کی خطرناک حالت میں دونوں کے درمیان اگر گر پڑی تھی۔ بابا نے طاہرہ کو اس حادثے کی تفسیرات سنائیں۔ خاتون، ساجد اور جلال آباد کی باتیں سنائیں۔

طاہرہ کو ایک ہفتہ جو بابا کے کندھے پر تھا سکرنا سکرنا، بابا کی گردن کے پیچھے سے گزرتا اس کے دوسرے کندھے تک پہنچ گیا۔ پھر بازو بابا کی گردن کے گرد لپٹ گیا اور طاہرہ کے دوسرے بازو نے بابا کے سینے کی طرف سے آگے بڑھ کر بازوؤں کا گھیر لیا۔ پھر گھبراہٹ سے ہونے لگا اور طاہرہ کے رخسار بابا کے گالوں کو چھونے لگے۔ ”اوہ! میرے آبا جاناں!“ طاہرہ کے سینے سے جیسے سسکی نکلی ہو۔

”تمہاری نانی! اہاں خاتون! تمہیں اٹھا کر بھاگ گئی تھی۔ اس وقت تمہاری عمر نسل دو گھنٹے تھی۔“ بابا کہہ رہا تھا۔ میں نے دیکھا اور ساجد دھڑکی جتے تو میں خرسے نکل گیا۔ یہی باتیں اسٹان ہے طاہرہ پرویز! کہیں نے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائیں، پھر کسی وقت سناؤں گا میں جلال آباد سے بنگال تک پہنچ گیا۔ پھر یادوں ایسے اکھڑے کہ سندھوستان کے کئی شہر گھوم لیے۔ ساجد مقرر اور نورانیہ پکی میرے دل و دماغ پر آسیب بن کر سوار ہو گئیں۔ انہوں نے ہر جگہ میرا تعاقب کیا اور میں ہلکا ہلکا۔ مکمل ایک سال باگل! خود بخود طبیعت سنبھل گئی تو ایک معمولی سے سکول میں دوسری جماعت کی ماسٹر لی گئی ہیں ایک آگ میں جلتا رہتا تھا جب میں نے پہلے سکول میں پہلے پچھے سے پیار کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سینے کی آگ بجھنے لگے۔ اسی دن میں نے گلی سے گزرتے ایک ننھی سی بچی کو اٹھا کر چانوہ کرا دی اور میں نے اپنے آپ میں لطیفی تنکی محسوس کی پھر میں نے ہر پچھے سے پایا۔ پھر میں نے اپنی رگ میں بچوں کے پیار کو سمویا۔ مجھے ہر بچی کے روپ میں ساجد اور اس کی بچی کی جھلک نظر آتی تھی۔ طاہرہ پرویز! میں نے ہر بچی کی محض قربت میں تجھے تلاش کیا ہے۔ میں نے ہر بچی سے اپنے گناہوں کی صفائی مانگی ہے۔ اس طرح میں اس گال کو بچوں کے پیار سے بھاننے کی کوشش کرتا رہا ہوں اور کر رہا ہوں۔ شروع شروع میں تو میں کسی بچے کو چھو نہ تھا تو میں رو پڑتا تھا۔۔۔

”تمہیں یاد ہو گا طاہرہ پرویز! پہلے روز جب تم بچہ ساجد کے ساتھ کھیل کے میدان میں مجھے دیکھتے آتی تھیں تو میں نے بلاشبہ بول دیا تھا کہ ساجد بچہ دیشاں کی کچی ہے تم نے محسوس نہیں کیا ہو گا لیکن میری وہ حالت دیکھنے اور محسوس کرنے والی تھی۔“

طاہرہ نے باپ کا سر اپنے سینے سے لگا لیا تھا اس نے جھک کر باپ کی پیشانی پر ہنٹ رکھ دیتے۔ اس قدر طویل تو طاہرہ ہوسے کے لیے پیلا ہوئی تھی مگر اسے کی فضا خاموش تھی جس میں بابا کی آہیں اور مٹی مٹی سکون آ میرے سکسکیاں نکلیں ہوا

اگر بارہواں سے پردے سے ہوتی تو شاید طاہرہ باپ کی پیشانی سے اپنے ہنٹ باقی عرکات مگر کی۔ طاہرہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا یا لیکن اسے خیال آیا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ وہاں سے اٹھنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے بلند آواز سے کہا — ”آئیے۔ اندر آجائیں۔“ اور اپنی سسکی سے آواز کو بچھ کر بابا سے ڈاپرے ہو گئی۔

”اس بچے کے والد صاحب باہر کھڑے ہیں۔ چپرا سی نے کمرے میں کر کہا۔“

”انہیں اندر ہی بھیج دو۔ طاہرہ نے کہا۔“ پتھر گویا ہے۔ ذرا سونے ہی دوا ہے۔“ طاہرہ نے دوپٹا سر پر لے

تمہارا انتظار کیا ہے۔ پورے ساڑھے سات سال۔ یہ ستر تو ہر وقت طاہرہ آتی، طاہرہ آتی کرتے رہتے تھے۔  
 ”اور میں تو شادی کر کے بیوہ بھی ہو چکی ہوں۔“ طاہرہ نے یوں کہا جیسے اُس کے مُنہ سے نکل گیا ہو۔  
 ”کوئی بچہ؟“ ارشد نے پوچھا۔  
 ”کوئی نہیں۔“

جمال بیگ نے چونک کر طاہرہ کی طرف دیکھا اور ارشد بلا جھجک طاہرہ کے باپ سے مخاطب ہوا۔ ”اُن کا تعلق  
 میں کراؤں صاحب؟“ ارشد نے ساڑھے سات سال بعد اپنی مخصوص شگفتہ مزاحیہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ  
 بس طاہرہ اور ایک دودن ہیں یہ ستر ارشد بن جاتیں گی۔ میرے بچے کی ماں۔“  
 طاہرہ نے طاہرہ پرویز کے سر کے اوپر سے ارشد کو دیکھا۔ ”اے کے ذہن میں نجمہ کا یہ سوال جاگ اٹھا۔“ ارشد بغیر  
 اطلاع کے آگیا تو؟۔ طاہرہ کے دل نے کہا۔ ”نجمہ آ پانچیاں لے لیتی تھیں کہ ارشد بغیر اطلاع کے آگیا تو تم انکار نہ کر لو  
 گی۔“ طاہرہ نے شرما کر آنکھیں طاہرہ پرویز کی اوستھ میں کر لیں۔

اور چند لمحوں بعد طاہرہ پرویز پٹنگ پر بیٹھنے ہوئے جمال بیگ کی گود میں بیٹھا تھا۔ اسی پٹنگ پر وہ اپنی طرف طاہرہ ٹپٹی تھی  
 اور بائیں طرف ارشد جمال بیگ کا ایک ہاتھ طاہرہ کی گردن کے گرد تھا اور دوسرا ارشد کے کندھوں پر۔ باپ نے دونوں کو اپنے  
 قریب کر لیا اور اس کے آنسو چھ چا دی ہو گئے۔ اطمینان اور سکون کے آنسو۔

”آج ساجدہ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ بیانے کہا اور ارشد اور طاہرہ کو اور قریب کر لیا۔ ☆ ☆ ☆

## اب ”طاہرہ“ کا دوسرا حصہ پڑھیں

طاہرہ کی کہانی ختم ہوئی۔ یہاں سے طاہرہ کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ یہ آپ  
 ہمارے ناول ”خاک وِردی، لال لہو“ میں پڑھیں جو دو جلدوں میں ہے۔ اس  
 میں آپ کو جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء، جنگِ دسمبر ۱۹۷۱ء، منقبوضہ کشمیر میں  
 کمانڈ و ایکشن اور پاکستان میں بھارت کے بڑے حسین جاسوسوں کی  
 سرگرمیاں ملیں گی۔